ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

دفتر ترجمان القرآن [illegible]

فہرست مضامین

ماہ محرم ۱۳۵۵ھ۔ جلد ۸۔ عدد (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

ترجمان القرآن کی اشاعت کو اب پورے تین سال گذر چکے ہیں۔ اور محرم ۵۵ھ سے اس کی زندگی کا چوتھا سال شروع ہو رہا ہے۔ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے جو انعامات ہوئے ہیں ان کا شکر بجا لانا میرا پہلا فرض ہے۔ اول تو یہی احسان کیا کم ہے کہ ایک حقیر گنہگار بندے کو دین حق کی خدمت کے لیے منتخب فرمایا گیا، حالانکہ اگر انتخاب کا مدار علم، تقویٰ، اخلاص اور کمالات ظاہری و باطنی پر ہوتا تو شاید میں آخری شخص ہوتا جس کی طرف نگہ انتخاب مائل ہوتی۔ پھر اس پر مزید احسان یہ ہے کہ میری تمام کوتاہیوں کی تلافی اپنے فضل و انعام سے کی گئی۔ بے علم تھا، نور علم عطا کیا گیا، ناواقف راہ تھا، راہ راست کی طرف ہدایت بخشی گئی۔ کمزور اور پست ہمت تھا، صبر و ثبات اور استقامت کی توفیق دی گئی۔ بے سروسامان اور بے یار و مددگار تھا، خزانۂ غیب سے ہر ہر قدم پر سروسامان بہم پہنچایا گیا، اور ہر مشکل کو ایسے ایسے طریقوں سے آسان کیا گیا کہ میری فکر و تدبیر کا اس میں کچھ بھی دخل نہ تھا۔ یہ تو وہ احسانات ہیں جن کو میں جانتا ہوں، اور ان کا بھی پورا پورا شکر ادا کرنا میری قدرت

سے باہر ہے ۔ رہے وہ بے شمار احسانات جن کی مجھ کو خبر تک نہیں ، تو ان کا شکر کیسے بجالاؤں بجز اس کے ، اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمتہائے تو

مگر حق تعالیٰ اپنے فضل و احسان میں جیسا فیاض ہے، یہ بندہ اس سے فضل و احسان کی طلب میں ویسا ہی حریص ہے ۔ اس نے جو کچھ دیا ہے اس پر شکر ضرور ہے مگر قناعت نہیں ۔ خدا کے مقابلہ میں قناعت کیسی ؟ اس کو اپنے غنا پر ناز ہے تو بندے کو بھی اپنے فقر پر ناز ہے۔ اس کا فیض بے پایاں ہے تو بندے کی احتیاج بھی بے پایاں ہے۔ وہ دینے سے نہیں تھکتا تو بندہ مانگنے سے کیوں تھکے ؟ اور اس سے نہ مانگے تو پھر کس سے مانگے ؟ میں علم کا پیاسا ہوں ، اور اس پیاس کو بجھانے والا اس کے سوا کوئی نہیں ۔ میری عقل و فہم میں ہزاروں کوتاہیاں ہیں اور ان کو دور کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہی ہے ۔ میرا دل بے چین ہے، میری روح مضطرب ہے، میرا دماغ سکون سے محروم ہے، خدا ہی ہے جو اس بیماری کا مداوا کرسکتا ہے ۔ میں گناہوں میں گھرا ہوا ہوں ، میرے عمل میں لاکھوں خامیاں ہیں، میری فطرت کی کمزوریاں قدم قدم پر مرضات الٰہی کے اتباع سے مجھکو روکتی ہیں ۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جو میرے ان عیوب کی اصلاح کرے اور عمل صالح کی توفیق بخشے ۔ میں اس سے خلوص نیت کا طلب گار ہوں ، صحت فکر اور سداد نظر مانگتا ہوں ۔ الحب فی اللہ والبغض للہ کی توفیق چاہتا ہوں ۔ میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے بندوں سے بے نیاز کر کے صرف اپنا نیازمند بنائے ، محبت اور خوف اور طمع کا تعلق سب سے توڑ کر صرف اپنے ساتھ جوڑ دے ، اور اتنی قوت و طاقت عطا فرمائے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنے دل کے سب حوصلے نکال سکوں ۔ وَاَدْعُوْ رَبِّیْ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ۔

اس گئی گذری حالت میں بھی شاید مسلمانوں کی کوئی بستی ایسی نہ ہوگی جس میں کم از کم
دو چار درد مند دل نہ پائے جاتے ہوں۔ بڑے شہروں کی حالت تو بظاہر مایوس کن ہے لیکن
چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں ایسے لوگوں کے لیے کام کرنے کے مواقع بہت زیادہ ہیں۔ اگر ایک ایک
بستی میں ایک بھی سچا درد رکھنے والا مسلمان عملی جد و جہد کے لیے کمربستہ ہو جائے تو مسلمانوں میں نظم
اور نظم میں حیات پیدا ہو سکتی ہے۔ اسلام نے تو ہمارے کام کو بہت ہی ہلکا کر دیا ہے۔ ہمیں صرف دو چیزوں
کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک اقامت صلوٰۃ۔ دوسرے ایتائے زکوٰۃ۔ اسلام کے یہ دو
ارکان مضبوطی کے ساتھ قائم کر دیجئے، پھر دیکھئے کہ پراگندہ افراد خود جماعت بنتے ہیں، جماعت
میں خود بخود زندگی کی حرکت پیدا ہوتی ہے، حرکت آپ سے آپ قوت پیدا کرتی ہے، اور قوت
بالطبع ترقی کی جانب قدم بڑھاتی ہے۔ پراگندگی، بے سروسامانی اور اخلاقی و روحانی انحطاط کی
کوئی حالت اس حالت سے بڑھ کر متصور نہیں ہو سکتی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت
عرب میں پائی جاتی تھی۔ مگر وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے ان تمام کمزوریوں کو دور کر کے عرب کو
ایک طاقتور قوم بنا دیا؟ یہی دو چیزیں۔ انہی پر قرآن میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔
انہی کو قائم کرنے پر نبی اکرم اور صحابہ کرام نے سب سے زیادہ اپنی قوت صرف کی۔ انہی دو ستونوں
پر اسلامی عظمت کی عالمگیر عمارت قائم ہوئی۔ یہی وہ ارکان ہیں جن کا انہدام اسلام کا انہدام ہے۔ عہد رسالت
اور عہد صحابہ پر نظر کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ اس دور میں اسلام اور اقامت صلوٰۃ لازم و ملزوم تھے
اور کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان تارک الصلوٰۃ ہو۔ ایتائے زکوٰۃ کی اہمیت کا یہ حال
تھا کہ سرکار رسالتمآب کی رحلت کے بعد جن لوگوں نے اس رکن اسلام کو منہدم کرنا چاہا، ان پر
صدیق اکبر نے تلوار کھینچ لی اور اس طرح ان سے جنگ کی جیسے کفار سے کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ
کس لیے تھا؟ محض اس لیے کہ نماز اور زکوٰۃ کے مٹ جانے کے بعد اسلام کا عدم و وجود

برابر ہوجاتا ہے ایمان کا شعلہ بجھنے لگتا ہے۔ اخلاق فاسد ہوجاتے ہیں، جماعت کا شیرازہ منتشر ہوجاتا ہے، باہمی تعاون کا رشتہ منقطع ہوجاتا ہے، اور آخرکار امت کی حالت وہ ہوجاتی ہے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پس جو لوگ حقیقت میں اسلامی جمعیت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں، انہیں کسی نئے پروگرام کی ضرورت ہی نہیں۔ اسلام کی فطرت سے جو جمعیت مناسبت رکھتی ہے اس کے لیے صحیح ماڈل نہ تو نازی اور فاسسٹی ہے، اور نہ خاکساری و خدائی خدمتگاری۔ بلکہ اس کا صحیح ماڈل وہی مدنی و محمدی ہے، اور اس کے لیئے صرف اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کا پروگرام کافی ہے۔

ایک مہلک مرض جو مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو گھن کی طرح کھا گیا ہے، اور کھائے جا رہا ہے "وراثت" کا مرض ہے۔ سب سے پہلے اس نے ہمارے نظام سیاست کو خراب کیا۔ اس کے بعد یہ گھاس تلے کے پانی کی طرح ہمارے نظم ملت کے ہر شعبے کی جڑوں میں پھیلتا چلا گیا اور ہماری قوت کے جتنے مرکز تھے ان سب کو اس نے فاسد کردیا۔ اسلام میں تو نبی کا بیٹا بھی وراثت میں نبوت نہیں پاتا مگر یہاں وراثت کا قانون ایسا عالمگیر ہوا ہے کہ عالم کا بیٹا عالم ہے، مرشد کا بیٹا مرشد، قاضی کا بیٹا قاضی، امام کا بیٹا امام اور سپہ سالار کا بیٹا سپہ سالار۔ ہر شخص جس نے اپنے فضل و کمال سے جماعت میں اپنا ایک ممتاز مقام پیدا کیا، اس کی ایک باقاعدہ مسند بن گئی، اور اس کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں کا اس مسند پر بیٹھنا لازم ٹھیر گیا، خواہ ان میں اہلیت ہو یا نہ ہو۔ وراثت کے اس غلط اور جاہلانہ طریقے نے اتنا زور پکڑا کہ جوہر کمال بے قیمت ہوگیا اور اکثر و بیشتر دینی و اجتماعی خدمات جن کی بجاآوری پر تمام ملت کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے، محض نسبی استحقاق کی بنا پر ناقابل لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ علماء کا اصلی کام علم حق کا پھیلانا تھا۔ مگر جب علم کے خانوادے بن گئے تو

علماء حق کے بے علم جانشینوں نے جہالت کی تاریکی پھیلائی اور مسلمانوں کو گمراہ کر دیا۔ مرشدوں کا اصلی منصب تزکیہ نفوس اور فضائل اخلاق کی اشاعت اور خلق اللہ کی ہدایت تھا، مگر جب مسند ارشاد و ہدایت ورثہ میں منتقل ہونے لگی تو ارشاد غائب ہوگیا، اور اس مسند کے وارثوں کا کام صرف یہ رہ گیا کہ دست و پا کو بوسے دلوائیں، مریدوں، معتقدوں اور زائروں سے نذرانے وصول کریں، اور اس تو ان فروشی سے جو مال حاصل ہو اس کو فسق و فجور کی نذر کر دیں۔ قضاۃ اس لیے تھے کہ شریعت کی حدود قائم کریں، مگر جب منصب قضا مال و جائداد کی طرح باپوں سے بیٹوں کو ترکے میں ملنا شروع ہوا تو قاضیوں کا کام یہ ہوگیا کہ بزرگوں کی معاشوں سے داد عیش دیں اور اقامت حدود کے لیے سعی کرنا تو درکنار خود اپنے کرتوتوں سے شریعت کی ایک ایک حد کو توڑ ڈالیں یہی انجام دوسرے اہم مناصب کا بھی ہوا۔ مساجد کو مسلمانوں کی آبادیوں میں جو مرکزیت حاصل تھی وہ نالائق اماموں اور متولیوں کے ہاتھوں قریب قریب فنا ہوگئی۔ اوقاف اسلامی جو کبھی خیرات و حسنات کے منابع تھے، اسی منحوس وراثت کی بدولت تباہ ہوگئے۔ اسلام کا عسکری نظام جس کی ہیبت و جبروت سے روئے زمین کانپ اٹھتا تھا۔ اسی وجہ سے غارت ہوا کہ امارت و قیادت کے اہم مناصب خاندانوں کی میراث بن گئے۔ غرض اسلامی تہذیب و تمدن کو اس چیز سے جتنے شدید نقصانات پہنچے اور پہنچ رہے ہیں۔ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ جدھر نظر کی جاتی ہے، دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کے بڑے بڑے وسائل پر ایسے لوگ قابض پائے جاتے ہیں جو خود فساد کے سرچشمے اور مفاسد کی پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ اس سد راہ کو پوری قوت کے ساتھ اکھاڑ نہ پھینکا جائے۔

آخری دور کے بادشاہوں اور امراء و حکام نے کچھ تساہل، کچھ ناعاقبت اندیشی اور

کہ بیجا فیاضی کی بنا پر یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علماء، مشائخ، قضاۃ، ائمہ اور دوسرے اہل مناصب کے لیے جاگیریں اور معاشیں مقرر کیں اور ان مناصب کو موروثی بنا دیا۔ اس دور کے عام مسلمان بھی فقدانِ علم اور عدمِ تدبر کی وجہ سے اسی غلطی میں مبتلا ہوئے اور اپنی عقیدتوں کو باکمال بزرگوں کے بعد ان کے بے کمال جانشینوں کی طرف منتقل کرتے چلے گئے۔ اس کے برے نتائج کو انہوں نے نہ سمجھا، یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن آج وہ نتائج بے نقاب ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص شریعت یا رسم و رواج کی آڑ لیکر اس غلط قاعدے کی حمایت کرتا ہے تو اس کی عقل پہ ہزار افسوس ہے رواج کی آڑ تو مسلمانوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے اصل اور بودی آڑ ہے۔ کوئی غلطی محض اس بنا پر برقرار رہنے کی مستحق نہیں ہو سکتی کہ اس کا ارتکاب سو دو سو یا ہزار برس پہلے کیا گیا تھا۔ رہی شریعت تو اس کی نگاہ میں ہر چیز سے زیادہ اہم اور اقدم دین کی مصلحت اور امت کی بہتری ہے۔ اگر شرعی قانون کے مطابق کوئی فعل کیا گیا ہو اور بعد میں ثابت ہو جائے کہ وہ فعل مصلحتِ دینی کے خلاف اور جماعت کے لیے مضر تھا تو اس فعل کے جاری رکھنے کے لیے یہ کوئی محکم دلیل نہیں ہے کہ اصطلاحی حیثیت سے وہ فعل شرعی قانون کے مطابق کیا گیا تھا۔ خود شرعی قانون ہی اس کی اجازت دیتا ہے کہ ایسے فعل کو مٹا دیا جائے۔

ناظرین ترجمان القرآن اس سے باخبر ہیں کہ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی آجکل انگریزی زبان میں قرآن مجید کا با تفسیر ترجمہ کر رہے۔ اس کام کے لیے ان کو لین (Lane) کی مشہور انگریزی لغت (Arabic English Lexicon) کی ضرورت ہے اگر کوئی صاحب اس کتاب کو فروخت کرنا چاہیں تو مولنا سے دریاباد ضلع بارہ بنکی کے پتہ پر مراسلت فرمائیں۔

مقالات

مسئلہ بداء

علم کلام کا ایک تشنۂ تحقیق جزئیہ

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی کا صلہ
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

(۱)

بداء سے کیا مراد ہے؟ سید شریف جرجانی فرماتے ہیں۔

البداء ظہور الرای بعد ان لم یکن	بداء یہ ہے کہ پہلے ارادہ نہ تھا، رای نہ تھی، بعد کو یہ صورت ظاہر ہوئی۔
والبدائیۃ ھم الذین جوزوا البداء علی اللہ تعالیٰ	جو لوگ اللہ تعالیٰ سے بداء کو منسوب کرتے ہیں وہی "بدائیہ" ہیں [1]

شرح مواقف میں ہے:۔

فرقہ بدائیۃ | البدائیۃ جوزوا البداء بدائیہ اللہ تعالیٰ پر بداء کو تجویز کرتے ہیں، تجویز کی

[1] ۔ تعریفات؛ طبع ۱۳۱۸ ۔ استانبول ۔ ص ۲۹۔

علی اللہ تعالیٰ ای جوّز وان یرید اللہ شیئاً ثم یبد و لہ ای یظھر علیہ مالم یکن ظاھراً علیہ ویلزمہ ان لایکون الرّبّ عالماً بعواقب الامور[1]	صورت یہ قرار دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی شی چاہتا ہے، پھر اس خواہش کے خلاف کوئی مصلحت ظاہر ہوتی ہے، لہذا اس کو ترک کر دیتا ہے اس عقیدے کے لوازم میں یہ ہے کہ پروردگار انجام کار سے لاعلم ہو[1]

علم کلام کا یہ جزئیہ بالکل ہی تشنۂ تحقیق ہے، آئیے تاریخ سے اس کی تشریح کرائیں۔

—— (۲) ——

مابعد سانحہ کربلا ہجرت نبوی کا چھیاسٹواں سال ہے، سیدنا حسین بن علی علیہما السلام دشت کربلا میں شہید ہو چکے ہیں، جوش انتقام نے عراق کو ایک شعلۂ جوالہ بنا رکھا ہے، یزید و آل یزید پر عام بیزاری مزید ہے، توابین کا تو خاتمہ ہو چکا ہے مگر تو بہ تلّا اب بھی برپا ہے، اسی حالت میں قبیلہ ثقیف کا ایک جوانمرد اٹھتا ہے اور سب کو بٹھا دیتا ہے، اس کی کنیت ابو اسحاق ہے، پہلے خارجی رہ چکا ہے۔ اس میں کامیابی موہوم نظر آئی تو اب زمرۂ طرفداران اہل بیت میں اپنے تئیں منسلک کرنا چاہتا ہے، ایں ہمہ شیعہ اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسنؑ مجتبےٰ کے عہد میں اس کی کاٹ پھانس دیکھ چکے ہیں، اب نہ جانے یہ کانٹا کیا گل کھلائے، یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے۔

کانت الشیعۃ تسبّہ وتعیبہ لما کان منہ فی امر الحسن بن علی حین طعن فی ساباط وحمل الی ابیض المدائن[2]	سیدنا حسن بن علی علیہما السّلام کے معاملہ میں جب کہ ساباط میں نیزہ مارا گیا اور رہ ایوان کسریٰ کے قصر سفید میں اٹھا کر پہونچا یا گیا اس شخص کی جو روش

رہ چکی تھی اسی بنا پر شیعہ اس کو گالیاں دیتے اور اس پر طرح طرح کے عیب لگاتے تھے[2]۔

[1] شرح مواقف۔ طبع ۱۳۲۵ مطبعۂ سعادۃ۔ مصر۔ ج ۸، ص ۳۷۸۔ [2] الکامل طبع ۱۳۰۱۔ ازہریہ مصر ج ۴ ص ۸۳

―――― ۳ ――――

خلافت ابن زبیر | دمشق میں یزید کا خاتمہ ہو چکا تھا، معاویہ بن یزید کے دن پورے ہو چکے تھے، سال بعد ہوے مروان بھی مر چکا تھا اور عبدالملک کو چھوڑ گیا تھا کہ "مرج راہط" کے نتائج سے نفع اٹھائے۔ حجاز و یمن و مصر کے ساتھ عراق نے بھی عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت تسلیم کر لی تھی۔

اسی حالت میں یہ جوانمرد عراق آتا ہے، بیگانہ وار کوفہ کا رخ کرتا ہے، اور جاننا چاہتا ہے کہ آیا اُس کے لیے بھی کوئی میدان ہے؟ ہانی بن جبۃ الوداعی سے ملاقات ہوتی ہے جو اسے بتاتا ہے۔

روزن دیوار | اهل الكوفة على طاعة ابن الزبير، الا ان طائفة من الناس هم عدد اهلها لو كان لهم من يجمعهم على رأيهم اكل بهم الارض۔

کوفہ کے لوگ عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کے مطیع ہیں البتہ ایک چھوٹا سا فریق اور ہے کہ ان سب میں یہی لوگ شمار و قطار میں لانے کے قابل ہیں کوئی انہیں سمیٹ کے بجائے بلادے تو انہیں کے سہارے تمام زمین کو کھا جائے

ہمارا جوانمرد یہ سن کے بے اختیار ہو جاتا ہے کہ:-

ذریعہ فتح یاب | انا ابو اسحاق - انا واللہ لهم ان اجمعهم على الحق والقی بهم ركبان الباطل، واهلك بهم كل جبار عنيد[1]

میں ہوں ابو اسحٰق، میں ہی ان کے لیے ہوں اُن کو امر حق پر اکٹھا کروں گا، ان کے ذریعہ باطل پسندوں سے لڑوں گا۔ اور ہر ایک سرکش جبار کو ہلاک کروں گا[1]

[1] الکامل - ج ۴ ص ۲۲ -

رفتار روزگار نے یہ الفاظ حرف بحرف صحیح ثابت کیے، قاتلان حسین علیہ السلام سے اُس کا انتقام نہایت خون ریز تھا۔

(۴)

فریب بتقابل فریب | انہیں معرکوں میں ایک مرتبہ ایک پر کالۂ آتش بھی گرفتار ہوا کہ سراقہ بن مرداس بارقی کے نام سے معروف عام تھا، قیدیوں کو عموماً قتل کی سزا دیجاتی تھی لیکن یہ تو بارقی تھا، تلوار کی بجلی ایسے برق وش پر کیا گرتی، قتل کے لیے پیش ہوا تو کہنے لگا۔

فرشتہ نمائی | اصلح اللہ الامیر احلف	صاحب کو اللہ تعالیٰ صلاحیت کے ساتھ رکھے میں
باللہ الذی لا الٰہ الا ھو لقد رأیت	اُس خدا کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی دوسرا
الملائکۃ تقاتل معک علی الخیول	معبود نہیں میں نے فرشتوں کو دیکھا کہ آسمان و زمین
البلق بین السماء والارض	کے درمیان ابلق گھوڑوں پر سوار تیری جانب سے لڑ رہے ہیں

حکم ہوا:۔

اصعد المنبر فاعلم الناس۔	منبر پر چڑھ کے اپنے مشاہدات سے لوگوں کو آگاہ کر دے

عوام یہ باتیں سن کے قدرۃً خوش ہوئے ہوں گے کہ اس لڑائی میں اللہ ہمارا مددگار ہے ہاں زمانہ شناس جوانمرد اتنا سادہ دل نہ تھا کہ ان باتوں میں آجاتا تاہم مصلحت مقتضی تھی کہ اس کو رہا کر دیا جائے۔

(۵)

افشائے راز | یہ بجلی آزاد ہو کے بصرہ پہونچی اور مصعب کے لشکرگاہ سے یہ شرارے چھوڑے:۔

الا ابلغ ابا اسحاق انی ‏ ‏ ‏ رأیت البلق دُھماً مُصمتات

(ابواسحاق کو خبر دو کہ جو ابلق گھوڑے میں نے دیکھے تھے سچ مچ کے ابلق نہ تھے وہ تو نرے کالے رنگ کے مشکی تھے)

أُرِيَ عينيّ مالم تبصراهُ   كلانا عارفٌ بالتُّرهاتِ

(میں اپنی آنکھوں کو ایسی چیزیں دکھاتا ہوں جو دیکھی تک نہیں، ہم تم دونوں باطل شناس ہیں)

كفرتُ بوحيكم وجعلت نذرا   عليّ قتالكم حتى المماتِ[1]

(تم پر جو وحی آتی ہے میں اس کا منکر ہوں اس وحی کے کفر ہونے میں نے منت مان رکھی ہے اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ہے کہ مرتے دم تک تم لوگوں سے لڑتا رہوں گا)۔

ادعائے نزول وحی | آخری بیت سے کچھ محسوس ہوتا ہے کہ عوام میں چرچا تھا کہ ہمارے جوانمرد پر وحی نازل ہوتی ہے یہ سخن سازی ہی تھی یا اس میں واقعیت کا بھی کچھ شائبہ تھا؟

عربوں کی شاعری سے جو آگاہ ہیں آجکل کی عجمی خیال بندی پر اس کو قیاس نہیں کر سکتے اس کی تحقیق کے لیے بھی آپ کو تاریخ ہی کی عدالت میں رجوع کرنا پڑے گا۔

بیا کہ پردہ زروے خوش تو بردارم

———(۶)———

عمارت وحی کی کرسی | کوفہ میں طفیل بن جعدہ بن ہبیرہ کے دن بڑی تنگی و ترشی سے بسر ہو رہے تھے، نہ دولت مال حوادث کی تلوار سے نڈھال کہ مال ہی نہیں پھر کون پوچھتا ہے کمال۔

پڑوس میں ایک تیلی صاحب کی دوکان پر ایک میلی کچیلی کرسی پڑی رہتی طفیل نے اس کو اٹھا منگایا گھر میں صاف کرایا، لکڑی تیل پی چکی تھی، نہایت روغندار نکلی، دربار میں جاکے اطلاع دی کہ:-

ان فيه اثرا من علي   اس کرسی میں علی علیہ السلام کی نشانی ہے۔

حکم ہوا:-

سبحان الله اخرته الى هذا الوقت ابعثه   اللہ اللہ اب تک اس کی اطلاع نہ دی، ابھی منگا۔

[1] الکامل ص۱۱۱

کرسی حاضر کی گئی، بارہ ہزار انعام ملا، اجتماع عام ہوا اور حماقت نے اپنی شان دکھائی

تابوت سکینہ کا نمونہ | الم یکن فی الامم الخالیۃ — گذشتہ قوموں کا کوئی ایسا امر نہیں کہ ویسا ہی اس

امر الا و ھو کائن فی ھذہ الامۃ — امت میں شدنی نہ ہو، بنی اسرائیل میں تابوت سکینہ

مثلہ وانہ کان فی بنی اسرائیل تابوت — تھا، ہماری امت میں یہ کرسی اسی تابوت کے

وان ھذا فینا مثل التابوت۔ — مماثل ہے:

اللہ اکبر کے نعروں میں کرسی پر سے غلاف اتارا گیا اور اب اس کی عظمت مسلم ہوگئی۔

ابن زیاد سے حسین علیہ السلام کے خون کا بدلہ لینے کے لیے جب لشکر چلا ہے تو ایک خچر پر

آگے آگے یہ کرسی بھی ایک غلاف کے اندر تھی۔

فقتل اھل الشام مقتلۃ عظیمۃ فزادھم — لشکر نے شامیوں پر بڑا کشت و خون کیا، کامیابی نے

ذلک فتنۃ فارتفعوا حتی تعاطوا الکفر — فتنہ کو اور بڑھا دیا، کرسی کے متعلق جو عقیدہ تھا اس سے بھی بڑھے، اور اس قدر بڑھے کہ کفر کرنے لگے۔

(۷)

چھوٹے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر | یہی موقع تھا جب اعشیٰ ہمدان کو کہنا پڑا:-

شھدت علیکم انکم سبائیۃ — وانی بکم یا شرطۃ الشرک عارف

(تمہارے خلاف میں گواہی دیتا ہوں کہ تم سب ابن سبا یہودی کے فرقہ کے لوگ ہو، شرک کے پولس والو! میں تم کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں)

فاقسم ما کرسیکم بسکینۃ — وان کان قد لفت علیہ اللفائف

(قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری کرسی پر غلاف تو چڑھے ہوئے ہیں باایں ہمہ وہ تابوت سکینہ نہیں ہے

وأن ليس كالتابوت فينا وإن سعت شبامٌ حواليه ونهدٌ وخارفٌ

(میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ اگرچہ اس کرسی کے ارد گرد شبام و نہد اور خارف دوڑتے رہتے ہیں، پھر بھی وہ تابوت سکینہ کے مانند نہیں) ۔

واني امرؤٌ احببت آل محمد وتابعت وحياً ضمنتهُ المصاحفُ

(میں ایسا شخص ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت رکھتا ہوں اور اُسی وحی الٰہی کا تابع ہوں جو قرآن شریف میں ہے) ۔

وبايعتُ عبدالله لما تتابعت عليه قريشٌ شمطها والغطارفُ

اہل بیت سے محبت رکھتے ہوئے میں نے عبد اللہ بن الزبیرؓ سے بیعت کر لی اس لیے کہ قریش کے جتنے فرقے ہیں اور جس قدر سرداران قوم ہیں سب نے ان کی خلافت پر اتفاق کر لیا) ۔

کرسی کے پجاری | اس نظم کی تیسری بیت کی تشریح بھی سن لیجئے ۔

خرجت شبامٌ وشاكرٌ ودوس شبام اور شاکر اور دوسرے سرداران قوم اس
اصحابه وقد جعلوا عليه الحرير كان کرسی کی بزرگداشت کو نکلے، اس پر ریشمی غلاف چڑھا
اول من سدنه موسى الاشعري رکھا تھا، پہلے پہل موسیٰ اشعری اس کرسی کے خادم
فعتب الناس على موسى فتركه و مقرر ہوئے لوگوں نے جب ملامت کی تو موسیٰ نے
سدنه حوشب البرسمي ۔ یہ خدمت ترک کر دی پھر یہ خدمت حوشب برسمی کے تفویض ہوئی

کرسی اور وحی کا پایہ | چوتھی بیت کی نسبت "لیثی" کی شہادت پر غور کیجئے ۔

ابلغ ابا اسحاق ان جئته اني بكرسيكمو كافر

(ابو اسحاق کے پاس جانا تو یہ پیغام سنانا کہ تم لوگوں نے جو کرسی بنا رکھی ہے میں اس کا منکر ہوں)

ترو اشباه حول اعواده و تحمل الوحی له شاکر

(تم دیکھو گے کہ کرسی کی لکڑیوں کے اردگرد شبام پھر رہا ہے اور شاکر اس کے لیے حالِ وحی کا کام کر رہا ہے)

محمرۃ اعینهم حوله کانهن الحامض الخائر

(کرسی کے گرد یہ لوگ کھڑے ہیں، آنکھیں لال لال ہیں، ایسا دکھائی دیتا ہے کہ بھنگلے اور تنگ چشم ہیں)۔

فرقہ مختاریہ | یہ مختار بن ابی عبید ثقفی تھا جس کی کنیت ابو اسحاق تھی اور جس نے سیدنا حسین علیہ السلام کے قاتلوں سے بڑا سخت انتقام لیا ہے، مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں اس کا بھی ایک فرقہ ہے جسے "مختاریہ" کہتے ہیں۔

فرق الشیعہ | جرمن مستشرقوں کی ناموری مجلس نے "نشریات اسلامیہ" کے سلسلہ میں استامبول کے مطبعۃ الدولہ (یعنی سرکاری مطبع) سے ۱۹۳۱ میں "کتاب فرق الشیعہ" شائع کی ہے جو سلسلہ نشریات کی چوتھی یادگار رہے، ڈاکٹر ھ. ریٹر اس کے ناشر ہیں، سید ہبۃ اللہ شہرستانی نے کہ علمائے شیعۂ اہل بیت علیہم السلام میں ممتاز شہرت رکھتے ہیں، اشاعت کتاب میں امداد فرمائی ہے اور مستند مصنفاتِ امامیہ اثنا عشریہ سے مصنف کے واقعاتِ حیات یکجا کیے ہیں۔

علامہ نوبختی | عہد خلافت عباسیہ میں خاندان نوبخت بہت ہی بڑا ور نکلا، یہ لوگ مجوسی تھے مسلمان ہو کے علم ہیئات میں شہرۂ آفاق ہوئے، حسن بن موسیٰ نوبختی اسی بڑی خاندان کے رکن رکین تھے جنہیں علمائے شیعہ نہایت ثقہ مانتے ہیں اور اپنے علم کلام کا علامہ جانتے ہیں، شیخ حلی خلاصہ میں ان کو اپنا شیخ لکھتے ہیں۔ (صہ ۲۱ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی المتوفی ۴۶۰ کی کتاب الفہرست طبع کلکتہ ۱۸۵۳ میں کان اماميًا حسن الاعتقاد ثقة (وہ طریقۂ شیعہ امامیہ کے خوش اعتقاد ثقہ و قابل اعتماد بزرگ تھے) ان کی شان میں وارد ہے (صہ ۹۶) شہید ثالث قاضی سید نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں "از اکابر این طائفہ و عظمائے این سلالہ" ان کو قرار دیتے ہیں (طبع تبریز

صلا ؛ تاریخ فرق الشیعہ انھیں علامہ نوبختی کی کتاب ہے۔

(۹)

اس کتاب میں مختار بن ابی عبید ثقفی اور اس کی جماعت کے اعتقادات دیکھنے کے قابل ہیں، فرماتے ہیں۔

امام مہدی اور وصی — **اہل بیت ان کے تابع ہیں**

قالت ان محمد بن الحنفية رحمة الله تعالى هو الامام المهدي وهو وصي علي بن ابي طالب عليه السلام ليس لاحد من اهل بيته ان يخالفه ولا يخرج عن امامته ولا يشهر سيفه الا باذنه

اس فرقہ کا قول ہے کہ محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ ہی امام مہدی آخر الزماں ہیں اور انہیں کو امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنا وصی مقرر فرمایا تھا اہل بیت میں کسی کو حق نہیں کہ اُن کی مخالفت کر سکے نہ ان کی امامت سے کوئی سرتابی کر سکتا ہے اور نہ بدون ان کی اجازت کے تلوار کھینچ سکتا ہے۔

حسن علیہ السلام محکوم تھے

وانما خرج الحسن بن علي الى معاوية محاربًا له باذن محمد و وادعه وصالحه باذنه۔

محمد بن حنفیہ ہی کی اجازت سے سیدنا حسن علیہ السلام معاویہ سے لڑنے کو نکلے تھے اور پھر اُنھیں کے حسب حکم مصالحت کی تھی۔

حسین علیہ السلام بھی محکوم تھے — **ہلاکت و ضلالت**

وان الحسين انما خرج لقتال يزيد باذنه ولو خرجا بغير اذنه هلكا وضلا۔

سیدنا حسین علیہ السلام بھی یزید سے لڑنے کی غرض سے محمد بن حنفیہ ہی کے حکم سے برآمد ہوئے تھے حسنین علیہما السلام اگر محمد بن حنفیہ کی اجازت کے بغیر نکلتے تو ہلاک و گمراہ ہو جاتے

کفر و شرک

وان من خالف محمد بن الحنفية كافر مشرك۔

جس نے محمد بن حنفیہ کی مخالفت کی وہ کافر بھی ہے اور مشرک بھی۔

اختیار بدست مختار

وان محمدًا استعمل المختار بن ابي عبيد على العراقين بعد

شہادت حسین علیہ السلام کے بعد محمد بن حنفیہ نے مختار بن ابی عبید کو عراقین یعنے بصرہ و کوفہ کا والی

قتل الحسين وامره بالطلب بدم الحسين وثاره وقتل قاتليه وطلبهم حيث كانوا۔
وسماه كيسان لكيسه ولما عرف من قيامه ومذهبه فيهم

وکالت فرما مقرر کر کے حکم دیا کہ شہید کربلا کے خون کا انتقام لیں ان کے قاتلوں کو قتل کریں، اور جہاں کہیں ملیں انھیں ڈھونڈھ نکالیں۔
مختار کی دانشمندی وکیاست کی بنا پر محمد بن حنفیہ نے کیسان کے خطاب سے اُن کو مخاطب کیا، جانتے تھے کہ وہ کتنے بڑے مستعد ہیں اور دشمنان خاندان نبوت کے متعلق اُن کی روش کیا ہے۔

فرقہ مختاریہ | فهم يسمون المختارية ويدعون الكيسانية[1]

اسی بنا پر یہ فرقہ مختاریہ کے نام سے موسوم اور کیسانیہ کے خطاب سے مشہور ہے[1]۔

(۱۰)

شہرستانی کی مِلل ونِحل ۱۸۴۶ء میں ریورنڈ کورٹن نے ایڈٹ کی تھی جو ۱۹۲۳ء میں لیبزک سے شائع ہوئی، اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:-

مختار پہلے خارجی تھا | المختارية اصحاب المختار بن عبيد كان خارجيا ثم صار زبيريا ثم صار شيعيا وكيسانيا، قال بامامة محمد بن الحنفية بعد علي وقيل لا بل بعد الحسن والحسين و كان يدعوا الناس اليه ويظهر انه من رجاله ودعاته ويذكر علوما مزخرفة ينوطها به۔

مختار بن عبید کے فرقہ کا نام مختاریہ ہے، یہ شخص پہلے خارجی تھا، پھر عبداللہ بن زبیرؓ کا پیرو بنا، پھر شیعی ہوگیا اور شیعہ کیسانیہ کا عقیدہ اختیار کیا، علی علیہ السلام کے بعد محمد بن حنفیہ کو امام برحق مانا۔ مختار کے عقیدہ کی نسبت دو روایتیں ہیں، ایک روایت ہے کہ علی علیہ السلام کے بعد ان کے تیسرے فرزند محمد بن حنفیہ کی امامت کا معتقد تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ نہیں علی علیہ السلام کے بعد حسنین علیہم السلام کو اور ان کے

[1] فرق الشیعہ ص ۲۴۔

بعد محمد بن حنفیہ کو امام معصوم کہتا تھا، ان کی امامت کا داعی تھا ان کے لوگوں میں اپنے آپ کو جتاتا، ان کے داعیوں میں اپنے تئیں قرار دیتا کچھ مزخرف علوم کا تذکرہ کرتا کہ یہ محمد بن حنفیہ کے علوم ہیں

امام کی تبری اپنے مقتدی سے

ولما وقف محمد بن الحنفیۃ علی ذلک تبرأ منہ و اظہر لاصحابہ انہ انما نمس علی الخلق ذلک لیتمشی امرہ و یجتمع الناس علیہ۔

محمد بن حنفیہ واقف ہوے تو انہوں نے مختار سے برات کی اور اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر دیا کہ خلق اللہ کو مختار نے محض اس لیے فریب دیا ہے کہ اس کا کام چل نکلے اور سب اس پر اتفاق کر لیں۔

کامیابی کے اسباب

وانما انتظم لہ ما انتظم بامرین۔

اس کو جتنی کامیابی ہوئی دو سبب سے ہوئی

احدہما انتسابہ الی محمد بن الحنفیۃ علماً و دعوۃً۔

ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو محمد ابن الحنفیہ سے منسوب کرتا تھا کہ میں اُن کے علم کا حامل اور ان کی امامت کا داعی ہوں۔

والثانی قیامہ بثار الحسین علیہ السلام و اشتغالہ لیلاً و نہاراً بقتال الظلمۃ الذین اجتمعوا علی قتل الحسین

اور دوسرا سبب یہ ہوا کہ وہ حسین علیہ السلام کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کھڑا ہوا اور شب و روز ان ظالموں کو سزا دینے میں سرگرم رہا جو حسین علیہ السلام کے قتل پر مجتمع ہوے تھے۔

مختار کا مذہب

فمن مذہب المختار انہ یجوز البداء علی اللہ تعالی

مختار کے مذہب کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالے پر ”بدا“ کی تجویز کرتا ہے۔

والبداء لہ معان۔

”بدا“ کے کئی معنی ہیں۔

بدا فی العلم | البدا فی العلم	ایک تو وہ بدا ہے جو علم میں ہو۔
وھو ان یظھر له خلاف ما علم۔	"بدا فی العلم" یہ ہے کہ پہلے جو معلوم ہوا تھا اس کے خلاف ظاہر ہوا
ولا اظن عاقلا یعتقد ھذا	یہ بات میرے گمان میں تو نہیں آتی کہ کوئی عقلمند یہ عقیدہ
الاعتقاد۔	رکھتا ہو۔
بدا فی الارادہ | والبدا فی الارادة۔	دوسرا وہ "بدا" ہے جو ارادہ میں ہو۔
وھو ان یظھر له صواب علی خلاف	"بدا فی الارادة" یہ ہے کہ پہلے جو ارادہ اور فیصلہ
ما اراد وحکم۔	کیا تھا اب اس کا مخالف پہلو درست نکلے۔
بدا فی الامر | والبدا فی الامر	تیسرا وہ "بدا" ہے جو امر (حکم) میں ہو
وھو ان یامر بشیء ثم یامر بعدہ	"بدا فی الامر" یہ ہے کہ کسی شے کی نسبت پہلے کوئی حکم
بخلاف ذلك۔	دیا تھا، پھر اس کے مخالف کوئی حکم دیں۔
منھ سے بچا، پرنالے کے نیچے | ومن لم یجوز النسخ	کلام اللہ میں جو ناسخ و منسوخ کو ناجائز قرار دیتے
ظن ان الاوامر المختلفة فی الاوقات	وہ یہی گمان کرتے ہیں کہ مختلف اوقات میں مختلف احکام
المختلفة متناسخة۔	ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مٹا ڈالتا ہے
راز درون پردہ | وانما سار المختار الی	بدا کا عقیدہ اختیار کرنے کی علت یہ تھی کہ مختار کو
اختیار القول بالبدا لانه کان یدعی	دعویٰ تھا کہ جو حالات اس وقت پیش آ رہے ہیں یا
علم ما یحدث من الاحوال۔	آیندہ چل کے پیش آنے والے ہیں مجھے ان سب کا علم ہے
اما بوحی یوحی الیه۔	یہ علم یا تو وحی الٰہی کے ذریعہ سے ہے جو مجھ پر نازل ہوتی ہے
واما برسالة من قبل الامام۔	یا امام کے پیغام سے یہ علم حاصل ہوا ہے۔
فکان اذا وعد اصحابه بکون شیء	اپنے ساتھیوں سے جب کسی شے کے ہونے یا کوئی تما

وحدوث حادثۃ فان وافق کونہ	پیش آنے کا وعدہ یا وعید کرتا تھا تو واقعات اگر
قولہ جعلہ دلیلاً علی صدق دعواہ۔	اسی کے قول کے مطابق پیش آتے تو اپنے دعوے کے سچ ہونے کی دلیل قرار دیتا۔
وان لم یوافق	لیکن اگر اس کے کہنے کے موافق نہ ہوتا تو کہتا تمہارے
قال: قد بدا لربکم۔	پروردگار نے بدا کر لیا" یعنی پہلے جو کرنا چاہتا تھا

جب ظاہر ہوا کہ وہ خلاف مصلحت تھا تو اس سے رجوع کر لیا۔ اور اس کے مخالف کام کیا جو مصلحت کے مطابق تھا۔

وکان لایفرق بین النسخ والبدا۔	یہ شخص نسخ اور بدا دونوں کو ایک کہتا تھا اور ان میں کوئی تفریق نہیں کرتا تھا۔
قال: اذا جاز النسخ فی الاحکام جاز البدا فی الاخبار۔[1]	اس کا قول تھا کہ احکام میں جب نسخ جائز ہے تو خبروں میں بدا بھی جائز ہے۔[1]

یہ ہے بدا جس کی توضیح کے لیے آیندہ اشاعت کا انتظار فرمائیے۔

از جلوہ بیا رام دے کایں ہمہ سامان

در حوصلۂ دیدہ بیتاب نگنجد

---

[1] کتاب الملل والنحل ص ۱۰۹ - ۱۱۲

حجاب اور بے حجابی

از

زعیم اسلام امیر شکیب ارسلان

مترجمہ جناب حکیم سید محمد شعیب صاحب

چند سال ہوئے عالم اسلامی کے مشہور لیڈر امیر شکیب ارسلان کا ایک مضمون مصر و شام اور دوسرے ممالک کے عربی اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں خواتین اسلام کی تعلیم اور ان کی آزادی کے حدود پر صحیح اسلامی نقطۂ نظر بیان کیا گیا تھا معلوم نہیں کہ ہندوستان تک بھی وہ پہنچا یا نہیں۔ میں نے نیویارک کے جریدہ "البیان" سے اس مضمون کا اقتباس کیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ترجمان القرآن دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ امیر شکیب ارسلان کی رائے کسی ملا یک خیال پرانے ملا کی رائے سمجھ کر نظرانداز نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جس کو یورپ کی سیاحت اور یورپین تہذیب کے مطالعہ اور حاملین تہذیب مغربی کے ساتھ مبادلۂ خیال کے اتنے مواقع ملے ہیں جتنے شاذ ہی ہندوستان، ایران، مصر اور ٹرکی کے کسی شخص کو ملے ہوں گے اور اس کے ساتھ یہ بھی بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق کے بہت کم لوگوں کی نظر موجودہ زمانے کے عمرانی وسیاسی مسائل میں اتنی گہری ہوگی جتنی امیر موصوف کی ہے۔ (محمد شعیب)

اب سے تقریباً تین سال پہلے کا واقعہ ہے کہ جرمنی میں زندگی بہت سستی ہوگئی تھی۔ ایک طالب العلم وہاں کے کالجوں میں دو یا تین گنی ماہوار پر بآسانی گذر کر سکتا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ

اٹھایا، اور اپنے وطن شام و فلسطین کے باشندوں کو توجہ دلائی کہ اس وقت جرمنی میں زندگی خود
ہمارے ملک سے زیادہ ارزاں ہے لہٰذا جو لوگ تنگ دستی کی وجہ سے اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلا سکتے
ان کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو جرمنی بھیج دیں، تاکہ وہاں کم سے کم خرچ پر جس کا اس زمانہ میں تصور
کیا جا سکتا ہے ان کو زمانۂ حال کی بہترین تعلیم حاصل ہو جائے۔ میرا یہ مضمون قدس شریف کے جریدہ
"الصباح" میں شائع ہوا، اور اس کے اثر سے تقریباً ۴۰ طالب علم برلین، لائپزگ، کونستانز اور دوسرے
مقامات کی یونیورسٹیوں میں تحصیل علوم کے لیے پہنچ گئے۔ اس زمانہ میں جرمنی کی تعلیم اور وہاں کی
زندگی کے متعلق جزئی معلومات فراہم کرنے کے لیے مجھ پر سوالات کی اتنی بوچھار ہوئی کہ میں جواب
دیتے دیتے عاجز آگیا۔ آخر کار میں نے برلن میں ایک خاص مجلس اس غرض کے لیے قائم کر دی کہ
لوگوں کو اس باب میں ضروری معلومات بہم پہنچائے۔

اس سلسلہ میں جن لوگوں نے مغربی تعلیم کے مسئلہ پر مجھ سے استفسارات کیے ان میں سے ایک
صاحب فلسطین کے اکابر میں سے بھی تھے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ جرمنی میں میرے دو بچے تعلیم پا رہے ہیں
ایک لڑکا ہے اور دوسری لڑکی ہے لڑکے کی عمر ۸ برس کی ہے اور وہ "جمنازیوم" نامی مدرسہ میں
داخل ہے۔ لڑکی ۱۶ سال کی ہے اور وہ وہاں کے ایک زنانہ مدرسہ میں پڑھ رہی ہے۔ صاحب خط
نے مجھ سے ان دونوں بچوں کی تعلیم کے متعلق دریافت کیا کہ آیا ان دونوں کو وہیں تکمیل تعلیم تک
رہنے دیا جائے یا وطن واپس بلا کر بقیہ تعلیم مکمل کرائی جائے۔ خصوصاً لڑکی کے مسئلہ میں وہ زیادہ متردد
تھے، کیونکہ وہ سن رشد کے قریب پہنچ گئی تھی۔

میں نے ان کو جواب دیا کہ لڑکے کو وہاں تکمیل تعلیم کے لیے چھوڑا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس
کی عربی تعلیم کا بھی کافی انتظام ہو، کیونکہ جو عرب لڑکا بچپن سے عربی تعلیم حاصل نہ کرے اور جس کو بچپن
سے اپنے عرب ہونے کا احساس نہ دلایا جائے، وہ خواہ تعلیم کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج تک کیوں نہ پہنچ

جائے، اس کا شمار ہمارے شجر تہذیب کی صالح شاخوں میں نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ایک ٹہنی ہے جو ہمارے درخت سے کٹ گئی اور ایک دوسری کیاری میں بودی گئی۔ اب وہ ہم سے نہیں ہے اور ہمارے لیے اس کا وجود کچھ بھی مفید نہیں۔ رہا لڑکی کا معاملہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا جواب دوں، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ اس باب میں آپ کا مشرب خاص کیا ہے، اور مسئلہ ایسا ہے جس کا تعلق ہر شخص کے اپنے مشرب سے ہے۔ آپ کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ بچی کو اب جرمنی سے بلا کر باقی تعلیم قدس شریف میں دلائیں، جہاں مجھ کو یقین ہے کہ اس کی تعلیم کے لیے کافی انتظام موجود ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے جرمنی ہی میں رہنے دیں تاکہ وہ ایک اچھی جرمن لڑکی کی طرح اپنی تعلیم پوری کر کے نکلے لیکن پہلی صورت میں آپ اپنی لڑکی کو بعض یوروپین زبانوں اور علوم جدیدہ کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور اسلامی عقیدہ کی تعلیم بھی دلوا سکیں گے اور وہ ایک مسلمان لڑکی بن کر نکلے گی۔ اور دوسری صورت میں وہ بعض یوروپین زبانیں اور جدید علوم تو ضرور سیکھ لے گی، مگر صرف نام کی مسلمان ہوگی اور محض عرف عام کے لحاظ سے اس کو عربیہ کہا جا سکے گا۔ پہلی صورت میں آپ کی بیٹی آپ ہی کی بیٹی رہے گی اور مسلمان کے سوا کسی کی بیوی نہ بنیگی۔ دوسری صورت میں وہ اگر چاہے گی تو آپ کی بیٹی رہے گی اور اگر نہ چاہے گی تو آپ کسی معاملہ میں اس کے ارادہ کو نہ روک سکینگے، اور آپ کے لیے کسی وقت یہ خبر سننا خلاف توقع نہ ہوگا کہ آپ کی صاحبزادی، فلاں جرمن نوجوان کے دام محبت میں گرفتار ہو گئیں اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا، حتی کہ یہ سن کر بھی آپ کو اچنبھا کرنے کا حق نہ ہوگا کہ اس نے ایک یہودی نوجوان سے محبت کی اور اپنی زندگی کو اس کے ساتھ منسلک کر دیا۔ پس آپ خود ہی اپنے لیے دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار فرمالیجیے چونکہ میں اس مسئلہ میں آپ کے مشرب خاص سے واقف نہیں اور نہ آپ کے میلان قلب کا حال مجھ کو معلوم ہے اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں سے کونسی صورت آپ کو پسند ہے اور کس صورت کے اختیار کرنے سے آپ کو درد سر لاحق ہوگا۔ آپ یہ ہرگز خیال نہ فرمائیں کہ میں آپ کو یہ صورت یا وہ صورت اختیار کرنے

کا مشورہ دے رہا ہوں، یا آپ کے لیے ایک صورت کو دوسری صورت پر ترجیح دے رہا ہوں میں نے کوئی بات اس معنی میں نہیں کہی۔ میرے کلام کا مقصود صرف یہ ہے کہ اگر آپ اس بات کو برداشت کرنے کی قدرت اپنے اندر نہیں پاتے کہ آپ کی صاحبزادی ہیٹ اور اسکرٹ پہن کر نکلے اور جو نوجوان اس کو پسند آئے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر چلے اور جس سے چاہے خلا ملا پیدا کرے۔ خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اور وہ سب کچھ کرے جو آج مسلمانوں میں جدید ہے، تو آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آج ہی اس کو جرمنی سے واپس بلالیں قبل اس کے کہ اس کی واپسی کے امکانات کم ہو جائیں، کیونکہ کچھ مدت اور گذر جانے کے بعد اس کی خواہشات کے مرکز سے اس کو پھیر دینا آپ کی قدرت سے باہر ہو جائیگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ یقیناً کسی غیر مسلم سے شادی کرے گی اور حتماً جس جوان کو پسند کرے گی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیگی۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اس کے ایسا کرنے کا امکان ہے، اور اگر وہ ایسا کرنا چاہے گی تو آپ اس کو نہ روک سکیں گے لیکن اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ جو کچھ ایک جرمن یا کوئی اور یورپین کر سکتا ہے، وہی ایک مسلمان بھی کر سکتا ہے (وہ بھی بشر ہے اور ہم بھی بشر ہیں) جب ایک یورپین عورت کے لئے اپنے والدین کی رضامندی سے یا بلا رضامندی ایک مسلمان کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے تو ایک مسلمان عورت کے لیے بھی ایک یورپین یا یہودی یا چینی یا بودھ یا ہندو سے رشتہ جوڑنا جائز ہونا چاہیے خواہ والدین راضی ہوں یا نہوں، تو اس مشرب کے لحاظ سے میں آپ سے کہونگا کہ اس کو جرمنی میں تکمیل تعلیم کر لینے دیجئے۔

پس مسئلہ دراصل رجحان اور نظر کا ہے۔ جو شخص اس طرف رجحان رکھتا ہے اس کے لئے یہ طریقہ ہے، اور جو اس طرف رجحان رکھتا ہے اس کیلئے وہ طریقہ ہے لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اپنی لڑکی کو یورپ بھی بھیجے اور ایسے مدارس میں پڑھائے جہاں نہ عربی کی تعلیم ہے نہ عقائد اسلامیہ کی، اور پھر یہ بھی چاہے کہ وہ دیندار مسلمان عورت بنے اور اپنے ذوق اور مشرب میں ایک مشرقی عورت بن کر اٹھے، وہ دراصل اپنی لڑکی سے خرق عادت کا طالب ہے، جس کا صدور محض اتفاقاً اگر ہو بھی جائے تو یہ خود اس کے فراہم کیے ہوئے اسباب کا فطری نتیجہ نہ ہوگا، بلکہ ایک اتفاقی امر ہو گا، ویسا ہی

اتفاقی امر جیسا یہ کہ آپ کسی کو زہر کھلائیں اور وہ اتفاقاً بچ نکلے۔

یہاں میں ایک مثال پیش کروں گا۔ ۱۹۰۸ء میں دستور عثمانی کا جب اعلان ہوا تو آزاد خیال ترکوں کے لیڈروں میں سے ایک شخص احمد رضا بک نے کہا۔

"جب تک ایک ترک نوجوان کو اتنی آزادی حاصل نہ ہو کہ وہ غلطہ کے پل پر ایک ترک عورت کے ساتھ چل سکے اور عورت کا چہرہ نقاب سے معرا ہو، اس وقت تک میں نہیں کہہ سکتا کہ ترکی میں کوئی دستور یا آزادی ہے۔"

یہ ابتدا تھی۔ اب اس کی انتہا سنیے۔ حال میں یہ اطلاع مجھ کو پہنچی ہے کہ انقرہ کی پارلیمنٹ کے ارکان میں سے ایک شخص فالح رفقی بک جو پہلے شام میں جمال پاشا کا سکرٹری تھا اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

"جب تک ایک ترک لڑکی کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ جس سے چاہے اور جہاں چاہے شادی کر سکے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، بلکہ جب تک اس کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ جس مسلم یا غیر مسلم کے ساتھ چاہے رہ سکے اس وقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ترکی شاہ راہ ترقی پر پہنچ گئی ہے۔"

میں نے یہ تحریر خود نہیں دیکھی بلکہ روایتہً سنی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح ہے۔

اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مسئلہ صرف رفع حجاب کا نہیں ہے، اور نہ عورتوں کو مجرد ایاب و ذہاب کی آزادی دینے کا ہے۔ بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ ہے جس کی کڑیاں باہم پیوستہ ہیں اور اس کی معصوم ابتدا کو دیکھنے کے ساتھ ضروری ہے کہ اس کی ناگزیر انتہا تک بھی نظر پہنچ جائے۔ جو شخص عورتوں کی مطلق آزادی کا حامی ہے، وہ اگر اس سلسلہ کو انتہائی حدود تک قبول کرنے کے لیے بخوشی آمادہ ہو، اور کمال ترقی اسی کو سمجھتا ہو کہ ایک مسلمان عورت جس نصرانی یا یہودی یا مجوسی کے ساتھ چاہے نکاح یا سفاح کرنے میں آزاد ہو تو مشکل دور ہو گئی اور کوئی نزاع باقی

نہیں رہی۔ اس کے بعد اس بحث کی کوئی ضرورت ہی نہیں کہ حجاب بہتر ہے یا بے حجابی۔ البتہ اگر کوئی شخص حریت اور عدم حریت دونوں کو جمع کرنا چاہے پہلے اس کو آزاد چھوڑے کہ جہاں چاہے جائے جس سے چاہے ملے جلے ہنسے بولے کھیلے سیر سپاٹے کرے، پھر جب اس کا دل کسی غیر سے الجھ جائے اور وہ اس کے ساتھ رہنا بسنا شروع کردے، اور قانونی یا غیر قانونی تعلق قائم کرے تو حمیت اور غیرت کا جوش بھڑک اٹھے، تو میں کہونگا کہ یہ غلط ہے، خلاف عدل ہے، عقل اور منطق کے منافی ہے۔

حال میں تحت العرب، استاذ سید مصطفیٰ صادق الرافعی نے ایک کتاب لکھی ہے جو عربی لٹریچر کی بہترین کتابوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ اس میں انہوں نے ایک مصری نوجوان کے ساتھ اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے جو یورپ سے تحصیل علم کرکے تازہ تازہ آیا ہوا تھا اور اس پر فرنگیت پوری طرح مسلط تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

میں نے اس نوجوان سے پوچھا کیا تم مصری ہو؟ اس نے جواب دیا "پورا اور پکا" میں نے کہا کیا تم اپنے علم اور تہذیب کی بنا پر اپنے آپ کو اس لائق سمجھتے ہو کہ تمہارے نمونے پر تمہارے ابنائے ملک کا نشو و نما ہو؟ اس نے کہا میں اس کی توقع رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کیا تم شرقی عورتوں کی آزادی مطلق اور مردوں کے ساتھ ان کی پوری مساوات کے قائل ہو اور ان قیود سے ان کو نکال لانا چاہتے ہو جن کا نام کفر ہے؟ اس نے کہا یہ تو میرا مذہب ہے۔ میں نے کہا تمہاری کیا رائے ہے اگر مصری مرد یوروپین عورتوں سے شادیاں کریں اور ان سے اپنے گھروں کو آباد کریں؟ اس نے کہا غالباً ہمارے ملک کی بہتری کے لیے اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس سے ہماری نسلوں میں تازہ خون آئے گا، اور ہماری سوسائٹی میں نظم اور شائستگی پیدا ہوگی اور ہماری معاشرت کی تعمیر نئی بنیادوں پر شروع ہو جائے گی۔ میں نے کہا بارک اللہ،

آپ نے خوب فرمایا۔ اب اگر ہم آپ سے سادات کی درخواست کریں اور کہیں کہ اپنی بہن کو بھی کسی یورپین مرد سے دوستی کرنے اور اس کے ساتھ نکاح یا ازدواج مدنی کر لینے کی اجازت دیں تاکہ وہ بھی ایک یوروپین مرد لے آئے جس طرح آپ ایک یوروپین عورت لے آئے ہیں پھر یہ مصری عورت اس کی تقلید کرے اور مصری عورتوں کا رشتہ بھی فرنگیوں کے ساتھ قائم ہو جائے تو فرمائیے کہ اس باب میں جناب کی کیا رائے ہے؟ اس نے کہا اعوذ باللہ میں نے کہا خدا تمہاری عقل درست کرے کیا تمہاری غفلت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ جب تک اللہ کی لعنت کو تم اپنی پوری قوم میں لبریز نہ دیکھ لو اسوقت تک تم کو احساس نہیں ہوتا کہ یہ اللہ کی لعنت ہے؟ اور کیا تم اپنی قوم کا حق اس وقت پہچانتے ہو جب اس کے مٹنے کا وقت قریب آجائے؟ اس نے کہا میں اور مجھ جیسے لوگ شاذ ہیں، اگر قاعدہ کو تو ہمیشہ قاعدہ ہی رہنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ تم پر اور تمہارے قاعدہ پر خدا کا غضب ہو۔ بخدا ہمارے ملک کا تم جیسے لوگوں کے وجود سے پاک ہو جانا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ تم ہمارے درمیان رہ کر اختلاط انساب کا فتنہ برپا کرو اور عربیت اور اسلامیت کی جڑیں اکھاڑو۔

یہاں ہمارے مقصد کے لیے استاذ رافعی کی صرف اتنی عبارت کافی ہے جو نتیجہ ہم بیان کرنا چاہتے ہیں وہ حاصل ہو گیا، اور وہ یہ ہے کہ عورت کے مسئلہ میں یورپ والوں کی قدم بقدم پیروی کرنے کے چند توابع اور لوازم ہیں جن سے اس مسلک کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اس مسلک کو اختیار کریں تو ان ناگزیر توابع و لوازم کو بھی ہمیں قبول کرنا پڑے گا۔ پھر اعوذ باللہ کہنے کا کوئی موقع نہیں۔ بلکہ وہاں اعوذ باللہ پایا ہی نہیں جاتا۔ وہ ایک تہذیب ہے اور یہ ایک دوسری تہذیب ہے۔ وہ ایک نظریہ ہے اور یہ دوسرا نظریہ ہے، ہم ان دونوں میں سے کوئی ایک ہی تہذیب اور ایک ہی نظریہ اختیار کر سکتے ہیں۔ دونوں کا اجتماع ممکن نہیں ہے کہ ایک طرف آپ دوسری تہذیب بھی اختیار کریں اور جب وہ اپنے طبعی نتائج کے ساتھ پھل پھول

لائے تو اعوذ باللہ ہی کہیں۔

آپ نے دیکھا! جب استاذ رافعی نے اس مصری نوجوان سے کہا کہ کیا تم اپنی بہن کا کسی یورپین مرد کے ساتھ اختلاط گوارا کر سکتے ہو، تو اس نے کہنے کو اعوذ باللہ کہدیا، مگر فوراً ہی اس کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ یہ اعوذ باللہ تو اس قاعدہ کے خلاف ہے جس کے متعلق اس نے چند ہی لمحوں پہلے دعویٰ کیا تھا کہ اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، یعنی وہی قاعدہ کہ عالم مغربی کی طرح عالم اسلامی میں بھی عورتوں کو حریت مطلقہ حاصل ہو، اور وہی قاعدہ جس کو فالح رفقی بک نے بیان کیا ہے، اور وہی قاعدہ جس کو ڈاکٹر عبداللہ جودت نے پیش کیا تھا کہ ترکی نسل میں تازہ خون بہم پہنچانے کے لیے جرمن اور اٹالین قوموں سے شادی بیاہ ہونا چاہیے (جس پر ایک ترک نوجوان نے بگڑ کر کہا کہ ہم ترکوں کے خون کی طہارت اس سے بالاتر ہے کہ ہم اس کو پاک کرنے کے لیے یورپ والوں سے خون لیں) پس جب یہ قاعدہ قبول کر لیا جائے تو اس کے لازمی اثرات مترتب ہونے پر اعوذ باللہ کہنے کا کیا موقع ہے؟ لہٰذا اس نے چونک کر پھر کہا کہ میں اور مجھ جیسے لوگ شاذ ہیں، مگر قاعدہ کو تو ابداً قاعدہ ہی رہنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم تو ہمیشہ سلطان وہم ہی کے ماتحت رہیں گے۔ اور یہ جو اپنی بہنوں کو یورپ والوں کے حوالہ کرنے سے ہم انکار کرتے ہیں، تو یہ بھی اقتضاء عقل و حکمت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اسی وہم کے اتباع میں ہے۔ یعنی وہ قاعدہ جو اباحت کا مقتضی ہے، وہ تو اپنی جگہ صحیح ہے، مگر ہمیں علانیہ اس کی اجازت دیتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہماری بہن کسی غیر مسلم نوجوان کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرے اور نکاح شرعی کے بغیر اپنے نفس کو کسی کے حوالہ کر دے۔ ہم پر ابھی تک پچھلی تہذیب کا اثر ہے اس لیے ہمیں شرم آتی ہے۔ مگر ہمیں امید ہے کہ ہمارے بیٹوں یا پوتوں میں یہ چیز باقی نہ رہے گی اور سنہ ۱۹۵۰ء میں وہ مصری پارلیمنٹ سے اس قسم کی آزادی کو جائز تسلیم کرالیں گے۔

بہت سے لوگ جو میرے اس مضمون کو پڑھیں گے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اس موقع پر منہ بگاڑ کر بول اٹھیں گے کہ یہ کیا تم نے کہنا شروع کر دیا۔ اباحت اس حریت مطلقہ کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم عورت کی آزادی کے حامی بھی ہوں اور دین وعصمت کے پرستار بھی۔ جائز ہے کہ ہم بے پردگی کی دعوت تو دیں مگر ہم اپنی بہنوں کا غیروں کی زینت آغوش بننا پسند نہ کریں ہم ہرگز یہ نہیں سمجھتے کہ جن قوموں نے اپنی عورتوں کو آزادی دے رکھی ہے، اور جو پردے کے نام تک سے ناآشنا ہیں وہ مردوں کی نیک چلنی اور عورتوں کی عفت کی قدر کرنے میں ہم سے کچھ کم ہیں۔ عورتوں کی حریت کے ساتھ ان کی تعلیم بھی تو ہے۔ اور عورت جب تعلیم یافتہ اور مہذب ہو جاتی ہے تو اس کا علم اس کے لیے وہ حجاب بن جاتا ہے جو اسے فحش کاری سے روکتا ہے۔ یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں ضرور کہی جائیں گی جن کی بکثرت تکرار ہو چکی ہے۔ مگر میں اپنے ان دوستوں سے کہوں گا کہ ٹھیرو! ٹھیرو! جلد بازی سے کام نہ لو۔ تم بحث کے مختلف گوشوں کو خلط ملط کر رہے ہو، اور اس بحث کے اتنے گوشے ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مقالہ میں نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے دو تین مقالے بھی کافی نہیں ہیں۔ عفت اور صیانت اور حفظ انساب اور اطاعت احکام دین کے ساتھ جو آزادی اور روکشائی ممکن ہے وہ صرف اس حد تک ہے کہ عورت اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر نکلے، چلے پھرے حسب ضرورت چہرہ بھی کھول لے شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ اس نے چہروں کو ڈھانکنا فرض نہیں کیا ہے، نہ وہ اس کا حکم دیتی ہے کہ عورت جیتے جی مدفون ہو جائے۔ مگر تم کو نہ بھولنا چاہیے کہ یہ آزادی اور روکشائی غیر مردوں کے ساتھ خلاملا، اور غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط کی حد تک نہیں ہے۔ اور اگر مسئلہ اسی حد تک محدود رہے تو اس میں وہ ترقی ممکن نہیں جس کو فالح رفقی اور عبداللہ جودت اور مصری نوجوان اور ایسے ہی بہت سے حضرات ترقی سمجھتے ہیں کیونکہ اس ترقی کیلئے صرف اتنی آزادی تو کافی نہیں ہے کہ

ایک مسلمان عورت گھر سے باہر نکل سکے اور حسب ضرورت چہرہ کھول سکے۔ اس درجہ آزادی کے متعلق تو وہ بھی جانتے ہیں کہ وہ شریعت میں جائز ہے، اور صدیوں تک مسلمان عورتیں اس سے مستفید ہوتی رہی ہیں، وہ نکلتی تھیں لین دین کرتی تھیں، بڑے بڑے کاموں میں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، اور شریعت ان کو نہ روکتی تھی۔ اس حد سے بڑھ کر جو حجاب ہے، وہ فرط غیرت کا نتیجہ ہے نہ کہ حکم شریعت پر مبنی لیکن یہ درجہ تو اس گروہ کے نزدیک ترقی کا دنی درجہ ہے۔ وہ جس آزادی کے طالب ہیں وہ بعینہ وہ آزادی ہے جو یورپین عورتوں کو حاصل ہے یعنی زینت وآرائش کے ساتھ نکلنا، جسم کے محاسن کو نمایاں کرنا۔ مردوں کے ساتھ خلوت وجلوت میں گھلنا ملنا، اور ازدواج میں اپنی خواہش نفس کے سوا کسی ضابطہ کا پابند نہ ہونا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اگر یہی وہ چیز ہے جس کے تم طالب ہو تو پوری جرأت کے ساتھ اس کا اور اس کے تمام توابع اور متممات کا صاف اقرار کرو، اور اس مصری نوجوان کی طرح اس کے بعض شرمناک پہلوؤں کو اعوذ باللہ کہنا چھوڑ دو، کیونکہ آخر یہ بھی تو ایک نظریہ ہے، اور متمدن دنیا کے کروڑوں آدمی اس نظریے کے قائل اور اس پر عامل ہیں، کیا حرج ہے کہ تم بھی ہیئت اجتماعیہ میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم ایک طرف اس حریت مطلقہ کے بھی طالب ہو اور دوسری طرف یہ بھی چاہتے ہو کہ مسلمان عورت عفت وعصمت اور ازدواج کے معاملات میں اسلامی حدود کی پابند رہے تو ہم کہیں گے کہ یہ نقیضین ہیں، ان کا اجتماع ممکن نہیں ہے۔ ایک جہت سے غیر مقید آزادی اور دوسری جہت سے صرف مسلمان کے ساتھ تعلق اور کلیۃً شرعی تعلق کی قید! کونسی منطق ہے جو ان دونوں کا اجتماع ثابت کر سکتی ہے؟

اگر تم اُس مقید آزادی پر قناعت کر سکتے ہو جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، تو شریعت اس کی پوری پوری ضمانت دیتی ہے، اور اس سے تم کو نہیں روکتی۔ اور اگر تم اُس مطلق اور مکمل حریت

کے طالب ہو جو یورپ کی عورتوں میں پائی جاتی ہے تو خوب جان لو کہ اسلام اور ایسی آزادی باہم مجتمع نہیں ہو سکتے جس کا جی چاہے اسلام کو اختیار کرے اور جو چاہے اس آزادی کو اختیار کرے۔ صرف یہی نہیں کہ اسلام اس کا مخالف ہے۔ بلکہ نصرانیت بھی اس کی مخالف ہے۔ نصرانیت بھی مرد و زن کے اختلاط بلا نکاح کو جائز نہیں رکھتی اور غیر مسیحی مرد کے ساتھ مسیحی عورت کے اقتران کو روکتی ہے بلکہ اس معاملہ میں مسیحیت کی قید اسلام سے بھی زیادہ سخت ہے اسلام نے صرف مسلمان عورت پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ مسلمان کے سوا کسی سے نکاح نہ کرے۔ مسلمان مرد کو وہ اس کا پابند نہیں بناتا۔ مگر مسیحیت مرد اور عورت دونوں پر یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ وہ صرف مسیحی سے ازدواجی تعلق قائم کریں۔ پھر دین مسیحی اپنے پیروؤں کو طلاق کے معاملہ میں بھی زیادہ سخت قوانین سے جکڑتا ہے۔ وہ مرد اور عورت دونوں سے طلاق کا حق سلب کرتا ہے اور اگر وہ اس کا اقدام کریں تو ان کے نکاح ثانی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین مسیحی میں بھی عورت کی حریت مطلق ہے اور نہ تام۔ یورپ اور امریکہ میں جو لوگ ان قواعد کے خلاف عمل کر رہے ہیں وہ مسیحیت کے پابند نہیں ہیں۔ اور جو مسیحیت کے پابند ہیں وہ عورت کی حریت مطلقہ کے قائل نہیں ہیں۔

رہی یہ بات کہ جن قوموں میں حجاب نہیں ہے وہ عورتوں کی عفت و صیانت میں ان قوموں سے کم نہیں ہیں جو حجاب کی قائل ہیں، تو یہ ایک غلط بات ہے۔ اس معاملہ میں ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو مشرق کے عیسائیوں کو مثال میں نہ لیجیے، کیونکہ وہ بھی ہماری ہی طرح مقید آزادی کے قائل ہیں اور جن امور میں عفت کے لیے خطرہ ہے ان کو جائز نہیں رکھتے۔ صحیح مقابلہ عالم اسلام اور یورپ کے درمیان ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ عفت اور صیانت اخلاق میں یورپ کا وہی درجہ ہے

جو عالم اسلامی اور عالم نصرانی شرقی کا ہے ؟ یورپ کے ایک شہر پیرس میں جو فسق و فجور ہو رہا ہے صرف وہی تمام عالم اسلامی کے مجموعی فسق و فجور سے مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے!

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ صرف تعلیم کے اثر سے عورت اخلاق کے اُس بلند مرتبے پر پہنچ سکتی ہے جہاں حجاب اور شوہر کی حفاظت سے وہ بے نیاز ہو جائے، تو باوجودیکہ ہم تعلیم کے تہذیب بنانے والے اور اخلاق کو سنوارنے والے اثرات کے منکر نہیں ہیں یہ کہنا ہمارے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس معاملہ میں بجائے خود کافی ہے اور اس کے بعد قیود شرعیہ اور حفاظت زوجیہ کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ تعلیم (اور خصوصاً وہ تعلیم جو آج کل دی جا رہی ہے) نہ تو خوف کی قائم مقام ہے اور نہ تنہا اتنی قوت رکھتی ہے کہ انسان کو قانون اور اخلاق کی حدود سے تجاوز کرنے میں مانع ہو۔ ہم جانتے ہیں اور روز مرہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ علم کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گئے ہیں، ان کے علم و فضل نے ان کی عفت اور پاک دامنی اور افعال قبیحہ سے اجتناب میں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا۔ مشرق کے باشندے علم میں مغرب سے بہت پیچھے ہیں، مگر فسق و فجور جتنا وہاں پایا جاتا ہے اتنا یہاں نہیں پایا جاتا، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں مذہب کا اثر زیادہ گہرا ہے، اور عورتوں پر مردوں کی قوامیت باقی ہے۔ مسلمان اور مشرقی مسیحی عورت اپنے خدا سے بھی ڈرتی ہے اور اپنے شوہر سے بھی، اگرچہ وہ جاہل ہے، بخلاف اس کے اکثر و بیشتر مغربی عورتیں اب اس حال میں نظر آتی ہیں کہ نہ ان کو خدا کا خوف ہے نہ شوہر کا، اگرچہ وہ بہت تعلیم یافتہ ہیں۔

اب ایک اعتراض اور باقی ہے جو یقین ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ضرور پیش کیا جائے گا جو اپنے آپ کو "حر یہ الخیال" کہلانا پسند کرتے ہیں، اور جن کو دعوی ہے کہ ہم ا... اور عقائد سے آزاد ہیں اور محض عقول علمیہ اور بصائر فنیہ کے بل پر جادۂ ترقی میں گامزن ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ایک مسلمان جو اپنی بہن یا بیٹی کو کسی مسیحی یا یہودی یا بت پرست کے پہلو میں

نفرت کرتا ہے، یا ایک مسیحی جو اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کی بہن یا بیٹی کسی مسلم یا یہودی یا وثنی کی بیوی بنے، یہ سب اوہام اور رسوخ عقائد کی تاثیرات ہیں، بلکہ یہ محض وساوس ہیں جن کو حقائق سے کچھ واسطہ نہیں۔ اسی طرح ایک مسلم یا مسیحیہ کے کسی مرغوب خاطر مرد کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرنے پر جو ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے، یہ بھی اوہام و وساوس کا نتیجہ ہے جو شدت تکرار اور مرور زمان کی وجہ سے شرف اور غیرت اور حمیت بن گیا ہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ ان اوہام سے دلوں کو پاک کر دے اور ان میں حقائق کے سوا کسی اور چیز کے لیے گنجائش ہی نہ رہنے دے۔ دور حاضر کی بیداری کو جو سب سے بڑی خدمت انجام دینی ہے وہ تو اوہام کا استیصال اور خرافات کی فرمانروائی کا قلع وقمع ہی ہے۔

اگر کسی کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جائے تو ہم کو پھر اسی قاعدہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو فالح رفقی اور عبداللہ جودت اور اس مصری نوجوان نے بیان کیا ہے۔ یہاں ہم اس سوال سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ یہ قاعدہ بجائے خود صحیح ہے یا غلط۔ ہم صرف یہ کہیں گے کہ اگر تم یورپین تہذیب اور اس کے نظریات کو اسلام، اور عفت وطہارت کے متعلق اس کے نظریات پر ترجیح دیتے ہو تو علانیہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اس کے تمام لوازم اور متممات سمیت اختیار کرو اور جب اس کے ایسے شرمناک پہلو سامنے آئیں جو کسی طرح اس سے منفک نہیں ہو سکتے تو اس سے دامن بچانے کے لیے کج بحثیاں کرنا چھوڑ دو۔ پھر ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی بحث باقی نہ رہے گی۔ البتہ اگر تم عفت اور طہارت کے ان اصولوں کا التزام کرو جو اسلام اور مشرقی تہذیب میں پائے جاتے ہیں اور عورت کے اخلاق میں عصمت کو وہ اہمیت دو جو ایک مسلمان اور مشرقی دیتا ہے، اور اولاد کے صرف اپنے باپ کی صلب سے پیدا ہونے کا اطمینان کرنا اتنا ہی ضروری سمجھو جتنا ہماری ملت میں سمجھا جاتا ہے تو اس بنیاد پر ہم اور تم بحث کر سکتے ہیں کہ ان اغراض

بشارات الانبیاء

صحائف آسمانی میں نبوت محمدی کی پیشین گوئیاں

از جناب مولوی فضل حق صاحب

تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں جب انگریزی سلطنت کا اقتدار پوری قوت کے ساتھ ہندوستان پر قائم ہو گیا تو عیسائی مشنریوں کی تبلیغ کا فتنہ عظیم اٹھا۔ اگرچہ کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ سے ان کی تبلیغ کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا، مگر اب علی الاعلان بازاروں اور عام گذرگاہوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کے سامنے اسلام اور قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر حملے کیے جانے لگے اور مسلمانوں کو ان کے دین اور ان کے نبی اور ان کی کتاب مقدس کے متعلق وہ سب کچھ سنایا جانے لگا جس کے سننے کی تاب ان میں کبھی نہ تھی یہ کام بظاہر مذہبی تبلیغ کے رنگ میں تھا لیکن اس کے پیچھے ایک بڑا سیاسی مقصد بھی تھا، بلکہ درحقیقت اصل مقصود وہی تھا۔ ہندوستان کے دوراندیش فاتحین یہ سمجھتے تھے کہ جس قوم سے انہوں نے حکومت چھینی ہے اس میں اگر کچھ بھی قوت و طاقت باقی رہی تو وہ ہمیشہ ان کے لیے ایک خطرہ بنی رہے گی۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس قوم کی قوت کا اصلی مرکز اس کا مذہب اور جذبۂ غیرت مذہبی ہے۔ اس لیے جب ہندوستان کی قوت مدافعت کو مغلوب کرنے میں ان کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہو گئی تو انہوں نے اس امر کی کوشش شروع کی کہ مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کے جراثیم پھیلا کر ان کے عقائد کو کمزور اور ان کے اعمال کو خراب کر دیا جائے

یا بدرجۂ آخر ان کو اتنا بے حمیت بنا دیا جائے کہ وہ اپنے دین اور اپنے نبی تک کی عزت پر
ہر قسم کے حملوں کو برداشت کرنے لگیں اور ان کے دلوں کی وہ چنگاری بجھ جائے جس کے کسی وقت
آتش فشاں بن جانے کا خوف کیا جا سکتا ہے یہی وجہ تھی کہ جب مسیحی پادری اپنے مشن پر نکلے تو ایک بڑی
طاقت ان کی پشت پر تھی، پولس اور عدالت کی حمایت ان کو حاصل تھی، اور ہر قسم کی بدزبانی کا لائسنس ان کو ملا

یہ زمانہ تھا جب علماء حق کی ایک جماعت اسلام کی حمایت کے لئے اٹھی اور اس نے یہ جانتے
کے باوجود کہ پادریوں کا مقابلہ دراصل ایک بڑی قوت کا مقابلہ ہے، نہایت دلیری کے ساتھ
ان سے مناظرے کیے، ان کے حملوں کے رد میں رسالے لکھے اور ان کی کتابوں کا مطالعہ کرکے
خود ان کے مذہب پر جوابی حملے کئے جن کے جواب سے بڑے بڑے مسیحی علماء عاجز ہو گئے۔ اس جہاد عظیم
میں کوئی ان سرفروش مجاہدین کی مدد کرنے والا نہ تھا، مسلمان شکستہ دل اور پراگندہ حال تھے
ان میں اتنی قوت باقی ہی نہ تھی کہ اپنے دین کے مددگاروں کا ہاتھ بٹاتے۔ حکومت کی طرف
سے ان کی راہ میں ہزاروں رکاوٹیں تھیں۔ خود ان کے پاس مقابلہ کے لیے کوئی سروسامان
نہ تھا مگر باوجود اس کے ہر قسم کی مصیبتیں جھیل کر انھوں نے اعدائے اسلام کا مقابلہ کیا اور زبان
و قلم سے کفر و الحاد کے سیلاب عظیم کو روکنے میں اپنی قدرت و استطاعت سے بڑھ کر جدوجہد کی

انہی مجاہدین اسلام میں سے ایک مولنا رحمۃ اللہ دہلوی بھی تھے۔ پادریوں کے مقابلہ
میں ان کے معرکے آج تک یادگار ہیں۔ انہوں نے مسیحی لٹریچر کا وہ تمام ذخیرہ فراہم کیا جو اس
زمانے میں مل سکتا تھا۔ نہایت دقت نظر سے اس کا مطالعہ کیا، اور اس پر ایسی زبردست
تنقیدیں لکھیں کہ کسی بڑے سے بڑے حامی نصرانیت سے بھی ان کا جواب نہ بن پڑا۔ ان کے
اس زبردست جہاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی اور انھوں
نے ہندوستان سے حجاز کی راہ لی۔ اس زمانے میں مسیحی سلطنتوں کے اثر سے پادریوں کا فتنہ

ممالک عربیہ میں پھیل رہا تھا مصر و شام و روم کے علماء اسلام کے لیے یہ فتنہ نیا تھا اور وہ مسیحی لٹریچر پا اتنی وسیع نظر نہ رکھتے تھے کہ اس کا مقابلہ کر سکتے۔ مولانا رحمۃ اللہ نے یہ حال دیکھکر اظہار الحق کے نام سے عربی زبان میں ایک زبردست کتاب لکھی جس میں تحریف، نسخ تثلیث قرآن، اور نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسائل پر تمام ان دلائل کو جمع کر دیا جو مسیحی علماء کے مقابلہ میں کام آسکتے تھے۔ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں بمقام قاہرہ طبع ہوئی اور ممالک عربیہ میں سیلاب مسیحیت کو روکنے کے لیے اس نے وہ کام کیا جو شائد کسی دوسری کتاب نے نہیں کیا۔

ذیل کا مضمون اسی معرکۃ الآرا کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس میں علامہ ہندی کے صرف ان دلائل کو جمع کیا گیا ہے جو انہوں نے نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر خود مسیحیوں کے صحائف آسمانی سے فراہم کئے ہیں۔ امید ہے کہ اس مضمون کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا جائیگا۔

مصنف علام نے باب باندھا ہے اِخبار الانبیاء المتقدمین علیہ عن نبوتہ علیہ السلام۔ اس باب کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ عیسوں نے اس مسئلہ میں عوام کو بہت دھوکے دیے ہیں، اس لیے قبل ازیں کہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کو نقل کیا جائے۔ ہم بطور مقدمہ آٹھ ایسے امور بیان کریں گے جن کا مطالعہ ناظرین کے لیے افزائش بصیرت کا موجب ہوگا۔

۱۔ بشارت انبیاء کا اثبات | انبیائے بنی اسرائیل مثلاً اشعیاء، ارمیا، دانیال، حزقیال اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ نے آیندہ آنے والے بہت سے حوادث کی پیشین گوئیاں کی ہیں۔ مثلاً حادثہ بخت نصر، حادثہ قورش، سکندر اور اس کے خلفاء اور وہ حوادث جو سرزمین آدوم اور مصر اور نینوا اور بابل میں پیش آئے۔ اب یہ قطعاً بعید از قیاس ہے کہ ان انبیاء میں سے کوئی بھی اس عظیم الشان واقعہ (یعنی بعثت محمدی) کی خبر نہ دیتا جو ابتدا میں اپنے ظہور کے وقت ایک بہت ہی

چھوٹا سا پودا تھا لیکن آگے چل کر ایسا تناور درخت بن گیا کہ اس کی شاخیں تمام روئے زمین پر پھیلیں اور آسمان کے پرندوں نے ان میں آشیانہ کیا۔ یہ وہ واقعہ ہے جس نے بڑے بڑے جبابرہ اور اکاسرہ کی بساط سلطنت الٹ دی، مشرق اور مغرب میں پھیل کر تمام ادیان کو مغلوب کیا، تیرہ صدیوں سے زمین کے اکثر و بیشتر حصوں پر اس کے اثرات چھائے ہوئے ہیں اور اس مدت میں لاکھوں علماء، حکماء، صاحب کشف و کرامت اولیاء اور عظیم الشان سلاطین اس کے زیر اثر پیدا ہوئے ہیں یقیناً یہ حادثہ اپنی اہمیت میں نینوا، بابل اور روم کے حوادث سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے، پھر کیا عقل سلیم یہ باور کر سکتی ہے کہ اُن حقیر حوادث کے متعلق تو انبیاء سابقین نے خبریں دی ہوں مگر اس مہتم بالشان واقعہ کی کوئی خبر نہ دی ہو؟

۲۔ بشارتوں کا اجمال | نبی سابق جب نبی لاحق کے متعلق کوئی پیشین گوئی کرتا ہے تو وہ ایسی مفصل اور شرح نہیں ہوتی کہ آنیوالا نبی فلاں ملک فلاں قبیلہ فلاں سنہ میں پیدا ہوگا، بلکہ ایسی پیشین گوئی اکثر عوام کے لیے مجمل ہوتی ہے، در خواص کے لیے قرائن کی وساطت سے جلی اور واضح ہوا کرتی ہے البتہ خواص کے لیے اس میں اتنی پوشیدگی باقی رہ جاتی ہے کہ اُس پیشین گوئی کا صحیح مصداق کون ہے۔ مگر یہ پوشیدگی بھی اس وقت دور ہوجاتی ہے جب آنے والا نبی دعویٰ کرتا ہے کہ نبی سابق نے اسی کے آنے کی پیشین گوئی کی تھی اور اس کے ثبوت میں معجزات اور علامات نبوت پیش کرتا ہے۔ اس وقت علماء اور خواص پر پیشین گوئی کا مصداق بلا کسی شک وریب کے ظاہر ہوجاتا ہے۔ اسی وجہ سے امت سابقہ کے علماء کو آنے والے نبی کی زبان سے ملامت کی جاتی ہے کہ وہ اُس نبی کو پہچان لینے کے بعد بھی اس کی تکذیب کرتے ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام علماء یہود کو اس طرح ملامت کرتے ہیں۔

"اے شریعت کے سکھلانے والو تم پر افسوس کہ تم نے معرفت کی کنجی لے لی تم آپ بھی داخل نہ ہوئے اور

داخل ہونے والوں کو بھی روک رکھا۔ (لوقا باب ۱۱ آیت ۵۲)۔

لیکن مسیحیوں کا مذاق یہ ہے کہ اس باب میں علماء تو درکنار خود انبیاء بھی نہیں جانتے کہ جو پیشین گوئیاں پہلے کی گئی ہیں ان کے مصداق وہ خود ہیں۔ چنانچہ یوحنا باب اول میں ہے

اور یوحنا کی گواہی یہ تھی جب کہ یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں تب انہوں نے اس سے پوچھا تو اور کون؟ کیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ پس آیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، تب انہوں نے اس سے کہا کہ تو کون ہے؟ تاکہ ہم انہیں جنہوں نے ہم کو بھیجا کوئی جواب دیں، کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو درست کرو۔ اور یہ فریسیوں کی طرف سے بھیجے گئے تھے انہوں نے اس سے سوال کیا اور کہا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ الیاس اور نہ وہ نبی پس کیوں بپتسمہ دیتا ہے (یوحنا باب ۱۔ آیت ۱۹ تا ۲۵)

یہاں علمائے یہود نے "وہ نبی" کا لفظ جو استعمال کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مراد وہ نبی موعود ہے جس کی خبر موسیٰ علیہ السلام نے کتاب استثناء کے اٹھارھویں باب میں دی ہے (حسب تصریح علمائے مسیحیہ) یہ کاہن اور لاوی علمائے یہود میں سے تھے اپنی کتابوں سے واقف تھے، یہ بھی جانتے تھے کہ یحییٰ علیہ السلام نبی ہیں لیکن اُن کو شک اس میں تھا کہ آیا وہ عیسیٰ ہیں یا الیاس یا وہ نبی موعود، جس کی خبر موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تینوں کی علامات ان کی کتابوں میں اتنی واضح نہ تھیں کہ عوام نہیں تو کم از کم خواص علماء کو ہی ان میں کوئی شبہہ باقی نہ رہتا۔ اسی لیے انہوں نے پہلے دریافت کیا کہ کیا تو مسیح ہے، جب اس نے انکار کیا تو پوچھا کہ کیا تو الیاس ہے؟ اور جب انہوں نے اس سے بھی انکار کیا تو

کیا تو وہ نبی ہے ؟ اگر علامات واضح ہوتیں تو شک کی گنجائش نہ رہتی۔

یہ تو خیر علماء کا حال تھا۔ اناجیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود حضرت یحییٰ بھی اپنی حقیقت سے واقف نہ تھے، اسی لیے انہوں نے اپنے الیاسؑ ہونے سے انکار کیا حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت یہ ہے کہ الیاس وہی ہیں:۔

"اور الیاس جو آنے والا تھا یہی ہے چاہو تو قبول کرو۔ (متی باب ۱۱۔ آیت ۱۴)۔

اور اس کے شاگردوں نے اس سے پوچھا پھر فقیہ کیوں کہتے ہیں کہ الیاس کا آنا ضرور ہے؟ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ الیاس البتہ پہلے آئیگا۔ اور سب چیزوں کا بندوبست کریگا۔ پر میں تم سے کہتا ہوں کہ الیاس تو آ چکا لیکن انہوں نے اس کو نہیں پہچانا۔ بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ابن آدم بھی ان سے دکھ اٹھا دے گا۔ تب شاگردوں نے سمجھا کہ اس نے ان سے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی بابت کہا" (متی باب ۱۰۔ آیۃ ۱۰ تا ۱۳)۔

آخری عبارت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ علمائے یہود یہ نہیں سمجھ سکے کہ وہی الیاس ہیں اور اسی لیے انہوں نے حضرت یحییٰ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو مشہور ہے۔ اسی طرح حوارین بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ وہی الیاس ہیں، حالانکہ مسیحیوں کے عقیدے میں حوارین نہ صرف انبیا ہیں بلکہ حضرت موسیٰ سے بھی ان کا مرتبہ بڑھا ہوا ہے انہوں نے حضرت یحییٰ سے بپتسمہ لیا، ان کو بارہا دیکھا، اور یہ بھی ان کو معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ کے آنے سے پہلے ان کا آنا ضروری ہے، باوجود اس کے وہ ان کو نہ پہچان سکے۔

پھر انجیل یوحنا کے باب اول آیۃ ۳۳ میں حضرت یحییٰ کا یہ قول منقول ہے۔

"اور میں اسے نہ جانتا تھا پر جس نے مجھے بھیجا کہ پانی سے بپتسمہ دوں، اس نے مجھے کہا کہ جس پر تو روح کو اترتا اور ٹھہرتے دیکھے وہی ہے جو روح قدس سے بپتسمہ دیتا ہے"

یحییٰ علیہ السلام کے اس قول میں "آپ کو نہ جانتا تھا" کا مطلب مسیحی علماء کے ہاں یہ ہے کہ میں صاف طور پر یہ نہ جانتا تھا کہ وہ مسیح جس کا وعدہ کیا گیا ہے وہ یہی ہے، اس سے یہ راز فاش ہوتا ہے کہ تیس سال تک حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ کو نہ پہچان سکے اور انہوں نے اُن کو اس وقت پہچانا جب روح القدس کا نزول ہوا۔ شائد ایک باکرہ کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی مسیح کی مختص علامات میں سے نہ تھا کہ اتنے بڑے معجزے سے بھی حضرت یحییٰ ان کو نہ پہچانے۔ خیر اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ یحییٰ علیہ السلام اُن کبار انبیا میں تھے جنہوں نے (حسب تصریح انجیل متی باب ۱۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت دی اور مسیحیوں کے دعوی کے مطابق حضرت عیسیٰ جن کے رب اور خداوند تھے اور جن کا مسیح سے پہلے آنا ضروری تھا، اور جن کا الیاس ہونا بھی یقینی تھا۔ جب ایسے نبی اشرف کا حال یہ ہے کہ آخر عمر تک وہ نہ اپنے آپ کو پہچانا اور نہ اپنے خداوند اور رب کو تیس برس تک پہچان سکا اور جب حضرت موسیٰ اور تمام انبیائے بنی اسرائیل سے زیادہ فضیلت رکھنے والے انبیا یعنی حواریوں کا حال یہ ہے کہ وہ حضرت یحییٰ کے جیتے جی ان کے الیاس ہونے سے ناواقف رہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پچھلے انبیاء کی پیشین گوئیوں سے کسی نبی کو پہچاننے میں ان کے علماء اور عوام کا کیا مرتبہ ہوگا۔ اور اس میں انھوں نے کتنی ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔

پھر دیکھیے کہ کاہنوں کا سردار "قیافا" خود یوحنا کی شہادت کے مطابق نبی تھا۔ (ملاحظہ ہو باب ۱۱ آیہ ۵۱) اور یہی وہ حضرت ہیں جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی توہین و تکفیر کی اور ان کے قتل کا فتوی دیا (ملاحظہ ہو انجیل متی باب ۲۷) اگر علمائے یہود و نصاری کی کتابوں میں حضرت عیسیٰ کی علامتیں صاف صاف موجود ہوتیں تو قیافا نبی کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنے خداوند اور رب کی تکفیر کرتا اور ان کے قتل کا فتوی صادر کرتا۔

پھر متی اور لوقا نے اپنے تیسرے باب میں اور مرقس و یوحنا نے اپنی انجیلوں کے

پہلے باب میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق اشعیا نبی کی پیشین گوئی نقل کی ہے اور یوحنا نے خود یحییٰ علیہ السلام کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ وہ پیشین گوئی انھیں کے حق میں ہے کتاب اشعیا باب چالیس آیہ ۳ میں اس پیشین گوئی کے الفاظ صرف اس قدر ہیں :-

"بیابان میں ایک منادی کی آواز تم خداوند کی راہ درست کرو صحرا میں ہمارے خدا کے لیے ایک سیدھی شاہ راہ تیار کرو"

اس میں نہ تو یحییٰ علیہ السلام کے حالات ہیں، نہ صفات، نہ خروج کا زمانہ، نہ مکان کی ایسی تعیین کہ کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ اگر یحییٰ علیہ السلام یہ دعویٰ نہ کرتے کہ یہ بشارت اُن کے حق میں ہے، اور عہد جدید کے مولفین اس کی تصریح نہ کرتے تو یہودیوں کے عوام تو درکنار اُن کے علما اور خواص پر بھی اس بشارت کی حقیقت ظاہر نہ ہوتی کیونکہ بیابان میں پکارنے کا وصف تو تمام ان انبیائے بنی اسرائیل میں عام ہے جو اشعیا نبی کے بعد آئے ہیں، بلکہ یہ وصف عیسیٰ علیہ السلام پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ بھی یحییٰ علیہ السلام کی طرح ندا کیا کرتے تھے کہ توبہ کرو آسمان کی بادشاہت قریب آگئی۔ آگے چل کر ہم ان پیشین گوئیوں کا حال بیان کریں گے جو اناجیل کے مصنفین نے مسیح علیہ السلام کی بعثت کے متعلق انبیائے متقدمین سے نقل کی ہیں۔ اُن کو دیکھنے سے تم کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ سب بھی ایسی ہی ہیں، اسی طرح ہمارا بھی یہ دعویٰ نہیں ہے کہ انبیائے سابقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیشین گوئیاں کی ہیں وہ سب اس قدر صاف اور واضح ہیں کہ اُن میں مخالف تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو۔ امام فخرالدین رازی رح آیۃ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ - کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "یہ بات ظاہر معلوم ہوتی ہے کہ بالباطل میں (ب) استعانت کے لیے ہے جیسے کَتَبْتُ بِالْقَلَمِ۔ معنی یہ ہوے کہ حق کو ان شبہات کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو جن کو تم سننے والوں کے سامنے پیش کرتے ہو۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ توراۃ اور

انجیل میں آنحضرت علیہ السلام کے لیے جو نصوص وارد ہوئی ہیں وہ نصوص خفیہ ہیں جن کو سمجھنے کے لئے استدلال کی حاجت ہے۔ مگر علماء اہل کتاب ان میں مجادلہ کرتے تھے اور شبہات پیدا کرکے وجہ دلالت کو گم کر دیتے تھے"

محقق عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی بیضاوی کی شرح میں لکھتے ہیں" یہ فصل مزید تشریح چاہتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر نبی نے کچھ اشارات اور رموز بیان کئے ہیں جن کو راسخین فی العلم کے سوا کوئی نہیں سمجھتا اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ لیکن وہ اشارات میں ہے اگر عوام کے لیے واضح ہوتا تو اس کے کتمان پر صرف علماء کو ملامت نہ کی جاتی پھر ان اشارات کی پوشیدگی ایک زبان سے دوسری زبان میں، عبرانی سے سریانی میں سریانی سے عربی میں منتقل ہونے کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئی تاہم تورات اور انجیل کے جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔ ان پر اگر تم غور کروگے تو تم کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صحت پر ایسے اشارات کے ساتھ دلالت کر رہے ہیں جو راسخین فی العلم کے لیے واضح اور عوام کے لیے مخفی ہیں"۔

۱۳۔ اہل کتاب کس کس کے منتظر تھے | یہ دعوٰی کہ اہل کتاب مسیح اور الیاس کے سوا کسی اور نبی کے منتظر نہیں تھے بالکل باطل ہے۔ اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ علماء یہود جو حضرت عیسٰی کے معاصر تھے یحییٰ علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ مسیح ہیں جب انہوں نے انکار کیا تو پھر پوچھتے ہیں کیا آپ الیاس ہیں؟ جب انہوں نے اس سے بھی انکار کیا تو آخر میں دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ "وہ نبی" ہیں؟ اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل حضرت مسیح اور الیاس کے سوا ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے اور اس نبی کی شہرت ایسی تھی کہ نام لینے کی بھی حاجت نہ تھی، صرف اشارہ ہی کافی تھا۔

انجیل یوحنا کے ساتویں باب میں حضرت عیسٰی کا وعظ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

تب ان لوگوں میں سے بہتیروں نے یہ سن کر کہا فی الحقیقت یہی وہ نبی ہے۔ اوروں نے کہا یہ مسیح ہے" (آیہ ۴۰۔۴۱)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک "وہ نبی" مسیح علیہ السلام کے سوا کوئی اور تھا کیونکہ ایک جماعت کہہ رہی ہے کہ یہ مسیح ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ "وہ نبی" ہے۔ تو مسیح خاتم النبیین نہیں تھے۔ یہ ادعا کہ مسیح خاتم النبیین تھے اور ان کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہ تھا غلط ہے کیونکہ اوپر تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل ایک اور نبی کے منتظر تھے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا، اور جو مسیح اور الیاس کے سوا تھا۔ جب دلائل سے اس نبیٔ موعود کی بعثت قبل مسیح ثابت نہیں ہوئی تو مسیح کے بعد اُس کا آنا ضرور ہوا علاوہ بریں خود مسیحیوں کی کتابیں ان کے اس دعوے کا ابطال کر رہی ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ کے بعد نہ صرف حواریوں اور پولوس کی نبوت کا اعتراف کیا ہے بلکہ وہ ان کے سوا دوسرے انبیا کے بھی قائل ہیں چنانچہ کتاب اعمال کے گیارھویں باب میں ہے۔

انہی دنوں کئی ایک نبی یروشلم سے انطاکیہ میں آئے اور ان میں سے ایک نے جس کا نام اگبس تھا کھڑا ہو کے روح کی ہدایت سے ظاہر کیا کہ تمام مملکت میں بڑا کال پڑیگا جو قلودیوس قیصر کے وقت میں واقع ہوا" (آیہ ۲۷۔۲۸)

انجیل کی تصریح کے مطابق یہ سب انبیا ہیں جن میں سے ایک شخص اگبس نے ایک بڑے قحط کی پیشین گوئی کی۔ اسی کتاب کے اکیسویں باب میں پھر لکھا ہے۔

"اور جب ہم وہاں بہت روز رہے، اگبس نامی ایک نبی یہودیہ سے اتر آیا۔ اس نے ہمارے پاس آکے پولس کا کمربند اٹھالیا اور اپنے ہاتھ پاؤں باندھ کر کہا روح القدس یوں کہتی ہے اس مرد کو جس کا یہ کمربند ہے یہودی یروشلم میں یوں ہی باندھیں گے اور غیر قوموں کے

انھوں میں حوالے کر دیں گے۔ (آیہ ۱۰-۱۱)۔

یہ عبارت بھی مسیح کے بعد اگبس کی نبوت پر گواہی دے رہی ہے۔

مسیحی علما مسیح کے خاتم النبیین ہونے پر اُن کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں جو انجیل متی کے باب ۷، آیہ ۱۵ میں یوں الفاظ نقل کیا گیا ہے۔

"پر جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے لباس میں آتے پر باطن میں چھاڑنے والے بھیڑیے ہیں"

مگر اس آیت سے استدلال بھی عجیب ہے مسیح نبی علیہ السلام نے جھوٹے نبیوں سے محترز رہنے کی ہدایت کی ہے نہ کہ سچے نبیوں سے۔ اسی لیے انہوں نے صاف الفاظ میں جھوٹے نبیوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہاں اگر وہ یہ فرماتے کہ ہر اس نبی سے جو میرے بعد آئے بچو تو بلحاظ ظاہر یہ قول استدلال کے قابل ہو سکتا تھا اگرچہ پھر بھی ان کو اس کی تاویل ہی کرنی پڑتی کیونکہ پولوس اور حواریین اور اگبس کی نبوت ان کے نزدیک ثابت ہے۔

مسیح کے مذکورۂ بالا قول کا منشا دراصل ان جھوٹے نبیوں سے ڈرانا تھا جو ان کے صعود کے بعد طبقۂ اولیٰ میں بکثرت ظاہر ہوئے۔ یہ بات خود ان رسائل سے ثابت ہوتی ہے جو عہد جدید میں مندرج ہیں۔ قرنتیون ۲ باب ۱۱ میں ہے

"پر میں جو کرتا ہوں سو ہی کرتا رہوں گا کہ میں ان کو جو قابو ڈھونڈتے ہیں قابو پانے نہ دوں تاکہ جس بات میں وے فخر کرتے ہیں ایسے جیسے ہم ہیں پائے جاویں کیونکہ ایسے لوگ جھوٹے رسول دغاباز کارندے ہیں جو اپنی صورتوں کو مسیح کے رسولوں سے بدل ڈالتے ہیں" (آیہ ۱۲-۱۳)

اس عبارت میں ان کا مقدس پولوس ببانگ دہل کہہ رہا ہے کہ اس کے عہد میں جھوٹے

غداروں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور رسل مسیح کے مشابہ ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس مقام کی شرح کرتے ہوئے آدم کلارک اپنی تفسیر میں لکھتا ہے ا۔

یہ مدعیان نبوت جھوٹے تھے اس دعوے میں کہ ان کو مسیح نے بھیجا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ حقیقت واقعہ کے قطعاً خلاف تھا یہ لوگ وعظ اور اجتہاد کرتے تھے جس سے ان کا مقصد جلب منفعت کے سوا کچھ نہ تھا۔"

یوحنا کے پہلے خط عام میں لکھا ہے۔

اے پیارو تم ہر ایک روح کا یقین نہ کرو بلکہ روحوں کو آزماؤ کہ وے خدا کی طرف سے ہیں کہ نہیں کیونکہ بہت سے جھوٹے پیغمبر دنیا میں نکل آئے ہیں۔ (باب ۴- آیۃ ۱)۔

ان دونوں عبارتوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ حوارین کے عہد میں بکثرت جھوٹے مدعیان نبوت پیدا ہوگئے تھے اب کتاب اعمال کی حسب ذیل آیات کو بھی دیکھیئے:۔

"اس کے پہلے اس شہر میں شمعون نامی ایک شخص جادوگری کرتا اور سامریہ کے لوگوں کو دنگ رکھتا کہ میں کچھ ہوں اور چھوٹے سے بڑے تک سب اس کی طرف رجوع لاکر کہتے تھے کہ یہ خدا کی بڑی قدرت ہے" (باب ۸ آیۃ ۹-۱۰)

"اور اس تمام ٹاپو میں پافس تک سیر کرکے انہوں نے ایک یہودی جادوگر اور جھوٹے نبی کو جس کا نام بریسوع تھا، پایا" (باب ۱۳۔ آیہ ۶)۔

انجیل متی کی آیت ذیل بھی ملاحظہ ہو۔ حضرت مسیح فرماتے ہیں ا۔

خبردار کوئی تمہیں گمراہ نہ کرے کیونکہ بہتیرے میرے نام پر آویں گے اور کہیں گے کہ میں مسیح ہوں اور بہتوں کو گمراہ کریں گے" (باب ۲۴ آیہ ۴-۵)۔

ان آیات کو مسیح کی اس تنبیہ کے ساتھ جو مدعیان کاذب کے متعلق اوپر نقل کی گئی ہے

ملا کر دیکھیے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ حضرت نے اپنے پیرؤوں کو بہت سے دجالوں اور کذابوں کی خبر دی" اور ان کو آگاہ کیا کہ یہ سب مسیح اور نبی ہونے کا دعوی کریں گے، اور ان کو حکم دیا کہ ان سے پرہیز کریں نہ کہ خدا کے بھیجے ہوئے سچے نبیوں سے۔ چنانچہ جہاں وہ جھوٹے مدعیوں سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں وہیں یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

تم انہیں ان کے پھلوں سے پہچان لوگے کیا کانٹوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں۔ (متی باب ۷، آیہ ۱۶)۔

اس قول سے انبیاء صادقین کی پہچان بھی معلوم ہوگئی اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے ہیں۔ کیونکہ آپ کے پھل خود آپ کی صداقت پر گواہ ہیں۔ رہے منکرین کے مطاعن تو وہ کسی اعتبار کے قابل نہیں، اگر ان کا اعتبار کیا جائے تو خود حضرت عیسیٰ کب ان سے بچے ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ یہودی ان کے منکر ہیں، اُن کو جھوٹا قرار دیتے ہیں، اور ان کے نزدیک ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک کوئی شخص آنجناب سے زیادہ شریر پیدا نہیں ہوا (معاذ اللہ) اسی طرح بہت سے حکما اور علما خود مسیحیوں میں ایسے پیدا ہوئے ہیں جو ملت مسیحی سے نکل گئے اور سختی کے ساتھ اس پر طعنہ زن ہوئے آج اکناف عالم میں ان کے رسائل بکثرت شائع ہو رہے ہیں اور یورپ میں ان کے متبعین کی تعداد بڑھ رہی ہے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں یہود اور ان حکما اور علماء کے طعنے ہمارے نزدیک مقبول نہیں ہیں اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اہل تثلیث کے طعنے بھی قطعاً مردود ہیں۔

۵:- تاویلات یہود اور تاویلات مسیحیہ| مسیحیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انبیاء سابقین کی جو پیش گوئیاں نقل کی ہیں ان کی تفسیر یہودیوں کے ہاں مسیحیوں کی تفسیر سے بالکل مختلف ہے اسی وجہ سے یہودی عیسیٰ علیہ السلام کا بشدت انکار کرتے ہیں مگر علمائے مسیحیت یہودیوں کی ان تفسیروں اور

تاویلوں کی طرف التفات نہیں کرتے اور ان کی تفسیر اور تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان کے اعتقاد کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر راست آجائیں ایک مشہور عیسائی عالم لکھتا ہے :—

"ملت مسیحیہ کے قدیم معلمین نے صرف یہ دعویٰ اور صحیح دعویٰ کیا ہے کہ جن آیات میں یسوع مسیح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہودیوں نے ان کی غلط اور نامناسب تاویلیں کی ہیں اور انکو خلاف واقعہ طریق پر بیان کیا ہے (میزان الحق فارسی مطبوعہ ۱۸۶۶ء صفحہ ۴۶)

اس مصنف کا یہ قول کہ قدمائے ملت مسیحیہ نے فقط یہی دعویٰ کیا تھا غلط ہے۔ ان کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ یہودیوں نے اپنی کتابوں میں تحریف لفظی کی ہے مگر یہاں ہم اس مسئلہ سے قطع نظر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ جس طرح مسیحیوں کے نزدیک آیات مذکورہ کی یہودی تاویلات غلط اور نامناسب ہیں اسی طرح ہمارے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو آیات وارد ہوئی ہیں انکی مسیحی تاویلات بھی مردود اور ناقابل قبول ہیں عنقریب آپ دیکھیں گے کہ جو بشارتیں ہم رسول اللہ کی بعثت کے متعلق نقل کرنے والے ہیں ان کی صداقت ان بشارتوں سے زیادہ روشن ہے جو نصرانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نقل کی ہیں پس اگر ہم ان کی تاویلات فاسدہ کی طرف التفات نہ کریں تو کچھ مضایقہ نہیں جس طرح یہودی بعض ان خبروں کے متعلق جو بزعم مسیحیہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ہیں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کے مسیح منتظر یا کسی اور کے حق میں ہیں یا کسی کے حق میں بھی نہیں ہیں اور مسیحی ان کو حضرت عیسیٰ کے حق میں قرار دیتے ہیں اور یہودیوں کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے اسی طرح ہم بھی بعض ان خبروں کے بارے میں مسیحیوں کے قول کی پرواہ نہیں کرتے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہیں گو مسیحی ان میں سے بعض کو حضرت عیسیٰ پر چسپاں کرتے ہیں مگر آگے چل کر تم دیکھ لوگے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں۔ لہذا ہمارا دعویٰ ان کے دعوے سے زیادہ برحق ہے۔

۶۔ **حضرت مسیح کے متعلق پیشین گوئیوں پر ایک نظر** عہد جدید کے مؤلفین کو مسیحی اپنے اعتقاد میں ملہم سمجھتے ہیں

پس ضرور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں جو خبریں انہوں نے نقل کی ہیں وہ بھی ان کے اعتقاد کے مطابق الہامی ہوں۔ اب ہم نمونہ کے طور پر ان پیشین گوئیوں میں سے چند یہاں نقل کرتے ہیں جن کو دیکھ کر ناظرین اندازہ کر سکیں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو پیشین گوئیاں ہم آگے نقل کرنے والے ہیں ان کے مقابلہ میں مؤلفین اناجیل کی نقل کردہ پیشین گوئیوں کا کیا مرتبہ ہے پھر اگر کوئی پادری کج بحثی پر اتر آئے اور ان خبروں کی تاویل کرنے لگے جن کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں قرار دیتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ پہلے تو آپ اپنی تاویلات کا رخ ان خبروں کی طرف پھیرئے جو عہد جدید کے مؤلفین نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے نقل کی ہیں۔ ہر منصف مزاج شخص دونوں کا مقابلہ کر کے خود رائے قائم کرے گا کہ قوت اور ضعف کے اعتبار سے دونوں میں کیا نسبت ہے لیکن اگر وہ عیسوی خبروں کو چھوڑ کر صرف محمدی خبروں کی تاویل پر اصرار کرے تو یہ اس کے عجز اور تعصب پر صریح دلالت کرے گا۔

میں یہاں عہد جدید کے صرف چند اقتباسات پر اکتفا کروں گا کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ بعض قطعی غلط ہیں اور بعض میں تحریف لفظی کی گئی ہے اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر یاد عا اور حکم کے سوا کسی اور طریقہ سے چسپاں نہیں کی جا سکتیں تو ظاہر ہو جائیگا کہ وہ خبریں جن کے ناقل ملہم بھی نہیں ہیں ان کا پایہ کس قدر گرا ہوا ہے۔ پھر ان کے نقل کی کیا حاجت؟ (باقی)

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

(۵)

تالیف علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدیر الاصلاح اعظم گڈھ

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد ۷، عدد ۴)

تمام ملتوں پر ملت مسلمہ کی فضیلت | ۱۱- یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ نماز کو جس طرح تمام عبادات پر فضیلت و تقدم حاصل ہے اسی طرح قربانی پر بھی اس کو فضیلت حاصل ہے۔ اسی لیے بیان میں خدا نے ان کو مقدم رکھا۔ ان دونوں کی باہمی مناسبت پر ہم نے جو تقریر کی ہے اس پر غور کرنے کے بعد اس فضیلت کی وجہ اور ان دونوں کی عظمت بالکل بے نقاب ہو جائے گی۔ اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے لیکن ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ کوثر کی عظیم الشان نعمت کو ہمارے لیے مخصوص کرنے اور نماز و قربانی کے ایک ساتھ ذکر کرنے سے کیا خاص نتائج نکلتے ہیں:—

۱. ملت مسلمہ کو تمام دوسری ملتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

۲. یہود و نصاریٰ کی توبہ کی قبولیت، اسلام لانے پر منحصر ہے۔

۳. صرف مسلمان حضرت ابراہیم کے وارث ہیں۔

ان امور کے سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

تمام قدیم مذاہب میں خدا کے تقرب کا سب سے بڑا ذریعہ قربانی تھا یعنی ہمارے

یہاں جو رتبہ نماز کو حاصل ہے، وہی رتبہ دوسرے مذاہب میں قربانی کو حاصل تھا یہود کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ انہوں نے نماز کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، اور روزے کا ذکر بھی ان کے ان کنایات و اشارات کے حجاب میں گم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عقل حقیقی رشد و بلوغ کو نہیں پہنچی تھی، اس لیے مجرد توجہ الی اللہ، جو نماز کی حقیقت ہے، ان کی روحانی تربیت کے لیے کفایت نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے اس ملت میں نماز کو مقدم کرنا اور اس کو دین کا مغز قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ دین نے اپنی ترقی کا قدم، عروج و کمال کے آخری زینہ پر رکھ دیا لیکن یہ اہم نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ طبیعتوں کے مدارج فطرتاً مختلف ہوتے ہیں۔ ایک قوم علم و حکمت کے ذروۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے تاہم اس میں بہت سے ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو طفولیت عقلی کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں اس لیے اسلام نے اگرچہ نماز کو عماد دین قرار دیا اور اپنے اصول میں اس کے لیے جو جگہ مخصوص کی وہ کسی عبادت کو نہ دی تاہم قربانی کو بالکلیہ نہیں مٹایا حتیٰ کہ اس نے ان قدما کی یادگار بھی اپنے مراسم میں باقی رکھی جو دین کو محض رہبانیت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے کچھ آثار حج کے مراسم میں باقی ہیں۔

نصاریٰ کا حال یہود کے مراسم میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف نماز ہے۔ قربانی کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اس سے وہ ایک کامل مذہب پر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے، کیونکہ کمال اعتدال میں ہے۔ غلو سے کوئی بھلائی وجود میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ اس غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کی اصل بنیاد ایمان کے باب میں وہ یہود سے بھی نیچے گرگئے۔ جس طرح اعمال کے باب میں یہود ان سے پست حالت میں تھے۔

اسی وسط و اعتدال کی رعایت اور ہر چیز کو اس کی اصلی جگہ دینے کے لیے قرآن میں سب سے زیادہ ذکر نماز کا آتا ہے اور "نحر" کا لفظ بجز اس سورۃ کے پورے قرآن میں کہیں

نہیں آیا ہے۔ جن چند جگہوں پر "تفحیۃ" کا ذکر آیا ہے، وہاں بھی تبعاً آیا ہے پس چونکہ امت مسلمہ کے لیے نماز اور قربانی دونوں عبادتیں یکجا کی گئی ہیں اور خدا نے ان کے فلسفہ اور ان کی عظمت کو پوری طرح ہمارے لیے کھولا ہے؛ لہٰذا ہمارے پاس یہ کہنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ اس جامع شریعت کو دوسری تمام شریعتوں اور ملتوں پر فضیلت بخشی گئی ہے۔

مشرکین اور ملاحدہ کا ذکر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ان کی نماز و قربانی خدا کے لیے نہیں ہے، اس لیے وہ خارج از بحث ہیں۔ باقی رہے یہود و نصاریٰ تو وہ صرف شریعت کے رکن اعظم ہی سے محروم نہیں رہے بلکہ یک قلم دین ہی سے محروم ہو گئے، کیونکہ وہ ایک ایسے مذہب پر قانع ہو گئے جو ایک محدود مدت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نصاریٰ کا مذہب تجرد اور علیحدگی کا مذہب تھا اس میں ہر شخص پر صرف اس کے نفس کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا تھا، اس لیے ان کو جہاد نہیں دیا گیا بلکہ روزہ، نماز اور زکوٰۃ پر رہنے کا حکم ہوا۔ اور ان عبادات کو بھی پوشیدہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ طریقہ اگرچہ ان کی اصلاح و تربیت کے لیے نہایت موزوں تھا لیکن ان کے فرائض و سنن اس اخفا اور راز داری کے حجاب میں غائب ہو گئے، اور آہستہ آہستہ انہوں نے یہ تمام تعلیمات ضائع کر دیں۔ چنانچہ موجودہ اناجیل روزہ اور نماز کا بحیثیت فرائض کے حکم نہیں دیتیں بلکہ ان کو صرف مستحبات کا درجہ دیتی ہیں اور سعی و تدبیر، کسب و محنت اور عوض و انعام کی بالکل مخالف ہیں۔ جب انہوں نے اپنی شریعت کا ایک بڑا حصہ ضائع کر دیا (ونسوا حظًا مِمَّا ذُكِّروا به) اس کی جگہ ان کی بدعات و خرافات نے لے لی، چنانچہ ان میں یہ اعتقاد پھیل گیا کہ چونکہ حضرت مسیح اپنی تمام امت کی طرف سے قربان ہو گئے اس لیے قربانی کے حکم کی ذمہ داریوں سے وہ سبکدوش ہو گئے۔ اس خیال میں یہود کی شریعت کے اس حکم کی جھلک ہے جس کا منشا یہ ہے کہ کسی گناہ کا کفارہ بغیر خون بہائے

نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے اپنا خون بہا کر اپنی تمام امت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس عقیدہ کے اختیار کر لینے کے بعد نصاریٰ کے لیے دو باتوں میں سے ایک کا ماننا لازمی ہو گیا۔ اور دونوں کفر و شناعت میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ یا تو وہ یہ تسلیم کریں کہ حضرت مسیحؑ نے ان کے مستقبل کے تمام گناہوں کا بھی کفارہ ادا کر دیا، چنانچہ ان کے ایک فرقہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لانا نجات کے لیے کافی ہے اور یہ مرجائیت کی بدترین صورت ہے یا یہ مانیں کہ مستقبل کے گناہوں کی مغفرت کی کوئی صورت نہیں ہے، جیسا کہ ان کے ایک فرقہ اور ان کے امام بولوس کا خیال ہے۔ اور یہ معتزلہ کی اس شناعت سے بدرجہا بڑھ کر ہے جس کے وہ مرجائیت کی مفرط مخالفت میں مرتکب ہوئے ہیں۔ یہی ابتری یہود کے ہاں بھی ہے ان کے ہاں دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ بغیر قربانی کے مغفرت نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ ہیکل کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں۔ ان حکموں کی موجودگی میں ان کے ہاتھوں سے ہیکل کے نکل جانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے مذہب نے ان پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا۔ اور ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ باقی نہیں رہی کہ اس نبی موعود (صلعم) پر ایمان لائیں جس کی بعثت سے ان کی تمام آرزوئیں وابستہ کی گئی تھیں۔ اور جس کی پوری طرح ان کے انبیاء نے پہنچوا دیا تھا۔ قرآن مجید میں جس جگہ یہود کو آخری اور کامل شریعت کے ناقابل بتایا گیا ہے اور حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے مغفرت چاہی ہے، وہاں اس وعدہ کا بھی ذکر ہے :-

قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ	کہا، میں اپنا عذاب جس پر چاہتا ہوں، نازل کرتا
رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا	ہوں، اور میری رحمت ہر چیز کے لیے عام ہے، پس
لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ	میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ
الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ	پر قائم رہیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری

يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ۔ آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو اس رسول اور نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو وہ اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ تین لفظوں کی ایک آیت دنیا کے تمام مذاہب و ادیان پر بھاری ہے۔ اگر یہودیت و نصرانیت کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور اس آیت کو دوسرے میں تو پہلے لفظ کے وزن سے، وہ یہودیت بھاری ہو جائیگی اور دوسرے لفظ کا وزن اس کی نصرانیت پر بھاری کر دے گا، اور چونکہ بقیہ تمام دنیا کی قربانیاں غیر اللہ کے لیے ہیں اور سب نے اللہ واحد کو چھوڑ کر ارباب و اصنام بنا لیے ہیں اس لیے بیچ کا عظیم الشان لفظ اس کا پلہ تمام عالم سے گراں کر دے گا۔ پھر حسن نظم کا اعجاز دیکھیے کہ آپ سے آپ خدا پرستی کی کیسی سیدھی اور صاف راہ باز ہو گئی ہے! یعنی اللہ کی بندگی کی راہ یہ ہے کہ ہر حال میں خدا ہی یاد کی جائے اور دل اس کی طرف متوجہ رہے۔ اور زمانہ اور حالت کی رعایت کے ساتھ ہر موزوں شکل میں اس کے سامنے عجز و نیاز کی نذر گزرانی جائے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی وراثت نبی امی صلعم اور ان کے اتباع کی طرف منتقل کر دی اور اس مخصوص وراثت سے یہود و نصاریٰ کو محروم کر دیا۔ اس لیے اُس نماز اور قربانی کا حکم دیا جو اس امت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ظاہر و منصوص ہے حضرت ابراہیم نے ایک مسجد کی تعمیر کی تھی، کوئی قربان گاہ نہیں بنائی تھی طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرو یعنی نماز ہی ان کے دین کی غایت اور اصل و اساس تھی۔

باقی رہی قربانی، تو یہ ان کی اور ان کے اطاعت شعار فرزند۔ حضرت اسمٰعیلؑ۔ کی فدویت وجاں سپاری کی یادگار ہے، اس لیے اس سنت کے قیام و احیاء کے لیے مقام مروہ مخصوص ہوا، جو حضرت اسمٰعیل کی قربانی کی جگہ ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے حجاج بیت اللہ کی قربانی کی یادگار بناکر اس کو ہمیشہ کے لیے قائم و ثابت کردیا۔

یہود کی عبادت تمام تر قربانی میں محصور تھی اور یہ بھی ان تمام حقائق و اشارات سے یکسر خالی جن کی طرف قرآن حکیم نے جابجا رہنمائی کی ہے۔ ان کے ہاں کوئی ایک شہادت بھی اس بات کی نہیں ملتی کہ ان کی یہ قربانی حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے اُن کی آسمانی کتاب خود ان کے اس دعوی کی بہ وجوہ تردید کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم مفصل اس کے مقام پر لکھ چکے

چونکہ صورت معاملہ یہ تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر "نحر" کا لفظ استعمال کیا جو اونٹ کے ذبح کے لئے مخصوص ہے اور اونٹ یہود پر حرام تھا۔ اس بحث کی تفصیلات سورۂ بقرہ اور آل عمران سے متعلق ہیں، اس لیے یہاں اجمالی اشارہ کافی ہے یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہیے کہ اونٹ کی قربانی میں یہود کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ قربانی صرف ابراہیمی قربانی ہے حضرت اسمٰعیل کی اولاد کے لیے مخصوص ہے۔

شانئک اور الابتر کی تاویل ۱۲۔ آخری آیہ کی تاویل سے پہلے اس کے دو لفظوں "شانئک" اور "الابتر" پر غور کر لینا چاہیے۔

لفظ "شانی" معرفہ کی طرف مضاف ہوکر خود تعریف کے حکم میں آگیا ہے لیکن معرفہ کے لیے تعین و تشخص لازمی نہیں، تاہم بعض مفسرین نے تعیین کرنی چاہی اور چونکہ ان کا مبدا استنباط عام احوال و واقعات ہیں اس لیے جیسا کہ اس حالت میں متوقع ہے، ان کے اقوال مختلف ہوگئے ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؓ، مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد عاصم بن وائل ہے جس نے

کہا تھا "انا شانی محمد" میں محمد کا دشمن ہوں۔ شمر بن عطیہ سے روایت ہے کہ یہ عقبہ بن معیط ہے وہ یہ کہا کرتا تھا کہ پیغمبر کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہے گی۔ ان کی نسل منقطع ہے۔ اسی طرح ابن عباسؓ اور عکرمہؓ کے بعض اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس سے قریش مراد لیتے ہیں۔ میرے نزدیک اگرچہ اس لفظ کا مصداق کوئی مخصوص شخص ہونا چاہیے اور آیت کا اولین محمل وہی ہوگا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا نام لے کر اس کی فضیحت نہیں پسند کی تو بہتر یہی ہے کہ ہم بھی تسمیہ و تعیین سے احتراز کریں۔

یہ تفصیلات اس صورت سے متعلق ہیں جب کسی معین شخص کو مراد لیا جائے لیکن جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں صرف ھنک لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ مامون راہ یہ ہے کہ استنباط کی باگ قرآن مجید کے ہاتھ میں دیدیجائے اس کا نظم و سیاق جس طرف اشارہ کرے اسی طرف چلنا چاہیے۔ پچھلی سورہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ رجحان کلام قریش کی طرف ہے، تمام قابل اعتماد روایات اسی کی تائید کرتی ہیں۔ پھر حالات و قرائن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہی اس لفظ کے سب سے صحیح مصداق ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پچھلے مباحث کا اقتضا بھی یہی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اولاً اور بالذات اس سے قریش کو مراد لینا چاہیے۔ پھر ہر اس جماعت یا شخص کو جس میں یہ صفت پائی جائے۔ موقع نزول کی خصوصیات کسی لفظ کی وسعتوں کو محدود نہیں کرتیں۔ یہاں اس لفظ کے متعلق اتنی گفتگو کافی ہے۔ آیہ کی تفسیر کے ذیل میں مزید تفصیل ملیگی۔

"ابتر" لفظ بتر سے صفت کا صیغہ ہے۔ "بتر" کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ یہ لفظ مختلف طریقوں سے استعمال ہوا ہے جن پر غور کرنے سے اس معنی کی طرف رہبری ہوتی ہے جو یہاں مراد ہے۔ اس لیے اس مادہ کے مشتقات ہم ان کی معنوی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

سیف باتر، یا بتار، شمشیر بُرّاں کو کہتے ہیں۔ بَتَرَ فُلَانٌ رَحِمَہٗ، فلاں شخص نے رشتۂ رحم کو کاٹ دیا۔ اسی سے اباتر ہے، جس کے معنی قاطع رحم کے ہیں۔ ابتر الرجل کے معنی ہیں دبا پھر رک گیا۔ حجۃ "بتراء" برہان قاطع کو کہتے ہیں۔ قربانی والی حدیث میں ہے۔ انہ نہٰی عن المبتورہ۔ آپ نے دم بریدہ جانور کی قربانی سے منع فرمایا۔ ابتر ایک خاص سانپ کو کہتے ہیں جس کی دم چھوٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح ابتر اس شخص کو کہتے ہیں جس کی نسل منقطع ہو۔ حدیث میں ہے "کُلّ اَمرٍ ذِی بَالٍ لَم یُبدأ بِبسم اللّٰہ فھو ابتر، جو اہم کام اللہ کے نام سے نہ شروع کیا جائے وہ ابتر ہے۔ جو خطبہ حمد و صلوٰۃ سے خالی ہو اس کو بتراء کہتے ہیں۔ بتراس مشکیزہ یا ڈول کو بھی کہتے ہیں جس میں لٹکانے کی رسی یا تسمہ نہ ہو۔ "ابتران" گدھے اور غلام کے لیے بولا جاتا ہے۔ سورج کی تمازت اور اس کی شعاعوں کی تابانی جب ماند پڑ جاتی ہے تو اس کو "بتیراء" کہتے ہیں۔

ان تمام مشتقات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ابتر" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اُن تمام چیزوں سے محروم ہو گیا ہو جو ایک شخص کی عزت و عظمت اور قوت و شوکت کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ دیکھو، سورج جب اپنی شعاعوں کی فوج سے الگ ہو کر اپنے تمام جلال و عظمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی ٹکیا کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے تو اس کو "بتیراء" کہتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص اپنے رشتہ رحم کو کاٹ کر اعوان و انصار کی حمایت سے محروم ہو جائے اس کو ابتر کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے "ابتران" کا لفظ گدھے اور غلام کے لیے بولا گیا کہ قبیلہ میں سب سے زیادہ کم حمایتی انہی کے ہوتے ہیں۔

اس بنا پر قتادہؒ نے ابتر کے معنی "حقیر و ذلیل" کے بتائے ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ مقطوع کے معنی سے چل کر صغیر و قصیر کے معنی میں آیا پھر بے یار و مددگار اور حقیر و ذلیل کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ان دونوں لفظوں کی تفسیر سے فارغ ہونے کے بعد ہم آیۃ

کی نادیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کی تاویل ۱۳۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ان لوگوں کے جواب میں ہے جنہوں نے آنحضرت صلعم کو بطریق طعن ابتر کہا تھا۔ تمام مفسرین نے ایسا ہی سمجھا ہے۔ ہم کو بھی اس سے پورا اتفاق ہے لیکن اس کہنے سے ان کا مطلب کیا تھا؟ اس کا جواب کسی قدر محتاج تفصیل ہے۔

جب آنحضرت صلعم نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو قریش نے خیال کیا کہ آپ نے رشتہ رحم کاٹ کر، ایک طرف عرب کے معزز ترین خاندان کی تمام عظمتوں سے اپنے کو محروم کر لیا اور دوسری طرف تولیتہ کعبہ اور اس کی ہمجواری کی جو عزت و سعادت اس خاندان کے واسطے سے آپ کو حاصل تھی، وہ بھی اپنے ہاتھوں برباد کر دی۔ اس کے بعد آپ کی حیثیت ان کی نظر میں محض ایک شاخ بریدہ کی تھی جو اپنے تنہ سے الگ ہو کر خشک اور فنا ہو جانے کے لیے چھوڑ دی گئی ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو برکت و کثرت اور فتح و نصرت کی بشارت دی کہ آپ کے دشمنوں کا خیال بالکل غلط ہے خود وہی بے یار و مددگار اور تباہ و برباد ہوں گے؛ اور چونکہ یہ بات ان کے خیال کی تردید میں کہی گئی ہے اس لیے اس میں ایک لطیف تعرض بھی ہے کہ آپ کے اعداء جس عزت پر آج فخر کر رہے ہیں وہ عنقریب ان سے چھن جائے گی۔ اس پہلو سے اس آیت میں فتح مکہ کی بشارت ہے۔

لغت اور نظم کلام کے علاوہ روایات سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے امام سیوطی رح کہتے ہیں:-

"بزار وغیرہ نے بسند صحیح ابن عباس سے تخریج کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ کعب بن اشرف مکہ آیا قریش نے اس سے کہا، تم اہل مدینہ کے سردار ہو۔ اس شخص کو دیکھتے ہو

جو اپنی قوم سے کٹ کر علیٰحدہ ہو گیا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہم سے افضل خیال کرتا ہے! حالانکہ حاجیوں کے نگران ان کو پانی پلانے والے اور خانہ کعبہ کے کلید بردار اور متولی ہم ہیں۔

کعب نے جواب دیا تم اس سے افضل ہو۔ اس پر " اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ " والی آیت اتری۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں تخریج کی ہے کہ " ابن المنذر عکرمہ سے راوی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے مشرف فرمایا۔ قریش نے کہا کہ محمد ہم سے کٹ گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان شانئك الخ والی آیہ نازل فرمائی "

امام احمد وغیرہ نے اسی مضمون کی روایتیں تخریج کی ہیں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔

بعینہ اسی مضمون کی ایک روایت ابن جریر نے تخریج کی ہے جو ابن عباس سے مروی ہے کہ جب کعب بن اشرف مکہ آیا تو قریش اس سے ملے اور کہا کہ ہم حجاج کو پانی پلاتے ہیں اور کعبہ کے کلید بردار ہیں۔ تم اہل مدینہ کے سردار ہو۔ بتاؤ ہم بہتر ہیں یا یہ شخص جو اپنی قوم سے کٹ کر علیٰحدہ ہو گیا ہے اور اپنے کو ہم سے افضل خیال کرتا ہے۔ اس نے کہا تم افضل ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان شانئک الخ والی آیت نازل فرمائی اور اسی موقع پر یہ آیۃ بھی نازل ہوئی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ	کیا تو نے دیکھا ان لوگوں کو جن کو کتاب آسمانی کا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ	ایک حصہ ملا ہے اور وہ جبت وطاغوت پر ایمان لاتے
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ	ہیں اور کفار سے کہتے ہیں کہ تم لوگ مسلمانوں سے زیادہ
اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ	راہ پر ہو۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی پھٹکار ہے اور جن
اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا	خدا کی پھٹکار ہوئی تم ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پا سکتے

بعینہ اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت عکرمہؓ سے بھی ہے ۔صرف وعند نا نعمن الصنابر کے الفاظ زیادہ ہیں۔

یہ تمام روایتیں، تقریباً ہم معنی ہیں۔قریش کو اپنے خاندانی شرف و اصالت نیز بیت اللہ کی مجاوری وخدمت اور قربانی پر بڑا ناز تھا۔وہ اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت سمجھتے تھے، اس لیے ان کو خیال ہوا کہ جو شخص ان سے علیٰحدہ ہو گیا وہ اس شاخ بریدہ کے مانند ہے جس کا خشک ہو کر فنا ہو جانا یقینی ہے۔وہ اپنے اس گمان میں مگن تھے اور یہودی سردار کی تائید نے اس کو مزید قوت دیدی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ جو خیال تم پیغمبر عالم صلعم کے متعلق قائم کر رہے ہو، وہ بالکل غلط ہے بالبتہ تم عنقریب مخذول ومقہور ہو گے۔اور وہ تمام نعمتیں جو تم کو خانہ کعبہ کی تولیت کے صلہ میں ملی تھیں تمہاری شرارتوں اور بدعہدیوں کی پاداش میں تم سے چھین لی جائیں گی۔چنانچہ سورہ براءۃ کے نزول نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو سچ کر دیا اور خانہ کعبہ سے مشرکین کا رشتہ یک قلم منقطع کر دیا گیا۔یہاں یہ مجمل اشارات کافی ہیں، چند آئندہ فصل میں اس کے متعلق مزید تفصیلات آئیں گی۔

سورۃ کا موقع نزول اور فتح مکہ کی بشارت ہم پچھلی فصلوں میں گذر چکا ہے کہ یہ سورۃ فتح مکہ کی بشارت ہے اور "انا اعطینٰک" میں ماضی کا صیغہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ وعدہ فتح عنقریب پورا ہونیوالا ہے۔ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات میں، اللہ تعالیٰ نے نبی صلعم کو صبر و انتظار کا حکم دیا ہے۔اور فتح ونصرت کا وعدہ فرمایا ہے لیکن ہر آیت میں ایک قسم کا ابہام ہے۔مثلاً۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔ ہم ان کو جس چیز کی دھمکی دے رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو تم کو دکھا دیں گے یا دکھانے سے پہلے تم کو اٹھا لیں گے تمہارے اوپر صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے احتساب کا تعلق ہم سے ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۔

یا تو ہم تم کو اٹھا لیں گے پھر ہم ان سے انتقام لیں گے یا تمہیں دکھائیں گے وہ چیز جس کی ہم نے ان کو دھمکی دی ہے کیونکہ ہم کو ان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے

ان آیتوں سے صاف نہیں کھلتا تھا کہ آن حضرت صلعم کے ساتھ کس طرح کا معاملہ ہوگا آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح نصرت الٰہی کے ظہور سے پہلے وفات پائیں گے یا حضرت نوح علیہ السلام کی طرح غلبہ و نصرت ربانی کا جلال دیکھ کر، یا ان دونوں سے الگ آپ کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سا معاملہ پیش آئے گا۔ جن کو فتح و نصرت کا کچھ حصہ ان کی زندگیوں میں دکھا دیا گیا لیکن اس کے کامل ظہور کا وعدہ آخری بعثت پر انتظار رکھا گیا، اس لیے مسلمان ایک صاف وصریح وعدہ کے لیے بیقرار تھے۔ اس آیت نے نازل ہوکر مسلمانوں کو فتح و نصرت کی خوش خبری سنائی اور جو بات اب تک اخفا و ابہام کے حجاب میں گم تھی بے نقاب ہوکر سامنے آگئی۔

اس لیے قیاس یہ ہے کہ یا تو یہ سورۃ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا پہلی فتح یعنی صلح حدیبیہ کے روز نازل ہوئی ہے۔ روایات سے بھی ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں مندرجہ ذیل روایات نقل کی ہے۔

"سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ "فصل لربک وانحر" والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ قربانی کرکے لوٹ جاؤ۔ آنحضرت اٹھے اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ (راوی کو شبہہ ہے) کا خطبہ دیا۔ پھر دو رکعت نماز ادا کی اور قربانی کی اسی وقت حضرت جبرئیل نے فصل لربک وانحر کا پیام دیا"

امام سیوطی نے یہ حدیث نقل کرکے لکھا کہ "اس میں سخت غرابت ہے" لیکن اس غرابت کی

کوئی وجہ نہیں بیان کی ہے۔ چونکہ یہ روایت مختلف وجوہ سے مشہور خیال کے خلاف نظر آئی اس لیے انھوں نے وجہ غرابت کی تشریح ضروری نہیں سمجھی۔ حالانکہ جن اسباب سے ان کو یہ وہم ہوا، وہ غور و تامل کے بعد بالکل بے حقیقت ہوجاتے ہیں۔ ہم اجمالاً ان کو یہاں بیان کردیتے ہیں تاکہ ان کے ضعف کا اندازہ ہوسکے۔

(۱) انھوں نے خیال کیا کہ یہ سورۃ مکی ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے بعد پیش آیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ علماء نے تصریح کردی ہے کہ جو سورتیں ہجرت کے بعد مکہ کے قریب نازل ہوئی ہیں وہ بھی مکی کہلاتی ہیں۔ حدیبیہ مکہ سے بالکل قریب ہے دونوں کے درمیان صرف ایک منزل کی مسافت ہے اور حدیبیہ اور مدینہ کے درمیان نو منزلوں کی مسافت ہے۔ حدیبیہ حرم میں داخل ہے۔

۲۔ دوسرا شبہہ یہ ہوا کہ حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے ۵ سال ۲ مہینے کے بعد پیش آیا اور کعب بن اشرف ہجرت کے تیسرے سال قتل ہوا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ "ان شانئک ھو الابتر" اس کے اس سوال کے جواب پر نازل ہوی ہے جو قریش نے اس سے پوچھا تھا اور جس کی تفصیل پہلی فصل میں گذر چکی ہے۔ اس لیے اس سورہ کا حدیبیہ کے موقع پر اترنا صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ جب کسی آیت کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس طرح کے موقع پر اتری تو اس کا مطلب کوئی تعیین محض وقت نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص حالت کے ساتھ آیۃ کی مطابقت ظاہر کرنی مقصود ہوتی ہے اس لیے ان شانئک ھو الابتر سے وہ تمام جماعتیں مراد ہوں گی جو آنحضرت صلعم کی دشمن ہوں خواہ وہ فنا ہو چکی ہوں یا قیامت تک ظاہر ہوتی رہیں۔ اس آیۃ کے نزول کے وقت تک آپ کے جو اعداء ذلت و نامرادی کی موت مر چکے تھے وہ گویا سب باقی رہ جانے والے دشمنوں کے لیے مثال و عبرت تھے۔ کعب سے گفتگو کرنے کے بعد یہ نہیں ہوا تھا کہ قریش نے آنحضرت صلعم کے بارہ میں

اپنا فیصلہ بدل دیا ہو بلکہ اس شریر نے جو کچھ ان کے کانوں میں پھونک دیا تھا وہی ان کا اذعان واعتقاد تھا لیکن جب نصرت الٰہیہ کے ظہور نے آپ کے تمام اعداء کو پامال کر ڈالا تو مجبوراً ان کو اپنا یقین بدلنا پڑا۔ پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت قریش کے متعلق ہے، جو کعب کے فریب میں آئے تھے، ان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ آیت ان کے حال سے بالکل مطابق ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کے طعنہ کا جواب دیا اور ذرا بھی توقف نہیں فرمایا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ اس آیہ میں "شانی" سے "عقبہ بن معیط" کو مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ اس نے آنحضرت صلعم کو طعنہ دیا تھا کہ آپ کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی اس لیے آپ ابتر ہیں۔ عقبہ بدر میں قید ہوا اور بدر کے جو قیدی قتل ہوئے ان کے ساتھ قتل کیا گیا لیکن یہ وجہ بھی کوئی قوی وجہ نہیں ہے۔ دوسری وجہ کی تردید میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی تردید کے لیے بھی کافی ہے۔ پھر اس آیت کی صحیح تاویل اس طعن سے بالکل بے تعلق ہے، ابتر سے یہاں منقطع النسل یا لاولد مراد نہیں ہے۔ یہ تاویل بالکل سخیف ہے۔ نظم بھی اس سے ابا کرتا ہے اور روایت کی طرف سے بھی اس میں ضعف ہے۔ اس لیے سعید بن جبیر کے قول میں کوئی غرابت نہیں ہے بلکہ حق بات یہی ہے۔

اس سورہ کی اوپر والی دو آیتوں کی تفسیر میں محمد بن کعب قرظی سے جو قول مروی ہے اس سے بھی سعید بن جبیر کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"بہت سے لوگ غیر اللہ کے لیے عبادت و قربانی کرتے تھے پس اے محمد جب ہم تم کو کوثر بخشیں تو تمہاری نماز و قربانی صرف ہمارے لیے ہوتی چاہیے۔"

وہ گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قریش کوثر کی عظیم الشان نعمت پاکر بھی محروم ہی رہے کیونکہ انہوں نے اس نعمت کی قدر نہیں پہچانی اور اس کا حق ادا نہیں کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ان سے چھین کر تم کو بخشی۔ پس جب ہم اس کو تمہیں دیدیں، اور گو یا دے چکے تو تم اس کا

حق ادا کرو۔

یہ مسلم ہے کہ جب کوئی ایسا کام کرنے کا حکم دیا جائے "جو کسی واقع ہونے والی بات پر متفرع ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بات یا تو واقع ہو چکی ہے یا عنقریب واقع ہونے والی ہے۔ چنانچہ جب سورہ بقرہ اتری تو لوگوں نے اس کے مضمون سے یہی سمجھا کہ اس کا نزول ظہور فتح و غلبہ اسلام کے وقت ہوا ہے۔ اسی طرح ہم نے بھی محمد بن کعب کے قول "جب ہم تم کو کوثر بخشیں" کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ ہم نے تم کو بخش دیا اور اس وعدہ کے ظہور کا وقت قریب آگیا ہے۔

(باقی)

تفسیر سورۂ ماعون

از جناب مولانا عبدالقدیر صدیقی

أَرَأَيْتَ ۔ کیا تونے دیکھا ۔ یہ جملہ بمعنے اخبرنی ہے یعنے یہ تو بتاؤ کہ ایسے شخص کا کیا حال ہے

الَّذِیْ ۔ اس شخص کو جو ۔ الذی مثل ال کے کبھی جنس کے لیے آتا ہے یعنے ہر ایک شخص جو ہو اور کبھی عہد کے لیے آتا ہے اور اس سے خاص شخص مراد ہوتا ہے یعنے اس شخص کو جس کو تم جانتے

یُکَذِّبُ ۔ کَذَبَ یَکْذِبُ کَذِباً وکِذْباً مثل ضرب جھوٹ کہنا ۔ کذّب یکذّب تکذیباً باب تفعیل سے جھٹلانا ۔ جھوٹا سمجھنا ۔

اَلدِّیْن ۔ مذہب ۔ اسلام ۔ بدلہ وجزاء ۔

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۔ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو جزاء اور روز قیامت کا منکر ہے ۔ اس کو یقین نہیں کہ جو جیسا کریگا ویسا پائیگا، عمل ورد عمل برابر ہوتے ہیں

سیاق آیات اور عبارت کے تسلسل سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سورت میں کسی بخیل منافق کی حالت بیان کی گئی ہے کہ مسلمان کو ایسا نہ ہونا چاہئے ۔

یَدُعُّ ۔ دھکیلتا ہے ۔ دھکے دے کر نکالتا ہے ۔ گردنی دیتا ہے ۔

اَلْیَتِیْم ۔ بے باپ کا ۔

ایک عام غلطی لوگوں کی زبانوں پر ہے ۔ یتیم و یسیر ۔ جس کا باپ ہو نہ ماں ہو یسیر کوئی لفظ نہیں ہے قرآن شریف میں ایک جگہ ہے یتیماً وَّ اَسِیْراً ۔ یعنی یتیم اور قیدی ۔ یاروں نے اسیر سے یسیر بنالیا یعنے جس کی ماں نہ ہو ۔

فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ۔ یہ شخص جزا کا یقین نہ رکھنے ہی کی وجہ سے ایسا بے رحم سنگ دل ہو گیا ہے کہ غریب یتیم کو دھکے دے دے کر نکال دیتا ہے ۔

یَحُضُّ مثل یَمُدُّ۔ ترغیب دیتا ہے۔ برانگیختہ کرتا ہے۔ حث، عرّض، برغب ۔

طعام جو چیز کھائی جائے۔ طَعِمَ مثل سمع طَعْمًا و طُعمًا ما کھانا و طَعْمًا کھنا و طَعَمَ مثل فتح ، سیر ہونا۔

مسکین، سکن الرَّجُل یَسْکُن سَکُوْنًا۔ مثل نصر و سَکُنَ یَسْکُنُ سَکُوْنَۃ مثل کرم ۔ وتسکن۔ باب تفعل سے و تَمَسْکَنَ باب تفعیل سے مسکین و فقیر ہوا مِسْکِیْن و مَسْکِیْن جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ یا جو کچھ ہو وہ کافی نہ ہو۔ اور ذلیل وضعیف عورت کو مسکین و مسکینہ دونوں کہتے ہیں۔

وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ اور مسکین کو آپ کھلانا تو ایک طرف رہا لوگوں کو بھی اس کے کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

وَیْلٌ۔ افسوس ہے۔ خرابی ہے۔ تباہی ہے۔

ساھون۔ سھا یسھو سَھْوًا مثل دعا۔ بھولنا۔ سَھَا عَنِ الصَّلٰوۃِ و فیھا ۔ میں کیا فرق ہے۔ سھا عن الصلٰوۃ۔ بھول کر غفلت کر کے نماز چھوڑ دی۔ یا قضا کر دی اور بے وقت ادا کی۔ سھا فی الصلٰوۃ نماز میں کچھ بھول گیا۔ معمولی آدمیوں کو وسوسۂ شیطانی سے اور بزرگوں کو کمال حضور سے تعداد رکعات وغیرہ کی بھول ہوتی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کئی دفعہ نماز میں سہو ہوا ہے مگر کہاں غفلت کی بھول اور کہاں ہر کمال حضور کا سہو۔ ؎ کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلٰوتِھِمْ سَاھُوْنَ ۔ افسوس ہے ان

نمازیوں پر جو غفلت کرکے یا تو نماز ہی نہیں پڑھتے یا پڑھتے بھی ہیں تو بے وقت پڑھتے ہیں۔ اس سے پہلے منافقوں کا معاملہ مخلوق کے ساتھ بتایا گیا تھا۔ اس آیت میں ان کا معاملہ خالق سے بتایا گیا ہے۔ پہلے صرف ایک شخص سے بحث کی گئی پھر اس کے ساتھ اس کے ہم رنگ منافقوں کو بھی لا لیا گیا۔ اور فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ بصیغہ جمع کہا گیا۔

يُرَاؤُنَ۔ رَاءٰى يُرَائِىْ مُرَاءَاةً وَرِيَاءً۔ ریا کرتے ہیں۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کا مقصد امتثال امر الٰہی نہیں۔ لوگوں میں اپنے تقوی کی شہرت مطلوب ہے چونکہ یہ شخص کام کرتا ہے۔ اور لوگ تعریف کرتے ہیں، اس لیے باب مفاعلہ لایا گیا ہے۔ ریا، حقیقۃً ایک قسم کا شرک خفی ہے۔ ریاء سے اعمال ضائع جاتے ہیں۔ اس کا اصلی وقت ابتداءً ہے۔ نیت کا پاک، خالص خدا کے لیے رکھنا اصل ہے تنہا نمازیں اور امام بن کر جس طمانیت اور قراءت سے نماز پڑھائی جاتی ہے۔ فرق کا پیدا ہونا قابل توجہ ہے جس عبادت سے رضاء حق مقصود ہوتی ہے اس کا ثواب حق تعالیٰ سے ملے گا۔ جس عبادت سے رضاء مخلوق مطلوب ہوتی ہے، اس کا بدلہ حق جل وعلیٰ سے کیونکر مل سکتا ہے۔ خدا کے بندے ہو تو خدا کے لیے عمل کرو۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ۔

مَاعُوْن۔ مَعَنَ الْمَاءُ يَمْعَنُ مَعْنًا فَهُوَ مَعِيْنٌ۔ باب فتح سے جاری ہوا بہا الماعون۔ احسان۔ پانی۔ زکوٰۃ، وہ چیزیں جو عادتاً مستعار یا مفت دی جاتی ہیں۔ جیسے ہانڈی۔ کلہاڑی۔ آگ۔ پانی۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔ وہ جو نماز پڑھتے ہیں تو ریا کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ تو دیتے ہی نہیں۔

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۴)

اب تک سود کے مسئلہ پر جو بحث کی گئی ہے وہ صرف ایک اصولی بحث تھی اب ہم اس کے تعلقات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم ان شبہات کو بھی رفع کریں گے جو ڈاکٹر سیادت علی صاحب نے اپنے خطبہ میں بیان کئے ہیں اور جو ہمارے سابق مضامین کو دیکھ کر بعض دوسرے حضرات نے پیش کیے ہیں۔

ربا الفضل | ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ربٰو دراصل اُس زیادتی کو کہتے ہیں جو راس المال سے اشتغنٰی کی مہلت دینے کے معاوضہ میں وصول کی جاتی ہے۔ اصطلاح شرع میں اس کو "ربا النسیئۃ" کہا جاتا ہے یعنی وہ ربٰو جو قرض کے معاملہ میں لیا اور دیا جائے۔ قرآن مجید میں اسی کو حرام کیا گیا ہے، اس کی حرمت پر تمام امت کا اتفاق ہے اور اس میں کبھی کسی شک و شبہہ نے راہ نہیں پائی ہے۔

لیکن شریعت اسلامی کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جس چیز کو حرام کیا جاتا ہے اس کی طرف جانے کے جتنے راستے ممکن ہیں ان سب کو بند کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی ابتدا جس مقام سے ہوتی ہے وہیں روک لگا دی جاتی ہے تاکہ انسان اس کے قریب بھی نہ جانے پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدے کو ایک لطیف مثال میں بیان فرمایا ہے۔ عرب کی اصطلاح میں حمٰی اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو کسی شخص نے اپنے لیے مخصوص کر لی ہو اور

جس میں دوسروں کے لیے اپنے جانور چرانا ممنوع ہو۔ حضور فرماتے ہیں کہ ہر بادشاہ کی ایک حمیٰ ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی حمیٰ اس کے محارم ہیں۔ جو جانور حمیٰ کے اردگرد چرتا پھرتا ہے، بعید نہیں کہ کسی وقت چرتے چرتے وہ حمیٰ کے حدود میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی حمیٰ یعنی اس کے محارم کے اطراف میں چکر لگاتا رہتا ہے، اس کے لیے ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ کب اس کا پاؤں پھسل جائے اور وہ حرام میں مبتلا ہو جائے۔ لہٰذا جو امور حلال و حرام کے درمیان واسطہ ہیں ان سے بھی پرہیز لازم ہے تاکہ تمہارا دین محفوظ رہے۔ یہی مصلحت ہے جس کو مدنظر رکھکر شارع حکیم نے ہر ممنوع چیز کے اطراف میں حرمت اور کراہیت کی ایک مضبوط باڑہ لگا دی ہے، اور ارتکاب ممنوعات کے ذرائع پر بھی ان کے قرب و بعد کے لحاظ سے سخت یا نرم پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ آگے چل کر پردہ کی بحث میں ہم اس قاعدہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ یہاں اظہار مدعا کے لیے صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔

سود کے مسئلہ میں ابتدائی حکم صرف یہ تھا کہ قرض کے معاملات میں جو سودی لین دین ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ہے۔ چنانچہ اسامہ بن زید سے جو حدیث مروی ہے۔ اس میں حضور کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ انما الربا فی النسیئة - وفی بعض الالفاظ لا ربا الا فی النسیئة - یعنی سود صرف قرض کے معاملات میں ہے[۱] لیکن بعد میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کی اس حمیٰ کے اردگرد بھی بندشیں لگانا ضروری سمجھا تاکہ لوگ اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکیں۔ اسی قبیل سے وہ فرمان نبوی ہے جس میں سود کھانے اور کھلانے کے ساتھ سود کی

[۱] حضرت عبداللہ ابن عباس نے ابتدا میں اسی حدیث کی بنا پر یہ فتویٰ دیا تھا کہ سود صرف قرض کے معاملات ہی میں ہے نقد میں نہیں ہے لیکن جب بعد میں ان کو متواتر روایات سے معلوم ہوا کہ حضور نے نقد معاملات میں بھی تفاضل کو منع فرمایا ہے تو انہوں نے اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ حضرت جابر کی روایت ہے کہ رجع ابن عباس عن قوله فی الصرف عن قوله فی المتعة۔ اسی طرح حاکم نے حیان العدوی کے طریق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے بعد میں اپنے سابق فتوے پر توبہ و استغفار کی اور نہایت سختی کے ساتھ ربا الفضل سے منع کرنے لگے۔

دستاویز لکھنے اور اس پر گواہی دینے کو بھی حرام کیا گیا ہے۔ اور اسی قبیل سے وہ احادیث ہیں جن میں ربوا الفضل کی تحریم کا حکم دیا گیا ہے۔

ربوا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا، کیونکہ اس سے زیادہ ستانی کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خواری ہے۔ چنانچہ حضور نے خود ہی اس مصلحت کو اس حدیث میں بیان فرما دیا ہے جس کو ابو سعید خدری نے بدین الفاظ نقل کیا ہے کہ لاتبیعوا الدرھم بدرھمین فانی اخاف علیکم الرما (والرماھوالربا) یعنی ایک درہم کو دو درہموں کے عوض نہ فروخت کرو کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خواری میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔

ربا الفضل کے احکام سود کی اس قسم کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام منقول ہیں ان کو یہاں لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے۔

عبادہ بن صامت کی حدیث جو بخاری کے سوا تمام صحاح میں آئی ہے

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ یداً بیدٍ فاذا اختلفت ھذہ الاجناس فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بیدٍ۔	سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا مبادلہ چاندی سے، گیہوں کا مبادلہ گیہوں سے، جو کا مبادلہ جو سے، کھجور کا مبادلہ کھجور سے، نمک کا مبادلہ نمک سے اس طرح ہونا چاہیے کہ مثل بمثل اور برابر برابر اور دست بدست ہو۔ البتہ اگر یہ جنسیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

ابو بکرہؓ کی حدیث جس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔

لا تبیعوا الذهب بالذهب الا سواء	سونے کو سونے کے عوض نہ فروخت کرو مگر برابر برابر
بسواء والفضة بالفضة الا سواء بسواء	اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ فروخت کرو مگر برابر برابر
وبیعوا الذهب بالفضة والفضة	البتہ سونے کو چاندی کے عوض اور چاندی کو سونے
بالذهب کیف شئتم	کے عوض جس طرح چاہو بیچو۔

عبادہ بن صامت کی دوسری حدیث جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات
ینهی عن الذهب بالذهب والفضة	سے منع کرتے سنا ہے کہ سونے کا سونے سے اور چاندی
بالفضة والبر بالبر والشعیر	کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جو کا جو سے
بالشعیر والتمر بالتمر والملح	اور کھجور کا کھجور سے اور نمک کا نمک سے مبادلہ کیا
بالملح الا سواء بسواء عینا بعین	جائے مگر اس طرح کہ مبادلہ برابر برابر اور عین بعین
فمن زاد وازداد فقد اربیٰ۔	ہو۔ جس نے زیادہ لیا اس نے سود لیا۔

عبداللہ ابن عمر کی حدیث جس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے۔

الذهب بالذهب ربا الا هاء	سونے کا مبادلہ سونے سے سود ہے الا یہ کہ دست
وهاء والورق بالورق ربا الا هاء	بدست ہو۔ اور چاندی کا مبادلہ چاندی سے گیہوں
وهاء والبر بالبر ربا الا هاء وهاء	کا مبادلہ گیہوں سے، جو کا مبادلہ جو سے کھجور کا مبادلہ
والشعیر بالشعیر ربا الا هاء و	کھجور سے سود ہے الا یہ کہ دست بدست ہو۔
هاء والتمر بالتمر ربا الا هاء وهاءً	

ابو سعید خدری کی حدیث جس کو ابو حنیفہ نے روایت کیا ہے۔

الذهب بالذهب مثل بمثل یدا بید	سونے کا مبادلہ سونے سے مثل بمثل دست بدست ہونا

والفضل ربا والفضة بالفضة مثلا بمثل يداً بيد والفضل ربا وهكذا قال إلى اخر الستة۔ | چاہئے اور جو زیادہ ہے وہ سود ہے، اور چاندی کا مبادلہ چاندی سے مثل بمثل دست بدست ہونا چاہیے اور جو زیادہ ہے وہ سود ہے۔ اسی طرح بقیہ چاروں اجناس کے متعلق بھی آپ نے ایسا ہی فرمایا۔

ابو داؤد میں ہے۔

ولا باس ببيع الذهب بالفضة والفضة اكثرهما يداً بيد واما نسيئة فلا ولا باس ببيع البر بالشعير والشعير اكثرهما يداً بيد واما النسيئة فلا | اور کوئی حرج نہیں اگر سونے کو چاندی کے عوض بیچا جائے اور چاندی زیادہ ہو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔ رہا قرض تو وہ جائز نہیں اور کوئی حرج نہیں اگر گیہوں کا مبادلہ جو سے ہو اور جو زیادہ ہوں بشرطیکہ مبادلہ دست بدست ہو جائے۔ رہا قرض تو وہ جائز نہیں۔

احکام بالا کا حاصل ان احادیث کے الفاظ اور مقاصد پر غور کرنے سے حسب ذیل اصول اور احکام حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ جب دو چیزیں ایک ہی جنس اور ایک ہی قدر کی ہوں (یعنی مثل بمثل اور عین بعین ہوں) تو ان کا مبادلہ تفاضل (کمی و بیشی) کے ساتھ نہیں ہو سکتا، خواہ نقد ہو یا نسیہ۔ مثلاً ایک تولہ سونے کا مبادلہ اسی عیار کے ایک تولہ ایک رتی سونے کے ساتھ جائز نہیں۔ مبادلہ اگر ہو سکتا ہے تو ایک ہی تولہ سونے کے ساتھ اسی طرح ہو سکتا ہے۔

۲۔ اگر جنس ایک ہے لیکن قدریں مختلف ہوں تو ان میں تفاضل جائز ہے، مگر قرض جائز نہیں اس صورت میں تفاضل کے ساتھ دست بدست مبادلہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک سونا ۲۲ قیراط کے عیار کا ہے۔ اور دوسرا سونا ۲۰ قیراط کے عیار کا، تو ان کے مبادلہ میں صرف کے لحاظ سے تفاضل

جائز ہے، مگر معاملہ دست بدست (یداً بید) ہونا چاہیے۔ قرض کی صورت میں یہ شبہ واقع ہوسکتا ہے کہ تفاضل یا کمی مقدار مقرر کرنے میں مہلت کا بھی اعتبار کر لیا گیا ہو۔

۳۔ اگر قدر ایک ہو اور جنس مختلف ہوں تب بھی تفاضل جائز ہے مگر قرض جائز نہیں۔ مثلاً ایک تولہ سونا ایک سیر چاندی کے برابر قدر رکھتا ہے تو دونوں میں مبادلہ ہوسکتا ہے، مگر دست بدست۔ نسیہ میں وہی شبہ پیدا ہوتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ اگر جنس اور قدر دونوں میں اختلاف ہو تو تفاضل بھی جائز ہے اور قرض بھی۔ مثلاً ایک طرف نمک ہے اور دوسری طرف گیہوں ہیں۔ ان دونوں میں تفاضل کے ساتھ مبادلہ بھی ہوسکتا ہے اور نسیہ بھی لیکن اگر نسیہ کی صورت میں تفاضل کی مقدار اتنی رکھی جائے جتنی نقد کی صورت میں نہ ہوتی تو یہ سود ہو جائے گا۔

۵۔ اتحاد جنس کے ساتھ اگر نوعیت اور قدر بدل جائے تو مبادلہ میں تفاضل بھی ہوسکتا ہے اور نسیہ بھی۔ مثلاً ایک طرف خالص سونا ہے اور دوسری طرف سونے کی بنی ہوئی کوئی چیز یا ایک طرف گیہوں ہیں اور دوسری طرف گیہوں کا آٹا ہے۔ ان صورتوں میں اگرچہ جنس مشترک ہیں، لیکن محنت اور عمل کے شمول سے ان کے درمیان جنسی مماثلت باقی نہیں رہی اور قدر میں بھی اختلاف ہوگیا یہی نوعیت زرمسکوک کی بھی ہے۔ اس کا چلن محض اس کی فضیّت یا طلائیت کے اعتبار سے نہیں ہوتا بلکہ مسکوکیت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اس لیے سونے یا چاندی کے ساتھ اس کا مبادلہ تفاضل کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ البتہ اگر مبادلہ میں مسکوکیت کا اعتبار ساقط ہوکر صرف فضیت یا طلائیت کا اعتبار باقی رہ جائے تو اس پر وہی احکام جاری ہوں گے جو سونے اور چاندی پر ہوتے ہیں۔

۶۔ اگر زرمسکوک معیار مبادلہ قرار پا جائے اور اشیاء کی قیمتیں اسی کے لحاظ سے

متعین ہوں تو پھر شے کا مبادلہ شے کے ساتھ اس کے وزن یا پیمانہ کے لحاظ سے نہ ہوگا بلکہ زر
سکوک کے معیار پر ان دونوں کی قیمتوں کے لحاظ سے ہوگا۔ مثلاً ایک قسم کے گیہوں روپے کے
دس سیر ہیں، اور دوسری قسم کے گیہوں روپے کے آٹھ سیر ہیں تو ان کے درمیان اتحاد جنس
کے باوجود تفاضل کے ساتھ مبادلہ ہو سکتا ہے، کیونکہ اب اصل اعتبار ان کے وزن کا نہیں بلکہ ان
کی قیمتوں کا ہے۔ اس صورت میں اگر تعین قیمت کے لحاظ سے قرض پر بھی معاملہ ہو تو جائز
ہوگا۔ مثلاً ایک شخص ایک روپے کے گیہوں قرض لیتا ہے جبکہ گیہوں کا نرخ دس سیر فی روپیہ ہے
اور ایک مہینہ بعد وہ ایک روپیہ اس کو واپس دیتا ہے جبکہ گیہوں کا نرخ ۱۲ سیر فی روپیہ ہو گیا،
یا آٹھ سیر فی روپیہ رہ گیا۔ جنس شے میں یہ تفاضل سود کی تعریف میں نہ آئے گا۔ کیونکہ اس صورت
میں دراصل معاملہ کی نوعیت یہ ہوگی کہ اس نے روپیہ کے بدلے میں روپیہ ادا کیا۔ مگر یہ اسی
وقت جائز ہے جبکہ معاملہ میں اعتبار جنس شے کا نہیں بلکہ قیمت شے کا ہو۔

حضرت عمرؓ کا قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ احکام مجمل ہیں اور معاملات کی تمام جزئی صورتوں
کی ان میں تصریح نہیں ہے، اس لیے بہت سے جزئیات ایسے پائے جاتے ہیں جن میں شک کیا جا سکتا
ہے کہ آیا وہ ربٰوا کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ یہی بات ہے جس کی طرف حضرت عمرؓ نے اشارہ
کیا ہے کہ:-

ان آیۃ الربا من اٰخر ما نزل من القراٰن وان النبی صلعم قبض قبل ان یبینہ لنا فدعوا الربا والریبۃ	آیت ربٰوا قرآن کی ان آیات میں سے ہے جو آخر زمانہ میں نازل ہوئی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا قبل اس کے کہ آپ اس کے

تمام احکام ہم پر واضح فرماتے لہٰذا تم اس چیز کو بھی چھوڑ دو جو یقیناً سود ہے۔ اور اس چیز
کو بھی جس میں سود کا شبہہ ہو۔

فقہا کے اختلافات | احکام کا یہ اجمال ہی ان اختلافات کا مبنیٰ ہے جو اجناس ربویہ کے تعین، اور ان میں تحریم کی علت، اور حکم تحریم کے اجرار میں فقہائے امت کے درمیان ہوئے ہیں۔

ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ ربو صرف اُن چھ اجناس میں ہے جن کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے یعنی سونا چاندی گیہوں، جو خرما اور نمک۔ ان کے سوا دوسری تمام چیزوں میں تفاضل کے ساتھ بلا کسی قید کے لین دین ہو سکتا ہے۔ یہ مذہب قتادہ، اور طاؤس اور عثمان البتی، اور ابن عقیل حنبلی اور ظاہریہ کا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم تمام ان چیزوں میں جاری ہوگا جن کا لین دین وزن اور پیمانہ کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ یہ عمار اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے، اور ایک روایت کی رو سے امام احمد ابن حنبل کی بھی یہی رائے ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم ان تمام چیزوں میں جاری ہوگا۔ جو کھانے کے کام میں آتی ہیں۔ اگرچہ وہ مکیل اور موزون نہ ہوں۔ یہ امام شافعی کی رائے ہے اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کی بھی۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم طعام کے ساتھ مخصوص ہے بشرطیکہ وہ پیمانہ اور وزن کے لحاظ سے لیا اور دیا جائے۔ یہ سعید بن المسیب کا مذہب ہے اور ایک ایک روایت اس باب میں امام شافعی اور امام احمد سے بھی منقول ہے۔

پانچواں گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم مخصوص ہے ان چیزوں کے ساتھ جو قُوت کے کام آتی ہیں۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔

درہم و دینار کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ ان میں علت تحریم موزونیت ہے۔ اور شافعی و مالک اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کی رائے یہ ہے کہ

تعنیت اس کی علت ہے۔

مذاہب کے اس اختلاف سے جزئی معاملات میں حکم تحریم کا اجراء بھی مختلف ہو گیا ہے۔ ایک چیز ایک مذہب میں سرے سے جنس ربوی ہی نہیں ہے اور دوسرے مذہب میں اس کا شمار اجناس ربویہ میں ہوتا ہے۔ ایک مذہب کے نزدیک ایک شے میں علت تحریم کچھ اور ہے اور دوسرے مذہب کے نزدیک کچھ اور۔ اس لئے بعض معاملات ایک مذہب کے لحاظ سے سود کی زد میں آجاتے ہیں اور دوسرے مذہب کے لحاظ سے نہیں آتے۔ لیکن یہ تمام اختلافات اُن امور میں نہیں ہیں جو کتاب وسنت کے صریح احکام کی رو سے "ربوٰ" کے حکم میں داخل ہیں۔ بلکہ ان کا تعلق صرف مشتبہات سے ہے، اور ایسے امور سے ہے جو حلال وحرام کی درمیانی سرحد پر واقع ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان اختلافی مسائل کو حجت بنا کر اُن معاملات میں شریعت کے احکام کو مشتبہ ٹھیرانے کی کوشش کرے جن کے سود ہونے پر نصوص صریحہ وارد ہو چکی ہیں، اور اس طریق احتجاج سے رخصتوں اور حیلوں کا دروازہ کھولے، اور پھر اُن دروازوں سے بھی گذر کر امت کو سرمایہ داری کے راستوں پر چلنے کی ترغیب دے، وہ خواہ اپنی جگہ نیک نیت اور خیر خواہ ہی کیوں نہ ہو حقیقت میں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنہوں نے کتاب وسنت کو چھوڑ کر ظن وتخمین کی پیروی کی، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

معاشی قوانین کی تدوین جدید ہم تسلیم کرتے ہیں کہ زمانے کے حالات بدل چکے ہیں، دنیا کے تمدنی اور معاشی احوال میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوا ہے، اور اس انقلاب نے مالی اور تجارتی معاملات کی صورت کچھ سے کچھ کر دی ہے۔ ایسے حالات میں وہ اجتہادی قوانین جو اسلام کے ابتدائی دور میں حجاز، عراق، شام اور مصر کے معاشی وتمدنی حالات کو ملحوظ رکھ کر مدون کیے گئے تھے مسلمانوں کی موجودہ ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہیں۔ فقہائے کرام نے اس دور میں احکام شریعت کی جو تعبیر کی تھی

وہ معاملات کی ان صورتوں کے لئے تھی جو ان کے گرد و پیش کی دنیا میں پائی جاتی تھیں، مگر اب ان میں سے اکثر صورتیں باقی نہیں رہی ہیں، اور بہت سی دوسری صورتیں ایسی پیدا ہو گئی ہیں جو اس وقت موجود نہ تھیں۔ اس لیے بیع و شرا اور مالیات و معاشیات کے متعلق جو قوانین ہماری فقہ کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کی اب حاجت نہیں رہی اور جن قوانین کی اب حاجت ہے وہ ان میں موجود نہیں ہیں۔ پس اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ معاشی اور مالی معاملات کے لئے قانون اسلامی کی تدوین جدید ہونی چاہیئے یا نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ تدوین کس طرز پر ہو۔

تجدید سے پہلے تفکر کی ضرورت ہمارے تجدد پسند حضرات نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اگر اس کا اتباع کیا جائے اور ان کی اہواء کے مطابق احکام کی تدوین کی جائے تو یہ تدوین در اصل اسلامی شریعت کے احکام کی تدوین نہ ہوگی بلکہ ان کی تخریب ہوگی، اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم درحقیقت اپنی معاشی زندگی میں اسلام سے مرتد ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ طریقہ جس کی طرف یہ حضرات ہماری رہنمائی کر رہے ہیں اپنے مقاصد اور نظریات اور اصول و مبادی میں اسلامی طریقہ سے کلی منافات رکھتا ہے۔ ان کا مقصود محض کسب مال ہے اور اسلام کا مقصود اکل حلال۔ ان کا منتہائے آمال یہ ہے کہ انسان لکھ پتی اور کروڑ پتی بنے، عام اس سے کہ جائز ذرائع سے بنے یا ناجائز ذرائع سے۔ مگر اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان جو کچھ کمائے جائز طریقہ سے، دوسروں کی حق تلفی کیے بغیر کمائے، خواہ لکھ پتی بن سکے یا نہ بن سکے۔ وہ کامیاب اس کو سمجھتے ہیں جس نے دولت حاصل کی، زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل پر قابو پایا، اور ان کے ذریعہ سے آسائش، عزت، طاقت اور نفوذ و اثر کا مالک ہوا، خواہ یہ کامیابی اس نے کتنی ہی خود غرضی، ظلم، شقاوت، جھوٹ، فریب اور بے حیائی سے حاصل کی ہو، اور اس کے لئے اپنے دوسرے ابنائے نوع کے حقوق پر کتنے ہی ڈاکے ڈالے ہوں، اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے دنیا میں شر و فساد، بداخلاقی اور فواحش پھیلانے

اور نوعِ انسانی کو مادی، اخلاقی اور روحانی ہلاکت کی طرف دھکیلنے میں ذرہ برابر دریغ نہ کیا ہو لیکن اسلام کی نگاہ میں کامیاب وہ ہے جس نے صداقت، امانت، نیک نیتی، اور دوسروں کے حقوق و مفاد کی پوری نگہداشت کے ساتھ کسبِ معاش کی جدوجہد کی، اگر اس طرح کی جدوجہد میں وہ کروڑپتی بن گیا تو یہ اللہ کا انعام ہے لیکن اگر اس کو تمام عمر صرف قوتِ لایموت ہی پر زندگی بسر کرنی پڑی ہو اور اس کو پہننے کے لیے پیوند لگے کپڑوں اور رہنے کے لیے ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی سے زیادہ کچھ نصیب نہ ہوا ہو تب بھی وہ ناکام نہیں۔ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف اُن کو اسلام کے بالکل مخالف ایک دوسرے راستہ کی طرف لے جاتا ہے جو خالص سرمایہ داری کا راستہ ہے۔ اس راستے پر چلنے کے لیے ان کو جن قوانین اور جن آسانیوں اور رخصتوں اور اباحتوں کی ضرورت ہے وہ اسلام میں کسی طرح نہیں مل سکتے۔ اسلام کے اصول اور احکام کو کھینچ تان کر خواہ کتنا ہی پھیلا دیجئے، مگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ اصول اور احکام وضع ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ اس کی تحصیل کے لیے ان سے کوئی ضابطہ اور دستور العمل اخذ کیا جا سکے۔ پس جو شخص اس راستہ پر جانا چاہتا ہو، اس کے لیے تو بہتر یہی ہے کہ وہ دنیا کو اور خود اپنے نفس کو دھوکہ دینا چھوڑ دے، اور اچھی طرح سمجھ لے کہ سرمایہ داری کے راستہ پر چلنے کے لیے اس کو اسلام کے بجائے صرف یورپ اور امریکہ ہی کے معاشی اور مالی اصول و احکام کا اتباع کرنا پڑیگا۔

رہے وہ لوگ جو مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ قرآن اور طریق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنی عملی زندگی میں اسی کا اتباع کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کو ایک جدید ضابطۂ احکام کی ضرورت دراصل اس لیے نہیں ہے کہ وہ نظامِ سرمایہ داری کے ادارات سے فائدہ اٹھا سکیں یا ان کے لیے قانونِ اسلامی میں ایسی سہولتیں پیدا کی جائیں جن سے وہ کروڑپتی تاجر، ساہوکار اور کارخانہ دار بن سکیں، بلکہ ان کو

ایسے ایک ضابطہ کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ جدید زمانے کے معاشی حالات اور مالی و تجارتی معاملات میں اپنے طرز عمل کو اسلام کے صحیح اصولوں پر ڈھال سکیں، اور اپنے لین دین میں ان طریقوں سے بچ سکیں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہیں۔ اور جہاں دوسری قوموں کے ساتھ معاملات کرنے میں ان کو حقیقی مجبوریاں پیش آئیں وہاں ان رخصتوں سے فائدہ اٹھا سکیں جو اسلامی شریعت کے دائرے میں ایسے حالات کے لیے نکل سکتی ہیں۔ اس غرض کے لیے قانون کی تدوین جدید بلاشبہہ ضروری ہے اور علماء اسلام کا فرض ہے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی سعی بلیغ کریں۔

اسلامی قانون میں تجدید کی ضرورت اسلامی قانون کوئی ساکن اور منجمد (Static) قانون نہیں ہے کہ ایک خاص زمانہ اور خاص حالات کے لیے اس کو جس صورت پر مدوّن کیا گیا ہو اسی صورت پر وہ ہمیشہ قائم رہے اور ازمنہ و احوال کے بدل جانے پر بھی اس صورت میں کوئی تغیر نہ کیا جا سکے۔ یہ نظریہ جن حضرات کا ہے وہ غلطی پر ہیں، بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ وہ اسلامی قانون کی روح ہی کو نہیں سمجھے ہیں۔ اسلام میں دراصل شریعت کی بنیاد حکمت اور عدل پر رکھی گئی ہے تشریع کا اصل مقصد بندگان خدا کے معاملات اور تعلقات کی تنظیم اس طور پر کرنا ہے کہ ان کے درمیان مزاحمت کے بجائے معاونت ہو، ایک دوسرے کے مقابلہ میں ان کے حقوق اور فرائض کامل عدل اور توازن کے ساتھ متعین ہو جائیں، اور نظام اجتماعی میں ہر شخص نہ صرف اپنے کمال لائق کو پہنچ سکے، بلکہ دوسروں کے لیے بھی ان کے کمالات لائقہ کو پہنچنے میں مددگار ہو، یا کم از کم مانع و مزاحم بن کر موجب فساد نہ ہو جائے۔ اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی اور حقائق اشیاء کے اس علم کی بناء پر جو اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے زندگی کے ہر شعبہ میں چند ہدایات

دی ہیں، اور اس کے رسول نے اسی کے دئے ہوئے علم سے ان ہدایات کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ہمارے سامنے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ یہ ہدایات اگرچہ ایک خاص زمانے اور خاص حالات میں دی گئی تھیں اور ان کو ایک خاص سوسائٹی کے اندر نافذ کرایا گیا تھا، لیکن ان کے الفاظ اور طریق نفاذ سے قانون کے چند ایسے وسیع اور ہمہ گیر اصولوں کی تعلیم دے دی گئی ہے جو ہر زمانے، ہر احوال اور ہر حالت میں تشریع کے اسی مقصد کو پورا کر سکتے ہیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اسلام میں جو چیز ثابت اور غیر متبدل ہے وہ یہی اصول ہیں۔ اب یہ متفقہین کا کام ہے کہ عملی زندگی میں جیسے جیسے حالات اور حوادث پیش آتے جائیں ان کے لیے اصول شریعت کے مطابق صحیح قوانین بناتے جائیں، اور معاملات میں ان کو اس طور پر نافذ کریں کہ شارع کا اصل مقصد پورا ہو۔ شریعت کے اصول جس طرح ثابت اور غیر متبدل ہیں اس طرح وہ قوانین ثابت اور غیر متبدل نہیں ہیں جن کو انسانوں نے ان اصولوں پر متفرع کیا ہے، کیونکہ وہ اصول خدا نے بنائے ہیں اور یہ قوانین انسانوں نے وضع کیے ہیں، وہ تمام ازمنہ وامکنہ اور احوال وحوادث کے لیے ہیں، اور یہ خاص حالات اور خاص حوادث کے لیے۔

تجدید کے لیے چند ضروری شرطیں پس اسلام میں اس امر کی پوری وسعت رکھی گئی ہے کہ تغیر احوال اور خصوصیات حوادث کے لحاظ سے احکام میں اصول شرع کے تحت تغیر کیا جا سکے، اور جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی جائیں ان کو پورا کرنے کے لیے قوانین وضع کیے جا سکیں۔ اس معاملے میں ہر زمانے اور ہر جماعت کے متفقہین کو قانون سازی کے پورے اختیارات حاصل ہیں، اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کسی خاص دور کے اہل علم کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لیے وضع قانون کا چارٹر دے کر دوسروں کے اختیارات کو سلب کر لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ہر شخص کو اپنے منشا اور اپنی اھواء کے مطابق احکام کو بدل ڈالنے اور اصول کو توڑ مروڑ

ان کی الٹی سیدھی تاویلیں کرنے، اور قوانین کو شارع کے اصل مقصد سے پھیر دینے کی آزادی حاصل ہو۔ اس کے لئے بھی ایک ضابطہ ہے اور وہ چند شرائط پر مشتمل ہے۔

پہلی شرط | قانون سازی کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مزاج شریعت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بات صرف قرآن مجید کی تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تدبر کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے[1]۔ ان دونوں چیزوں پر جس شخص کی نظر وسیع اور عمیق ہوگی وہ شریعت کا مزاج شناس ہو جائیگا۔ اور ہر موقع پر اس کی بصیرت اس کو بتادے گی کہ مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ اس شریعت کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے، اور کس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کے مزاج میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے گی۔ اس بصیرت کے ساتھ احکام میں جو تغیر وتبدل کیا جائے گا وہ نہ صرف مناسب اور معتدل ہوگا، بلکہ اپنے محل خاص میں شارع کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ اتنا ہی بجا ہوگا جتنا خود شارع کا حکم ہوتا۔ اس کی مثال میں بہت سے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا یہ حکم کہ دوران جنگ میں کسی مسلمان پر حد نہ جاری کی جائے، اور جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شرب خمر پر معاف کر دینا، اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانہ میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ یہ امور اگرچہ بظاہر شارع کے صریح احکام کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن جو شخص شریعت کا مزاج دان ہے وہ جانتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں حکم عام کے امتثال کو چھوڑ دینا مقصود شارع کے عین مطابق ہے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے

---

[1] یہاں اشارۃً یہ کہہ دینا بیجا نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ہماری دینی تعلیم سے قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ خارج ہو گیا ہے اور اس کی جگہ محض فقہ کے کسی ایک سسٹم کی تعلیم نے لی ہے اور یہ تعلیم بھی اس طرح دیجاتی ہے کہ ابتدا ہی سے خدا و رسول کے منصوص احکام اور ائمہ کے اجتہادات کے درمیان حقیقی فرق و امتیاز طالب علم کے پیش نظر نہیں رہتا۔ کوئی شخص جب تک حکیمانہ طریق پر قرآن میں بصیرت حاصل نہ کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا غور مطالعہ نہ کرے، اسلام کے مزاج اور اسلامی قانون کے اصول کو نہیں سمجھ سکتا۔ اجتہاد کے لیے یہ چیز ضروری ہے اور تمام عمر فقہ کی کتابیں پڑھتے رہنے سے بھی یہ حاصل نہیں ہو سکتی۔

بو حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حاطب کے غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے۔ حضرت عمر نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دیدیا، پھر فوراً ہی آپ کو تنبہ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا مگر ان کو بھوکا مار دیا اور اس حال کو پہنچا دیا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز بھی کھا لے تو اس کے لیے جائز ہو جائے۔ یہ کہکر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اسی طرح تطلیقات ثلاثہ کے مسئلہ میں حضرت عمر نے جو حکم صادر فرمایا وہ بھی عہد رسالت کے عملدرآمد سے مختلف تھا مگر چونکہ احکام میں یہ تمام تغیرات شریعت کے مزاج کو سمجھ کر کیے گئے تھے اس لیے ان کو کوئی نامناسب نہیں کہہ سکتا۔ بخلاف اس کے جو تغیر اس فہم اور بصیرت کے بغیر کیا جاتا ہے وہ مزاج شرع میں بے اعتدالی پیدا کر دیتا ہے اور مفضی الی الفساد ہو جاتا ہے۔

دوسری شرط مزاج شریعت کو سمجھنے کے بعد دوسری اہم شرط یہ ہے کہ زندگی کے جس شعبہ میں قانون سازی کی ضرورت ہو اس کے متعلق شارع کے جملہ احکام پر نظر ڈالی جائے اور ان میں غور و فکر کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ ان سے شارع کا مقصد کیا ہے، وہ کس نقشہ پر اس شعبہ کی تنظیم کرنا چاہتا ہے، اسلامی زندگی کے وسیع تر نقشہ میں اس شعبۂ خاص کا کیا مقام ہے، اور اس مقام کی مناسبت سے اس شعبہ میں شارع نے کیا پالیسی اختیار کی ہے۔ اس چیز کو سمجھے بغیر جو قانون وضع کیا جائیگا یا پچھلے قانون میں جو حذف و اضافہ کیا جائے گا، وہ مقصود شارع کے مطابق نہ ہوگا اور اس سے قانون کا رخ اپنے مرکز سے منحرف ہو جائے گا۔ قانون اسلامی میں ظواہر احکام کی اہمیت اتنی نہیں ہے جتنی مقاصد احکام کی ہے۔ فقیہ کا اصلی کام یہی ہے کہ وہ شارع کے مقصود اور اس کی حکمت و مصلحت پر نظر رکھے۔ بعض خاص مواقع ایسے آتے ہیں جن میں اگر

ظواہر احکام پر (جو عام حالات کو مدنظر رکھ کر دیے گئے تھے) عمل کیا جائے تو اصل مقصد فوت ہوجائے ایسے وقت میں ظاہر کو چھوڑ کر اس طریق پر عمل کرنا ضروری ہے جس سے شارع کا مقصد پورا ہوتا ہو۔ قرآن مجید میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی جیسی کچھ تاکید کی گئی ہے، معلوم ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر بہت زور دیا ہے، مگر اس کے باوجود آپ نے ظالم وجابر امراء کے مقابلہ میں خروج سے منع فرما دیا کیونکہ شارع کا اصل مقصد تو فساد کو صلاح سے بدلنا ہے جب کسی فعل سے اور زیادہ فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور صلاح کی امید نہ ہو تو اس سے احتراز بہتر ہے علامہ ابن تیمیہ کے حالات میں ہے کہ فتنۂ تاتار کے زمانہ میں ایک گروہ پر ان کا گذر ہوا جو شراب وکباب میں مشغول تھا، علامہ کے ساتھیوں نے ان لوگوں کو شراب سے منع کرنا چاہا مگر علامہ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ اللہ نے شراب کو سدِ باب فتنہ کے لئے حرام کیا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ شراب ان ظالموں کو ایک بڑے فتنے یعنی قتل نفوس اور نہب اموال سے روکے ہوئے ہے لہٰذا ایسی حالت میں ان کو شراب سے روکنا مقصودِ شارع کے خلاف ہے اس سے معلوم ہوا کہ حوادث کی خصوصیات کے لحاظ سے احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے۔ مگر تغیر ایسا ہونا چاہیے جس سے شارع کا اصل مقصد پورا ہو نہ کہ الٹا فوت ہوجائے

اسی طرح بعض احکام ایسے ہیں جو خاص حالات کی رعایت سے خاص الفاظ میں دیے گئے تھے۔ اب فقیہ کا کام یہ نہیں ہے کہ تغیر احوال کے باوجود انہی الفاظ کی پابندی کرے بلکہ اس کو ان الفاظ سے شارع کے اصل مقصد کو سمجھنا چاہیے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے حالات کے لحاظ سے مناسب احکام وضع کرنے چاہییں۔ مثلاً حضور نے صدقۂ فطر میں ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو، یا ایک صاع کشمش دینے کا حکم فرمایا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس وقت مدینہ میں جو صاع رائج تھا اور یہ اجناس جن کا حضور نے ذکر فرمایا بعینہا منصوص ہیں شارع کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ عید کے روز ہر مستطیع شخص اتنا صدقہ دے کہ اس کا ایک غیر مستطیع بھائی اس صدقہ میں اپنے بال بچوں

کے ساتھ کم از کم عید کا زمانہ خوشی کے ساتھ گذار سکے، اس مقصد کو کسی دوسری صورت سے بھی پورا کیا جا سکتا ہے جو شارع کی تجویز کردہ صورت سے اقرب ہو۔

تیسری شرط: پھر یہ بھی ضروری ہے کہ شارع کے اصول تشریع اور طرز قانون سازی کو خوب سمجھا جائے تاکہ موقع و محل کے لحاظ سے احکام وضع کرنے میں انہی اصولوں کی پیروی اور اسی طرز کی تقلید کی جا سکے۔ یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان مجموعی طور پر شریعت کی ساخت اور پھر فرداً فرداً اس کے احکام کی خصوصیات پر غور نہ کرلے۔ شارع نے کس طرح احکام میں عدل اور توازن قائم کیا ہے۔ کس کس طرح اس نے انسانی فطرت کی رعایت کی ہے دفع مفاسد اور جلب مصالح کے لیے اس نے کیا طریقے اختیار کئے ہیں کس ڈھنگ پر وہ انسانی معاملات کی تنظیم اور اس میں انضباط پیدا کرتا ہے کس طریقہ سے وہ انسان کو اپنے بلند مقاصد کی طرف لیجاتا ہے اور پھر ساتھ ساتھ اس کی فطری کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اس کے راستہ میں مناسب سہولتیں بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ سب امور تفکر و تدبر کے محتاج ہیں اور ان کے لیے نصوص قرآنی کی لفظی و معنوی دلالتوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کی حکمتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ جو شخص اس علم اور تفقہ سے بہرہ ور ہو وہ موقع و محل کے لحاظ سے احکام میں جزوی تغیر و تبدل بھی کر سکتا ہے اور جن معاملات کے حق میں نصوص موجود نہیں ان کے لیے نئے قوانین بھی وضع کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا شخص قانون سازی میں جو طریقہ اختیار کرے گا وہ اسلام کے اصول تشریع سے منحرف نہ ہوگا۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم ہے مگر اجتہاد سے کام لے کر اس حکم کو عجم کے مجوسیوں، ہندوستان کے بت پرستوں اور افریقہ کے بربری باشندوں پر بھی وسیع کر دیا گیا۔ اسی طرح خلفاء راشدین کے عہد میں جب ممالک فتح ہوئے تو غیر قوموں کے ساتھ بکثرت ایسے معاملات پیش آئے جن کے متعلق کتاب و سنت میں صریح احکام موجود نہ تھے صحابہ کرام نے ان کے لئے خود ہی قوانین مدون کئے اور وہ اسلامی شریعت کی

اسپرٹ اور اس کے اصول سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔

چوتھی شرط احوال اور حوادث کے جو تغیرات، احکام میں تغیر یا جدید قانون سازی کے مقتضی ہوں ان کو دو حیثیتوں سے جانچنا ضروری ہے۔ ایک یہ حیثیت کہ وہ حالات بجائے خود کس قسم کے ہیں! ان کی خصوصیات کیا ہیں اور ان کے اندر کونسی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ دوسری یہ حیثیت کہ اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے ان میں کس کس نوع کے تغیرات ہوئے ہیں اور ہر نوع کا تغیر احکام میں کس طرح کا تغیر چاہتا ہے۔

مثال کے طور پر اُسی مسئلہ کو لیجئے جو اس وقت زیر بحث ہے۔ معاشی قوانین کی تدوین جدید کے لیے ہم کو سب سے پہلے زمانہ حال کی معاشی دنیا کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم گہری نظر سے معاشیات، مالیات اور لین دین کے جدید طریقوں کا مطالعہ کریں گے، معاشی زندگی کے باطن میں جو قوتیں کام کر رہی ہیں ان کو سمجھیں گے۔ ان کے نظریات اور اصول سے واقفیت حاصل کریں گے۔ اور ان اصول و نظریات کا ظہور جن عملی صورتوں میں ہو رہا ہے ان پر اطلاع حاصل کریں گے۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ زمانۂ سابق کی بہ نسبت ان معاملات میں جو تغیرات ہوئے ہیں ان کو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے کن اقسام منقسم کیا جا سکتا ہے، اور ہر قسم پر شریعت کے مزاج اور اس کے مقاصد اور اصول تشریع کی مناسبت سے کس طرح کے احکام جاری ہونے چاہئیں جزئیات سے قطع نظر کر کے، اصولاً ان تغیرات کو ہم دو قسموں پر منقسم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ تغیرات جو درحقیقت تمدنی احوال کے بدل جانے سے رونما ہوئے ہیں اور جو دراصل انسان کے علمی و عقلی نشو و ارتقا اور خزائن الٰہی کے مزید اکتشافات اور مادی اسباب و وسائل کی ترقی اور حمل و نقل اور مخابرات کی سہولتوں، اور بین الاقوامی تعلقات کی وسعتوں کے طبعی نتائج ہیں ایسے تغیرات اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طبعی اور حقیقی تغیرات ہیں جن کو نہ تو مٹایا جا سکتا ہے اور نہ مٹا

مطلوب ہے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے اثر سے معاشی احوال اور مالی معاملات اور تجارتی
لین دین کی جو نئی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں، ان کے لیے اصول شریعت کے تحت نئے احکام وضع
کیے جائیں تاکہ ان بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اپنے عمل کو ٹھیک ٹھیک اسلامی طرز پر ڈھال سکیں۔

۲۔ وہ تغیرات جو دراصل تمدنی ترقی کے نتائج نہیں ہیں، بلکہ دنیا کے معاشی نظام اور
مالی معاملات پر سرمایہ داری کے حاوی ہو جانے کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں۔ وہی سرمایہ دارانہ ذہنیت
جو عہد جاہلیت میں پائی جاتی تھی، اور جس کو اسلام نے صدیوں تک مغلوب کر رکھا تھا، اب دوبارہ
معاشی دنیا پر غالب آ گئی ہے، اور تمدن کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے کام لے کر اس نے
اپنے انہی پرانے نظریات کو نت نئی صورتوں سے معاشی زندگی کے مختلف معاملات میں پھیلا دیا
ہے۔ سرمایہ داری کے اس غلبہ سے جو تغیرات واقع ہوئے ہیں وہ اسلامی قانون کی نگاہ میں حقیقی اور
طبعی تغیرات نہیں ہیں، بلکہ جعلی تغیرات ہیں جنہیں قوت سے مٹایا جا سکتا ہے، اور جن کا مٹا دیا جانا
نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ مسلمان کا اصلی فرض یہ ہے کہ اپنی پوری قوت
ان کے مٹانے میں صرف کر دے اور معاشی نظام کو اسلامی اصول پر ڈھالنے کی کوشش کرے۔
سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرنے کا فرض کمیونسٹ سے بڑھ کر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔ کمیونسٹ
کے سامنے محض روٹی کا سوال ہے، اور مسلمان کے سامنے دین و اخلاق کا سوال۔ کمیونسٹ محض چند طبقات
(Proletariates) کی خاطر جنگ کرنا چاہتا ہے اور مسلمان تمام نوع بشری کے حقیقی
فائدے کے لیے جنگ کرتا ہے جس میں خود سرمایہ دار بھی شامل ہیں۔ کمیونسٹ کی جنگ خود غرضی پر مبنی ہے
اور مسلمان کی جنگ للّٰہیت پر۔ لہٰذا مسلمان تو سرمایہ داری نظام سے کبھی مصالحت کر ہی نہیں سکتا۔
اگر وہ مسلم ہے اور اسلام کا پابند ہے تو اس کے خدا کی طرف سے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس ظالمانہ
نظام کو مٹانے کی کوشش کرے، اور اس جنگ میں جو ممکن نقصان اس کو پہنچ سکتا ہو اسے مردانہ وار

برداشت کرے۔ معاشی زندگی کے اس شعبہ میں اسلام جو قانون بھی بنائے گا اس کی غرض یہ ہرگز نہ ہوگی کہ مسلمانوں کے لیے سرمایہ داری نظام میں ضم ہونے اور اس کے اداسات میں حصہ لینے اور اس کی کامیابی کے اسباب فراہم کرنے میں سہولتیں پیدا کی جائیں، بلکہ اس کی واحد غرض یہ ہوگی کہ مسلمانوں کو اس گندگی سے محفوظ رکھا جائے اور تمام ان دروازوں کو بند کیا جائے جو مسلمان کو سرمایہ داری کی طرف لے جاتے ہیں۔

تخفیفات کے عام اصول اس موقع پر یہ کہا جائیگا کہ جب مفاسد زیادہ پھیل گئے ہوں، اور اسلام کے مخالف کوئی نظام مسلمانوں پر غالب آگیا ہو، اور مسلمانوں کے لیے مغلوبیت کی وجہ سے مشکلات پیش آ رہی ہوں تو اسلام میں ایسے حالات کے لیے رخصتوں اور سہولتوں کی بھی کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔ یہ قول ایک حد تک بجا ہے۔ بلاشبہ اسلامی قانون کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات اور المشقۃ تجلب التیسیر۔ چنانچہ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں متعدد مواقع پر شریعت کے اس قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲: ۶۲)	اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں ڈالتا
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (۲: ۲۲)۔	اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی نہیں کرنا چاہتا۔
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۲۲	اس نے تم پر دین میں کوئی سختی نہیں کی ہے۔
وفی الحدیث: احب الدین الی اللہ تعالیٰ الحنفیۃ السمحۃ	اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین وہ ہے جو سیدھا سادا اور نرم ہو۔
ولا ضرر ولا ضرار فی الاسلام	اسلام میں ضرر اور ضرار نہیں ہے۔

پس یہ قاعدہ اسلام میں مسلم ہے کہ جہاں مشقت اور ضرر ہو وہاں احکام میں نرمی کردی

جائے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر خیالی اور وہمی ضرورت پر تکالیف شرعیہ اور حدود الہیہ کو بالائے طاق رکھدیا جائے۔ اس کے لیے بھی چند اصول اور ضوابط ہیں جو شریعت کی تخفیفات پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں:۔

اولاً یہ دیکھنا چاہیے کہ مشقت کس درجہ کی ہے۔ مطلقاً ہر مشقت پر تو تکلیف شرعی رفع نہیں کی جاسکتی، ورنہ سرے سے کوئی قانون ہی باقی نہ رہے گا۔ جاڑے میں وضو کی تکلیف، گرمی میں روزے کی تکلیف، سفر حج اور جہاد کی تکالیف یقیناً مشقت کی تعریف میں آتی ہیں، مگر یہ ایسی مشقتیں نہیں ہیں جن کی وجہ سے تکلیفات ہی کو سرے سے ساقط کر دیا جائے۔ تخفیف یا اسقاط کے لیے مشقت ایسی ہونی چاہیے جو موجب ضرر ہو، مثلاً سفر کی مشکلات، مرض کی حالت، کسی ظالم کا جبر و اکراہ، تنگ دستی، کوئی غیر معمولی مصیبت، فتنۂ عام، یا کوئی جسمانی نقص۔ ایسے مخصوص حالات میں شریعت نے بہت سے احکام میں تخفیفات کی ہیں اور ان پر دوسری تخفیفات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ثانیاً تخفیف اسی درجہ کی ہونی چاہیے جس درجہ کی مشقت اور مجبوری ہے۔ مثلاً جو شخص بیماری میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے اس کے لیے لیٹ کر پڑھنا جائز نہیں۔ جس بیماری کے لیے رمضان میں دس روزوں کا قضا کرنا کافی ہے اس کے لیے پورے رمضان کا افطار ناجائز ہے۔ جس شخص کی جان شراب کا ایک چلو پی کر یا حرام چیز کے ایک دو لقمے کھا کر بچ سکتی ہے، وہ اس حقیقی ضرورت سے بڑھ کر پینے یا کھانے کا مجاز نہیں ہے۔ اسی طرح طبیب کے لیے جسم کے پوشیدہ حصوں میں سے جتنا دیکھنے کی واقعی ضرورت ہے اس سے زیادہ دیکھنے کا اس کو حق نہیں۔ اس قاعدہ کے لحاظ سے تمام تخفیفات کی مقدار، مشقت اور ضرورت کی مقدار پر مقرر کی جائے گی۔

ثالثاً کسی ضرر کو دفع کرنے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار نہیں کی جاسکتی جس میں اتنا ہی یا اس سے زیادہ ضرر ہو۔ بلکہ صرف ایسی تدبیر کی اجازت دی جاسکتی ہے جس کا ضرر نسبتہً خفیف ہو۔

اسی کے قریب قریب قاعدہ یہ بھی ہے کہ کسی مفسدہ سے بچنے کے لیے اس سے بڑے یا اس کے برابر کے مفسدہ میں مبتلا ہو جانا جائز نہیں ہے۔ البتہ یہ جائز ہے کہ جب انسان دو مفسدوں میں گھر جائے تو بڑے مفسدہ کو دفع کرنے کے لیے چھوٹے مفسدہ کو اختیار کر لے۔

پانچواں قاعدہ: طلب مصالح پر دفع مفاسد مقدم ہے۔ شریعت کی نگاہ میں بھلائیوں کے حصول اور ماموراتِ و واجبات کے ادا کرنے کی بہ نسبت برائیوں کو دور کرنا، اور حرام سے بچنا، اور مفاسد کو دفع کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے اسی لیے وہ مشقت کے مواقع پر مامورات میں جس فیاضی کے ساتھ تخفیف کرتی ہے، اتنی فیاضی منہیات اور محرمات کی اجازت دینے میں نہیں برتتی۔ سفر اور مرض کی حالتوں میں، نماز روزے اور دوسرے واجبات کے معاملہ میں جتنی تخفیفیں کی گئی ہیں اتنی تخفیفیں نجاستوں اور حرام چیزوں کے استعمال میں نہیں کی گئیں۔

چھٹا قاعدہ: مشقت یا ضرر کے زائل ہوتے ہی تخفیف بھی ساقط ہو جاتی ہے، مثلاً بیماری رفع ہو جانے کے بعد تیمم کی اجازت باقی نہیں رہتی۔

مسئلہ سود میں شریعت کی تخفیفات: مذکورۂ بالا قواعد کو ذہن نشین کر لینے کے بعد غور کیجیے کہ سود کے مسئلہ میں احکام شریعت کے اندر کس حد تک تخفیف کی جا سکتی ہے۔

(۱) سود لینے اور سود دینے کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔ سود پر قرض لینے کے لیے تو انسان بعض حالات میں مجبور ہو سکتا ہے لیکن سود کھانے کے لیے درحقیقت کوئی مجبوری پیش نہیں آ سکتی۔ سود تو وہی لے گا جو مالدار ہو، اور مالدار کو ایسی کیا مجبوری پیش آ سکتی ہے جس میں اس کے لیے حرام حلال ہو جائے؟

(۲) سودی قرض لینے کے لیے بھی ہر ضرورت، مجبوری کی تعریف میں نہیں آتی۔ شادی بیاہ اور خوشی و غمی کی رسموں میں فضول خرچی کرنا کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔ موٹر خریدنا یا مکان

بنانا کوئی واقعی مجبوری نہیں ہے عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنا یا کار و بار کو ترقی دینے کے لیے روپیہ فراہم کرنا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے امور جن کو ضرورت اور مجبوری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جن کے لیے مہاجنوں سے ہزاروں روپے قرض لیے جاتے ہیں، شریعت کی نگاہ میں ان کی قطعاً کوئی وقعت نہیں اور ان اغراض کیلئے جو لوگ سود دیتے ہیں وہ سخت گناہ گار ہیں۔ شریعت اگر کسی مجبوری پر سودی قرض لینے کی اجازت دے سکتی ہے تو وہ اس قسم کی مجبوری ہے، جس میں حرام حلال ہو سکتا ہو۔ یعنی کوئی سخت مصیبت جس میں سودی قرض کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، جان یا عزت پر آفت آگئی ہو یا کسی ناقابل برداشت مشقت یا ضرر کا حقیقی اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں ایک مجبور مسلمان کے لیے سودی قرض لینا جائز ہوگا۔ مگر وہ تمام ذی استطاعت مسلمان گنہگار رہیں گے جنہوں نے اس مصیبت میں اپنے اس بھائی کی مدد نہ کی اور اس کو فعل حرام کے ارتکاب پر مجبور کر دیا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس گناہ کا وبال پوری قوم پر ہوگا، کیونکہ اس نے زکوٰۃ و خیرات اور اوقاف کی تنظیم سے غفلت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے افراد بے سہارا ہو گئے اور ان کے لیے اپنی ضرورتوں کے وقت ساہوکاروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کے سوا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔

(۳) شدید مجبوری کی حالت میں بھی صرف بقدر ضرورت قرض لیا جا سکتا ہے اور لازم ہے کہ استطاعت بہم پہنچتے ہی سب سے پہلے اس سے سبکدوشی حاصل کی جائے کیونکہ ضرورت رفع ہو جانے کے بعد سود کا ایک پیسہ دینا بھی حرام مطلق ہے۔ یہ سوال کہ آیا ضرورت شدید ہے کہ نہیں، اور اگر شدید ہے تو کس قدر ہے، اور کس وقت وہ رفع ہو گئی، اس کا تعلق اس شخص کی عقل اور احساس دینداری سے ہے جو اس حالت میں مبتلا ہو۔ وہ جتنا زیادہ دیندار اور خدا ترس ہوگا، اور اس کا ایمان جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اس باب میں محتاط ہوگا۔

(۴) جو لوگ اپنے مال کی حفاظت یا موجودہ انتشار قومی کی وجہ سے اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے بنکوں میں روپیہ جمع کرائیں، یا انشورنس کمپنی میں بیمہ کرائیں، یا جن کو کسی قاعدہ کے تحت پراویڈنٹ فنڈ میں حصہ لینا پڑے ان کے لیے لازم ہے کہ انقضائے مدت کے بعد صرف اپنا راس المال واپس لیں۔ اور اس راس المال میں سے بھی ڈھائی فیصدی سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ ادا کریں، کیونکہ اس کے بغیر وہ جمع شدہ رقم ان کے لیے ایک نجاست ہوگی، بشرطیکہ وہ خدا پرست ہوں زر پرست نہ ہوں۔

(۵) بنک یا انشورنس کمپنی یا پراویڈنٹ فنڈ سے سود کی جو رقم ان کے حساب میں نکلتی ہو اس کو سرمایہ داروں کے پاس چھوڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ان مفسدوں کے لیے مزید تقویت کا موجب ہوگا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس رقم کو ان سے لے کر ان مفلس مسلمانوں پر خرچ کر دیا جائے جن کی حالت قریب قریب وہی ہے جس میں حرام کھانا انسان کے لیے جائز ہو جاتا ہے۔

(۶) مالی لین دین اور تجارتی کاروبار میں جتنے منافع، سود کی تعریف میں آتے ہوں، یا جن میں سود کا اشتباہ ہو، ان سب سے حتی الامکان احتراز کرنا چاہیے اور احتراز ممکن نہ ہو تو وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو نمبرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں ایک ایماندار مسلمان کی نظر طلب منفعت پر نہیں بلکہ دفع مفاسد پر ہونی چاہیے۔ اگر وہ خدا سے ڈرتا ہے اور یوم آخر پر اعتقاد رکھتا ہے تو حرام سے بچنا اور خدا کی پکڑ سے محفوظ رہنا اس کے لیے کاروبار کی ترقی اور مالی فوائد کے حصول سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے۔

اب اس سلسلہ مضمون میں سود کی بحث کو ختم کیا جاتا ہے کیونکہ آئندہ اشاعت میں اسی سلسلہ کے دوسرے مسئلہ یعنی مسئلہ حجاب پر کلام کرنا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سود کے مسئلہ پر مباحثہ کا دروازہ بند کیا جا رہا ہے گذشتہ پچاس سال سے اس باب میں اس کثرت کے ساتھ غلط خیالات کی اشاعت ہو رہی ہے کہ کسی ایک مضمون سے ان سب کی اصلاح نہیں ہو سکتی جن حضرات کی اس مضمون سے تشفی نہ ہوئی ہو، وہ اپنے شبہات و اعتراضات پیش کر سکتے ہیں ان شاء اللہ ان کی تفہیم کے لیے پوری کوشش کی جائے گی اور لا توفیقی الا باللہ۔

مطبوعات

الاصلاح ماہوار رسالہ زیر ادارت مولنا امین احسن صاحب اصلاحی۔ دائرۂ حمیدیہ۔ سرائے میر (ضلع اعظم گڈھ) ضخامت ۴۹ صفحات قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ۔

علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ نے دائرہ حمیدیہ کے نام سے ایک علمی حلقہ قائم کیا ہے جس کا مقصد اول علامۂ مرحوم کی عربی تصنیفات اور ان کے اردو ترجموں کی اشاعت ہے۔ مقصد دوم یہ ہے کہ مرحوم کے طریق پر قرآن مجید میں تدبر کیا جائے اور تحقیق کے نتائج کو مستقل تصنیفات یا مضامین کی صورت میں شائع کیا جائے۔ زیر نظر رسالہ اسی دائرہ کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔ علامۂ مرحوم کی تفسیر سورۂ فیل کا اردو ترجمہ اس میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب و نظم قرآن، ترجمۂ قرآن کے اصول، اور دوسرے مسائل پر ان کے خیالات جو ابتک صرف مسودوں کی صورت میں تھے، اس رسالہ کے ذریعہ سے پہلی مرتبہ برسر عام آئے ہیں۔ مرحوم کے فاضل تلامذہ میں سے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور مولوی ابواللیث نذیر محمد صاحب ندوی اور بعض دوسرے اہل قلم حضرات کے مفید مضامین بھی مطالعہ کے قابل ہیں۔

قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے معانی کی تحقیق ایک نہایت وسیع مضمون ہے جس کے بے شمار گوشے اور بہت سے مختلف پہلو ہیں۔ کوئی شخص نہ سب کا احاطہ نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ایسی تفسیر کر سکتا ہے جس پر من کل الوجوہ تمام اہل نظر کو اتفاق ہو۔ مفسرین کی آرا، اور ان کے طرز تفسیر و تحقیق میں اختلاف ہمیشہ پایا گیا ہے اور پایا جائیگا۔ مگر جو لوگ قرآن کے معانی میں بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو اختلافات سے تنگ دل نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہر محقق کی تحقیق سے استفادہ کی کوشش کرنی چاہیے

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت فی پرچہ (۸)

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت | اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے
نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ | وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ | اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب
جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار | دعوت اور تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس
اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ | اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلا[illegible]

جنگ دوسرے مذاہب میں | جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت اور یہودیت کی
تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

جنگ اور تہذیب جدید | بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ

ضخامت (۵۰۰) صفحے قیمت مجلد (۳) انگریزی (۳) سکہ عثمانیہ۔ غیر مجلد (۲) انگریزی (۲) سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن۔ [illegible]

فہرست مضامین

ماہ صفر ۵۵ھ جلد ۸ عدد ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

مسئلہ سود پر ہمارے مضامین کو دیکھ کر ایک خیال کا بار بار اظہار کیا گیا ہے۔ وہ خیال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں سرمایہ داری نظام سیاسی طاقت کے ساتھ ہمارے گرد وپیش کی پوری معاشی دنیا پر مسلط ہو چکا ہے، معیشت کی گاڑی اصول سرمایہ داری کے پہیوں پر چل رہی ہے، سرمایہ دار ہی اس کو چلا رہے ہیں اور وہی قومیں اس کے ذریعہ سے منزل ترقی کی طرف بڑھ رہی ہیں جن کے لئے پیدائش دولت اور صرف دولت کے باب میں کوئی مذہبی یا اخلاقی قید نہیں ہے۔ دوسری طرف ہماری اجتماعی قوت منتشر ہے۔ دنیا کے نظم معیشت کو بدلنا تو درکنار ہم خود اپنی قوم میں بھی اسلامی نظم معیشت کو از سرنو قائم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اب اگر ہماری مذہبی قیود ہم کو زمانے کے چلتے ہوئے نظام معاشی میں پورا پورا حصہ لینے سے روک دیں تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہماری قوم معاشی ترقی وخوشحالی کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائیگی، ہم مفلس ہوتے جائیں گے اور ہمسایہ قومیں دولت مند ہوتی چلی جائیں گی، اور ہماری یہ معاشی کمزوری ہم کو سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بھی ذلیل اور پست کر دیگی۔ یہ محض وہم اور اندیشہ نہیں ہے بلکہ واقعات کی دنیا میں یہی نتیجہ ہم کو نظر آ رہا ہے، برسوں سے نظر آ رہا ہے اور مستقبل میں ہمارا جو کچھ انجام ہونے والا ہے اس کے آثار کچھ ایسے دھندلے نہیں ہیں کہ ان کو نہ دیکھا جا سکتا ہو۔ پس ہم کو محض شریعت

کا قانون بتانے سے کیا فائدہ؟ اسلام کے معاشی اصول بیان کرنے سے کیا حاصل؟ ہم کو یہ بتاؤ کہ ان حالات میں اسلامی قانون کی پابندی کے ساتھ ہمارے لئے اپنی معاشی حالت کو سنبھالنے اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اگر نہیں ہے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت یقیناً پیش آئیگی۔ یا تو مسلمان بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ یا پھر وہ بھی دوسری قوموں کی طرح مجبور ہونگے کہ ایسے تمام قوانین کی پابندی سے آزاد ہو جائیں جو زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

یہ سوال صرف مسئلہ سود ہی تک محدود نہیں ہے۔ دراصل اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر زندگی کے تمام شعبوں میں سے محض ایک معیشت ہی کا شعبہ ایسا ہوتا جس پر ایک غیر اسلامی نظام مسلط ہوگیا ہوتا، تو شاید معاملہ نسبتہً بہت ہلکا ہوتا۔ مگر واقعات کی شہادت کچھ اور ہے۔ اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈالیئے۔ خود اپنے حالات کا جائزہ لے کر دیکھیے۔ زندگی کا کونسا شعبہ ایسا پایا جاتا ہے جس پر غیر اسلام کا تسلط نہیں ہے؟ کیا اعتقادات اور افکار و تخیلات پر الحاد و دھریت یا کم از کم شک و ریب کا غلبہ نہیں؟ کیا تعلیم پر ناخدا شناسی کی حکومت نہیں؟ کیا تمدن و تہذیب پر فرنگیت کا استیلا نہیں؟ کیا معاشرت کی جڑوں تک میں مغربیت اتر نہیں گئی ہے؟ کیا اخلاق اس کے غلبہ سے محفوظ ہیں؟ کیا معاملات اس کے تسلط سے آزاد ہیں؟ کیا قانون اور سیاست اور حکومت کے اصول و فروع۔ نظریات اور عملیات میں سے کوئی چیز بھی اس کے اثر سے پاک ہے۔؟

جب حال یہ ہے تو آپ اپنے سوال کو معیشت اور اس کے بھی صرف ایک پہلو تک کیوں محدود رکھتے ہیں؟ اس کو وسیع کیجیے۔ پوری زندگی پر پھیلا دیجیے۔ یوں کہیے کہ زندگی کے دریا نے اپنا رخ بدل دیا ہے۔ پہلے وہ اس راستہ پر بہ رہا تھا جو اسلام کا راستہ تھا۔ اب وہ اس راستہ پر بہ رہا ہے جو غیر اسلام کا راستہ ہے۔ ہم اس کے رخ کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتے۔ ہم میں اتنی قوت

یہی نہیں کہ اس کی رَو کے خلاف تیر سکیں۔ ہم کو تیرنے میں بھی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اب ہمیں کوئی ایسی صورت بتاؤ کہ ہم مسلمان بھی رہیں، اور اس دریا کے بہاؤ پر اپنی کشتی کو بھی چھوڑ دیں۔ ملازم کعبہ بھی رہیں اور اس قافلہ کا ساتھ بھی نہ چھوڑیں جو ترکستان کی طرف جا رہا ہے۔ ہم اپنے خیالات، نظریات، مقاصد، اصول حیات، اور مناہج عمل میں نامسلمان بھی ہوں اور پھر مسلمان بھی ہوں۔ اگر ان اضداد کو جمع کرنے کی کوئی صورت تم نے نہ نکالی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ہم اسی دریا کے ساحل پر کہیں مر رہیں گے، یا پھر یہ اسلام کا لیبل جو ہماری کشتی پر لگا ہوا ہے ایک دن کھرچ ڈالا جائیگا اور یہ کشتی بھی دوسری کشتیوں کے ساتھ دریا کے دھارے پر بہتی نظر آئیگی۔

ہمارے "روشن خیال" اور "تجدد پسند" حضرات جب کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کی آخری حجت، جو ان کے نزدیک سب سے قوی حجت ہے، یہ ہوتی ہے کہ زمانے کا رنگ یہی ہے۔ ہوا کا رخ اسی طرف ہے۔ دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے، پھر ہم اس کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں، اور مخالف ہو کے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں؟ اخلاق کا سوال ہو۔ وہ کہیں گے کہ دنیا کا معیار اخلاق بدل چکا ہے۔ مطلب یہ کہ مسلمان اس پرانے معیار اخلاق پر کیسے قائم رہیں؟ پردے پر بحث ہو۔ ارشاد ہوگا کہ دنیا سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ جو چیز دنیا سے اٹھ چکی ہے اس کو مسلمان کیسے نہ اٹھائیں؟ تعلیم پر گفتگو ہو۔ ان کی آخری دلیل یہ ہوگی کہ دنیا میں اسلامی تعلیم کی مانگ ہی نہیں۔ مدعا یہ کہ مسلمان بچے وہ جنس بن کر کیسے نکلیں جس کی مانگ نہیں ہے، اور وہ مال کیوں نہ بنیں جس کی مانگ ہے؟ سود پر تقریر ہو۔ ٹیپ کا بند یہ ہوگا کہ اب دنیا کا کام اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ گویا مسلمان کسی ایسی چیز سے احتراز کیسے کر سکتے ہیں جو اب دنیا کا کام چلانے کے لئے ضروری ہوگئی ہے؟۔

غرض یہ کہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، معیشت، قانون، سیاست اور زندگی کے دوسرے

شعبوں میں سے جس شعبے میں وہ اصول اسلام سے ہٹ کر فرنگیت کا اتباع کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے زمانے کا رنگ اور ہوا کا رُخ اور دنیا کی رفتار وہ آخری حجت ہوتی ہے جو اس تقلید مغربی یا درحقیقت اس جزوی ارتداد کے جواز پر برہان قاطع سمجھ کر پیش کی جاتی ہے، اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عمارتِ اسلامی کے اجزا میں سے اُس جزو کو ساقط کر دینا فرض ہے جس پر اس دلیل سے حملہ کیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ شکست و ریخت کی یہ تجویزیں جن کو تم متفرق طور پر پیش کرتے ہو ان سب کو ملا کر ایک جامع تجویز کیوں نہیں بنا لیتے؟ ۔ مکان کی ایک ایک دیوار، ایک ایک کمرے اور ایک ایک دالان کو گرانے کی علٰحدہ علٰحدہ تجویزیں پیش کرنے، اور ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کرنے میں فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ کیوں نہیں کہتے کہ یہ پورا مکان گرا دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا رنگ زمانے کے رنگ سے مختلف ہے۔ اس کا رخ ہوا کے رخ سے پھرا ہوا ہے اور اس کی وضع ان مکانوں سے کسی طرح نہیں ملتی جو اب دنیا میں بن رہے ہیں۔

جن لوگوں کے حقیقی خیالات یہی ہیں ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان کے لیے تو صاف اور سیدھا جواب یہی ہے کہ اس مکان کو گرانے اور اس کی جگہ دوسرا مکان بنانے کی زحمت آپ کیوں اٹھاتے ہیں، جو دوسرا خوش وضع، خوشنما، خوش رنگ مکان آپ کو پسند آئے اس میں تشریف لے جائیے۔ اگر دریا کے دھارے پر بہنے کا شوق ہے تو اس کشتی کا بیل کھینچنے کی تکلیف بھی کیوں اٹھائیے۔ جو کشتیاں پہلے ہی سے بہ رہی ہیں ان میں سے کسی میں نقل مقام فرما لیجیے۔ جو لوگ اپنے خیالات، اپنے اخلاق، اپنی معاشرت، اپنی معیشت، اپنی تعلیم، غرض اپنی کسی چیز میں بھی مسلمان نہیں ہیں اور مسلمان نہیں رہنا چاہتے ہیں، ان کے برائے نام مسلمان بنے رہنے سے اسلام کا قطعاً

کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔ وہ خدا پرست نہیں ہوا پرست ہیں۔ اگر دنیا میں بت پرستی کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ بتوں کو پوجیں گے۔ اگر دنیا میں برہنگی کا رواج عام ہو جائے تو یقیناً وہ اپنے کپڑے اتار پھینکیں گے۔ اگر دنیا نجاستیں کھانے لگے تو یقیناً وہ کہیں گے کہ نجاست ہی پاکیزگی ہے، اور پاکیزگی تو سراسر نجاست ہے۔ ان کے دل اور دماغ غلام ہیں اور غلامی ہی کے لئے گھڑے گئے ہیں آج فرنگیت کا غلبہ ہے اس لیے اپنے باطن سے لیکر ظاہر کے ایک ایک گوشے تک وہ فرنگی بننا چاہتے ہیں کل اگر زنگیت غالب ہو جائے تو یقیناً وہ زنگی بنیں گے اپنے چہروں پر سیاہیاں پھیرینگے اپنے ہونٹ موٹے کرینگے اپنے بالوں میں حبشیت پیدا کریں گے اور ہر شئے کی پوجا کرنے لگیں گے جو حبشیوں سے ان کو پہنچے گی۔ ایسے غلاموں کی اسلام کو قطعی ضرورت نہیں ہے خدا اگر کروڑوں کی مردم شماری میں سے اِن سب منافقوں اور غلام فطرت لوگوں کے نام کٹ جائیں اور دنیا میں صرف چند ہزار وہ مسلمان رہ جائیں جنکی تعریف یہ ہو کہ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ "اللہ کو چاہنے والے اور اللہ کے محبوب مسلمانوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہوں، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف ان کے دل میں نہ ہو، تو اسلام اب سے بدرجہا زیادہ طاقت ور ہوگا اور اُن کروڑوں کا نکل جانا اس کے حق میں ایسا ہوگا جیسے کسی مریض کے جسم سے تمام مواد فاسد نکل جائے۔

نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَائِرَةٌ۔ "ہم کو خوف ہے کہ ہم پر مصیبت آجائیگی" یہ آج کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ بہت پرانی آواز ہے جو ہمیشہ منافقوں کی زبان سے بلند ہوتی رہی ہے۔ یہی آواز نفاق کی اُس بیماری کا پتہ دیتی ہے جو دلوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اسی آواز کو بلند کرنے والے ہمیشہ مخالفین اسلام کے کیمپ کی طرف لپکتے رہے ہیں ہمیشہ سے انہوں نے اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کو پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق ہی سمجھا ہے۔ ہمیشہ سے ان کو احکام خدا اور رسول کا اتباع گراں ہی گزرتا رہا

اطاعت میں جان و مال کا زیاں، اور نافرمانی میں حیات دنیا کی ساری کامرانیاں ہمیشہ سے اُن کو نظر آتی رہی ہیں پس ان کی خاطر خدا کی شریعت کو نہ ابتدا میں بدلا گیا ہے، نہ اب بدلا جا سکتا ہے اور نہ کبھی بدلا جائے گا۔ یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لئے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لئے نہیں اتری ہے۔ ہوا کے رخ پر اڑنے والے خس و خاشاک، پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض، اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لئے نہیں اتری ہے یہ ان بہادروں اور شیروں کے لئے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہیں جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں، اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ مسلمان جس کا نام ہے۔ وہ تو دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اُس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راست ہے، صراط مستقیم ہے۔ اگر دریا نے اپنا رخ اُس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رخ پر بہنے کے لئے راضی ہو۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑیگا، اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا، کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پروا نہ ہوگی، وہ ہر اس نقصان کو گوارا کر لے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو، حتی کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں، اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں، اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کر کے کسی کنارے پھینک دیں تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائیگی، ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی رَو پر بہنے والے کافروں اور منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائیگا۔

قرآن تمہارے سامنے ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں تمہارے سامنے ہیں۔ ابتداء سے لیکر آج تک کے علمبرداران اسلام کی زندگیاں تمہارے سامنے ہیں۔ کیا ان سب سے تم کو یہی تعلیم ملتی ہے کہ ہوا جدھر کا رُخ کرے ادھر اڑ جاؤ؟ پانی جدھر بہائے ادھر بہ جاؤ، اور زمانہ جو رنگ اختیار کرے اس میں رنگ جاؤ؟ اگر مدعا یہی ہوتا تو کسی کتاب کے نزول اور کسی نبی کی بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہوا کی موجیں تمہاری ہدایت کے لئے اور حیات دنیا کا بہاؤ تمہاری رہنمائی کے لئے اور زمانے کی نیرنگیاں تمہیں گرگٹ کی روش سکھانے کے لئے کافی تھیں۔ ایسی ناپاک تعلیم کے لیے خدا نے کوئی کتاب نہیں بھیجی اور نہ کوئی نبی مبعوث کیا۔ اس ذات حق کی طرف سے جو پیغام اور جو پیغام بھی آیا ہے اسی لئے آیا ہے کہ دنیا جن راستوں پر چل رہی ہے اُن سب کو چھوڑ کر ایک راستہ مقرر کرے، اور اس کے خلاف جتنے راستے ہوں ان کو مٹانے اور دنیا کو ان سے ہٹانے کی کوشش کرے، اور ایمان داروں کی ایک ایسی جماعت بنائے جو نہ صرف خود اس سیدھے راستہ پر چلیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف کھینچ لانے کی کوشش جاری رکھیں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین نے ہمیشہ اسی غرض کے لئے جہاد کیا ہے۔ اس جہاد میں اذیتیں اٹھائی ہیں، نقصان برداشت کئے ہیں، جانیں دی ہیں اور کبھی ان میں سے کسی نے مصائب کے خوف یا منافع کے لالچ سے رفتار زمانہ کو اپنا مقتدا نہیں بنایا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ ہدایت آسمانی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے میں نقصان اور مشکلات اور خطرات دیکھتا ہے اور ان سے خوف زدہ ہو کر کسی ایسے راستہ پر جانا چاہتا ہے جس پر چلنے والے اس کو خوشحال، کامیاب اور سربلند نظر آتے ہیں، تو وہ شوق سے اپنے پسندیدہ راستہ پر جائے، مگر وہ بزدل اور حریص اپنے نفس کو اور دنیا کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرے کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے نبی کے بتائے ہوئے طریقہ کو چھوڑ کر بھی اس کا پیرو ہے۔ نافرمانی خود ایک بڑا جرم ہے۔ اس پر جھوٹ اور فریب اور منافقت کا اضافہ کر کے آخر کیا فائدہ اٹھانا مقصود ہے؟

یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رخ پر بہ گیا ہے۔ اس سے وہ پھیرا نہیں جا سکتا، عقلاً بھی غلط ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں انقلاب ہوئے ہیں، اور ہر انقلاب نے اس دریا کے رخ کو بدلا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال خود اسلام ہی میں موجود ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو زندگی کا یہ دریا کس رخ پر بہ رہا تھا؟ کیا تمام دنیا پر کفر و شرک کا غلبہ نہ تھا؟ کیا استبداد اور ظلم کی حکومت نہ تھی؟ کیا انسانیت کو طبقات کی ظالمانہ تقسیم نے داغدار نہ بنا رکھا تھا؟ کیا اخلاق پر فواحش، معاشرت پر نفس پرستی، معیشت پر سرمایہ داری، اور قانون پر بے اعتدالی کا تسلط نہ تھا؟ مگر ایک تن واحد نے اٹھ کر تمام دنیا کو چیلنج دے دیا۔ تمام اُن غلط خیالات اور غلط طریقوں کو رد کر دیا جو اس وقت دنیا میں رائج تھے ان سب کے مقابلہ میں اپنا ایک عقیدہ اور اپنا ایک طریقہ پیش کیا۔ چند سال کی مختصر مدت میں اپنی تبلیغ اور جہاد سے دریا کے رخ کو پھیر کر اور زمانہ کے رنگ کو بدل کر چھوڑا۔

تازہ ترین مثال اشتراکی تحریک کی ہے۔ انیسویں صدی میں سرمایہ داری کا تسلط اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کوئی بزدل مرغ باد نما یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جو نظام ایسی ہولناک سیاسی اور جنگی قوت کے ساتھ دنیا پر مسلط ہے اس کو الٹ دینا بھی ممکن ہے۔ مگر انہی حالات میں ایک شخص کارل مارکس اٹھا اور اس نے اشتراکیت کی تبلیغ شروع کی۔ حکومتوں نے اس کی مخالفت کی، وطن سے نکالا گیا۔ ملک ملک کی خاک چھانتا پھرا۔ تنگ دستی اور مصائب سے دوچار ہوا، مگر مرنے سے پہلے اشتراکیوں کی ایک طاقتور جماعت پیدا کر گیا، جس نے چالیس سال کے اندر نہ صرف روس کی سب سے زیادہ خوفناک طاقت کو الٹ کر رکھ دیا، بلکہ تمام دنیا میں سرمایہ داری کی جڑیں ہلا دیں اور اپنا ایک معاشی و تمدنی نظریہ اس قوت کے ساتھ پیش کیا کہ آج دنیا میں اس کے متبعین کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور ان ممالک کے قوانین بھی اس سے

متاثر ہو رہے ہیں جن پر سرمایہ داری کی حکومت گہری جڑوں کے ساتھ جمی ہوئی ہے۔

مگر انقلاب یا ارتقا ہمیشہ قوت ہی کے اثر سے رونما ہوا ہے، اور قوت ڈھل جانے کا نام نہیں، ڈھال دینے کا نام ہے۔ مڑ جانے کو قوت نہیں کہتے، موڑ دینے کو کہتے ہیں۔ دنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جو لوگ اپنا کوئی اصول، کوئی مقصدِ حیات، کوئی نصب العین نہ رکھتے ہوں، جو کسی بلند مقصد کے لئے قربانی دینے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، جو خطرات اور مشکلات کے مقابلے کی ہمت نہ رکھتے ہوں، جن کو دنیا میں محض آسایش اور سہولت ہی مطلوب ہو، جو ہر سانچے میں ڈھل جانے اور ہر دباؤ سے دب جانے والے ہوں، ایسے لوگوں کا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ بنانا صرف بہادر مردوں کا کام ہے۔ انہی نے اپنے جہاد اور اپنی قربانیوں سے زندگی کے دریا کا رخ پھیرا ہے، دنیا کے خیالات بدلے ہیں، مناہجِ عمل میں انقلاب برپا کیا ہے، اور زمانے کے رنگ میں رنگ جانے کے بجائے زمانے کو خود اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

پس یہ نہ کہو کہ دنیا جس راستہ پر جا رہی ہے اس سے وہ پھیری ہی نہیں جا سکتی، اور زمانے کی جو روش ہے اس کا اتباع کیے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ مجبوری کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے بجائے تم کو خود اپنی کمزوری کا سچا اعتراف کرنا چاہیئے۔ اور جب تم اس کا اعتراف کرلوگے تو تم کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کمزور کے لیے دنیا میں نہ کوئی مذہب دکھتا ہے نہ کوئی اصول اور نہ کوئی ضابطہ۔ اس کو تو ہر زور آور سے دبنا پڑے گا۔ ہر طاقت کے آگے جھکنا پڑیگا۔ ہر قوی اثر سے متاثر ہونا پڑیگا۔ وہ کبھی اپنے کسی اصول اور کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی مذہب اس کے لیے اپنے اصول بدلتا چلا جائے تو وہ سرے سے کوئی مذہب ہی نہ رہے گا۔

عجیب پرلطف استدلال ہے کہ مسلمانوں کی عزت اور قومی طاقت کا مدار دولت مندی پر ہے، اور دولت کا مدار معاشی ترقی و خوشحالی کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے پر ہے، اور ان سب کا مدار سود کے جواز پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ابھی تک یہی خبر نہیں کہ عزت اور طاقت کا مدار دراصل ہے کس چیز پر۔ محض دولت ہرگز وہ چیز نہیں ہے جو کسی قوم کو معزز اور طاقتور بناتی ہو۔ تمہارا ایک ایک شخص اگر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جائے مگر تم میں کیرکٹر کی طاقت نہ ہو تو یقین رکھو کہ دنیا میں تمہاری کوئی عزت نہ ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر تم میں درحقیقت اسلامی سیرت موجود ہو، تم صادق اور امین ہو، لالچ اور خوف سے پاک ہو، اپنے اصول میں سخت اور اپنے معاملات میں کھرے ہو، حق کو حق اور فرض کو فرض سمجھنے والے ہو، حرام وحلال کی تمیز کو ہر حال میں ملحوظ رکھنے والے ہو، اور تم میں اتنی اخلاقی قوت موجود ہو کہ کسی نقصان کا خوف اور کسی فائدے کی طمع تم کو راستی سے نہ ہٹا سکے اور کسی قیمت پر تمہارا ایمان نہ خریدا جا سکے تو دنیا میں تمہاری ساکھ قائم ہو جائیگی۔ دلوں میں تمہاری عزت بیٹھ جائیگی۔ تمہاری بات کا وزن لکھ پتی کی پوری دولت سے زیادہ ہوگا۔ تم جھونپڑیوں میں رہ کر اور پیوند لگے کپڑے پہن کر بھی دولت سراؤں میں رہنے والوں سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھے جاؤ گے اور تمہاری قوم کو ایسی طاقت حاصل ہوگی جس کو کبھی نیچا نہیں دکھایا جا سکتا۔ عہد صحابہ کے مسلمان کس قدر مفلس تھے۔ جھونپڑیوں اور کمبل کے خیموں میں رہنے والے۔ تمدن کی شان و شوکت سے ناآشنا۔ نہ ان کے لباس درست، نہ غذا درست، نہ ہتیار درست، نہ سواریاں شاندار، مگر ان کی جو دھاک اور ساکھ دنیا میں تھی وہ نہ اموی عہد میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی نہ عباسی عہد میں اور نہ بعد کے کسی عہد میں۔ ان کے پاس دولت نہ تھی مگر کیرکٹر کی طاقت تھی جس نے دنیا میں ان کی عزت وعظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ بعد والوں کے پاس دولت آئی، حکومت آئی، تمدن کی

شان و شوکت آئی مگر کوئی چیز بھی کیرکٹر کی کمزوری کا بدل فراہم نہ کر سکی۔

تم نے تاریخ اسلام کا سبق تو فراموش ہی کر دیا ہے۔ مگر دنیا کی جس قوم کی تاریخ چاہو اٹھا کر دیکھ لو۔ تم کو ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ کسی قوم نے محض سہولت پسندی اور آرام طلبی اور منفعت پرستی سے عزت اور طاقت حاصل کی ہو۔ تم کسی ایسی قوم کو معزز اور سربلند نہ پاؤ گے جو کسی اصول اور کسی ڈسپلن کی پابند نہ ہو، کسی بڑے مقصد کے لیے تنگی اور مشقت اور سختی برداشت نہ کرتی ہو، اور اپنے اصول و مقاصد کے لیے نہ صرف اپنے نفس کی خواہشات کو بلکہ خود اپنے نفس کو بھی قربان کر دینے کا جذبہ نہ رکھتی ہو۔ یہ ڈسپلن اور اصول کی پابندی اور بڑے مقاصد کے لیے راحت و آسائش اور منافع کی قربانی کسی نہ کسی رنگ میں تم کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ اسلام میں اس کا رنگ کچھ اور ہے اور دوسری ترقی یافتہ قوموں میں کچھ اور۔ یہاں سے نکل کر تم کسی اور نظام تمدن میں جاؤ گے تو وہاں بھی تم کو اس رنگ میں نہ سہی دوسرے رنگ میں ایک نہ ایک ضابطہ کا پابند ہونا پڑے گا۔ ایک نہ ایک ڈسپلن کی گرفت برداشت کرنی ہی ہوگی۔ چند مخصوص اصولوں کے شکنجے میں بہرحال تم جکڑے جاؤ گے اور تم سے کسی مقصد اور کسی اصول کی خاطر قربانی کا مطالبہ ضرور کیا جائیگا۔ اگر اس کا حوصلہ تم میں نہیں ہے، اگر تم صرف نرمی اور کشادگی اور مٹھاس ہی کے متوالے ہو اور کسی سختی، کسی تنگی اور کسی کڑواہٹ کو گوارا کرنے کی طاقت تم میں نہیں ہے تو اسلام کی قید و بند سے نکل کر جہاں چاہو جا کر دیکھ لو۔ کہیں تم کو عزت کا مقام نہ ملے گا اور کسی جگہ طاقت کا خزانہ تم نہ پا سکو گے۔ قرآن نے اس قاعدۂ کلیہ کو صرف چار لفظوں میں بیان کیا ہے اور وہ چار لفظ ایسے ہیں جن کی صداقت پر پوری تاریخ عالم گواہ ہے۔ ان مع العسر یسرًا۔ یُسر کا دامن ہر حال میں عُسر کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس میں عُسر کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں وہ کبھی یُسر سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

مقالات

مسئلۂ بداء

علم کلام کا ایک تشنۂ تحقیق جزئیہ

(۲)

از جناب مولانا عبداللہ العمادی

(۱)

اسلامی مذاہب کی تاریخ شیخ ابو منصور بغدادی (متوفی ۴۲۹ھ) کی کتاب "الفرق بین الفرق" کی اہمیت وعظمت مجمع علیہ تھی، اصل کتاب تو کب کی نایاب ہو چکی، مگر ۶۴۷ھ میں شیخ عبدالرزاق بن رزق اللہ بن ابی بکر بن خلف نے اس کی تلخیص کی تھی جس کو بیروت کی امریکی یونی ورسٹی کے استاد فن تاریخ فلیپ حتی (د۔ ف) نے کہ نیویارک میں کولمبیا یونی ورسٹی کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں مصر کے مشہور رسالہ "الہلال" کے مطبع سے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا ہے۔ ابتدا میں ایک مقدمہ بھی ہے اور حواشی بھی ثبت کئے ہیں جو زیادہ تر اختلاف نسخ پر مبنی ہیں، اس کتاب میں مختار بن ابی عبید ثقفی کی وحی کا تذکرہ بھی ہے اور اس کے خیال میں جو وحی اُس پر نازل ہوتی تھی اُس کے متعدد نمونے بھی پیش کئے ہیں۔

مختار پر وحی ازلی اس وحی مفروض کی ایک مزعوم آیت ملاحظہ ہو۔

اما ورب السماء لتنزلن نار من السماء	ہوشیار ہو جاؤ، آسمان کے پروردگار کی قسم ہے
فلتحرقن دار اسماء	کہ آسمان سے حقیقت میں ایک آگ نازل ہوگی جو
	اسماء کا گھر جلا ڈالے گی۔

اسماء بن خارجہ کوفہ کا ایک سربرآوردہ رئیس تھا جس سے مختار کچھ مشکوک ہوگیا تھا اس وحی کی خبر جب اس کو ملی تو سمجھ گیا کہ :-

قد اسجع بی ابو اسحاق وانہ سیحرق داری — ابو اسحاق نے میری نسبت سخن سازی کی ہے فی الواقع وہ بہت جلد میرے گھر میں آگ لگا دیگا (ابو اسحاق مختار کی کنیت تھی) یہ کہا اور گھر چھوڑ کے راہ فرار اختیار کی۔

وحی کی تطبیق عمل سے — ثم بعث المختار الی دار اسماء من احرقها باللیل و اظهر من غده ان نارا من السماء نزلت فاحرقتها — مختار نے کسی شخص کو بھیجا جس نے اسی شب اسماء کے گھر میں آگ لگا دی صبح کو خبر ملنے پر مختار نے یہ ظاہر کیا کہ آسمان سے آگ نازل ہوئی تھی جس نے اسماء کا گھر جلا ڈالا[1]

(۱۲)

مختار کی جماعت "کیسانی" مشہور تھی بعد کو اس میں بھی متعدد فرقے ہوگئے با ایں ہمہ دو اصول ان سب میں قدر مشترک ہیں !

امامت — احدهما قولهم بامامة محمد بن الحنفیة و الیه کان یدعو المختار۔ — ایک اصل اصول یہ ہے کہ طریقہ کیسانیہ کے تمام فرقے محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی امامت کے قائل ہیں، مختار بھی انہیں کی امامت کا داعی تھا۔

بداء — والثانی قولهم بجواز البداء علی اللہ[2]۔ — دوسرا مشترک عقیدہ ان سب کا یہ ہے کہ "بداء کے قائل ہیں[2]۔

[1] الفرق بین الفرق ۔ ص ۲۶

[2] " " ۔ ص ۳۵ و ۳۶

پہلے عقیدہ کی ذیل میں جو لطیفہ پیش آیا سُننے کے قابل ہے۔

امام کا عزم | ثم نمی خبر المختار الی محمد بن الحنفیۃ فخاف من جھتہ الفتنۃ فی الدین فاراد قدوم العراق لیصیر الیہ الذین اعتقدوا امامتہ۔

مختار کے واقعات و حالات جب محمدؐ بن حنفیہ رضی اللہ عنہ تک پہونچے تو ڈرے کہ ایسا نہ ہو کہ شخص کی وجہ سے اسلام میں فتنہ برپا ہو اسی خوف سے حضرت نے عراق کا قصد کیا کہ جو لوگ آپکی امامت کے معتقد ہیں وہ آپکے گرد جمع ہو جائیں

مقتدی کی تشویش | وسمع المختار ذلک فخاف من قدومہ العراق ذہاب دولتہ و ریاستہ فقال لجندہ۔

مختار نے یہ خبر سُنی تو خوفزدہ ہو گیا کہ عراق میں حضرت اگر تشریف لائے تو مختار کی حکومت اور سرداری کا خاتمہ ہو جائیگا اس بنا پر اپنے سپاہیوں سے کہا:

قتل امام کا حیلہ | انا علی بیعۃ المہدی و لکن للمہدی علامۃ، وھو ان یضرب بالسیف ضربۃ فان لم یقطع السیف جلدہ فھو المہدی

امام مہدی کی بیعت پر میں قائم ہوں مہدی کی ایک شناخت ہے کہ تلوار سے ایک بھرپور وار اُن پر کیا جائے با ایں ہمہ اگر پوستال تک نہ ہوا تو وہی مہدی ہیں (محمدؓ بن حنفیہ کو مختار کی جماعت امام مہدی کہتی تھی)

فسخ عزم | وانتھی قولہ ھذا الی محمد بن الحنفیۃ فاقام بمکۃ خوفاً من ان یقتلہ المختار بالکوفۃ[1]

محمدؓ بن حنفیہ نے یہ بات سُنی تو مکۂ معظمہ ہی میں ٹھیر گئے آگے نہ بڑھے کہ مبادا کوفہ میں پہونچیں تو مختار اسی بہانے کہیں انکو قتل نہ کرڈالے[1]

—(۱۳)—

ظہور امام کے لیے بے قراری | محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی امامت میں غلو کرنے والے دوسری صنف میں تھی

[1] الفرق بین الفرق۔ ص ۲۳، ۲۵

بہت نمایاں رہ چکے ہیں، سید حمیری اسی طبقہ کے سرخیل تھے جن کا زمانہ حضرت کے ستر برس بعد ہے ان کو یقین تھا کہ حضرت اب بھی زندہ ہیں، شعب رضوی میں جہاں نظر بند تھے وہیں اب بھی فرشتوں کی صحبت میں رہتے ہیں، دیکھنا کس درد سے مخاطب کیا ہے۔

الا حی المقیم بشعب رضوی — واھد لہ بمنزلہ السلاما

(وہ جو کوہ رضوی کی گھاٹی میں مقیم ہیں ان کو سلامتی کی دعا دو اور وہیں ہدیۂ سلام پیش کرو۔)

اضر بمعشر والوک منا — وسموک الخلیفۃ والاماما

(یا حضرت ہم جو آپ کے محب ہیں اور آپ کو خلیفہ و امام مانتے ہیں انہیں آپ کی غیبت نے بڑا نقصان پہنچایا)

وعادوا فیک اھل الارض طرا — مقامک عنھم سبعین عاما

(آپ کے لئے تمام باشندگان روئے زمین سے دشمنی کرلی اپنے ہوا خواہوں سے ستر برس تک آپ کا جدا رہنا کیا کچھ ان کے زیاں کا موجب ہوا۔)

شیخ ابو منصور نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے[۲] مگر سید حمیری کی بے قراری اور دردِ دل کیلئے

بدا کی شان نزول | دوسرے عقیدہ کی شان نزول سنئیے۔

اما سبب قولہ بجواز البداء علی اللہ	"جائز ہے کہ اللہ بدا کرے" اس عقیدہ کی
فھوان ابراھیم بن مالک الاشتر لما بلغہ	ابتداء یوں ہوئی کہ سپہ سالار ابراہیم بن مالک
ان المختار تکھن وادعی نزول الوحی قعد	اشتر کو جب اطلاع ہوئی کہ مختار تو کاہن بن بیٹھا
عن نصرتہ واستولی لنفسہ علی بلاد الجزیرۃ	اور نزول وحی کا مدعی ہے، تو ابراہیم بیٹھ رہے

مختار کی اعانت سے دستکش ہو گئے، اور الجزیرہ کے علاقہ پر خود قبضہ کرلیا۔

[۱] فرق الشیعہ ص ۲۷ [۲] الفرق۔ ص ۴۰

وعلم مصعب بن الزبیر ان ابراهیم بن الاشتر لا ینصر المختار فطمع عند ذلك في قهر المختار	مصعب بن الزبیر کو — کہ عراق کے والی تھے جب معلوم ہوا کہ ابراہیم ابن مختار کی مدد نہ کریں گے تو اُن کو ہوس ہوی کہ مختار پر غالب آنے کا
مختار سے بیزاری ولحق به . . اکثر سادات الکوفة غیظا عنهم علی المختار لاستیلائه علی اموالهم وعبیدهم واطمعوا مصعبا في اخذ الکوفة قهرًا ۔	بیشتر سرداران کوفہ مصعب کے ساتھ ہو گئے یہ لوگ ناخوش تھے کہ مختار نے اُن کے مال و دولت اور غلاموں پر قبضہ کر لیا تھا سب نے مل کے مصعب کو لالچ دلایا کہ زبردستی کوفہ پر متصرف ہو جائیں ۔
فخرج مصعب من الکوفة في سبعة آلاف رجل من جنده سوی من انضم الیه من سادات الکوفة	مصعب سات ہزار سپاہ لے کے نکلے ، سرداران کوفہ کی جمعیت جو لشکر کے ساتھ شامل ہو گئی تھی وہ اس تعداد پر مستزاد تھی
فتح کی وحی فلما انتهی خبرهم الی المختار اخرج صاحبه احمر بن شمیط الی قتال مصعب ابن الزبیر في ثلاثة آلاف رجل من نخبة عسکره ، واخبرهم بان الظفر یکون لهم وزعم ان الوحي نزل علیه بذلك	مختار کو جب اس لشکر کشی کی خبر ملی تو احمر بن شمیط کو جو اس کا رفیق اور یار تھا تین ہزار منتخب سپاہ کے ساتھ مصعب کے مقابلہ کو روانہ کیا سپاہیوں کو یہ بھی اطمینان دلایا کہ تم ہی فتحیاب ہو گے اور اس باب میں مجھ پر وحی نازل ہو چکی ہے ۔
وحی پوری نہ ہوی فالتقی الجیشان بالمدائن فانهزم اصحاب المختار وقتل امیرهم ابن شمیط واکثر قواد المختار ورجع فلولهم الی المختار وقالوا ۔	مدائن میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا ، مختار کا لشکر بھاگا ، سر لشکر ابن شمیط اور اکثر سرداران سپاہ قتل ہوئے بقیۃ السیف بھاگ کے مختار کے پاس پہونچے اور اس کو یاد دلایا :

الم تعدنا بالنصرة علی عدونا ؟	کیا آپ نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم اپنے دشمن پر غالب آئیں گے
فقال :-	مختار نے جواب دیا :
خدا نے بدا کرلیا ان اللّٰہ کان قد وعدنی	اللہ نے مجھ سے یہی وعدہ کیا تھا، لیکن
ذالک، ولکنہ بدا لہ	پھر اس نے "بدا" کرلیا
واستدل علی ذالک بقولہ تعالیٰ:	کلام اللہ سے اس پر دلیل پیش کی کہ اللہ جو
یمحو اللّٰہ ما یشاء ویثبت -	چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت و برقرار رکھتا ہے
فھذا کان سبب قول الکیسانیۃ بالبداء	کیسانی جو بداء کے معتقد ہوئے اس کا یہی سبب تھا -

—— (۱۵) ——

فرقہ خطابیہ کیسانیوں سے دوسروں میں بھی یہی عقیدہ متعدی ہوا۔ سیدنا جعفر صادق علیہ السلام کے بعد کوفہ میں فرقہ خطابیہ کا ہنگامہ بلند ہوا جس کا سرگروہ ابو الخطاب تھا۔ عباسیوں کی سلطنت قائم ہو چکی تھی، ابو جعفر منصور کی جانب سے عیسیٰ بن موسیٰ کوفہ کے والی تھے، خطابیوں کی جماعت سے مقابلہ ہوا جن کے پاس اسلحہ نہ تھے، صرف ڈنڈے اور لکڑیاں تھیں، ابو الخطاب نے اُن کی ہمت بڑھائی :

لوہے کے مقابلہ میں لکڑی قاتلوھم فان قصبکم	دشمنوں سے لڑو، تمہاری لکڑیاں اُن میں نیزہ و
یعمل فیھم عمل الرماح والسیوف ورماحھم	شمشیر کا کام کریں گی، اُن کے نیزے، تلواریں اور
وسیوفھم وسلاحھم لا تضرکم ولا تخل فیکم	ہتیار نہ تم کو ضرر پہونچائیں گے نہ زخمی کریں گے

یہ حوصلہ افزائی جب کام نہ آئی، ان جانبازوں نے جب شکست کھائی تو ابو الخطاب سے مخاطب ہوئے

ما تری، ما یحل بنا من القوم وما نری	کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اِن لوگوں کے مقابلہ میں
قصبنا یعمل فیھم ولا یؤثر وقد عمل	ہماری کیا گت بنی، ان میں ہماری لکڑیاں کچھ کام
سلاحھم فینا وقتل من تری منا -	نہیں کرتیں، اثر تک نہیں ہوتا، ان کے ہتیار

سلہ الفرق - صفحہ ۲۰۹

البتہ ہم میں کارگر ہوئے اور آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے کتنوں کو قتل کر ڈالا۔

تکڑمی نے بداکی آڑ پکڑی | عام روایت کے مطابق ابو الخطاب نے اس کی نسبت یہ معذرت پیش کی:[1]

ان کان قد بدا اللہ فیکم فما ذنبی۔ تمہارے معاملہ میں اگر اللہ ہی نے بدا کر لیا تو میرا کیا گناہ ہے۔

—— (۱۶) ——

فرقۂ سلیمانیہ | شیعۂ زیدیہ میں ایک فرقہ سلیمان بن جریر سے منسوب ہے اور سلیمانیہ کے نام سے مذکور ہے۔ یہ فرقہ مفضول کی خلافت کا قائل تو ہے مگر سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتا ہے۔[2] علامہ نوبختی نے سلیمان بن جریر کا ایک تاریخی مقولہ نقل کیا ہے جس کی درشتی کو حتی الوسع نرم کرتے ہوئے اس ذیل میں درج کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

نقش سلیمانی | لوگوں نے ایمۂ اہل بیت علیہم السلام کی نسبت دو ایسے عقیدے بنا رکھے ہیں جن کے ہوتے ہوئے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ان میں ایک تو عقیدۂ بدا ہے۔

اور دوسرا تقیّہ

بدا کے ذریعہ جھوٹ کو سچ ثابت کرتے ہیں

اور تقیہ کے سہارے "حافظہ نباشد" کا ثبوت دیتے ہیں[3]

—— (۱۷) ——

متکلمین کا مذہب | ابن الخطیب (الرازی) معتقدین بدا کا یہ عقیدہ نقل کرتے ہیں:

---

[1] فرق الشیعہ۔ ص ۵۹۔ [2] الفرق۔ ص ۳۲ و ۳۳۔ [3] مقالۃ سلیمان بن جریر وھو الذی قال لاصحابہ بھذا السبب ان الائمۃ و ضعوا لشیعتھم مقالتین لا یظھرون معھما من ائمتھم علی کذب ابدًا بقیہ حاشیہ (صفحہ مقابلہ)

البداء جائز على الله تعالى وهو - ان يعتقد شيئا ثم يظهر له ان الامر بخلاف ما اعتقده - وتمسكوا فيه بقوله :- يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ :-

اللہ تعالیٰ کے لیے بدا جائز ہے یعنی پہلے کسی چیز کا تعین ہوتا ہے پھر کیفیت ظاہر ہوتی ہے کہ جو یقین کیا تھا واقعہ اُس کے خلاف ہے۔ اس کی دلیل کلام اللہ سے پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے

پھر اس پر تبصرہ کرتے ہیں :

واعلم ان هذا باطل لان علم الله من لوازم ذاته المخصوصة، وما كان كذلك كان

یہ اعتقاد محض باطل ہے، اللہ کا علم اللہ کی ذات خاص کے لوازمے ہے بنابریں صورت

وعلى القول بالبداء واجازة التقية فاما البداء فان ائمتهم لما احلوا انفسهم من شيعتهم محل الانبياء من رعيتها في العلم فيما كان ويكون والاخبار بما يكون في غد وقالوا لشيعتهم انه سيكون في غد وفي غابر الايام كذا وكذا فان جاء ذلك الشيء على ما قالوه قالوا لهم: الم نعلمكم ان هذا يكون فنحن نعلم من قبل الله عز وجل ما علمته الانبياء وبيننا وبين الله عز وجل مثل تلك الاسباب التي علمت بها الانبياء عن الله ما علمت وان لم يكن ذلك الشيء الذي قالوا انه يكون على ما قالوا قالوا لشيعتهم بدا لله في ذلك - واما التقية فانه لما كثرت على ائمتهم مسائل شيعتهم في الحلال والحرام وغير ذلك من صنوف ابواب الدين فاجابوا فيها وحفظ عنهم شيعتهم جواب ما سألوهم وكتبوه ودونوه ولم يحفظ ائمتهم تلك الاجوبة لتقادم العهد وتفاوت الاوقات لان مسائلهم لم ترد في يوم واحد ولا في شهر واحد بل في سنين متباعدة واشهر متباينة واوقات متفرقة فوقع في ايديهم في المسألة الواحدة اجوبة مختلفة متضادة وفي مسائل مختلفة اجوبة متفقة فلما وقفوا على ذلك منهم ردوا اليهم هذا الاختلاف والتخليط في جواباتهم وسألوهم عنه وانكروه عليهم فقالوا من اين هذا الاختلاف وكيف جاز ذلك قالت لهم ائمتهم انما اجبنا بهذا للتقية ولنا ان نجيب بما اجبنا وكيف شئنا لان ذلك الينا ونحن نعلم بما يصلحكم وما فيه بقاؤكم وكف عدوكم عنا وعنكم فمتى يظهر من هؤلاء على كذب ومتى يعرف لهم حق من باطل - فرق الشيعة، ص ۵۵ و ۵۶

دخول التغیر والتبدل فیہ محالاً[1]	ہوی وہاں اُس میں تغیر و تبدل محال ہوگا[1]
علامہ صفار لکھتے ہیں :	
بدا ایک نقص بشریت ہے اما البداء فھو ترک ما عزم علیہ۔	"بداء یہ ہے کہ جس کام کے کرنے کا عزم کیا تھا اس کو ترک کردیں۔
کقولک: فامض الی فلان، ثم تقول لا تمض الیہ فیبد ولک عن القول۔	مثلاً تم کسی سے کہو کہ فلاں کے پاس جاؤ" پھر کہو: نہ جاؤ، تم سمجھے کہ پہلا حکم مصلحت کے خلاف تھا، لہذا اس کے برعکس دوسرا حکم دیا۔
وھذا یلحق البشر لنقصانھم۔	ناقص ہونے کے باعث ایسی دورنگی انسان ہی کو پیش آسکتی ہے[2]

(۱۸)

مذہب شیعۂ اہل بیت | شیعۂ اہل بیت علیہم السلام بدا کو ایک مخصوص مذہبی رُکن قرار دیتے ہیں، ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی نے اپنی کتاب التوحید میں "بدا" کا ایک خاص باب کھولا ہے جس کی پہلی حدیث یہ ہے کہ ما عبد اللہ بشیٔ مثل البداء، اور دوسری حدیث میں ہے کہ ما عُظِّم اللہ بمثل البداء یعنی بداء اللہ تعالیٰ کی عبادت یا اس کی تعظیم کا بہترین وسیلہ ہے کوئی دوسری شے ایسی نہیں[3]

علامۂ کلینی | محدثین شیعہ میں ابوجعفر کلینی بڑے پایہ کے بزرگ ہیں کتاب الوجیزہ میں اُن کو ثقۃ الاسلام کا خطاب دیا ہے اور تیسری صدی ہجری کا مجدد ملت امامیہ قرار دیا ہے غیبت صغریٰ کے زمانہ میں بیس برس تک اس کتاب کی تالیف میں سرگرم رہے، امام علیہ السلام کے سفیروں سے ہدایت ہوا کرتی تھی تکمیل کے بعد امام قائم قیامت مہدی منتظر علیہ السلام پر پیش کی حضرت نے استحسان فرمایا اور حسن قبول کی عزت بخشی، ماہ شعبان ۳۲۹ میں وفات پائی، اس کتاب کی کچھ روایتیں ملاحظہ ہوں :

بداء کی حقیقت | عن ابی عبد اللہ علیہ السلام	ابو عبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ

[1] مفاتیح الغیب طبع ۱۳۰۸ عامرہ مصر ج ۵ ص ۲۱۶ ـ [2] الناسخ والمنسوخ طبع ۱۳۲۳ سعادۃ مصر ص ۱۰
[3] الاصول من کتاب الکافی طبع ۱۳۰۲ لکھنؤ ص ۸۴

قال: ان للہ علمین علم مکنون مخزون لا یعلمہ الاھو۔	کہ دو علم ہیں ایک علم مخفی جسے وہی جانتا ہے دوسرا کوئی نہیں جانتا
من ذالک یکون البداء۔	"بداء" اسی علم میں داخل ہے
وعلم علمہ ملائکتہ ورسلہ وانبیاءہ فنحن نعلمہ	دوسرا علم وہ ہے کہ اللہ نے اپنے فرشتوں اور پیغمبروں کو اس کی تعلیم دی ہے ہم اس علم سے آگاہ ہیں [۱]

مالک جہنی روایت کرتے ہیں:

بداء کا ثواب | سمعت اباعبداللہ علیہ السلام یقول: لو علم الناس ما فی القول بالبداء من الاجر ما افتروا عن الکلام فیہ۔	میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بداء کے قائل ہونے میں جو اجر و ثواب ہے لوگ اگر اس کو جانتے تو اس قول سے باز نہ رہتے

مرازم بن حکیم کہتے ہیں:

بداء شرط نبوت | سمعت اباعبداللہ علیہ السلام یقول: ما تنبأ نبی قط حتی یقر للہ بخمس بالبداء والمشیۃ والسجود والعبودیۃ والطاعۃ۔	ابوعبداللہ علیہ السلام کو میں نے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تک کسی پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے لئے پانچ صفات کا اقرار نہ کرلیا اس وقت تک پیغمبری نہ ملی بداء کا اقرار، مشیت کا اقرار، سجدہ و فروتنی کا اقرار، بندگی کا اقرار، عبادت کا اقرار۔

ریان بن الصلت کی روایت ہے:۔

بعثت انبیاء پر اقرار بداء | سمعت الرضیٰ یقول: ما بعث اللہ نبیاً قط الا بتحریم الخمر وان یقر للہ بالبداء۔	امام رضا علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس نے شراب کو حرام اور اللہ تعالیٰ کے لئے بداء کا اقرار نہ کیا ہو

[۱] الاصول من کتاب الکافی۔ طبع ۱۳۰۲۔ لکھنؤ مں ۸۵ ص ۸۶۔

بحث کی تنقیح | تفقہ اور تکلم کا زمانہ ہمیشہ عہد روایات و عصر احادیث کے بعد آیا کرتا ہے۔
اخباریین جب ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات کا سرمایہ فراہم کر چکے تو علم خلاف و کلام کی جانب متوجہ ہوئے اسی ذیل میں "بدا" کی نوبت بھی آئی تھی۔

ابو الحسن علی بن اسماعیل الاشعری المتوفی ۳۲۴ کی کتاب مقالات الاسلامیین و اختلاف المصلین ایک جرمن مستشرق (ہ۔ ریتر) نے استنبول کے سرکاری مطبع سے ۱۹۲۹ میں شائع کی ہے اس میں سوال اٹھایا ہے کہ : هل الباری یجوزان یبدوله اذا اراد شیئا ام لا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے جب کچھ ارادہ کر لیا تو کیا اس ارادہ سے پھرنا اس کے لئے روا ہے یا ناروا؟) جواب میں لکھتے ہیں کہ شیعہ اہل بیت علیہم السلام کے تین فرقے اس باب میں تین مختلف عقیدے رکھتے ہیں۔

خدا پابند بدا | فالفرقة الاولیٰ منهم یقولون ان الله تبدو له البداوات۔	پہلا فرقہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بدا پیش آتا ہے۔
وانه یرید ان یفعل الشیٔ فی وقت من الاوقات ثم لا یحدثه لحدوث البداء۔	کسی وقت وہ کچھ کرنا چاہتا ہے پھر بدا ء پیش آتا ہے یعنی پہلا ارادہ خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے اس بنا پر اس کو ترک کر دیتا ہے۔
بدا نے شریعت منسوخ کر دی | وانه اذا امر بشریعة ثم نسخها فانما ذلك لانه بدا له فیها۔	اللہ تعالیٰ نے جب ایک شریعت کا حکم دیا پھر اس کو منسوخ کر دیا، تو اس کا سبب یہ تھا کہ بدا پیش آیا۔
وان ماعلم انه یكون ولم یطلع علیه احدا من خلقه فجائز علیه البداء فیه۔	اللہ کو جس کے ہونے کا علم ہو مگر مخلوقات میں کسی کو اپنے علم سے مطلع نہ کیا ہو تو اللہ تعالیٰ کے لئے اس میں بدا جائز ہے۔
انحن نے جان لیا تو بدا نہ ہوگا۔ | وما اطلع علیه عباده فانه لا یجوز علیه	لیکن اگر اس نے اپنے بندوں کو اطلاع دیدی ہے

السبد اھیہ	تو پھر اس صورت میں بدا جائز نہیں
فرقِ ثانی | والفرقة الثانية منهم يزعمون انه جائز على الله البداء فيما اعلم انه يكون حتى لا يكون وجوزوا ذلك فيما اطلع عليه عباده وانه لا يكون كما جوزوه فيما لم يطلع عليه عباده	دوسرے فرقہ کے زعم میں اللہ تعالیٰ کے لئے بدا جائز ہے جس باب میں اُس کو علم تھا کہ یہ صورت ہوگی نہیں وہ بدا کر سکتا ہے کہ ایسی صورت نہ ہو اللہ نے اپنے بندوں کو جس کی اطلاع دیدی اُس میں بھی بدا کو جائز رکھتے ہیں لیکن جس باب میں اطلاع نہ دی ہو وہاں تجویز کے مطابق صورت نہ ہوگی۔
کہاں بداء اور کہاں خدا | والفرقة الثالثة منهم يزعمون انه لا يجوز على الله عز وجل البداء وينفون ذلك عنه تعالىٰ	تیسرا فرقہ اللہ تعالیٰ کے لئے بدا جائز نہیں رکھتا اور اس کی قطعی نفی کرتا ہے[۱]

——— (۲۰) ———

فلسفۂ امامیہ | علامہ باقر داماد متوفی ۱۰۴۰ نے "نبراس الضیاء" میں ما بدأ لله بداءً كما بدا له في اسماعيل اذ امر اباه بذبحه ثم فداه بذبح عظيم (اللہ نے اسماعیلؑ کے باب میں جیسا بدا کیا ایسا کوئی بدا نہیں، پہلے تو ابراہیم علیہ السلام کو اسماعیلؑ کے ذبح کرنے کا حکم دیا، پھر اُن کے بدلہ ایک بڑی قربانی کی) پر مفصل گفتگو کی ہے اور "قبسات" کے دسویں قبس میں فلسفہ سے اس عقیدہ کی توجیہ فرمائی ہے لیکن اس "کشف غطا" میں بڑا ہاتھ اسفار اربعہ کا ہے جو فلسفہ کی نہایت جامع تصنیف اور عقاید شیعہ اثنا عشریہ کی تائید و تثبیت میں حیرت انگیز فلسفی استدلال پر حاوی ہے، ۱۲۸۲ میں یہ کتاب چھپی تھی اس کی تیسری جلد میں (ص ۸۹-۹۱) فلسفہ کے زور سے عقیدۂ بداء کو ثابت کیا ہے۔

دلائل فلسفیہ | فرماتے ہیں کہ :

[۱] مقالات الاسلامیین۔ ص ۳۹

(۱) آسمانی طبقات میں اللہ کے ایسے بندے ہیں جن کے تمام افعال بلکہ ارادات تک اللہ ہی کیلئے ہیں
(۲) الواح سماء پر احکام قضا و قدر ثبت ہیں جن کے لکھنے والے کرام کاتبین ہیں
(۳) بداء انہیں آسمانی الواح پر کرام کاتبین سے ہوتا ہے۔

فظھر ان التجدد فی العلوم والاحوال لضرب من الملائکة وھم الکرام الکاتبون سائغ غیر ممتنع ولا مستبعد[1]

اس بحث کے بعد یہ امر واضح ہوگیا کہ علم اور واقعہ کی ذیل میں جو نئی صورت یعنی بداء کی شکل پیش آتی ہے اس کا تعلق فرشتوں کی صنف سے ہے کہ وہی کرام کاتبین ہیں، اس کی خوشگواری میں کچھ کلام نہیں کیوں کہ کوئی استبعاد عقلی استدلالی اس میں نہیں ہے۔

(۲۱)

"بداء کا سروکار اللہ تعالیٰ شانہ کی سرکار سے ہے، یا فرشتوں کے دربار سے، یا کسی سے بھی نہیں،" یہ مرحلے اس مضمون کی منزل مقصود سے بالکل جدا ہیں۔

اس مضمون کا مفاد محض اس قدر ہے کہ آجکل جو نازک مزاج طبیعتیں کلام اللہ میں ناسخ و منسوخ کے نام سے چیں بر جبیں ہو جاتی ہیں، وہ نسخ اور بداء میں فرق نہیں کرتیں،

نسخ اور ہے، بداء اور ہے اگرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
فرقے است ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست
تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

---

[1] اسفار اربعہ ـ سفر ثالث ـ ص ۹۰ ـ

بشارات الانبیاء

نبوت محمدی کے متعلق انبیائے سابقین کی پیشین گوئیاں

(۲)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

جن پیشین گوئیوں کو مسیحیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق کیا ہے اُن میں سے پہلی پیشین گوئی وہ ہے جو انجیل متی باب اول میں بیان کی گئی ہے +

پہلی پیشین گوئی | یہ سب کچھ ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا پورا ہو کہ دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھیں گے جس کا ترجمہ یہ ہے خدا ہمارے ساتھ (آیہ ۲۲-۲۳)

یہاں جس نبی کی پیشین گوئی کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ علمائے نصرانیت کی تصریح کے مطابق یسعیاہ علیہ السلام ہیں۔ کتاب یسعیاہ کے ساتویں باب میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ کے ساتھ پائی جاتی ہے -

"باوجود اس کے خداوند آپ تمکو ایک نشان دے گا۔ دیکھو کنواری حاملہ ہوگی اور اس کا نام عمانوایل رکھے گی" (آیہ ۱۴)

لیکن حضرت عیسیٰ اس پیشین گوئی کے مصداق نہیں ہو سکتے جس کی وجوہ حسب ذیل ہیں -

(۱) انجیل متی کے مصنف اور کتاب یسعیاہ کے مترجم نے جس لفظ کا ترجمہ کنواری کیا ہے وہ دراصل "علمہ" ہے جس کے معنی علمائے یہود کے نزدیک جوان عورت کے ہیں خواہ کنواری ہو یا نہ ہو یہی لفظ کتاب الامثال کے تیسویں باب میں آیا ہے۔ اور وہاں صاف طور پر اس سے مراد شادی شدہ جوان

عورت ہے۔ یہ کتاب یسعیاہ کے اس لفظ کا ترجمہ تینوں یونانی ترجموں تھیوڈوشن Theodotion اکولا (Aquilla) اور سیمیکس (Symmachus) میں جوان عورت کیا گیا ہے۔ یہ تینوں ترجمے قدیم ترین ہیں پہلا ترجمہ ۱۲۹ء میں ہوا ہے۔ دوسرا ۱۸۰ء میں اور تیسرا ۲۰۰ء میں خصوصاً تھیوڈوشن کا ترجمہ علماء مسیحیہ کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہے۔ پس علمائے یہودی تفسیر اور ان تینوں ترجموں کی بنا پر متی کی رائے کا فساد ظاہر ہے۔

(۲) مسیح علیہ السلام کا نام کسی نے بھی عمانوایل نہیں رکھا نہ اُن کے باپ نے اور نہ اُن کی والدہ نے بلکہ انہوں نے ان کا نام یسوع رکھا تھا۔ انجیل متی میں تصریح ہے کہ فرشتہ نے اُن کے باپ کو خواب میں جو بشارت دی تھی اُس میں یہی کہا تھا کہ تو اس کا نام یسوع رکھیگا (متی باب ۱۔ آیہ ۲۱) اور جبرئیل نے اُن کی ماں سے کہا تھا:۔

"دیکھ تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام یسوع رکھے گی"

(لوقا باب ۱۔ آیہ ۳۰)

خود حضرت مسیح نے ابھی کبھی یہ نہیں فرمایا کہ میرا نام عمانوایل ہے

(۳) جس قصہ میں یہ پیشین گوئی بیان ہوئی ہے۔ اُس سے خود یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے مصداق نہیں ہو سکتے کیونکہ وہاں بیان یہ ہے کہ آرام کا بادشاہ رضین اور اسرائیل کا بادشاہ فقح دونوں ملکر یروشلم کے بادشاہ آخز بن یوتام سے لڑنے کے لئے آئے۔ آخر کو ان کے اجتماع سے بہت خوف لاحق ہوا اس پر خداوند نے یسعیاہ نبی کو حکم دیا کہ آخز کا دل بڑھانے کے لئے اس سے کہے کہ تو خوف نہ کر یہ دونوں تجھ پر غالب نہ آئیں گے اور عنقریب ان کی سلطنت مٹ جائیگی پھر ان کی بربادی کی علامت یہ بتائی کہ ایک جوان عورت حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور قبل اس کے کہ وہ لڑکا نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل ہو ان دونوں بادشاہوں کی سلطنت

ہو جائیگی۔ (ملاحظہ ہو کتاب یسعیاہ باب ۷۔ آیہ۔ ۱تا۱۶) یہ ثابت ہے کہ فقح کی حکومت اس کے بعد اکیس برس کے اندر تباہ ہوگئی یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش سے (۷۲۱) سات سو اکیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پیشین گوئی کا حضرت عیسٰی سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

(۴) اناجیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ حمل کے وقت حضرت مریم کنواری (بن بیاہی) تھیں کیونکہ ان میں یہ تصریح ہے کہ وہ یوسف نجار کے نکاح میں آچکی تھیں چنانچہ حضرت عیسٰی کے معاصر یہودی اُن کو یوسف نجار کا بیٹا کہتے تھے۔ (انجیل متی باب ۱۳۔ آیہ ۵۵۔ انجیل یوحنا باب ۱۔ آیہ۔ ۴۵ و باب ۶ آیہ۔ ۴۲)

دوسری پیشین گوئی | انجیل متی باب ۲ میں لکھا ہے "تب اس نے سب سردار کاہنوں اور قوم کے فقیہوں کو جمع کر کے اُن سے پوچھا کہ مسیح کہاں پیدا ہوگا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی کی معرفت یوں لکھا ہے کہ اے بیت لحم یہوداہ کی سرزمین تو یہوداہ کے سرداروں میں ہرگز کمترین نہیں ہے۔ کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری قوم اسرائیل کی رعایت کرے گا (آیہ ۴تا۶)

اس پیشین گوئی کو جس نبی کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ میکاہ ہے، لیکن میکاہ نبی کی کتاب میں جو الفاظ پائے جاتے ہیں وہ متی کے الفاظ سے بالکل مختلف ہیں۔ وہاں لکھا ہے:-

"پر اے بیت لحم افراتاہ ہر چند کہ تو یہوداہ کے ہزاروں میں شامل ہونے کے لئے چھوٹا ہے، تب بھی تجھ میں سے وہ شخص نکلکر مجھ پاس آوے گا جو اسرائیل میں حاکم ہوگا۔ اور اس کا نکلنا قدیم سے ایام الازل سے ہے"

(باب ۵۔ آیہ ۲)

علمائے نصاریٰ تو محسوس کرتے ہیں کہ دونوں عبارتوں میں کتنا فرق ہے۔ مگر اپنے بچاؤ کے لئے انہوں نے یہ پہلو اختیار کیا ہے کہ کتاب میکاہ میں تحریف ہوئی ہے۔ حالانکہ نہ تو تحریف کا کوئی ثبوت

ان کے پاس ہے، نہ وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ میکاہ کی اصل عبارت کیا تھی جس کو بعد میں بدلا گیا۔

تیسری پیشین گوئی | انجیل متی باب ۲ آیت ۱۵ میں ہے۔

"اور ہیرودیس کے مرنے تک وہاں رہا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا پورا ہو کہ میں نے اپنے بیٹے کو مصر سے بلایا"

اس کو حضرت مسیح کے حق میں ہوسیع نبی کی پیشین گوئی کہا جاتا ہے مگر کتاب ہوسیع کے باب (۱۱) آیت (۱) میں یہ عبارت اس طرح ہے:-

"جب اسرائیل لڑکا تھا میں نے اس کو عزیز رکھا اور اپنے بیٹے کو مصر سے بلایا۔"

صاف ظاہر ہے کہ یہ ان احسانات کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں بنی اسرائیل پر کیے گئے تھے۔ ہوسیع کا جو ترجمہ ۱۸۱۱ء میں بزبان عربی کیا گیا تھا۔ اس میں اپنے بیٹے کے بجائے "اس کے (یعنی اسرائیل کے) بیٹوں" کا لفظ لکھا تھا۔ مگر اس تحریف کے باوجود اس عبارت کو مسیح علیہ السلام پر کسی طرح چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ ہوسیع نبی نے تو اس آیت کے بعد بنی اسرائیل کی نافرمانیوں اور ان کی بت پرستی اور تعلیم کے آگے ان کی قربانیوں کا ذکر کیا ہے اور بنی اسرائیل کو ملامت کی ہے کہ خدا نے تم پر وہ احسانات کیے اور تم نے ان کے جواب میں یہ حرکات کیں۔ اس کو پیشین گوئی اور وہ بھی مسیح علیہ السلام کے حق میں کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ توراۃ سے یہ ثابت ہے کہ بنی اسرائیل نے بابل کی اسیری سے رہا ہو کر بت پرستی سے توبہ کر لی تھی اور یہ حضرت مسیح کی پیدائش سے ۵۳۶ برس قبل کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد وہ کبھی اصنام کے آگے سربسجود نہیں ہوئے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ہوسیع نبی کا قول مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے

چوتھی پیشین گوئی | انجیل متی کا مصنف مسیح کی پیدائش کے واقعات اور ہیرودیس بادشاہ کے قتل اطفال کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے :-

تب وہ جو یرمیاہ نبی نے کہا تھا پورا ہوا کہ رامہ میں ایک آواز سننے میں آئی ہے نالہ اور رونے اور بڑے ماتم کی کہ راخل اپنے لڑکوں پر روتی اور تسلی نہیں چاہتی اس لئے کہ وہ نہیں ہیں

(باب ۲- آیت ۱۷ - ۱۸)

یہاں پھر تحریف سے کام لیا گیا ہے کیونکہ یہ مضمون یرمیاہ باب ۳۱- آیت ۱۵ میں آیا ہے اور وہاں اس سے پہلے اور بعد کی آیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ہیرودیس کے واقعہ سے نہیں بلکہ بخت نصر کے اس واقعہ سے ہے جو یرمیاہ نبی کے زمانے میں پیش آیا تھا جس میں ہزاروں اسرائیلی مارے گئے اور ہزاروں بابل کی طرف جلا وطن کئے گئے۔ ان لوگوں میں ایک کثیر تعداد آل راحیل کی تھی اس لئے راحیل کی روح عالم برزخ میں اس حادثہ پر تڑپنے لگی۔ اور حق تعالیٰ نے اس کو تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ "اپنی زاری کو روک اور اپنی آنکھوں کو آنسوؤں سے باز رکھ کہ تیری محنت کے لئے اجر ہے خداوند کہتا ہے اور وے دشمنوں کی زمین سے پھر آئیں گے اور تیری عاقبت کی بابت امید ہے خداوند کہتا ہے کہ تیرے لڑکے اپنی سرحد میں پھر داخل ہوں گے"

(یرمیاہ باب ۳۱- آیت ۱۶- ۱۷)

پانچویں پیشین گوئی | انجیل متی باب ۲- آیت ۲۳ میں پھر لکھا ہے۔

"اور ایک شہر میں جس کا نام ناصرت تھا جا کے رہا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا"

مگر عہد عتیق کے مجموعہ میں انبیاء کی جتنی کتابیں ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے علمائے یہود نے تو متی کی اس عبارت پر سخت حملے کئے ہیں۔ وہ اس کو قطعی جھوٹ اور بہتان قرار دیتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ ناصرہ تو درکنار جلیل کے پورے علاقے میں کبھی کوئی نبی پیدا ہی نہیں ہوا۔ (دیکھو یوحنا باب ۷- آیت ۵۲)

چھٹی پیشین گوئی | انجیل متی باب ۲۷ آیت ۹ میں مسیح کے صلیب دیے جانے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

"تب وہ جو یرمیاہ نبی کی معرفت کہا گیا تھا پورا ہوا کہ انہوں نے وہ تیس روپے لئے اکی ٹھیرائی ہوئی قیمت جس کی قیمت بنی اسرائیل میں سے بعضوں نے ٹھیرائی"۔

یہ مضمون نہ کتاب یرمیاہ میں ہے اور نہ عہد عتیق کی کسی دوسری کتاب میں۔ البتہ ذکریاہ نبی کی کتاب میں ایک جگہ یہ الفاظ ضرور ملتے ہیں۔

"اور میں نے انہیں کہا کہ اگر تمہاری نظر میں بھلا لگے تو میری قیمت مجھے دو اور نہیں تو مت دو" اور انہوں نے میرے مول کی بابت تیس روپے تول کے دیے اور خداوند نے مجھے حکم دیا کہ اسے کمہار پاس پھینک دے اس اچھی قیمت کو جو انہوں نے میری ٹھیرائی تھی اور میں نے ان تیس روپیوں کو لیا اور خداوند کے گھر میں کمہار کے لیے پھینک دیا" (باب ۱۱ آیۃ ۱۲-۱۳)

یہ عبارت اور اس سے قبل و بعد کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیش گوئی نہیں بلکہ ایک گذرے ہوئے واقعہ کا بیان ہے، اور ان دراہم کا لینے والا ذکریاہ خود تھا، نہ کہ یہوداہ اسکریوتی

ساتویں پیشین گوئی | انجیل متی کے باب ۱۳ میں حضرت عیسیٰ کے تمثیلی کلام کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

یہ سب باتیں یسوع نے ان جماعتوں کو تمثیلوں میں کہیں اور بے تمثیل ان سے نہ بولتا تھا تاکہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو کہ میں تمثیلیں لاکر کلام کرونگا میں ان باتوں کو جو دنیا کے شروع سے پوشیدہ ہیں ظاہر کروں گا۔ (آیت ۳۴ - ۳۵)

یہاں زبور کی اس عبارت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کتاب ۷۸ میں اسطرح لکھی ہوئی ہے:

"میں اپنا منہ کھول کر ایک تمثیل کہونگا اور میں رازکی باتوں کو جو قدیم سے ہیں ظاہر کرونگا جنہیں ہم نے سنا ہے اور جانا اور ہمارے باپ داداؤں نے ہم سے بیان کیا۔ ہم ان کی اولاد سے پوشیدہ نہ رکھیں گے بلکہ آئندہ آنیوالی پشت پر خداوند کی ستایش اور اس کی

قدرتیں اور اس کے عجائب کام جو اس نے کئے ظاہر کریں گے کیونکہ اس نے یعقوب میں ایک شہادت قائم کی اور بنی اسرائیل میں ایک شریعت رکھی جس کی بابت اس نے ہمارے باپ دادوں کو حکم کیا کہ وے اسے اپنی اولاد کو سکھلاویں تاکہ آئندہ پشت وے فرزند جو پیدا ہویں سیکھیں اور اٹھ کے اپنی اولاد کو سکھلاویں اور وے خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں بلکہ اس کے حکموں کو حفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور اُن کے جی خدا سے لگے نہ رہے (آیت ۲ تا ۹)

اس عبارت کو پڑھیئے اور غور کیجئے کہ یہاں داؤد علیہ السلام کسی آنے والے نبی کی پیشین گوئی کر رہے ہیں یا خود اپنے متعلق بیان کر رہے ہیں کہ میں ایسا اور ایسا کرونگا؟ اس کے بعد آیت ۱۰ سے لیکر ۶۵ تک وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور بنی اسرائیل کی شرارتوں اور ان کے عواقب کا سلسلہ ذکر فرماتے ہیں، پھر کہتے ہیں :

تب خداوند اس شخص کیطرح جو نیند سے چونکے اور اس پہلوان کی مانند جو مے کے نشہ میں ہو اٹھا اور اسنے اپنے دشمنوں کی پچھاڑی ماری اور اس نے انہیں سدا کا ننگ کیا اور اس نے یوسف کے خیمے کو رد کیا اور افرائیم کے فرقے کو چن نہ لیا پر اس نے یہوداہ کے فرقے کو اور کوہ صیہون کو جو اس کا محبوب تھا برگزیدہ کیا اور اس نے اپنے مقدس کو آسمان سا بلند بنایا اور زمین کی مانند جس کی نیو اس نے ہمیشہ کے لئے رکھی اور اسنے اپنے بندے داؤد کو برگزیدہ کیا اور گلوں کے بھیڑ سالوں میں سے اسے نکال لیا، اس نے اُسے بچوں والی بھیڑوں کے پیچھے سے لیا تاکہ اپنے لوگوں بنی یعقوب کو اور بنی اسرائیل کو جو اُس کی میراث ہیں چراوے سو اس نے انہیں اپنے دل کی راستی سے چرایا اور اپنے ہاتھوں کی چالاکی سے اُن کی رہنمائی کی ۔

(آیہ ۶۵ تا ۷۲)

یہ آیات اس بات پر صاف دلالت کر رہی ہیں کہ زبور ۸۰ بالکل حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں ہے اور حضرت عیسیٰ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔

آٹھویں پیشین گوئی | انجیل متی باب ۴ میں لکھا ہے :۔

"جب یسوع نے سنا کہ یوحنا گرفتار ہوا تب جلیل کو چلا گیا اور ناصرت کو چھوڑ کر کفر ناحوم میں جو دریا کے کنارے زبولون اور نفتالی کی سرحدوں میں ہے جا رہا کہ جو یسعیاہ نبی کی معرفت کہا گیا تھا پورا ہو ، زبولون کی سرزمین اور نفتالی کی سرزمین یعنی غیر قوموں کا جلیل جو دریا کی راہ یردن کے پار ہے' ان لوگوں نے جو اندھیرے میں بیٹھے تھے بڑی روشنی دیکھی اور ان پر جو موت کے ملک اور سایہ میں بیٹھے تھے نور چمکا" (آیہ ۱۲ تا ۱۶)

یہ اشارہ ہے کتاب یسعیاہ باب ۹ کی اس عبارت کی طرف :۔

" لیکن تیرگی وہاں نہ رہیگی جہاں آگے کو سخت پڑی تھی کہ اس نے پہلے زبلوں کی سرزمین کو اور نفتالی کی سرزمین کو ذلت دی پر آخری زمانہ میں غیر قوموں کے جلیل میں دریا کے سمت یردن پار بزرگی دی۔ وہ لوگ جو تاریکی میں چلتے تھے' انہوں نے بڑی روشنی دیکھی اور ان پر جو موت کے سایہ کے ملک میں رہتے تھے نور چمکا۔ (آیہ ۱ تا ۲)

ان دونوں عبارتوں میں فرق ظاہر ہے اور ان میں سے ایک محرف ہے۔ قطع نظر اس کے یسعیاہ نبی کے کلام میں کسی آیندہ شخص کے ظاہر ہونے پر کوئی دلالت نہیں ہے وہ تو صرف یہ بیان کرتے ہیں کہ زبلون اور نفتالی کے باشندوں کا حال پہلے خراب تھا پھر اچھا ہوگیا جیسا کہ ماضی کے صیغوں "ذلت دی" "بزرگی دی"، "روشنی دیکھی"، اور "نور چمکا" سے ظاہر ہو رہا ہے اگر ہم اس کو مجازاً مستقبل کے معنی میں بھی لیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں یہاں روشنی کے دیکھنے اور نور کے چمکنے سے مراد ان کی سرزمین سے صلحا کا گزرنا ہے۔ اس خبر کو تنہا عیسیٰ علیہ السلام پر چسپاں

کرنا سراسر تحکم ہے۔ اس کی تائید میں دلیل کوئی نہیں۔

یہ ان پیشین گوئیوں کا حال ہے جن کو مسیحیوں کی مقدس کتابوں میں عیسٰی علیہ السلام کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ ان میں جو کمزوریاں ہیں وہ آپ نے دیکھ لیں مگر وہی مسیحی علماء جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس سے بدرجہا زیادہ صریح پیشین گوئیوں پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں ان کا مادۂ تنقید اس وقت مفلوج ہو جاتا ہے جب یہ پیشین گوئیاں اُن کے سامنے آتی ہیں۔

۔ مترجموں کی تحریفات | اگلے اور پچھلے اہل کتاب کی عادت رہی ہے کہ وہ اکثر ناموں کا ترجمہ کر ڈالتے ہیں اور کتابوں کے ترجمے کرتے وقت اصل ناموں کے بجائے اُن کے معانی لکھ دیا کرتے ہیں پھر یہ بھی ان کی عادت ہے کہ وہ کتابوں کے تراجم میں تفسیر کے طور پر عبارتیں بڑھا دیتے ہیں اور کوئی ایسا اشارہ نہیں کرتے جس سے معلوم ہو سکے کہ اصل کلام کیا تھا اور اس میں کیا اضافہ کیا گیا۔ کتب قدیم کی تحریف میں اُن کی اِس عادت کا بھی بڑا حصہ ہے۔ مختلف زبانوں میں جو ترجمے ہوئے ہیں بلکہ ایک ہی زبان میں جو مختلف اڈیشن شایع ہوئے ہیں اُن کے مقابلہ سے بکثرت شواہد اس کے مل سکتے ہیں۔ میں نمونہ کے طور پر چند مثالیں یہاں نقل کرتا ہوں:۔

(۱) ۱۶۲۵ء اور ۱۸۳۱ء اور ۱۸۴۴ء میں تورات کے جو عربی ترجمے شائع ہوئے ہیں اُن میں حضرت ہاجرہؑ کے کنوئیں کا نام "بیر الحی الناظر" لکھا گیا ہے۔ اور ۱۸۶۵ء میں جو اُردو ترجمہ امریکن بائبل سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوا ہے اس میں اسی کوئیں کا نام 'بیر الحی رائی' لکھا گیا ہے۔ (کتاب پیدائش ب ۱۶۔ آیہ ۱۴) دونوں جگہ ایک ہی چیز کے ناموں میں کس قدر تفاوت ہے۔ عربی میں اصل نام کا ترجمہ کر دیا گیا اردو میں ایک غیر زبان کا نام نقل کر لیا گیا۔

(۲) ۱۸۱۱ء میں جو عربی ترجمہ شائع ہوا تھا اس میں حضرت ابراہیم کے تعمیر کردہ مکان کا نام میرحم اللہ یرزہ لکھا ہے ۱۸۴۴ء کے ترجمہ میں اسی کا نام الرب یریٰ ہے (دیکھو سفر تکوین باب ۲۲۔ آیت ۱۴) دونوں جگہ اصل عبرانی نام کے دو مختلف ترجمے کر دیئے گئے

(۳) کتاب پیدایش باب ۳۱ - کی آیہ ۲۰ کا عربی ترجمہ ۱۸۴۴ء کے ایڈیشن میں اسطرح ہے:
فلم یعقوب ام رامن حمید - اور ۱۸۲۵ء میں جو اردو ترجمہ شائع ہوا ہے اس میں لکھا ہے کہ
"یعقوب نے لابن ارامی سے اتنی دغا کی کہ اپنے بھاگنے کی خبر اس سے نہ کہی" ایک جگہ حمید کا لفظ ہے اور
دوسری جگہ "لابن ارامی" دونوں کو ایک دوسرے سے کیا نسبت۔

(۴) اسی کتاب پیدایش کے باب ۴۹ آیت ۱۰ کا عربی ترجمہ ۱۸۴۴ء کے ایڈیشن میں اس طرح
کیا گیا ہے: فلا یزول القضیب من یہوذا والمدبر من فخذہ حتی یجئ الذی لہ الکل وایاہ تنتظر الامم
یہاں "الذی لہ الکل" میں لفظ کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ شیلوہ ہے مگر ۱۸۱۱ء کے ترجمے میں اسی لفظ کا ترجمہ
الذی ہو لہ کیا گیا تھا۔ عیسائیوں کے مشہور محقق لیکلرک نے اسی لفظ کا ترجمہ عاقبتہ کیا ہے ۱۸۲۵ء
کے اردو ترجمے میں "شیلا" لکھا ہے اور لاطینی ترجمے میں اسی کو (جو عنقریب بھیجا جائیگا) کردیا گیا ہے۔
دیکھئے ایک ہی لفظ کے کتنے مختلف تراجم کیے گئے حالانکہ یہ لفظ اس شخص کے نام کے طور پر آیا تھا جس کی
بشارت دی گئی تھی۔

(۵) کتاب خروج کے باب ۳ آیت ۱۴ کا پہلا فقرہ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمے میں اسطرح لکھا ہے:
فقال اللہ لموسیٰ اھیہ اشراھیہ - یہ لفظ "اھیہ اشراھیہ" گویا بمنزلہ اسم ذات تھا۔ مگر ۱۸۱۱ء
کے عربی ایڈیشن میں اس کا ترجمہ الازلی الذی لایزال کیا گیا' اور ۱۸۴۴ء کے اردو ترجمے میں "میں
وہ ہوں جو میں ہوں" کردیا گیا۔

(۶) خروج باب ۱۲ آیت ۱۱ کا آخری فقرہ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمے میں یوں ہے تبقی فی الفم فقط
۱۸۱۱ء کے ترجمے میں اسی فقرے کا ترجمہ تبقی فی اللیل فقط کیا گیا تھا

(۷) خروج باب ۱۷ آیت ۱۵ کا ترجمہ ۱۸۴۴ء کے عربی ایڈیشن میں یوں کیا گیا ہے: فابتنی
موسیٰ مذبحا ودعا اسمہ الرب عظمتی۔ ۱۸۱۱ء کے ترجمے میں اس مذبح کا نام اللہ علی الکما گیا تھا

ایک اور ترجمے میں اس کو الرب السامیؔ سے تعبیر کیا گیا۔ یہ عبرانی نام یہواہ نسّی کے مختلف ترجمے ہیں۔

(۸) خروج باب ۳۰۔ آیت ۲۳ میں جہاں حضرت موسیٰ کو خوشبودار تیل بنانے کا نسخہ بتایا گیا ہے وہاں سنہ ۱۸۳۱ء کے اردو ترجمے میں "خالص مُر" لکھا ہے، سنہ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمے میں میعة فائقة ہے اور سنہ ۱۸۱۱ء کے ترجمے میں المسك الخالص۔ اور ترجمہ جزویت میں المرالفاطر۔ اس چیز کا اصل عبرانی نام تو بہرحال ایک ہی ہوگا مگر اس کو مترجموں نے کتنے مختلف المعنی ناموں سے تعبیر کر دیا۔

(۹) استثناء باب ۳۴۔ آیت ۵ میں حضرت موسیٰ کو سنہ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمے میں "موسیٰ عبدالرب" لکھا گیا ہے اور سنہ ۱۸۱۱ء کے ترجمہ میں موسیٰ رسول اللہ۔ عبد اور رسول کا فرق ظاہر ہے۔ ایسے مترجموں نے اگر بشارات محمدیہ میں لفظ رسول اللہ کو کسی اور لفظ سے بدل دیا ہو تو کیا تعجب ہے۔

(۱۰) متی باب ۱۱۔ آیت ۱۴ کا ترجمہ سنہ ۱۸۱۱ء اور سنہ ۱۸۴۴ء کے ایڈیشنوں میں فھو ایلیا المزمع ان یأتی کیا گیا ہے اور سنہ ۱۸۶۱ء کے ایڈیشن میں فھذا ھو المزمع بالاتیان کر دیا گیا، یعنی "ایلیا" کا نام اڑا کر محض نام کے ترجمہ پر اکتفا کر لیا گیا۔ ایسے لوگوں نے اگر کسی بشارت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو بھی دوسرے الفاظ سے بدل ڈالا ہو تو کیا عجب!

(۱۱) یوحنا باب ۴ آیت ۱ کا پہلا فقرہ سنہ ۱۸۱۱ء۔ سنہ ۱۸۳۱ء اور سنہ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجموں میں لما علم یسوع ہے اور سنہ ۱۸۲۲ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے ترجموں میں لما علم الرب۔ ایک ہی نام کا ترجمہ ایک شخص یسوع کرتا ہے اور دوسرا رب یا خداوند۔ ایسے لوگوں نے اگر عناد کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو بھی تحقیری الفاظ سے بدل دیا ہو تو کیا بعید ہے!

یہ مثالیں تو اس امر کی تھیں کہ بائبل کے ترجموں میں اکثر ناموں کا ترجمہ کر کے کچھ سے کچھ کر دیا گیا ہے۔ آیئے اب چند نظیریں اس امر کی بھی دیکھئے کہ اصل کلام کے ساتھ تفسیری فقروں کو کس طرح خلط ملط کیا گیا ہے :

۱۔ انجیل متی باب ۲۷۔ آیت ۴۶ میں ہے: "نویں گھنٹے کے قریب یسوع نے بڑے شور سے چلا کر کہا ایلی ایلی لما سبقتانی یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا"۔ یہ آخری فقرہ جو یعنی کے بعد لکھا گیا ہے یقیناً الحاقی ہے۔

۲۔ مرقس باب ۳۔ آیت ۱۷ میں ہے: "جنھیں بوئنرجس نام رکھا یعنی بنی رعد"۔ یہ "یعنی بنی رعد" عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا کوئی ٹکڑا نہیں ہے بلکہ بطور تفسیر بڑھا دیا گیا ہے۔

۳۔ مرقس باب ۵۔ آیت ۴۱ میں ہے: "اور اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کہا طلیتا قومی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے لڑکی میں تجھے کہتا ہوں اٹھ"۔ یہاں پھر عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کو تفسیری الفاظ کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا گیا ہے۔

۴۔ انجیل مرقس باب ۷۔ آیت ۳۴ کا ترجمہ ۱۸۷۰ء کے اردو ایڈیشن میں اس طرح ہے: "اور آسمان کی طرف نظر کر کے ایک آہ کی اور اسے کہا افتاح یعنی کھل جاؤ"۔ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور کے ترجمے میں افتاح کے بجائے افتح ہے۔ ۱۸۶۰ء کے عربی ترجمہ میں افثا، ۱۸۱۱ء کے ترجمے میں افاثا، ۱۸۴۴ء کے ترجمہ میں اینفتح اور شاہ جیمز کی بائبل میں Ephphatha ہے۔ یہاں اول تو یہی پتہ نہیں چلتا کہ حضرت عیسیٰ نے در اصل کیا کہا تھا۔ پھر یعنی کے بعد مختلف ترجموں میں جو فقرے بڑھائے گئے ہیں وہ اصل کلام سے خارج اور الحاقی ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ کی زبان عبرانی تھی اور ان کے اقوال جو یونانی میں نقل کئے گئے ہیں وہ ان کے اصل اقوال نہیں بلکہ ان کے ترجمے ہیں۔

۵۔ انجیل یوحنا باب اول آیت ۴۱ میں ہے: "ہم نے مسیح کو جس کا ترجمہ کرستس ہے پا لیا"۔ یہ ۱۸۷۰ء کا ترجمہ ہے۔ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور کے شائع کردہ ترجمہ میں یہ فقرہ اس طرح ہے: "ہم کو خرستس یعنی مسیح مل گیا"۔ ۱۸۱۱ء اور ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمے میں اس کو یوں لکھا ہے

قد وجدنا مسیا الذی تاویلہ المسیح"۔ اور فارسی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۱۶ء میں ہے "ما مسیح راکہ ترجمہ آن کرسطوس می باشد یافتیم"۔ اور شاہ جیمز کی انگریزی بائیبل میں ہے۔

We have found the Messias which is being interpreted the Christ

ان ترجموں کا اختلاف قابل غور ہے۔ اردو کے پہلے ترجمے اور فارسی ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ اندریاس نے دراصل "مسیح" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اور اس کا ترجمہ "کرسٹس" یا کرسطوس" ہے۔ عربی ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے "مسیا" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اور اس کا ترجمہ "مسیح" ہے۔ انگریزی ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے مسیاس" کہا تھا اور اس کا ترجمہ کرائسٹ" ہے۔ اردو کا دوسرا ترجمہ ان سب سے مختلف ہے۔ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ اندریاس نے "خرستس" کہا تھا اور اس کا ترجمہ "مسیح" ہے۔ اب یہ پتہ نہیں چلتا کہ اصل لفظ کیا کہا گیا تھا "مسیا" یا "مسیح" یا "کرسٹس"؟ مترجموں نے اصل لفظ اور اسکی تفسیر کو جس طرح خلط ملط کیا ہے ظاہر ہے۔

۶۔ اس کے بعد والی آیت میں پطرس کے متعلق مسیح علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔:

تو کیفاس کہلا ویگا جس کا ترجمہ پطرس ہے"۔ یہ ۱۸۷۰ء کا اردو ترجمہ ہے۔ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لاہور کا شایع کردہ ترجمہ یہ ہے: "تو کیفا یعنی پطرس کہلائیگا" ۱۶۷۱ء کا عربی ترجمہ یہ ہے انت تدعی ببطرس الذی تاویلہ الصخر"۔ ۱۸۴۴ء کا عربی ترجمہ یہ ہے: "ستسمی انت بالصفا المفسر ببطرس"۔ ۱۸۱۶ء کا فارسی ترجمہ: "ترا بکیفاس کہ ترجمۂ آن سنگ است مدا خواہند کرد"۔ شاہ جیمز کی انگریزی بائیبل میں یوں لکھا ہے۔

thou shalt be called Cephas whic is by interpretation a stone

یہاں پھر اصل اور تفسیر کے خلط ملط ہونے کی ایک بدترین مثال ملتی ہے۔ نہیں معلوم ہوتا کہ مسیح نے کیفاس یا کیفا یا صفا یا سیفاس کہا تھا اور اس کا ترجمہ پطرس یا پتھر ہے' یا انہوں نے دراصل "پطرس" کہا تھا اور اس کا ترجمہ پتھر ہے؟

ان مثالوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ ناموں کے ترجمے کرنے اور ان کو من مانے مفہومات سے بدل ڈالنے، اور اپنی کتابوں کے متن کو تفسیروں سے خلط ملط کر دینے کے خوگر رہے ہیں جس سے ان کی کتابیں تحریفات کا مجموعہ بن گئی ہیں۔ اور جب حال یہ ہے تو ہم کیا امید کر سکتے ہیں کہ ان کے ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ذکر آیا ہوگا اس کو انہوں نے اپنی اصل پر باقی رکھا ہوگا۔ یہاں تو تحریف کی عادت کے ساتھ عناد اور کتمان حق کا جذبہ بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو امام قرطبی اور دوسرے علمائے سلف کی کتابوں میں جو پیشین گوئیاں ملتی ہیں وہ موجودہ زمانے کے مشہور ترجموں میں ان الفاظ کے ساتھ نظر نہیں آتیں۔ کیونکہ ان بزرگوں نے اپنے زمانے کے عربی ترجموں میں ان کو پایا تھا اور اب وہ ترجمے بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے گئے ہیں۔

۸۔ **پال کا کوئی قول حجت نہیں** | اہل تثلیث نے سینٹ پال کو حواریوں کا مرتبہ دیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک وہ مومن صادق نہیں ہے بلکہ ہم اسے ان منافقوں اور جھوٹے مدعیان رسالت میں سے سمجھتے ہیں جو عروج مسیح کے بعد بکثرت ظاہر ہو گئے تھے۔ اُسی نے دین مسیحی کو خراب کیا اور اپنے معتقدوں کے لیے ہر حرام چیز کو مباح کر دیا۔ ابتداء میں وہ مسیحیوں کے طبقۂ اول کا کھلا دشمن تھا اور ان کو اذیتیں پہنچاتا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کھلی دشمنی سے کوئی معتدبہ فائدہ نہیں ہوتا تو وہ نفاق کی راہ سے اس دین میں داخل ہو گیا اور مسیح کی رسالت کا دعویٰ کیا اور بظاہر ایک زاہدانہ روش اختیار کی۔ اس پردے میں اس نے جو چاہا کیا' اور اہل تثلیث نے اس وجہ سے اس کی پیروی قبول کر لی کہ وہ بظاہر اس کو نہایت زاہد اور پرہیزگار پاتے تھے' اور اس سے بھی بڑھ کر جس چیز کی وجہ

سے وہ اس کے فریفتہ ہو گئے وہ یہ تھی کہ اس نے ان کو تمام تکالیف شرعیہ سے آزاد کر دیا۔ (۲) کا معاملہ ویسا ہی ہے جیسا دوسری صدی مسیحی میں منتش کے ساتھ پیش آیا۔ ایک زاہد مرتاض تھا اور جس نے دعویٰ کیا تھا کہ میں ہی وہ فارقلیط ہوں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ بہت سے عیسائیوں نے اس کے ظاہری زہد و ریاضت کو دیکھکر اس کے دعوے کو قبول کر لیا حالانکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مدعی کذاب تھا جیسا کہ آگے چل کر ثابت کیا جائے گا۔

پس سینٹ پال کا کوئی قول ہمارے لئے حجت نہیں ہے اور ہم اس کے ان رسائل کو جو عہد جدید کے مجموعہ میں شامل ہیں ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔

ان مقدمات کو بیان کرنے کے بعد ہم کہتے ہیں کہ یہود و نصاری کی کتابوں میں جو تحریفات ہوئی ہیں ان سب کے باوجود اب بھی ان کے ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بہت سی پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں۔ جو شخص انبیاء کی پیشین گوئیوں کے انداز کو سمجھ لیگا (جیسا کہ ہم اپنے دوسرے مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں) اور انصاف کی نظر سے ان پیشین گوئیوں کی شان پر غور کریگا جن کو انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ کے حق میں قرار دیا ہے۔ (جیسا کہ ہم اپنے چھٹے مقدمہ میں ظاہر کر چکے) وہ بآسانی اندازہ کریگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں وہ کس قدر قوی اور واضح ہیں۔

اب ہم اہل کتاب کی معتبر کتابوں سے ۱۸ پیشین گوئیاں نقل کریں گے۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

(۶)

تالیف علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدیر الاصلاح اعظم گڈھ

سورۃ پر بحیثیت مجموعی ایک نظر

۱۵۔ جو تاویل ہم نے اوپر بیان کی ہے، اگر تم اس کو صحیح تسلیم کر کے اس سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالو گے اور ان آیات کے تمام حدود و اطراف پر غور کرو گے تو تمہارے سامنے چند اہم حقیقتیں آئیں گی۔

۱۔ آنحضرت صلعم وراثت ابراہیمی کے وارث ہیں اور آپ کی بعثت دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا ظہور و اعلان ہے۔

۲۔ یہ عطیہ اللہ تعالیٰ نے خائنوں اور ناشکروں سے چھین لیا کیونکہ ایسے لوگ خدا کے مبغوض ہیں جیسا کہ سورۂ حج میں بیان فرمایا ہے۔

۳۔ اس عطیہ سے محرومی ایک مخصوص صفت کا نتیجہ قرار دی گئی ہے جس سے اس کی اصل علت بھی واضح ہوگئی یعنی پیغمبر سے دشمنی خدا کی برکتوں سے محرومی کا سبب ہے

۴۔ یہ محرومی و نامرادی اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ وراثت ابراہیمی کے وارث ہیں وہ اس کے دوست ہوں گے۔ یعنی یہ وراثت اہل حق اور اصحاب باطل کے درمیان ایک نشان امتیاز ہے۔ جو اس سے محروم ہوں گے ان کا شمار دشمنوں میں ہوگا اور

جو اس سے سرفراز ہوں گے ان کا شمار دوستوں میں ہوگا۔

۵۔ جب نماز اور قربانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی دوستی اور محبت کا نشان قرار دیا ہے تو لامحالہ ان کا ترک اس کی دشمنی کی دلیل ہوگا اور مشرکین اور یہود و نصاریٰ اور اس امت کے تمام مبتدعین اس کے اعدار کے حکم میں داخل ہوں گے۔ کیونکہ ان میں سے بعض نے نماز کا استخفاف کیا ہے اور بعض نے حج کا اور بعض دونوں ہی سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ پس جو لوگ نماز، قربانی اور حج کو ضایع کر دیں گے وہ پیغمبر علیہ السلام کے دشمن ہوں گے اور یہود و نصاریٰ کی طرح وراثت ابراہیمی سے محروم اور ذلیل و پامال ہوں گے لیکن اسلام پر اللہ تعالیٰ کا مخصوص فضل و کرم ہے کہ اہل حق و اصحاب سنت کی ایک جماعت اس کی خدمت کے لیے باقی ہے جو انشاء اللہ فروغ پائے گی۔ اور اسلام کی عزت و شوکت کا ذریعہ ہوگی۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ

اگر تم منہ موڑ لوگے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم کھڑی کرے گا۔ پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوگی۔

ان تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ یہ سورہ ایک طرف فتح مکہ کی بشارت ہے دوسری طرف اس میں آنحضرت صلعم کے دشمنوں کے لیے وراثت ابراہیمی سے محرومی کی تہدید و وعید ہے۔ اس کا اول و آخر بالکل مقابلہ کے اسلوب پر ہے اور بیچ کا حصہ گویا برزخ کی طرح دونوں طرف سے متعلق ہے یعنی جو لوگ توحید پر قائم رہ کر نماز اور قربانی کو قایم کریں گے وہ کوثر کی نعمت سے سرفراز ہوں گے۔ اور جو ان کو ترک کریں گے، وہ کوثر سے محروم ہوں گے۔ اس سورہ کی مثال ایک ترازو کی ہے جس میں دو پلڑے ہیں اور بیچ میں اس کی زبان ہے۔ ایک پلڑے میں خیر کثیر کی گراں مایہ دولت ہے اور دوسرے میں محرومی و نامرادی کی ذلت۔ یا یوں سمجھو کہ ایک طرف وجود ہے اور دوسری طرف عدم اور جس طرح میزان کی زبان وزن کی طرف جھکتی ہے اسی طرح بیچ کی آیت پہلی آیت کی طرف جھکتی ہے

اِس لیے اِن دونوں کے درمیان "ف" کے ذریعہ ربط قائم کیا گیا ہے۔ برعکس اس کے تیسری آیت بالکل علٰحدہ ہے۔ گویا سورۃ کا اسلوب ہی اعلان کر رہا ہے کہ حوض کوثر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اور جان نثاروں کا مخصوص حصہ ہے۔ آپ کے اعداء اور مخالفین اِس نعمت گرانمایہ سے محروم ہوں گے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ جس طرح یہ محرومی آپ کے تمام دشمنوں کے لیے عام ہے اسی طرح رضوان الٰہی کی بشارت یہ بخشش آپ کے لیے اور آپ کی اُمّت کے لیے عام ہے۔ اس لیے یہ بشارت کفر پر اسلام کے غلبہ ہی کی بشارت نہیں ہے بلکہ قیامت کے دن آپ کی امت پر رحمت و رضوان الٰہی کی جو بارش ہوگی اس کی بشارت بھی اس میں مضمر ہے اور آخرت میں حوض کوثر کا بخشنا اسی حقیقت کی ایک تعبیر ہے

اس سورۃ میں جو پیشین گوئی مضمر تھی۔ اس کے واقع ہو جانے کے بعد گویا اس امر کا اعلان ہو گیا کہ مسلمان خدا کے ایمان و تصدیق کی کسوٹی پر پورے اترے اور خدا نے ان سے راضی ہو کر ان کو قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے چن لیا۔ انبیاء کے حالات اور قرآن کی تصریحات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کا آغاز مصایب اور صبر کے ماحول میں ہوتا ہے اور اس کی انتہا برکات اور اجر پر ہوتی ہے۔ اس لیے مکہ کی فتح نے اعلان کر دیا کہ مسلمان خانہ کعبہ کے متولی اور خدا کی زمین میں دین حق کے گواہ ہیں۔ یہ گویا اس وعدہ کا ظہور ہے جو فرمایا گیا تھا۔

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم	جو تم میں سے ایمان لائے اور نیکوکار ہوئے ان سے
وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض	ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں
کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکّنن	کو اس نے خلافت دی تھی اسی طرح ان کو بھی زمین میں
لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم ولیبدّلنّھم	خلافت دیگا اور ان کے لیے اس دین کو محکم کرے گا
من بعد خوفھم امنًا۔ یعبدوننی	جسے اس نے ان کے لیے پسندیدہ ٹھیرایا ہے اور ان

ولا یشرکون بی شیئاً	کی خوف کی حالت کو امن واطمینان سے بدل دےگا
ومن کفر بعد ذلک فاولئک	وہ لوگ صرف میری بندگی کریں گے اور کسی چیز کو
ھم الفاسقون	میرا شریک نہ ٹھیرائیں گے اور ان انعامات کے بعد
	جس کسی نے کفر کیا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

یہی وہ وعدہ تھا جس کو "انا اعطیناک الکوثر" کہکر پورا کردیا۔ ان دونوں آیتوں میں خاص طرح کا تشابہ ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے واقیموا الصلٰوۃ واٰتوا الزکوٰۃ۔ "نماز قایم کرو اور زکوٰۃ دو" جو "فصل لربک وانحر" سے ملتی ہوئی ہے۔ پھر فرمایا۔ واطیعوا الرسول لعلکم ترحمون۔ "رسول کی اطاعت کرو کہ تم پر خدا رحم فرمائے۔ یہ آیۃ جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، "ان شانئک ھو الابتر" سے مشابہ ہے۔

بالکل یہی حال سورۂ فتح کا ہے۔ اللہ تعالی نے امت مرحومہ کے لیے امن ورحمت اور رضوان ومغفرت، نیز ارض مقدس پر غلبہ کے جو وعدے فرمائے تھے، یہ سورہ تمام تر الہی وعدوں کی تکمیل وظہور کی بشارت ہے۔ انبیاء کے صحیفوں اور خصوصاً زبور اور امثال سلیمان میں بھی یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید کی بعض آیات میں اس کی طرف اشارہ ہے مثلاً۔

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر	اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین
ان الارض یرثھا عبادی الصالحون	کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

یہاں زمین سے مراد وہ "ارض مقدس" ہے جو ارض جنت کی مثال ہے اور آل عمران اور سورہ فیل کی تفسیر میں ہم بیان کرچکے ہیں کہ شرف وتقدم کی جو مزیت مکۂ معظمہ کو حاصل ہے وہ اس آسمان کے نیچے زمین کے کسی ٹکڑے کو حاصل نہیں ہے۔ پس سورۂ کوثر کے نزول کے وقت وعدۂ وراثت کا ظہور شروع ہوچکا، یہاں تک کہ وہ پورا ہوگیا۔ اور اللہ تعالی نے اپنی مقدس "زمین" کفار کے ہاتھوں سے چھین کر مسلمانو

کے ہاتھوں میں دیدی او۔ اس طرح گویا اعلان کر دیا کہ اللہ کے نیک بندے اور الذین امنوا وعملوا الصلحت کے مصداق وہی ہیں اس لیے زمین کی خلافت وحکومت کے مستحق ہوئے۔

اس وعدہ کے ظہور نے آنحضرت صلعم کے متعلق اس بشارت کی بھی تصدیق کر دی جو حضرت موسیٰ نے دی تھی کہ جب نبی موعود آئیگا تو ارض مقدس کو کفار کے غلبہ واستیلاء سے پاک کریگا۔ بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء وسلاطین آئے ان میں سے کسی کے عہد میں بھی اس پیشگوئی کی تصدیق نہیں ہوئی۔ ان کے تمام صحیفے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں اس لئے یہود ایک ایسے پیغمبر کے منتظر تھے جو ارض مقدس کو کفار کے استیلاء سے پاک کرے۔ قرآن مجید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

ولما جاءهم كتاب من عند الله مصدق لما معهم وكانوا من قبل يستفتحون على الذين كفروا فلما جاءهم ما عرفوا كفروا به۔

اور جب ان کے پاس اللہ کے پاس سے ایک کتاب آئی جو ان کی کتابوں کی تصدیق کرتی تھی اور حال یہ تھا کہ وہ پہلے سے کافروں پر فتح کے طلبگار تھے تو جب وہ چیز ان کے پاس آگئی جس کو وہ پہچانتے تھے۔ انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔

نبوت محمدی صلعم کی ایک دائمی دلیل

۱۷۔ یہ سورۃ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ کوثر سے محرومی کی علت پیغمبر صلعم کی عداوت ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک متصل اور دائمی واقعہ ہے۔ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ کسی خاص سرزمین کے متعلق یہ اعلان کر دے کہ اس پر اس کی سلطنت ہمیشہ قائم رہیگی اور اس کے اعداء اس سرزمین سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ زمانہ کے سیل حوادث کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ بڑی بڑی بادشاہتیں اور بڑے بڑے سلاطین اس کے بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ لیکن قرآن نے سورۂ کوثر میں جو اعلان کیا اس کو زمانہ اب تک باطل نہ کر سکا۔ اس لیے یہ عظیم الشان پیشین گوئی ایک طرف مسلمانوں کے لئے ایک

لازوال بشارت ہے دوسری طرف اس میں خاتم النبیین کی نبوت کی ایک دائمی اور غیر فانی حجت ہے
اور یقیناً یہ تمام ان پیشین گوئیوں سے کہیں بڑھ کر ہے جن کی عمریں ختم ہوچکیں مثلاً عیسیٰ علیہ السلام
کی وہ پیشین گوئیاں جن کی طرف قرآن مجید نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے ۔

وَاُنَبِّئُكُم بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ اور تمہیں پہلے سے بتادوں گا جو تم کھاؤ گے
اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں جمع کروگے ۔

یا دانیال و حزقیل نبی کی پیشین گوئیاں جن کے ظہور کا اب تک انتظار ہے آنحضرت صلعم کی
بعثت ہمیشہ کے لیے تھی اس لیے چند روزہ پیشگوئیاں آپ کی شان رسالت سے فروتر تھیں آپ
آخری نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آپ کے ظہور سے بہت سی اگلی پیشین گوئیوں
کی تصدیق فرمائی دوسری طرف آپ کو ہمیشہ باقی رہنے والی حجتوں سے سرفراز فرمایا ۔

پھر پیشگوئی کا کمال اعجاز یہ ہے کہ وہ ظاہری حالات کے بالکل خلاف ہو۔ اس پیشگوئی میں
یہ شان کمال درجہ موجود ہے ۔ یہ سورۃ جیسا کہ روایات سے ثابت ہے صلح حدیبیہ کے دن نازل
ہوئی جس میں بظاہر غلبہ کفار کو حاصل ہوا تھا۔ صلح کی تمام شرطیں تقریباً ان کے موافق تھیں یہاں تک
کہ بعض صحابہ نے علانیہ اس سے اختلاف کیا۔ اور آنحضرت صلعم کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار
کردیا۔ معاہدہ کے بعض الفاظ کو کفار کے اصرار و اختلاف سے آنحضرت صلعم نے مٹانے کا حکم دیا
تو بعض صحابہ نے اسکی تعمیل سے انکار کردیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس روز کے ظاہری
حالات اس قسم کی پیشگوئی کے بالکل خلاف تھے۔ یہ پیشین گوئی بالکل اسی قسم کی تھی جیسی آپ نے
رومیوں کے غلبہ کے بارہ میں فرمائی تھی ۔ وہ بھی جیسا کہ ہم تفصیل لکھ چکے ہیں ظاہری حالات کے
بالکل خلاف تھی ۔

حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اس نبوت کی جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے

ازانجملہ یہ بھی ہے کہ اس کی پیشنگوئیاں جلد تر پوری ہوں گی یہاں تک کہ لوگ ان کو دیکھ کر اس کے نبی ہونے کا یقین کریں گے۔ تثنیہ ۱۸ میں ہے۔

"میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ جیسا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا۔ وہ سب ان سے کہیگا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لیکے کہیگا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا۔ اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں؟ تو جان رکھو کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے اُس سے مت ڈر۔" یوحنا باب ۱۶ میں ہے۔

لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔

چنانچہ اس سورہ کے نزول کے کچھ ہی دنوں بعد مکہ فتح ہوا۔ اور مسلمانوں کے لیے یہ پیشین گوئی ایک لازوال بشارت اور کفار کے لیے ایک دائمی انذار وعید کی شکل میں پوری ہوگئی۔ ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھکر غور کرو اس میں آنحضرت صلعم کی رسالت کی صداقت کی کیسی اہم حجتیں مضمر ہیں۔

حضرت ابراہیم سے اللہ کا وعدہ اور اس کی تصدیق ۸:۔ پچھلی فصلوں میں جو مباحث گذرے ہیں ان سے یہ حقیقت بالکل روشن ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلعم اور آپ کے اتباع کو خیر کثیر کی دولت بخشی اور آپ کے اعداء کو اس سے محروم فرمایا۔ یہ بعینہٖ اس وعدہ کی تکمیل ہے جو خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا تھا کہ تمام اہل زمین ان کی ذریت سے برکت پائیں گے۔ اور جو ان پر برکت بھیجے گا وہ مبارک ہوگا۔ اور جو لعنت بھیجیگا وہ ملعون ہوگا۔ یہ دونوں باتیں اس سورۃ میں موجود ہیں پہلی بات "اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ" میں موجود ہے۔ اور

دوسری بات اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ہیں ۔ دونوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرو تو تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلعم میں ایک نمایاں مشابہت نظر آئیگی ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و رحمت مقتضی ہوئی کہ تمام برکات کا سرچشمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنائے چنانچہ حضرت نوحؑ کے بعد تمام آسمانی برکتوں کے وارث وہی ہوئے جیسا کہ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ — اللہ تعالیٰ نے آدم، نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام عالم پر برگزیدہ کیا۔

آل عمرانؑ بھی ذریت ابراہیم میں شامل ہیں۔ اس لیے خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے لیے گویا تمام عالم میں صرف آل ابراہیم کا انتخاب ہوا۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے واسطہ سے تمام اہل زمین کو برکت دینے کا وعدہ کیا گیا۔

تکوین میں باب ۱۲ میں ہے۔

"اور خداوند نے ابرام کو کہا تھا کہ تو اپنے ملک اور قرابتوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے اس ملک میں جو میں تجھے دکھلاؤں گا، نکل چل۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤنگا اور تجھکو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا۔ اور تو ایک برکت ہوگا۔ اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں، برکت دونگا اور اس کو جو تجھ پر لعنت کرتا ہے، لعنتی کروں گا۔ اور دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے۔"

یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مروہ کی طرف ہجرت فرمائی ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی جگہ ہے ۔ اس لیے اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عام برکت کا وعدہ ان کی ذریت کے واسطے سے پورا ہوگا۔ چنانچہ ایک دوسرے

مقام پر اس کی طرف صاف تصریح فرما دی۔ تکوین باب ۲۲ میں ہے۔

"خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا .... اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی۔ کیونکہ تو نے میری بات مانی"

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اس برکت کا اصلی سبب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی ہے۔ ہر چند کہ یہ برکت اسحٰق علیہ السلام کی ذریت سے بھی پھیلی لیکن اس کا اصلی سرچشمہ حضرت اسماعیل ہی کی ذریت ہے۔ ایک دوسرے مقام پر اس کے متعلق ایک اہم حقیقت بیان ہوی ہے:-

"ابرہام تو یقیناً ایک بڑی اور بزرگ قوم ہوگا۔ اور زمین کی سب قومیں اس سے برکت پائیں گی کیونکہ میں اس کو جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے کو حکم کریگا اور وہ خداوند کی راہ کی نگہبانی کر کے عدل اور انصاف کریں گے۔ تاکہ خداوند ابرہام کے واسطے جو کچھ اس نے اس کے حق میں کہا ہے پورا کرے"۔ تکوین باب

یہاں برکت سے اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا۔ نیز اس سے ایک نئی حقیقت آشکارا ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو دین دیا گیا تھا اس کی حقیقت نیکی اور عدل تھی۔ اب غور کرو کہ آنحضرت کے ظہور سے یہ پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔ آپ کی بعثت اس سرزمین میں ہوئی جو ان تمام برکات کا سرچشمہ تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سرزمین اور دین ابراہیمی کا وارث بنایا۔ آپ کی شریعت کی بنیاد نیکی اور عدل پر ہے آپ کی بعثت سے تمام روئے زمین کے لیے عام برکت کا وعدہ پورا ہوا۔ کیونکہ آپ کی رسالت تمام عالم کے لیے ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا — ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ — اور ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر

چونکہ آپ کی رسالت تمام عالم کے لئے عام ہے اس لئے وہ برکت بھی جو آپ کے ذریعہ دنیا میں پھیلی آپ کے تمام پیروؤں کے لیے جو آپ کی ذات اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات پر برکت بھیجتے ہیں عام ہوگی۔ یہ اس وعدہ کی تصدیق ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا کہ

"جو تجھے برکت دیتا ہے میں اسے برکت دوں گا۔"

اس کو دوسرے لفظوں میں زیادہ وضاحت سے یوں سمجھو کہ برکت کے معنی ہیں اہل و عیال کی کثرت کی دعا دینا۔ اس لئے اگر کوئی شخص کسی شخص کو برکت کی دعا دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس کے اہل و عیال کو بھی خیر و برکت کی دعا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب ہم آنحضرت صلعم پر برکت بھیجتے ہیں تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر برکت بھیجتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جب ہم آنحضرت صلعم پر درود بھیجتے ہیں تو گویا آپ کی ذریت اور آل پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ اس لئے نمازوں میں ہم یوں دعا کرتے ہیں۔

"اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم"

یعنی تو نے جس طرح ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ پر رحمت نازل فرمائی اسی طرح محمدؐ اور آل محمدؐ پر بھی اپنی برکت و رحمت نازل فرما تاکہ تیرا وعدہ پورا ہو۔

یہ برکت بھیجنے کا حکم دوسری امتوں کو نہیں دیا گیا۔ صرف مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ — اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر رحمت بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو۔

اسی لئے ہم اپنی تمام نمازوں کو درود پر ختم کرتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ اول تو نماز کی فرضیت کے قائل نہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو حضرت ابراہیم

یا ان کی ذریت میں سے کسی پر درود نہیں بھیجتے۔ یہ درود صرف آنحضرت کا شعار ہے۔
ہم تشہد میں پہلے خدا کی بارگاہ میں "صلوات وطیبات" کی نذر گذرانتے ہیں پھر اس کے تمام صالح بندوں کے لیے اس کی رحمت وبرکت مانگتے ہیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلعم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام لیتے ہیں۔ تاکہ ان کے حقوق کا اعتراف کریں۔ یہ گویا اس نیکی اور عدل کی ایک فرع ہے جو نزول برکات کا سبب ہے۔

اس شریعت کی برکت عمومی کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ اس میں ہم کو تمام دنیا کے ساتھ عدل اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور عدل سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے دین کے بارہ میں لڑائی نہیں کی۔ اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ عدل کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۔

اے ایمان لانیوالو! اللہ کے لئے قوام بنے رہو انصاف کے ساتھ شہادت دینے والے اور کسی قوم کی عداوت تم کو ایسا مجرم نہ بنادے کہ تم عدل کو چھوڑ بیٹھو۔ عدل کرو کہ یہی تقویٰ سے اقرب ہے

اس شریعت کے جزئیات احکام بھی جیسا کہ اس کے محل میں ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے عمومیت اور مساوات کی اس روح سے معمور ہیں۔ اور یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے کہ خانہ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے احسان اور عدل کا مرکز بنایا ہے۔ کیونکہ اس کا سنگ بنیاد توحید ہے۔ اور اس کی تعمیر ذکر

شکر اور ہمدردی خلق کے لئے ہوئی ہے۔ اور قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ توحید راس العدل ہے کیونکہ اس نے شرک کو "ظلم عظیم" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ بلاشبہہ شرک ظلم عظیم ہے۔

اور پچھلے مباحث میں یہ بات پوری طرح واضح ہوچکی ہے کہ یہ نماز اور قربانی جس کا اس سورۃ میں ذکر ہے، درحقیقت خانہ کعبہ کے بنیادی مقاصد یعنی توحید، ذکر و شکر اور مواسات کے قیام و تحفظ کے لئے ہیں یعنی بالواسطہ یہ تمام چیزیں بر و عدل کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ چونکہ خانہ کعبہ ہی تعلیم احسان و عدل کا مرکز ہے اس لیے تمام برکات کا سرچشمہ بھی وہی ہوگا۔

یہ تمام باتیں اشارہ کر رہی ہیں کہ اس سورہ میں "کوثر" سے مراد "خانہ کعبہ" ہی ہے

اس سورۂ کی تفسیر کی یہ آخری سطریں ہیں۔ جن کو لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی عبادہ الصالحین۔

تفسیر سورۂ قریش

از

جناب مولانا عبد القدیر صدیقی

یہ صورت مکی ہے۔ اس میں چار آیتیں ہیں۔ قریش فہر کا لقب ہے اولاد فہر کو قبیلۂ قریش کہتے ہیں۔ رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور عشرۂ مبشرہ قریش سے ہیں سلسلۂ نسب اس طرح ہے کہ محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن غالب بن فہر۔ قریش ایک بڑی مچھلی کا نام ہے جو کشتیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ غالباً وہیل مچھلی یا اس کے مماثل اور مچھلی ہے۔ قرش کی تصغیر قُرَیش ہے کبھی تصغیر تعظیم کے لیے بھی ہوتی ہے۔ جیسے انہ اُخَیش فی امر اللہ۔ بے شک وہ امر خدا میں بہت سخت ہے۔

قبیلۂ قریش مکہ کا رہنے والا قبیلہ ہے۔ عام لوگ کعبۃ اللہ شریف کی وجہ سے قریش کی تعظیم کرتے تھے۔ قبیلہ قریش کا قافلہ سرما کے موسم میں یمن کی طرف بغرض تجارت جاتا تھا۔ اور ہندوستان وغیرہ کا سامان لاتا تھا اور گرما کے موسم میں شام کو جاتا تھا۔ اس طرح تجارت کی وجہ سے نیز حاجیوں کی آمد اور ان سے تجارت کرنے کی وجہ سے بہ نسبت اور قبائل کے خوش حال بھی تھا۔ اس قبیلے کے دو مشہور خاندان ہیں۔ بنی ہاشم جو مذہبی پیشوا اور بمنزلہ برہمن کے تھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اسی خاندان سے تھے۔ اور بنی امیہ انتظام امور دنیا کے متکفل تھے بمنزلہ چھتری کے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عام طور سے مکہ معظمہ میں بت پرستی ہوتی تھی۔ خود کعبۃ اللہ شریف میں (۳۶۰) بت نکال رکھے تھے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کو نجاست اور بتوں سے پاک کر دیا

مکہ معظمہ وادی غیر ذی زرع ہے۔ نہ وہاں کھیتی ہے نہ باڑی۔ مگر ضرورت کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو وہاں نہیں ملتی ہو۔ یہ سب طفیل ہے کعبۃ اللہ شریف کا۔ اللہ تعالیٰ انہیں احسانات کو یاد دلاتا ہے۔ اور شکر میں عبادت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اَلِفَ المکان وفلانًا یألف اِلفًا۔ مانوس ہوا۔ الفت پکڑلی دل لگایا۔ مثل سمع۔ اٰلَفَ یُؤْلِفُ فلانًا ناکذا اِیْلَافًا۔ الفت دلائی۔ مانوس کر دیا۔

فلیعبدوا۔ ف شرطی معنی کو متضمن ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوں گے کہ جب قریش پر اللہ کے یہ احسانات ہیں تو اُن کو چاہیے کہ اس کی عبادت کریں۔

یا پھر لام تعجب کے لیے ہے اور معنی یہ ہیں کہ "لوگو! ذرا اس قبیلہ قریش کو تو دیکھو کہ خدا کا یہ احسان اور اُن کا خدا سے یہ اعراض، یہ شرک، یہ بت پرستی! تعجب۔ افسوس!!

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اِیْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝

ارتحل القوم عن المکان رحلۃً ومرحلۃً وارتحالًا۔ قوم منتقل ہوگئی۔ سفر کر گئی۔ رُحلہ وہ غرض جس کے لیے سفر کیا جاتا ہے۔

"قریش کو خوگر عادتی بنانے کے لیے، سرما میں یمن کی طرف اگرما میں شام کی طرف، تجارتی سامان لے کر سفر کرنیکا عادی بنائے جانے کے لیے"

فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝ پس ان کو چاہیے کہ اس بیت اللہ کے پروردگار کی عبادت کریں۔

اَلَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا۔ تجارت کی توفیق دی۔ ہر ملک سے لوگ سامان لانے لگے۔ نذریں دینے لگے۔ اور اُن کو خوف سے امن دیا۔ کہ بیت اللہ کی عزت کی وجہ سے اطراف کی زمین کو حرم بنا دیا۔ وہاں کے باشندوں کو معزز اور محترم بنایا۔

ایاک نعبد وایاک نستعین

از

جناب مولانا طاہر بن احمد صاحب (دار العلوم ۔ دیوبند)

سورۂ فاتحہ میں انسان کو اس کے پروردگار کی طرف سے یہ دعائیہ کلمے اور استدعائیہ جملے سکھلائے گئے ہیں۔

ایاک نعبد وایاک نستعین۔ اھدنا الصراط المستقیم۔

یعنی اے رب العالمین مالک یوم الدین ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں اور صراط مستقیم چاہتے ہیں۔

ان آیتوں میں رب العالمین نے انسان کی طرف سے ایسے صیغے استعمال فرمائے ہیں اور انسان کو ایسے جملے تلقین کیے ہیں جو لغت عرب میں جمع کے لیے بولے جاتے اور چند افراد کے مجموعے پر صادق آتے ہیں حالانکہ قرینہ مقام واقتضائے کلام بظاہر یہ تھا کہ بندہ کی طرف سے ایسے جملے ادا کیے جاتے جن سے اس کی انفرادی حیثیت ظاہر ہوتی اور خدا کی حمد وستائش کرنے والا بندہ یوں کہتا کہ اِیَّاكَ اَعْبُدُ وَاِیَّاكَ اَسْتَعِیْن ۔ یعنی میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور میں تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں لیکن باوجود اس کے نماز وغیر نماز ہر حالت میں بندگان اطاعت شعار کی زبان اور قلب سے اَعبُد و اَستعین کے بجائے نَعبُد و نَستعین ہی ادا کرانا ملحوظ الٰہی ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکیم علی الاطلاق جل مجدہ کے کلام پاک کی ہر ترکیب اعجاز و ایجاز کا آخری مرتبہ لیے ہوئے ہے اور اس کا ہر ایک کلمہ اور ہر ایک جملہ میزان عدل میں تلا ہوا اور

ملکیت کے سانچوں میں ڈھلکر اس دنیا میں آیا ہے اور بلاشبہ دین قیم کی بنیادیں اس پر ایسی ہی طرح قائم واستوار ہیں جیسے فضا میں بلا کسی ستون اور سہارے کے آسمان قائم ہے، تو ضرور ہے کہ نعبد و نستعین میں بھی بجائے الف کے نون رکھدیے جانے سے کسی باریک حقیقت کی طرف اشارہ منظور ہوگا اور یقیناً اس میں بھی کوئی حکمت عظیمہ مضمر ہوگی حضرات مفسرین رحمہم اللہ نے اس موقع پر مختلف موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں فرمائی ہیں جن سب پر نہ عبور حاصل ہے نہ سب کا یہاں نقل کرنا ممکن۔ اس لئے اپنی معروضات سے قبل اس بلیغ اسلوب کے متعلق جو حکمت امام رازیؒ نے بیان فرمائی ہے صرف اسی کو نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مومن مصلّی کو خدا نے جمع کے صیغوں سے جو عرض حال کی تلقین کی ہے اس میں حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ جب جمع کے صیغوں سے بندہ مصلی اپنی دعا اور التجا اور عرض معروض جناب الٰہی میں باوجود اکیلا ہونے کے گذرانے گا تو جمع کے صیغوں کی وجہ سے ہر نماز میں اس کی دعا و استدعا تمام عباد صالحین کی دعا و استدعا کے ساتھ شامل ہوکر بارگاہ الٰہی میں پیش ہوا کریگی اور انہی کی قابل قبول عبادت کے ساتھ بندۂ عاصی کی عبادت بھی قبول ہوجایگی اور اس کی مثال امام صاحبؒ نے یہ تحریر فرمائی ہے کہ جس طرح غلہ کے بڑے بڑے ڈھیر جب تولے جاتے ہیں تو یہ ایک عام دستور ہے کہ جو تھوڑا بہت کوڑا کرکٹ اُن میں ملا ہوا ہوتا ہے وہ بھی غلہ کیساتھ تلجایا کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ گیہوں وغیرہ تو تلجائیں مگر کوڑا کرکٹ نہ تلے۔ اسی طرح بندۂ منفرد نے بھی ایاک نعبد و ایاک نستعین کہہ کر اپنی عبادت کو خدا کے مقبول بندوں کی عبادت کے ساتھ بارگاہ رحمت میں پیش کیا ہے تاکہ ارحم الراحمین ان کے طفیل میں بندگان عاصی کی عبادت کو بھی قبول فرمالے۔ باقی یہ اسکی رحیمی وستاری سے نہایت بعید ہے کہ وہ بندگان عاصی کی عبادت کو تو تمام عبادتوں سے الگ کرکے رد کردے اور صرف مقربین بارگاہ کی عبادت

کو قبول فرمالے۔ پس اسی غرض کو پیش نظر رکھتے ہوئے بندۂ منفرد باوجود منفرد ہونے کے نماز میں ایاک نعبد و ایاک نستعین ہی کہتا ہے یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور ہم تجھی سے سیدھی راہ کے طالب ہیں یہ نہیں کہتا کہ میں تیری عبادت کرتا ہوں اور میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں اور میں تجھ سے سیدھی راہ کا طالب ہوں۔

یہ نکتۂ شیریں بجائے خود نہایت لطیف اور بہتر ہے لیکن بطفیل فیوض و توجہ حضرت قاسم العلوم والخیرات نور اللہ مرقدہ جو وجوہات ہمارے قلب میں اس اسلوب جمعیت کی بابتہ القاء ہوئی ہیں وہ کچھ اور ہیں اور امید ہے کہ وہ انشاء اللہ ناظرین حقائق کے لیئے موجب فرحت باطنی ہوں گی۔

(۱) یہ کہ جو اسلوب جمعیت عہد الست میں بنی آدم نے پروردگار عالم کے لیے بلیٰ شہدنا سے ملحوظ رکھا تھا وہی اسلوب جمعیت اپنے عالم شہادت میں اپنے بندوں کے لیے ملحوظ رکھا اور اس طرح نعبد و نستعین و اہدنا سے ان کو بلیٰ شہدنا کا انداز یاد دلایا ہے حتیٰ کہ تمام بندگان اطاعت شعار کے لئے خواہ وہ مجتمع ہوں یا منفرد ہر حال میں نعبد و نستعین سے وہی نقشہ جمعیت سامنے کیا ہے جو ازل میں کھینچا گیا تھا۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ ازل میں جب رب العرش الکریم نے تمام بنی آدم کی صلبوں اور ان کی پشتوں سے ان کی تمام اولین و آخرین ذریت اور اولاد کو جو قیامت تک اس عالم شہادت میں نسلاً بعد نسلٍ و قرناً بعد قرنٍ ظاہر ہونے والی تھیں نکال کر تحت العرش جمع فرمایا اور خود ان کو ان کی جانوں پر شاہد بناتے ہوئے عالم شہادت کے لئے عقل و اختیار دیکر فرمایا الستُ بربکم، کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں تو تمام اولاد آدم نے عقل اور شعور اور عطا شدہ قوت نطق کی مدد سے مجتمعاً متفق اللسان ہو کر کہا تھا ”بلیٰ شھدنا“ ہاں تو ہی ہم سب کا پروردگار ہے یعنی جو ملکۂ شہادت تو نے اپنی تجلی ربوبیت سے ہم سب کی فطرت میں ڈالا ہے جس کی بدولت ہم سب پر عالم شہادت کے گران بار فرائض عاید ہونے والے ہیں اور خلافت ارضی کا تاج ہمارے سروں پر رکھا جانے والا ہے اس کی بناء پر ہم سب اقرار

کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ بیشک تو ہم سب کا پروردگار ہے۔ چنانچہ اسی ازلی اقرار اور عہد کو یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس عالم میں یاد دلایا ہے۔ جس پر فی الحقیقت ایمان بالغیب کا سنگ بنیاد نصب ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ۔ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

یعنی جب نکالا تیرے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو اور اقرار کرایا اُن سے اُنکی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا پروردگار بولے ہاں ہے ہم اقرار کرتے ہیں۔ (دیکھو) کہیں (پھر) کہنے لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی (یا کوئی اور حیلہ تراش کر) کہنے لگو کہ شرک تو نکالا ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے اور ہم ہوئے اُن کی اولاد اُن کے پیچھے تو کیا تو ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا گمراہوں نے (یعنی یہ کہ کوئی حیلہ اس مرکوز فی القلب شہادت فطری کے بعد معتبر ہوگا اور جبکہ ہر ایک متنفس کے اقرار کا ثبوت خود ہر ایک کے دل کی شہادت ہے تو اس کے بعد گمراہی کا حیلہ کوئی معنی ہی نہیں رکھتا اور قلوب کا فطری علاقہ عرش عظیم کے ساتھ قائم ہو جانے کے بعد پھر پچھلوں کا اگلوں کے لئے اور اگلوں کا پچھلوں کے لئے گمراہی اختیار کرنا کسی طرح بھی سند نہیں ہوسکتا)۔ اور ہم یوں کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں (جو ازل میں کی گئیں) تاکہ وہ پھر آدیں (اور فطری شہادت پر عمل کرتے ہوں)۔

اسی ازلی قول اور اقرار کے اجزا کو اللہ تعالیٰ نے سبع مثانی اور قرآن عظیم یعنی سورۂ فاتحہ میں یوں دہرایا ہے جس کو بندگانِ مخلصین ہر دن کے اندر ہر نماز کی ہر ایک رکعت میں دہراتے

چنانچہ الحمد للہ رب العلمین سے بندہ کو الست بربکم" کا جواب سکھلایا گیا ہے تو مالک یوم الدین سے ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ہذا غافلین کی طرف اشارہ ہے۔ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین سے او تقولوا انما اشرک آباؤنا من قبل وکنا ذریۃ من بعدہم افتھلکنا بما فعل المبطلون کی طرف نظر عبرت کرائی جا رہی ہے تو ایاک نعبد وایاک نستعین و اہدنا سے بلیٰ "شہدنا" کی طرف مع اس کے اسلوب عظیم کے متوجہ کیا جا رہا ہے اور وہ اسلوب عظیم و لطیف یہی ہے کہ جس طرح بندگان وحدت شعار سب کے سب ازل میں بجانب رب العرش العظیم ایک رنگ ایک ڈھنگ سے اس کی حمد و ستائش اور اقرار ربوبیت میں مستغرق و بے خود تھے اسی طرح ہر دن میں پانچ مرتبہ مساجد اللہ میں جمع ہو کر مخلصین وہی نقشہ دلربا ایاک نعبد و ایاک نستعین و اہدنا سے بلیٰ شہدنا کا کھینچا کریں۔

(۲) خدا توفیق دے تو یوم الحج الاکبر اور میدان عرفات میں بھی مجتمع ہو کر ایک اجتماع عظیم کے ساتھ اسی نمونہ و انداز کے مطابق اقرار ربوبیت ادا کیا کریں تا کہ جب اولاد آدم کا یہ اجتماع عظیم خانہ کعبہ و میدان عرفات میں شہادت وحدانیت کے لئے قائم ہوا کرے تو جس قدر پاک اور تزکیہ شدہ روحیں اس عالم سے اقرار ربوبیت کر کے واپس جا چکی ہیں یا جس قدر روحوں کو اس عالم میں ظاہر ہو کر فریضہ شہادت ادا کرنا باقی ہے وہ سب کی سب اس اجتماع عظیم کے ساتھ بلیٰ شہدنا سے اس دن ہمنوائی اختیار کریں اور اپنی تمام توجہ اس یوم اعظم میں اسی اجتماع اکبر کی طرف مبذول فرمائیں اور انسان کو اپنے آبائی و ابنائی سلسلوں سے ہر اعتبار سے حصول نور کا کافی موقع ملے۔ الغرض نعبد و نستعین و اہدنا سے بندہ کو [illegible] اسلوب جمعیت سے وہی شہدنا کا انداز یاد دلایا گیا ہے۔

۳۔ غالباً لکھا غلبا اشارہ اسی طرف فرمایا گیا ہے کہ جس طرح ذریت و اولاد ان کی صلبوں اور ان کی پشتوں سے

[illegible] [illegible] ماسبق [illegible] کو [illegible] شہدنا کا انداز یاد دلایا گیا ہے آنحضرت کے اس عمل سے بھی ظاہر ہے کہ حجۃ الوداع میں آنحضرت نے [illegible] فرمایا تو تمام مردوں اور [illegible] نے [illegible] ارشاد فرمایا کہ اے لوگو تم سے یہ سوال کیا جائے گا کیا سب احکام تم کو پہونچے ہیں یا نہیں تو کیا [illegible] کہ جو سب [illegible] کیا جواب [illegible] شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اسکے احکام ہم تک پہنچا دیئے اور آپ نے اپنا حق ادا کر دیا اس پر حضور علیہ السلام نے آسمان کی طرف انگلی [illegible] [illegible] منہ [illegible] بندہ۔

عالم شہادت میں آچکی ہے یا آنے والی ہے مگر ابھی تک مکلف بالشہادت اور مکلف بالاحکام نہیں ہوئی ہے ان سب کی طرف سے بھی بندہ مومن دست بستہ جناب الہی میں عرض کیا کرے کہ ایاک نعبد وایاک نستعین تاکہ جو اقرار ربوبیت ازل میں بندہ فانی اور اس کی ذریت نے مجتمعاً کیا ہے اطلاس اقرار میں بیٹے کو باپ کی اور باپ کو اپنی اولاد سے جو یکجانیت حاصل تھی عالم شہادت میں بھی اسی اسلوب جمعیت ویکسانی سے نعبد ونستعین کا اعادہ وتکرار ہو کر ازلی قول واقرار ابد تک فراموش نہ ہونے پائے۔

(۴) اور یہ استمرار وبیداری انسان کے خمیر اور مسلمان کی ضمیر میں خوب ہی پیوست ومطبوع ہو جائے اور جب بھی بندۂ مومن کی ذریت عالم شہادت میں آکر مکلف بالشہادہ ہو تو اس کے اجزاء نامیہ ومنویہ میں بھی یہ تلقیظ وبیداری رسوخ کا مرتبہ لئے ہوئے ہو اور یہ بیداری نسلاً بعد نسل اسی نہج سے اصلاب طیبہ میں منتقل ہوتی رہے اور انسان واعتصمو ابحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمۃ اللہ کی تعمیل بھی اس طرح کرتے۔

(۵) غرض جو ذریت اور اولاد آدم عالم شہادت میں ظاہر ہو جائے اس کے یوم ولادت سے ہی اس کے آباء اپنی زبان سے بطور وکالت ونمایندگی اپنی اولاد کے سن شعور کو پہنچنے تک اپنی تمام نمازوں میں نعبد ونستعین کہہ کر حسب قاعدہ واسلوب شریعت اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِیْكَ ان کی طرف سے حق وکالت ادا کیا کریں تاکہ رحمت الٰہی بھی نہ صرف بندۂ مومن ہی کے ظاہر وباطن میں سرایت کرے بلکہ اس کی تمام ذریت کو بھی محیط ولاحق ہو جائے اور کافروں جیسی غفلت مسلمانوں کے مادہ اور انکی روحوں میں بالکل نہ آنے پائے اور مسلمان کی عبادت میں جو نقصان

بقیہ اور تین مرتبہ فرمایا خداوندا تو گواہ رہ خداوندا تو گواہ رہ خداوندا تو گواہ رہ اور اس کے بعد آپ نے فرمایا الا فلیبلغ الشاہد الغائب یعنی جو لوگ موجود ہیں وہ ان تمام احکام کو ان لوگوں تک پہونچا دیں جو حاضر نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اجتماع حج میں بھی شہادت عظیمہ مطلوب رکھی ہے جس کا نقشہ خدا نے اپنے رسول سے کھنچوایا:

۔ جائے تو وہ اس مسلسل و متواتر شہادت سے اسطرح پورا ہو جائے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ یعنی لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ابھی کی راہ پر ایمان کیسا تھ چلی تو ہم نے پہنچا دیا اُن تک اُن کی اولاد کو اور بچھ گھٹایا ہم نے اون کے عمل سے کچھ بھی (اور بلاشبہ) ہر شخص اپنے کسب میں جکڑ ہوا ہے۔ یہی نیابت نمائندگی اور حق وکالت ہم کو دیگر احکام شریعت میں بھی نظر آتا ہے چنانچہ صدقۃ الفطر میں اولاد صغار غیر مکلف بالاحکام کی طرف سے ماں باپ کا صدقہ ادا کرنا ہمارے دعوی کا کھلا ہوا ثبوت ہے علی ہذا قربانی میں بھی اسی قسم کی وکالت موجود ہے۔ حج بدل میں بھی یہی وکالت ہے جو ایک شخص کا بار دوسرے پر منتقل کرتی ہے۔

(۶) علاوہ ازیں ہر نماز میں جو دعائے تحیۃ وسلام ہم کو سکھلائی گئی ہے۔ اس میں بھی یہی اسلوب نیابت مطلوب ہے چنانچہ جب التحیات ہم پڑھنے کو بیٹھتے ہیں تو پہلے خدا کی جناب میں آداب و تحیہ بجالاتے ہیں۔ ہر ایک مصلی نبی پر سلام بھیجتا ہے اس کے بعد کہا جاتا ہے السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین یہاں السلام علینا کے بعد وعلی عباد اللہ الصالحین کے جدا مذکور ہونے سے در انحالیکہ ہر ایک مصلی جدا جدا تحیہ وسلام بجالاتا ہے صاف طور پر یہی نظر آتا ہے کہ علینا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اپنی تمام اولاد روحانی وجسمانی مراد لی ہے تو بندوں کے اعتبار سے علینا سے وہ تمام ذریت مراد ہے جو عالم شہادت میں آچکی ہے مگر ابھی تک مکلف بالاحکام نہیں ہوئی ہے بلکہ دائرہ کو اور ذرا وسیع کیجئے تو کہا جاسکتا ہے کہ علینا میں وہ تمام ذریت مخفیہ موجود فی الاصلاب بھی مراد ہے جو ہنوز عالم غیب سے عالم شہادت میں نہیں پہنچی ہے باقی ان تمام امور کا آسانی سے سمجھ میں آجانا اسی وقت ممکن ہے جبکہ استحضار مغیبات ہو۔

علی ہذا صلوٰۃ الوتر میں بھی جو قنوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بندگان مخلصین کو تلقین فرمایا ہے

اس میں بھی اسی اسلوب جمعیت سے ان تمام جہتوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے چنانچہ دعائے قنوت کے الفاظ یہ ہیں اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْ رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِق۔ اس دعا میں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے استحضار اور ان کے لیے ہر قسم کے مفاد کی طلب کے ساتھ جو توکل اور شکر تحمد اور تخشع فرمایا ہے، اسی طرح تمام مسلمان بھی اس دعا کو پڑھ کر اپنی عاقل و بالغ معصوم و مخفی ذریت کے لیے ہر قسم کے مذکورۃ الصدر امور حسنہ میں حق نیابت ادا کرتے ہیں، اور اپنی تمام نسل کے لیے صراط نور سے انوار و برکات حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

(۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو درود سکھلانا جس میں خود حضور پر اور آپ کے اہل بیت پر آپ کے آباء پر اور تمام سلاسل ایمانیہ پر جو درود و سلام بھیجا جاتا ہے۔ وہ ہمارے اس دعوی کا مزید ثبوت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اس قسم کی دعاؤں کے الہام ہونے کا راز یہی تھا کہ مسلمان اپنی ہر حاجت اور ہر استدعا میں تقریباً اسی اسلوب جماعت کو ملحوظ رکھیں اور علماً و عملاً دعاءً و قلباً تمام مومنین۔ المومن کالبنیان یشد بعضھم بعضاً کے مصداق ہوں۔

(۱۰) حدیث شریف میں جو مادۂ منویہ کے شر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استعاذہ فرمایا ہے اس سے بھی مستنبط ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر وہی عہد الست کا الخ اور اسی استعاذہ سے یہ حقیقت مخفیہ اچھی طرح روشنی میں آجاتی ہے کہ بندۂ مومن و مصلی ایاک نعبد و ایاک نستعین میں نہ صرف اپنی ذریت موجودہ ہی کی طرف سے حق عبادت و استعانت

استعمال کرتا ہے اور نہ صرف تمام دنیا کے مسلمانوں کی نسبت کرتا ہے بلکہ اس کی صلب میں جو ذریت چھپی ہوئی ہے اس کی طرف سے بھی باعتبار مایکون وما یؤول کے انسان نعبد و نستعین کہہ کر اپنی ذریت مخفیہ غیبیہ کو اپنے ساتھ شامل کرتا ہے اور اس طرح اپنا جماعتی علاقہ دونوں عالموں سے یکساں پیدا کرتا ہے۔

(۱۱) پس یہ اسلوب جمعیت کس قدر پر اعجاز اسلوب ہے جس میں الدین یسّر کی پوری پوری تفسیر مضمر ہے اور نعبد و نستعین کیسے جامع اور مختصر جملے ہیں کہ انسان محض ان دو جملوں کو ادا کر لینے سے عالم غیب اور شہادت کے تمام امور حسنہ کو بآسانی لے سکتا ہے اور چاہے قصد کرے یا نہ کرے مگر یہ جامعیت بیان ہر دو عالم کے بہترین مقاصد کو غیر اختیاری صورت سے مراد بنا دیتی ہے لیکن اگر خدا کی طرف سے ایسا اسلوب استدعانہ سکھلایا جاتا بلکہ ہر دو عالموں کے جملہ مقاصد کو وقت استدعا الگ الگ بیان کرنے کا مکلف اگر خود بندہ ہی کو قرار دیا جاتا تو ہمارے خیال میں علاوہ دقت و زحمت و طوالت کے عمر نوح بھی بیان مقاصد کے لیے انسان کو کافی نہ ہوتی اور اب صورت حال یہ ہے کہ صرف نعبد و نستعین واہدنا کہہ لینے سے پھر کسی لمبی چوڑی استدعا کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ہے بلکہ تمام مقاصد حسنہ کا حل عبادات و معاملات کی انہی دو آیتوں میں انسان کو نظر آجاتا ہے۔

(۱۲) یہی اسلوب جمعیت وہ پر اعجاز اسلوب ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دیگر انبیا علیہم السلام نے بھی اپنی دعاؤں میں ملحوظ و مرعی رکھا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو تعمیر کرتے وقت دعا کی تو اس طرح کی رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِىۡ وَمَا نُعۡلِنُ‌ؕ وَمَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ یعنی اے ہمارے پروردگار تو جانتا ہے جو کچھ کرتے ہیں ہم چھپا کر اور جو کچھ کرتے ہیں ہم دکھا کر اور مخفی نہیں اللہ پر کوئی چیز زمین میں نہ آسمان میں یعنی پروردگار عالم ہماری ظاہر اور پوشیدہ سب چیزوں کو ایسی ہی طرح دیکھتا ہے جیسے آئینہ میں ہم اپنا منہ دیکھتے ہیں۔ باقی

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

۵

۲۔ پردہ

پردے کا مسئلہ بھی سود کے مسئلہ کی طرح ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں قریب قریب نصف صدی سے چھڑا ہوا ہے، لیکن جس طرح سود کی بحث کا آغاز ایک بنیادی غلطی کے ساتھ ہوا تھا اسی طرح پردے کی بحث کا آغاز بھی ایک بنیادی غلطی کے ساتھ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب میں بھی تجدد پسند مسلمانوں کے لیے اسلامی احکام کی علت اور ان کے مقاصد کو سمجھنا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا قبل اس کے کہ ہم ان احکام کی تفصیلات پر بحث کریں، اس بنیادی غلطی کو واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، تاکہ ذہن اس مسئلہ کو ایک صحیح نقطۂ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے مستعد ہو جائیں۔

تاریخی پس منظر اٹھارہویں صدی کا آخری اور انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا جب مغربی قوموں کی ملک گیری کا سیلاب ایک طوفان کی طرح اسلامی ممالک پر امنڈ آیا، اور مسلمان ابھی نیم خفتہ و نیم بیدار ہی تھے کہ دیکھتے دیکھتے یہ طوفان مشرق سے لے کر مغرب تک تمام دنیائے اسلام پر چھا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک پہنچتے پہنچتے بیشتر اسلامی قومیں یورپ کی غلام ہو چکی تھیں اور جو غلام نہ ہوئی تھیں وہ بھی مغلوب و مرعوب ضرور ہو گئی تھیں۔ جب اس انقلاب کی تکمیل ہو چکی تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔ وہ قومی غرور جو صدہا برس تک جہانبانی و کشورکشائی کے میدان میں سربلند رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا، دفعۃً خاک میں مل گیا، اور اس شرابی کی طرح جس کا نشہ

کسی طاقت اور دشمن کی پیہم ضربات نے اتار دیا ہو۔ انہوں نے اپنی شکست اور فرنگیوں کی فتح کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا لیکن ابھی دماغ درست نہیں ہوا تھا۔ گو نشہ اتر گیا تھا، مگر عقل کا توازن ابھی تک بگڑا ہوا تھا۔ ایک طرف ذلت کا شدید احساس تھا جو اس حالت کو بدل دینے پر اصرار کر رہا تھا۔ دوسری طرف صدیوں کی آرام طلبی اور سہولت پسندی تھی جو تبدیل حالت کا سب سے آسان اور سب سے زیادہ قریب کا راستہ ڈھونڈھنا چاہتی تھی۔ تیسری طرف سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی زنگ خوردہ قوتیں تھیں جن سے کام لینے کی عادت سالہا سال سے چھوٹی ہوئی تھی۔ چوتھی جانب مرعوبیت اور دہشت زدگی تھی جو ہر شکست خوردہ غلام قوم میں فطرۃً پیدا ہو جاتی ہے۔ ان سب چیزوں نے مل جل کر اصلاح پسند مسلمانوں کو بہت سی عقلی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا کر دیا۔ ان میں سے اکثر تو اپنی پستی اور یورپ کی ترقی کے حقیقی اسباب سمجھ ہی نہ سکے اور جنہوں نے ان کو سمجھا، ان میں بھی اتنی ہمت، جفاکشی اور مجاہدانہ اسپرٹ نہ تھی کہ ترقی کے دشوار گذار راستوں کو اختیار کرتے۔ مرعوبیت اس پر مستزاد تھی جس میں دونوں گروہ برابر کے شریک تھے۔ اس بگڑی ہوئی ذہنیت کے ساتھ ترقی کا سہل ترین راستہ جو ان کو نظر آیا وہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن کے مظاہر کا عکس اپنی زندگی میں اتار لیں اور اس آئینہ کی طرح بن جائیں جس کے اندر باغ و بہار کے مناظر تو سب کے سب موجود ہوں مگر درحقیقت نہ باغ ہو، نہ بہار۔

ذہنی غلامی | یہی بحرانی کیفیت کا زمانہ تھا جس میں مغربی لباس، مغربی معاشرت، مغربی آداب و اطوار حتیٰ کہ چال ڈھال اور بول چال تک میں مغربی طریقوں کی نقل اتاری گئی، اسلامی سوسائٹی کو مغربی سانچوں میں ڈھالنے کی کوششیں کی گئیں۔ الحاد و دہریت اور مادہ پرستی کو فیشن کے طور پر بغیر سمجھے بوجھے قبول کیا گیا۔ ہر وہ پختہ یا خام تخیل جو مغرب سے آیا، اس پر ایمان بالغیب لانا اور اپنی مجلسوں میں اس کو موضوع بحث بنانا روشن خیالی کا لازمہ سمجھا گیا۔ شراب، جوا، لاٹری، ریس، تھیٹر

رقص و سرود اور مغربی تہذیب کے دوسرے ثمرات کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ معاشرت، تمدن، اخلاق، معیشت، سیاست، قانون حتیٰ کہ مذہب کے متعلق بھی جتنے مغربی نظریات یا عملیات تھے ان کو کسی تنقید اور کسی فہم و تدبر کے بغیر اس طرح تسلیم کر لیا گیا کہ گویا وہ آسمان سے اتری ہوئی آیات ہیں جن پر سمعنا و اطعنا کہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ اسلامی تاریخ کے واقعات، اور اسلامی شریعت کے احکام، اور قرآن و حدیث کے بیانات میں سے جس جس چیز کو اسلام کے پرانے دشمنوں نے نفرت یا اعتراض کی نگاہ سے دیکھا اس پر مسلمانوں کو بھی شرم آنے لگی، اور انہوں نے کوشش کی کہ اس داغ کو کسی طرح دھو ڈالیں۔ انہوں نے جہاد پر اعتراض کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور بھلا ہم کہاں اور جہاد کہاں؟ انہوں نے غلامی پر اعتراض کیا۔ انہوں نے کہا کہ غلامی تو ہمارے ہاں بالکل ہی ناجائز ہے۔ انہوں نے تعداد ازدواج پر اعتراض کیا۔ انہوں نے قرآن کی ایک آیت پر خط نسخ پھیر ڈالا۔ انہوں نے کہا کہ عورت اور مرد میں کامل مساوات ہونی چاہیے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہی ہمارا مذہب بھی ہے۔ انہوں نے قوانین نکاح و طلاق پر اعتراضات کیے۔ یہ ان سب میں ترمیم کر دینے پر تل گئے۔ انہوں نے کہا کہ سود کی حرمت معاشی اصول کے بالکل خلاف ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو صرف سود در سود حرام ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آرٹ کا دشمن ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام ہمیشہ سے ناچ گانے اور مصوری و بت تراشی کی سرپرستی کرتا رہا ہے۔

مسئلہ حجاب کی ابتدا | اسلام کی تاریخ میں یہ دور سب سے زیادہ شرمناک ہے، اور یہی دور ہے جس میں پردے کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ اگر سوال محض اس قدر ہوتا کہ اسلام میں عورت کے لیے آزادی کی کیا حد مقرر کی گئی ہے تو جواب کچھ بھی مشکل نہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ جو اختلاف اس باب میں پایا جاتا ہے وہ محض اس حد تک ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولنا جائز ہے یا نہیں، اور یہ کوئی اہم اختلاف نہیں ہے۔ لیکن دراصل یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مسلمانوں میں یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوا ہے کہ یورپ نے

حرم" اور پردہ و نقاب کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اپنے لٹریچر میں اس کی نہایت گھناونی اور مضحکہ انگیز تصویریں کھینچیں، اور اسلام کے عیوب کی فہرست میں عورتوں کی "قید" کو نمایاں جگہ دی۔ ایسا کیونکر ممکن تھا کہ مسلمانوں کو حسب دستور اس چیز پر بھی شرم نہ آنے لگتی؟ انہوں نے جو کچھ جہاد اور غلامی اور تعدد ازدواج اور سود اور ایسے ہی دوسرے مسائل میں کیا تھا، وہی اس مسئلہ میں بھی کیا، قرآن اور حدیث اور اجتہادات ائمہ کی ورق گردانی محض اس غرض سے کی گئی کہ وہاں اس "بدنما داغ" کو دھونے کے لیے کچھ سامان ملتا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض ائمہ نے ہاتھ اور منہ کھولنے کی اجازت دی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ عورت میدان جنگ میں سپاہیوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے بھی جا سکتی ہے، مسجدوں میں نماز کے لیے جانے اور علم سیکھنے اور درس دینے کی بھی گنجائش پائی گئی۔ بس اتنا مواد کافی تھا۔ دعویٰ کر دیا گیا کہ اسلام نے عورت کو پوری آزادی عطا کی ہے۔ پردہ محض ایک جاہلانہ رسم ہے جس کو تنگ نظر اور تاریک خیال مسلمانوں نے قرون اولیٰ کے بہت بعد اختیار کیا ہے۔ قرآن اور حدیث پردہ کے احکام سے خالی ہیں۔ ان میں تو صرف شرم و حیا کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے، کوئی ایسا ضابطہ نہیں بنایا گیا جو عورت کی نقل و حرکت پر کوئی قید عائد کرتا ہو۔

اصل محرکات انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اپنی زندگی کے معاملات میں جب وہ کوئی مسلک اختیار کرتا ہے تو عموماً اس کے انتخاب کی ابتدا ایک جذباتی غیر عقلی رجحان سے ہوتی ہے، اور اس کے بعد وہ اپنے اس رجحان کو معقول ثابت کرنے کے لیے عقل و استدلال سے مدد لیتا ہے۔ پردے کے معاملہ میں ایسی ہی صورت پیش آئی ہے۔ اس کی ابتدا کسی عقلی یا شرعی ضرورت کے احساس سے نہیں ہوئی، بلکہ اس رجحان سے ہوئی ہے جو ایک غالب قوم کے خوشنما تمدن سے متاثر ہونے اور اسلامی تمدن کے خلاف اس قوم کے پروپیگنڈا سے مرعوب ہو جانے کا نتیجہ ہے۔

ہمارے اصلاح طلب حضرات کی ذہنی کیفیت سے آپ اوپر روشناس ہو چکے ہیں۔ اس ذہنیت کے ساتھ جب انہوں نے فرنگی عورتوں کی زینت و آرایش اور ان کی آزادانہ نقل و حرکت، اور فرنگی معاشرت میں ان کی سرگرمیوں کو دیکھا تو اضطراری طور پر ان کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ہماری عورتیں بھی اسی روش پر چلیں تاکہ ہمارا تمدن بھی فرنگی تمدن کا ہم سر ہو جائے۔ پھر وہ آزادیٔ نسواں، اور تعلیم اناث، اور مساوات مرد و زن کے ان جدید نظریات سے بھی متاثر ہوئے، جو طاقتور استدلالی زبان اور شاندار طباعت کے ساتھ بارش کی طرح مسلسل ان پر برس رہے تھے اس لٹریچر کی زبردست طاقت نے ان کی قوتِ تنقید کو ماؤف کر دیا اور ان کے وجدان میں یہ بات اتر گئی کہ ان نظریات پر ایمان بالغیب لانا اور تحریر و تقریر میں ان کی وکالت کرنا اور (بقدر جرأت و ہمت) عملی زندگی میں بھی ان کو رائج کر دینا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو "روشن خیال" کہلانا پسند کرتا ہو اور "دقیانوسیت" کے بدترین الزام سے بچنا چاہتا ہو۔ اس پر مزید وہ جذبۂ شرم و ندامت تھا، جو پردہ و نقاب کے خلاف یورپ کے پروپگنڈا سے پیدا ہوا تھا۔

انیسویں صدی کے آخری زمانے میں آزادیٔ نسواں کی جو تحریک مسلمانوں میں پیدا ہوئی اس کے اصلی محرک بھی جذبات و رجحانات ہیں۔ بعض لوگوں کے شعور خفی میں یہ جذبات چھپے ہوئے تھے اور ان کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ دراصل کیا چیز انہیں اس تحریک کی طرف لے جارہی ہے۔ یہ لوگ خود اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا تھے۔ دوسری طرف بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جن کو خود اپنے ان جذبات کا بخوبی احساس تھا، مگر انھیں اپنے اصلی جذبات کو ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ یہ خود تو دھوکے میں نہ تھے لیکن انہوں نے دنیا کو دھوکا دینے کی کوشش کی۔ بہر حال دونوں گروہوں نے کام ایک ہی کیا اور وہ یہ تھا کہ اپنی تحریک کے اصل محرکات کو چھپا کر اس کو ایک جذباتی تحریک کے بجائے ایک عقلی تحریک بنانے کی کوشش کی عورتوں کی صحت، ان کے عقلی و علمی ارتقا، ان کے فطری اور

پیدائشی حقوق، ان کے معاشی استقلال، مردوں کے ظلم و استبداد سے ان کی رہائی، اور قوم کا نصف حصہ ہونے کی حیثیت سے ان کی ترقی پر پورے تمدن کی ترقی کا انحصار، اور ایسے ہی دوسرے حیلے جو براہ راست یورپ سے درآمد ہوئے تھے اس تحریک کی تائید میں پیش کیے گئے تاکہ مسلمان دھوکے میں مبتلا ہوجائیں، اور ان پر یہ حقیقت نہ کھل سکے کہ اس تحریک کا اصل مقصد مسلمان عورت کو اس روش پر چلانا ہے جس پر یورپ کی عورت چل رہی ہے، اور نظام معاشرت میں اُن طریقوں کی پیروی کرنا ہے جو اس وقت فرنگی قوموں میں رائج ہیں۔

سب سے بڑا فریب لیکن سب سے زیادہ شدید اور فضیح فریب جو اس سلسلہ میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث سے استدلال کرکے اس تحریک کو اسلام کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ دونوں کے مقاصد اور تنظیم معاشرت کے اصولوں میں زمین و آسمان کا بعد ہے۔ اسلام کا اصل مقصد جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، انسان کی شہوانی قوت (Sex energy) کو اخلاقی ڈسپلن میں لاکر اس طرح منضبط کرنا ہے کہ وہ آوارگی عمل اور ہیجان جذبات میں ضائع ہونے کے بجائے ایک پاکیزہ اور صالح تمدن کی تعمیر میں صرف ہو۔ برعکس اس کے مغربی تمدن کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے معاملات اور ذمہ داریوں میں عورت اور مرد کو یکساں شریک کیا جائے اور جنسی میلان کو ایسے فنون اور مشاغل میں استعمال کیا جائے جن سے کشمکش حیات کی تلخیاں لطف اور لذت میں تبدیل ہوجائیں مقاصد کے اس اختلاف کا لازمی نتیجہ تنظیم معاشرت کے طریقوں میں بھی اسلام اور مغربی تمدن کے درمیان اصولی اختلاف ہے۔ اسلام اپنے مقصد کے لحاظ سے معاشرت کا ایسا نظام وضع کرتا ہے جس میں عورت اور مرد کے دوائر عمل بڑی حد تک الگ کردیے گئے ہیں۔ دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط کو روکا گیا ہے اور ان تمام اسباب کا قلع قمع کیا گیا ہے جو اس نظم و ضبط میں برہمی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی تمدن کے پیش نظر جو مقصد ہے اس کا طبعی اقتضا یہ ہے کہ دونوں صنفوں کے درمیان

سے وہ تمام حجابات اٹھا دیے جائیں جو ان کے آزادانہ اختلاط اور ملاقات میں مانع ہوں اور ان کو ایک دوسرے کے حسن اور صنفی کی لات سے لطف اندوز نہ ہونے دیتے ہوں۔

اب ہر صاحب عقل انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ ایک طرف مغربی تمدن کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے قوانین کو اپنے لیے حجت بناتے ہیں وہ کس قدر سخت فریب میں خود مبتلا ہیں یا دوسروں کو مبتلا کر رہے ہیں۔ اسلامی نظم معاشرت میں تو عورت کے لیے آزادی کی آخری حد یہ ہے کہ حسب ضرورت ہاتھ اور منہ کھول سکے اور اپنی حاجات کے لیے گھر سے باہر نکل سکے۔ مگر یہ لوگ اس آخری حد کو اپنے سفر کا نقطۂ آغاز بناتے ہیں، اور ان منازل کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں جہاں حیا اور شرم بالائے طاق رکھدی جاتی ہے، ہاتھ اور منہ ہی نہیں بلکہ خوبصورت مانگ نکلے ہوئے سر، اور شانوں تک کھلی ہوئی بانہیں اور نیم عریاں سینے بھی نگاہوں کے سامنے پیش کیئے جاتے ہیں اور جسم کے باقی ماندہ محاسن کو بھی ایسے باریک کپڑوں میں ملفوف کیا جاتا ہے جن میں سے ہر جاذب نظر چیز دیکھی جاسکتی ہے پھر ان لباسوں اور آرائشوں کے ساتھ محرموں کے سامنے نہیں بلکہ دوستوں کی محفلوں میں بیویوں بہنوں اور بیٹیوں کو لایا جاتا ہے اور ان کو غیروں کے ساتھ ہنسنے بولنے اور کھیلنے میں وہ آزادی بخشی جاتی ہے جو مسلمان عورت اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی نہیں برت سکتی گھر سے نکلنے کی جو اجازت محض ضرورت کی قید اور کمال ستر پوشی و حیا داری کی شرط کے ساتھ دی گئی تھی اس کو جاذب نظر ساڑیوں، اور نیم عریاں بلاؤزوں، اور بے باک نگاہوں کے ساتھ سڑکوں پر پھرنے، پارکوں میں ٹہلنے، ہوٹلوں کے چکر لگانے اور سینماؤں کی سیر کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کو خانہ داری کے ماسوا زندگی کے دوسرے امور میں حصہ لینے کی جو مقید اور مشروط آزادی اسلام میں دی گئی تھی اس کو حجت بنایا جاتا ہے اس غرض کے لیے کہ مسلمان عورتیں بھی فرنگی عورتوں کی طرح حیات منزلی اور اس کی

ذمہ داریوں کو طلاق دے کر سیاسی، معاشی اور عمرانی سرگرمیوں میں حصہ لیں، اور مل کر ہر میدان میں مردوں کے ساتھ دوڑ دھوپ کریں۔ اور اس طرح اس پورے نظام معاشرت کو جو اسلام نے قائم کیا ہے بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی جگہ ایک دوسرا نظام معاشرت اختیار کیا جاتا ہے جو اپنے اصول اور مقاصد میں اسلامی نظام معاشرت کی بالکل ضد ہے۔ اور پھر اس فعل کی تائید میں استدلال کیا جاتا ہے قرآن و حدیث سے اور یقین دلایا جاتا ہے کہ ہم یہ سب کچھ اسلامی قانون ہی کی پیروی میں کر رہے ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی دجل و تلبیس اور فریب و دغا کی مثال دنیا میں کوئی اور ہو سکتی ہے؟

مغربی معاشرت کے اصول مغربی نظم معاشرت جس کی پیروی یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں، اس کی بنیاد تین قاعدوں پر ہے۔

۱۔ عورتوں اور مردوں کی مساوات۔

۲۔ عورتوں کا معاشی استقلال۔

۳۔ دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط۔

ان تین بنیادوں پر معاشرت کو از سر نو منظم کرنے کا تخیل اگرچہ انقلاب فرانس کے اثر سے پیدا ہوا تھا مگر عملاً یہ تنظیم انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی۔ جیسا کہ اس قسم کی تمام غیر متوازن اور غیر معتدل تنظیمات کا قاعدہ ہے، اس نئی تنظیم سے بھی ابتدا میں بہت خوشگوار نتائج ظاہر ہوئے۔ عورتوں میں اعلیٰ تعلیم پھیلی۔ سوسائٹی میں ان کا مرتبہ جس کو مسیحیت نے بہت گرا دیا تھا، بلند ہوا۔ بہت سے معاشرتی و تمدنی حقوق جو ان سے سلب کر لیے گئے تھے ان کو حاصل ہو گئے۔ انہوں نے گھروں کو سنوارا۔ معاشرت میں نفاست پیدا کی۔ رفاہ عام کے بہت سے مفید کام انجام دیے۔ صحت عامہ کی ترقی، بچوں کی تعلیم و تربیت، بیماروں کی خدمت اور سوسائٹی کے بدنصیب طبقوں کو پستی کے گڑھے سے نکالنے کی کوششوں میں ان کا حصہ ناقابل انکار رہا۔ لیکن اس کے بعد انسانی

فطرت کے مقتضیات جن کی طرف سے ابتدا میں آنکھیں بند کر لی گئی تھیں، اپنے طبیعی نتائج کے ساتھ رفتہ رفتہ ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ ابتدائی مراحل سے گذرنے کے بعد عورتوں نے سیاست اور معیشت کے وسیع تر میدانوں میں قدم رکھا، اور اس خارزار کی طرف پیش قدمی شروع کی جس کو بیداری اناث اور حریت نسواں کے بہت خوشنما ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اس دور کا آغاز ہوا جس میں انتخابات کی جد و جہد، دفتروں اور کارخانوں کی ملازمتیں، تجارت، صنعت و حرفت اور آزاد پیشوں میں مردوں کے ساتھ مسابقت، کھیلوں اور ورزشوں کی دوڑ دھوپ، سوسائٹی کے تفریحی مشاغل میں ایک عنصر لطیف کی حیثیت سے شرکت، کلب اور اسٹیج اور رقص و سرود کی سرگرمیاں عورت کی زندگی کے اہم تر اجزاء بن گئیں، اور گھر کی تنظیم، حیات ازدواجی کی ذمہ داریاں، بچوں کی تربیت اور خاندان کی خدمت اس کے لائحۂ عمل سے خارج ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ان امور سے اس کی دلچسپی کم ہوتے ہوتے نفرت و استکراہ کی حد تک پہنچ گئی۔ اس دور کو محض ایک اتفاقی دور نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ طبیعی نتیجہ ہے ان اساسی قاعدوں کا جن پر معاشرت کے اس جدید نظم کی بنا رکھی گئی ہے۔ آپ خواہ اس کا ارادہ کریں یا نہ کریں، بہرحال یہ دور ہر اس نظم میں آئے گا جو ان بنیادوں پر قائم ہو۔

اصول مذکورہ کے نتائج عملی زندگی میں مذکورۂ بالا اصول ثلثہ کو نافذ کرنے سے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں۔

۱۔ معاشی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں میں عورت کے انہماک نے اس کو ان وظائف کی بجا آوری سے غافل کر دیا ہے جو فطرت نے اس کے اور صرف اسی کے سپرد کیے ہیں اور جن کی بجا آوری پر نہ صرف تمدن کے بقا بلکہ نوع انسانی کے بقا کا انحصار ہے۔ عورت کی ذمہ داریوں اور دلچسپیوں کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جاتا ہے اتنا ہی عائلی زندگی (Family life

ت۔ اس کا اشتراک اور ازدواجی ذمہ داریوں سے اس کا نفور اور افزائش نسل سے اس کا انحراف بھی بڑھتا جاتا ہے۔ خاندان جو دراصل تمدن کا سنگ بنیاد ہے منتشر ہو رہا ہے نکاح کا رشتہ جو تمدن کی خدمت میں مرد اور عورت کے تعاون کی صحیح صورت ہے کمزور ہوتا چلا جارہا ہے گھر جو کبھی سکون اور راحت کی جنت تھے، دوزخ بنتے جارہے ہیں۔ اور نسلوں کی افزائش کو برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اولاد کے ذریعہ سے روکا جارہا ہے۔

۲۔ عورت کے معاشی استقلال (Economic independece) نے اس کو مرد سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ قدیم اصول کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے اب اس نئے قاعدے سے بدل گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کمائیں، اور گھر کا انتظام بازار کے سپرد کر دیا جائے۔ اس انقلاب کے بعد دونوں کی زندگی میں بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ایسا ربط باقی نہیں رہا جو ان کو ایک دوسرے سے وابستہ ہونے پر مجبور کرتا ہو، اور محض شہوانی خواہشات کو پورا کرنا کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے جس کی خاطر وہ اپنے آپ کو ایک دائمی تعلق کی گرہ میں باندھنے اور ایک گھر بنانے پر آمادہ ہوں۔ جو عورت آزادی کے ساتھ اپنی روٹی آپ مہیا کرتی ہے اور اپنی تمام ضروریات کی خود کفیل ہے، اور اپنی زندگی میں کسی دوسرے کی حفاظت اور اعانت کی محتاج نہیں ہے وہ محض اپنی شہوانی خواہش کے لئے ایک شوہر کی بیوی بننے اور اپنے اوپر بہت سی قانونی اور اخلاقی پابندیاں عائد کر لینے اور ایک خاندان کی ذمہ داریوں کا بار سنبھالنے کے لیے کیوں مجبور ہو، درآنحالیکہ وہ اپنی اس خواہش کی تسکین کے لیے دوسرے آسان طریقے بھی اختیار کر سکتی ہے جن میں کسی قسم کی ذمہ داریاں اس پر عائد نہیں ہوتیں۔ آزاد شہوت رانی اب کوئی معیوب فعل نہیں رہا۔ دنیا ایسی عورت کو (Society woman) کے قابل فخر نام سے یاد کرتی ہے۔ اس کام میں اگر کوئی خطرہ ہے

تو صرف حرامی بچے کی پیدائش کا ہے سو اس سے بچنے کے لیے برتھ کنٹرول کے ذرائع موجود ہیں۔ ان ذرائع کے باوجود اگر حمل ٹھیر جائے تو اس کو ساقط کیا جا سکتا ہے۔ اگر اسقاط میں بھی کامیابی نہ ہو تو بچے کو خاموشی کے ساتھ قتل کیا جا سکتا ہے۔ اگر جذبہ مادری نے (جو ابھی بالکل فنا نہیں ہوا ہے) بچے کو ہلاک کرنے سے بھی روک دیا تو حرامی بچے کی ماں بن جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اب "کنواری ماں" کی حمایت میں اتنا پروپگنڈا ہو چکا ہے کہ سوسائٹی اس کو کچھ زیادہ نفرت کی نظر سے نہیں دیکھتی۔

یہ وہ چیز ہے جس نے مغربی معاشرت کی جڑیں ہلا دی ہیں۔ آج ہر ملک میں لاکھوں جوان عورتیں تجرد پسند ہیں جن کی زندگیاں آزاد شہوت رانی میں بسر ہو رہی ہیں۔ ان سے بہت زیادہ تعداد ان عورتوں کی ہے جو عارضی میلان کے اثر سے شادیاں کرتی ہیں۔ مگر چونکہ اب شہوانی تعلق کے سوا مرد اور عورت کے درمیان کوئی احتیاجی ربط باقی نہیں رہا ہے، نہ شوہر اپنی خانگی راحت کے لیے بیوی کا محتاج ہے اور نہ بیوی اپنی بسر اوقات کے لیے شوہر کی محتاج، اس لیے مناکحت کے رشتہ میں اب کوئی پائداری نہیں رہی۔ میاں اور بیوی جو ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو چکے ہیں آپس کے تعلقات میں کسی مراعات باہمی اور مدارات (Compromise) کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایک ادنیٰ وجہ اختلاف اُن کو ایک دوسرے سے جدا کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر نکاحوں کا انجام طلاق یا تفریق پر ہوتا ہے۔ منع حمل اور اسقاط اور قتل اولاد کی کثرت اور حرامی بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد بھی بڑی حد تک اسی سبب کی رہین منت ہے۔ زنا اور امراض خبیثہ کی ترقی میں بھی اس کا دخل کچھ کم نہیں۔

۲۔ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے عورتوں میں حسن کی نمائش، عریانی

اور بے حیائی کو غیر معمولی ترقی دیدی ہے۔ جنسی میلان عورت اور مرد کی فطرت میں یکساں ودیعت کیا گیا ہے۔ اور دونوں صنفوں کے آزادانہ میل جول میں اس کا حد اعتدال سے بڑھ جانا یقینی ہے۔ ایسے ماحول میں ہر عورت اور ہر مرد میں فطرۃً یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ صنف مقابل کے لیے زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بنے۔ یہ چیز ابتدا میں محض زینت و آرائش کی حد تک تھی۔ مگر رفتہ رفتہ اس نے عریانی کی صورت اختیار کرلی۔ عورتوں میں اپنے جسم کے پوشیدہ محاسن کو نمایاں کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ لباس مختصر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اس کو سینوں اور شانوں اور پنڈلیوں کے لیے مستقل طور پر جگہ خالی کردینی پڑی مگر عورتوں کا شوقِ نمائشِ حسن اس حد پر بھی نہ ٹھیرا غسل کے لباس میں برہنگی نے اس سے آگے قدم بڑھایا اور اسٹیج پر تو ایک ذرا سے حصہ جسم کے سوا پورا جسم برہنہ کردیا گیا۔ عریانی کی نمائش نے "آرٹ" کی صورت اختیار کرلی۔ ادب کے نام سے بدترین قسم کا فحش لٹریچر شائع ہونے لگا ننگی تصویریں برسرعام فروخت ہونے لگیں۔ اور صنفی لٹریچر جو کبھی صرف طبی معلومات کے لیے لکھا جاتا تھا، ہر جوان مرد اور جوان عورت کے ہاتھوں میں پہنچنے لگا۔ فواحش اور امراض خبیثہ کی کثرت سب سے بڑھ کر اسی چیز کی منت کش ہے۔ جو لوگ ہر طرف سے شہوانی محرکات میں گھرے ہوئے ہوں جن پر ایک سخت ہیجان انگیز ماحول پوری طرح محیط ہو گیا ہو جن کے جذبات کو ہر آن ایک نئی تحریک اور ایک نئے اشتعال سے سابقہ پڑے، عریاں تصویریں، فحش لٹریچر، عشق و محبت کے فلم، ولولہ انگیز گانے، برانگیختہ کرنے والے ناچ، جن کے خون کو ہر وقت جوش میں لاتے رہیں اور پھر جن کو آزادی کے ساتھ صنفِ مقابل سے ملنے کے مواقع بھی حاصل ہوں اور داعیات نفس کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو وہ فرشتے نہیں ہیں کہ قعرِ دریا میں رہ کر بھی دامن تر نہ ہونے دیں۔

امریکہ کی مثال | یہ محض قیاسات نہیں ہیں، واقعات ہیں، ناقابل انکار حقائق ہیں۔ یہاں اس کا

موقع نہیں کہ شہادت میں ان تمام ممالک کے حالات پیش کیے جاسکیں جنہوں نے یہ طرز معاشرت اختیار کیا ہے۔ اختصار کو مدنظر رکھکر ہم صرف امریکہ کو مثال میں پیش کریں گے۔ اگرچہ ایک غیر قوم کے عیوب بیان کرنا کوئی خوشگوار کام نہیں ہے، لیکن کسی طرز معاشرت کے اصولوں کی تنقید اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ عملی زندگی میں ان اصولوں کو برتنے سے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں۔

بچوں پر ماحول کے اثرات جج بن لینڈسے (Ben Lindsey)جس کو ڈنور (Denver)کی عدالت جرائم اطفال (Juvenile Court)کا صدر ہونے کی حیثیت سے امریکہ کے نوجوانوں کی اخلاقی حالت سے واقف ہونے کا بہت زیادہ موقع ملا ہے اپنی کتاب (Revolt of Modrn Youth)میں لکھتا ہے کہ امریکہ میں بچے قبل از وقت بالغ ہونے لگے ہیں اور بہت کم عمر میں ان کے اندر صنفی احساسات بیدار ہو جاتے ہیں ۳۱۳ لڑکیاں جن کے حالات کی تحقیق اس نے کی، ان میں سے ۲۵۵ ایسی تھیں جو گیارہ اور تیرہ برس کے درمیان عمر میں بالغ ہو چکی تھیں اور ان کے اندر ایسی صنفی خواہشات اور ایسے جسمانی مطالبات کے آثار پائے جاتے تھے جو ایک ۱۸ برس اور اس سے بھی زیادہ عمر کی لڑکی میں ہونے چاہئیں[1]۔ ڈاکٹر ایڈتھ ہوکر (Hooker)اپنی کتاب (Laws of sex)میں لکھتا ہے کہ "نہایت مہذب اور دولت مند طبقوں میں بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ سات آٹھ برس کی لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں سے عشق و محبت کے تعلقات رکھتی ہیں جن کے ساتھ بسا اوقات مباشرت بھی ہو جاتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ :-

"ایک سات برس کی چھوٹی سی لڑکی جو ایک نہایت شائستہ خاندان کی چشم و

[1] صفحہ ۸۲ تا ۸۶ ۔

چراغ بھی خود اپنے بڑے بھائی اور اس کے چند دوستوں سے ملوث ہوئی۔ ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ پانچ بچوں کا ایک گروہ جو دو لڑکیوں اور تین لڑکوں پر مشتمل تھا اور جن کے گھر پاس پاس واقع تھے باہم شہوانی تعلقات میں وابستہ پائے گئے اور انہوں نے دوسرے ہم سن بچوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ ان میں سب سے بڑے بچے کی عمر صرف دس سال تھی۔ ایک اور واقعہ ایک ۹ سال کی بچی کا ہے جو بظاہر بہت حفاظت سے رکھی جاتی تھی۔ اس بچی کو متعدد "عشاق" کی منظور نظر ہونے کا فخر حاصل تھا۔[1]

بالٹیمور Baltimore کے ایک ڈاکٹر کی رپورٹ ہے کہ ایک سال کے اندر اس کے شہر میں ایک ہزار سے زیادہ ایسے مقدمات پیش ہوئے جن میں بارہ برس سے کم عمر کی لڑکیوں کے ساتھ مباشرت کی گئی تھی۔[2]

یہ پہلا ثمرہ ہے اس ہیجان انگیز ماحول کا جس میں ہر طرف جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اسباب فراہم ہو گئے ہیں۔ امریکہ کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ "ہماری آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ آج کل جن حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے وہ اس قدر غیر فطری ہیں کہ لڑکے اور لڑکیوں کو دس پندرہ برس کی عمر ہی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ عشق رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ نہایت افسوس ناک ہے۔ اس قسم کی قبل از وقت صنفی دلچسپیوں سے بہت برے نتائج رونما ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں۔ ان کا کم سے کم نتیجہ یہ ہے کہ نو عمر لڑکیاں اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں یا کم سنی میں شادیاں کر لیتی ہیں۔ اور اگر محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو خودکشی کر لیتی ہیں۔"

[1] صفحہ ۸۲۲

[2] صفحہ ۱۰۷

تعلیم گاہ کا مرحلہ اس طرح جن بچوں میں قبل از وقت صنفی احساسات بیدا رہو جاتے ہیں ان کے لیے پہلی تجربہ گاہ مدارس ہیں۔ مدرسے دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم ان مدرسوں کی ہے جن میں ایک ہی صنف کے بچے داخل ہوتے ہیں۔ دوسری قسم ان مدرسوں کی جن میں تعلیم مخلوط ہے۔

پہلی قسم کے مدرسوں میں صحبت ہم جنس (Homo sexuality) اور خود کاری (Masturbation) کی وبا پھیل رہی ہے، کیونکہ جن جذبات کو بچپن ہی میں ابھر کا جا چکا ہے، اور جن کو مشتعل کرنے کے سامان فضا میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، وہ اپنی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی صورت نکالنے پر مجبور ہیں۔ ڈاکٹر ہوکر لکھتا ہے کہ اس قسم کی تعلیم گاہوں، کالجوں، نرسوں کے ٹریننگ اسکولوں اور مذہبی مدرسوں میں ہمیشہ اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن میں ایک ہی صنف کے دو فرد آپس میں شہوانی تعلق رکھتے ہیں اور صنف مقابل سے ان کی دلچسپی فنا ہو چکی ہے[1]۔ ایک مرتبہ ایک مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر نے بہ خانداؤں کو خفیہ طریقہ سے اطلاع دی کہ ان کے لڑکے اب مدرسہ میں نہیں رکھے جا سکتے کیونکہ ان میں "بداخلاقی کی ایک خوفناک حالت" کا پتہ چلا ہے[2]۔ لاز آف سکس کے مصنف نے بکثرت واقعات ایسے بیان کیے ہیں جن میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ اور لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ملوث ہوئے اور دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔ بعض دوسری کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحبت ہم جنس کی وبا کس قدر کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔

اب دوسری قسم کے مدارس کو لیجیے جن میں لڑکیاں اور لڑکے ساتھ مل کر پڑھتے ہیں یہاں اشتعال کے اسباب بھی موجود ہیں اور اس کو تسکین دینے کے اسباب بھی جس

---

[1] Laws of sex P. 331

[2] Herself. by Dr Lowry. P.179

ہیجان جذبات کی ابتدا بچپن میں ہوئی تھی یہاں پہنچکر اس کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ بدترین قسم کا فحش لٹریچر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ عشقیہ افسانے، نام نہاد "آرٹ" کے رسالے، صنفی مسائل پر نہایت گندی کتابیں، اور برتھ کنٹرول کی معلومات فراہم کرنے والے مضامین۔ یہ ہیں وہ چیزیں جو عنفوان شباب میں مدرسوں اور کالجوں کے طالبین وطالبات کے لیے سب سے زیادہ جالب نظر ہوتی ہیں۔ مشہور امریکن مصنف Hendrich Van Loon کہتا ہے کہ "یہ لٹریچر جس کی سب سے زیادہ مانگ امریکن یونیورسٹیوں میں ہے گندگی، فحش اور بیہودگی کا بدترین مجموعہ ہے جو کسی زمانہ میں اس قدر آزادی کے ساتھ ملک میں پیش نہیں کیا گیا۔"[1] پھر دونوں صنفوں کے نوجوان آپس میں صنفیات پر نہایت آزادی اور بے باکی سے مباحثے کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد عملی تجربات کی طرف قدم بڑھایا جاتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں مل کر Petting parties کے لیے نکلتے ہیں جن میں شراب اور سگرٹ کا استعمال خوب آزادی سے ہوتا ہے اور ناچ رنگ سے پورا لطف اٹھایا جاتا ہے۔[2] لینڈسے کا اندازہ ہے کہ ہائی اسکول کی کم از کم ۴۵ فی صدی لڑکیاں مدرسہ چھوڑنے سے پہلے خراب ہو چکتی ہیں اور بعد کے تعلیمی مدارج میں اوسط اس سے بہت زیادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

"لڑکیاں خود اس چیز کے لیے اُن لڑکوں سے اصرار کرتی ہیں جن کے ساتھ وہ (تفریحی مشاغل کے لیے) جاتی ہیں، اور اس قسم کے ہیجانات کی طلب میں ایک پُر فریب طریقہ سے وہ اتنی ہی دراز دست (Aggressive) ہوتی ہیں جتنے خود لڑکے ہوتے ہیں۔"[2]

---

[1] How I can get married P. 172

[2] Revolt of Modern Youth. P. 57

دوسری جگہ لکھتا ہے کہ :—

"ہائی اسکول کا لڑکا بمقابلہ ہائی اسکول کی لڑکی کے اظہار جذبات کی شدت میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ عموماً لڑکی ہی پیش قدمی کرتی ہے، خواہ وہ کسی قسم کی ہو، اور لڑکا اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔" [1]

تین زبردست محرکات مدرسے اور کالج میں پھر بھی ایک قسم کا ڈسپلن ہوتا ہے جو کسی نہ کسی حد تک آزادیٔ عمل میں رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ نوجوان جب تعلیمگاہوں سے مشتعل جذبات، بگڑی ہوئی عادات اور ایک سراسر شہوانی ماحول میں پرورش کیا ہوا نظریۂ حیات لے کر زندگی کے وسیع تر عملی میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی شورش تمام حدود و قیود سے آزاد ہو جاتی ہے۔ یہاں ان کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے ایک پورا آتش خانہ موجود ہوتا ہے اور ان بھڑکے ہوئے جذبات کی تسکین کے لیے ہر قسم کا سامان بھی کسی وقت کے بغیر فراہم ہو جاتا ہے۔

ایک امریکن رسالہ میں ان اسباب کو، جن کی وجہ سے وہاں بداخلاقی کی غیر معمولی اشاعت ہو رہی ہے، اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"تین شیطانی قوتیں ہیں جن کی تثلیث آج ہماری دنیا پر چھا گئی ہے اور یہ تینوں ایک جہنم کی تخلیق کر رہی ہیں۔ فحش لٹریچر جو جنگِ عظیم کے بعد سے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنی بےشرمی اور کثرتِ اشاعت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ متحرک تصویریں جو شہوانی محبت کے جذبات کو نہ صرف بھڑکاتی ہیں بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں۔ عورتوں کا گرا ہوا اخلاقی معیار جو ان کے لباس اور بسا اوقات ان کی برہنگی، اور سگریٹ کے روز افزوں استعمال اور مردوں کے ساتھ ان کے ہر قید و امتیاز سے ناآشنا اختلاط

---

[1] Revolt of Modern Yuoth. P. 55

میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تین چیزیں ہمارے ہاں بڑھتی چلی جارہی ہیں اور ان کا نتیجہ مسیحی تہذیب و معاشرت کا زوال اور آخرکار کامل تباہی ہے۔ اگر ان کو نہ روکا گیا تو ہماری تاریخ بھی روم اور ان دوسری قوموں کے مماثل ہوگی جن کو یہی نفس پرستی اور شہوانیت ان کی شراب اور عورتوں اور ناچ رنگ سمیت فنا کے گھاٹ اتار چکی ہے۔

یہ تین اسباب جو تمدن و معاشرت کی پوری فضا پر چھائے ہوئے ہیں ہر اس جوان مرد اور جوان عورت کے جذبات میں ایک دائمی تحریک پیدا کرتے رہتے ہیں جس کے جسم میں تھوڑا سا بھی گرم خون موجود ہے۔ فواحش کی کثرت، اس تحریک کا لازمی نتیجہ ہے۔

فواحش کی کثرت جن عورتوں نے زناکاری کو مستقل پیشہ بنا لیا ہے ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ چار اور پانچ لاکھ کے درمیان ہے[1]۔ یہ شیطان کی باضابطہ فوج ہے۔ مگر امریکہ کی رنڈی کو ہندوستان کی رنڈی پر قیاس نہ کیجیے۔ وہ خاندانی رنڈی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی عورت ہے جو کل تک کوئی آزاد پیشہ کرتی تھی۔ بری صحبت میں خراب ہوگئی اور قحبہ خانے میں آن بیٹھی چند سال یہاں گذارے گی۔ پھر اس کام کو چھوڑ کر کسی دفتر یا کارخانہ میں ملازم ہو جائے گی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ کی ۵۰ فی صدی رنڈیاں خانگی ملازموں (Domestic servants) میں سے بھرتی ہوتی ہیں اور باقی پچاس فی صدی ہسپتالوں دفتروں اور دوکانوں کی ملازمتیں چھوڑ کر آتی ہیں، عموماً پندرہ اور بیس سال کے درمیان عمر میں یہ پیشہ شروع کیا جاتا ہے اور پچیس تیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ عورت جو کل تک رنڈی تھی قحبہ خانے سے منتقل ہو کر کسی دوسرے آزاد پیشے میں چلی جاتی ہے[2]۔ اس سے اندازہ کیا

---

[1] Prostitution in the United States P. 38
[2] Prostitution in the United States. P. 64-69

جا سکتا ہے کہ امریکہ میں چار پانچ لاکھ رنڈیوں کی موجودگی درحقیقت کیا معنی رکھتی ہے۔

قحبہ خانوں کے علاوہ بکثرت Call Houses اور Assignation Houses ہیں، جو اس غرض کے لیے آراستہ رکھے جاتے ہیں کہ "شریف" اصحاب اور خواتین جب باہم ملاقات فرمانا چاہیں تو وہاں ان کی ملاقات کا انتظام کر دیا جائے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ایک شہر میں ایسے ۷۸ مکان تھے۔ ایک دوسرے شہر میں ۴۳۔ ایک اور شہر میں ۳۳[۱] ان مکانوں میں صرف بن بیاہی خواتین ہی نہیں جاتیں بلکہ بہت سی بیاہی ہوئی خواتین کا بھی وہاں گذر ہوتا رہتا ہے[۲] ایک مشہور ریفارمر کا بیان ہے کہ "نیویارک کی شادی شدہ آبادی کا پورا ایک تہائی حصہ ایسا ہے جو اخلاقی اور جسمانی حیثیت سے اپنی ازدواجی ذمہ داریوں میں وفادار نہیں رہے۔ اور نیویارک کی حالت ملک کے دوسرے حصوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں[۳]"۔

امریکہ کے مصلحین اخلاق کی ایک مجلس (Committee of fourteen) کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلس کی طرف سے بد اخلاقی کے مرکزوں کی تلاش اور ملک کی اخلاقی حالت کی تحقیقات اور اصلاح اخلاق کی عملی تدابیر کا کام بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے اس کی رپورٹوں میں بیان کیا گیا ہے کہ امریکہ کے جتنے رقص خانے، نائٹ کلب، Beauty Saloons، Hair Dressing اور Manicure - Shops، Massage ہیں قریب قریب سب کے سب باقاعدہ قحبہ خانے بن چکے ہیں، بلکہ ان سے بدتر

---

[۱] Prostitution in the United States. P. 138 - 39

[۲] Ibid. P. 96

[۳] Herself. by Dr. Lowrey. P. 116

کیونکہ وہاں ناقابل بیان افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

امراض خبیثہ | فواحش کی اس کثرت کا لازمی نتیجہ امراض خبیثہ کی کثرت ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ کی قریب قریب ۹۰ فی صدی آبادی ان امراض سے متاثر ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے سرکاری دواخانوں میں اوسطاً ہر سال آتشک کے ۲ لاکھ اور سوزاک کے ایک لاکھ ۶۰ ہزار مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ ۶۵۰ دواخانے صرف انہی امراض کے لیے مخصوص ہیں۔ مگر سرکاری دواخانوں سے زیادہ مرجوعہ پرائیویٹ ڈاکٹروں کا ہے جن کے پاس آتشک کے ۶۱ فی صدی اور سوزاک کے ۸۹ فی صدی مریض جاتے ہیں (ملاحظہ ہو جلد ۲۳ صفحہ ۴۵) تیس اور چالیس ہزار کے درمیان بچوں کی اموات صرف موروثی آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ دق کے سوا بقیہ تمام امراض سے جتنی موتیں واقع ہوتی ہیں ان سب سے زیادہ تعداد ان اموات کی ہے جو صرف آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ سوزاک کے متعلق ماہرین کا کم سے کم تخمینہ یہ ہے کہ ۶۰ فی صدی جوان اشخاص اس مرض میں مبتلا ہیں، جن میں شادی شدہ بھی ہیں اور غیر شادی شدہ بھی۔ امراض نسوان کے ماہرین کا متفقہ بیان یہ ہے کہ شادی شدہ عورتوں کے اعضاء جنسی پر جتنے آپریشن کیے جاتے ہیں ان میں سے ۷۵ فی صدی ایسی نکلتی ہیں جن میں سوزاک کا اثر پایا جاتا ہے۔[۱]

طلاق اور تفریق | ایسے حالات میں خاندان کا نظم اور ازدواج کا مقدس رابطہ قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے۔ آزادی کے ساتھ اپنی روزی کمانے والی عورتیں جن کو شہوانی ضروریات کے سوا اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی مرد کی ضرورت نہیں ہے، اور جن کو شادی کے بغیر آسانی کے ساتھ مرد مل بھی سکتے ہیں، شادی کو ایک فضول چیز سمجھتی ہیں۔ جدید فلسفہ اور مادہ پرستانہ خیالات

---

[۱] Laws of Sex. P. 204

نے ان کے وجدان سے یہ احساس بھی دور کر دیا ہے کہ شادی کے بغیر کسی شخص سے تعلقات رکھنا کوئی عیب یا گناہ ہے۔ سوسائٹی کو بھی اس ماحول نے اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ وہ ایسی عورتوں کو قابل نفرت یا ملامت نہیں سمجھتی۔ جج لنڈ سے امریکہ کی عام لڑکیوں کے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"میں شادی کیوں کروں۔ میرے ساتھ کی جن لڑکیوں نے گذشتہ دو سال میں شادیاں کی ہیں۔ ہر دس میں سے پانچ کی شادی کا انجام طلاق پر ہوا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس زمانہ کی ہر لڑکی محبت کے معاملہ میں آزادی عمل کا فطری حق رکھتی ہے۔ ہم کو منع حمل کی کافی تدبیریں معلوم ہیں۔ اس ذریعہ سے یہ خطرہ بھی دور کیا جا سکتا ہے کہ ایک حرامی بچے کی پیدائش کوئی پیچیدہ صورت حال پیدا کر دے گی۔ ہم کو یقین ہے کہ روایتی طریقوں کو اس جدید طریقہ سے بدل دینا کامن سنس کا مقتضا ہے۔"

ان خیالات کی بے شرم عورتوں کو اگر کوئی چیز شادی پر آمادہ کرتی ہے تو وہ صرف جذبۂ محبت ہے لیکن اکثر یہ جذبہ بھی دل اور روح کی گہرائی میں نہیں ہوتا، بلکہ محض ایک عارضی کشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خواہشات کا نشہ اتر جانے کے بعد زوجین میں کوئی الفت باقی نہیں رہتی مزاج اور عادات کی اونی ناموافقت ان کے درمیان منافرت پیدا کر دیتی ہے۔ آخر کار عدالت میں طلاق یا تفریق کا دعوی پیش ہو جاتا ہے۔ لنڈ سے لکھتا ہے کہ۔

"سنہ ۱۹۲۲ء میں ڈنور میں ہر شادی کے ساتھ ایک واقعہ تفریق کا پیش آیا۔ اور ہر دو شادیوں کے مقابلہ میں ایک مقدمہ طلاق کا پیش ہوا۔ یہ حالت محض ڈنور ہی کی نہیں ہے۔ امریکہ کے تقریباً تمام شہروں کی قریب قریب یہی حالت ہے۔"

پھر وہ کہتا ہے کہ :-

"طلاق اور تفریق کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں اور اگر یہی حالت رہی جیسی کہ امید ہے، تو غالباً ملک کے اکثر حصوں میں جتنے شادی کے لائسنس دیے جائیں گے اتنے ہی طلاق کے مقدمے پیش ہوں گے"[۱]

کچھ عرصہ ہوا کہ Detrcit کے اخبار (Free Press) میں ان حالات پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا ایک فقرہ یہ ہے۔

"نکاحوں کی کمی، طلاقوں کی زیادتی، اور نکاح کے بغیر مستقل یا عارضی ناجائز تعلقات کی کثرت یہ معنی رکھتی ہے کہ ہم حیوانیت کی طرف واپس جارہے ہیں، بچے پیدا کرنے کی فطری خواہش مٹ رہی ہے، پیداشدہ بچوں سے غفلت کی جارہی ہے، اور اس امر کا احساس رخصت ہو رہا ہے کہ خاندان اور گھر کی تعمیر، تہذیب اور آزاد حکومت کے بقا کے لیے ضروری ہے، بلکہ اس کے برعکس تہذیب اور حکومت کے انجام سے ایک بے دردانہ بے اعتنائی پیدا ہو رہی ہے"۔

طلاق و تفریق کی اس کثرت کا علاج اب یہ نکالا گیا ہے کہ Companionate marriage یعنی "آزمائشی نکاح" کو رواج دیا جائے۔ مگر یہ علاج اصل مرض سے بھی بدتر ہے آزمائشی نکاح کے معنی یہ ہیں کہ مرد اور عورت "پرانے فیشن" کی شادی کیے بغیر کچھ عرصہ تک باہم مل کر رہیں۔ اگر اس یکجائی میں دل سے دل مل جائے تو شادی کرلیں۔ ورنہ دونوں الگ ہو کر کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔ دوران آزمائش میں دونوں کو اولاد پیدا کرنے سے پرہیز کرنا لازم ہے، کیونکہ بچے کی پیدائش کے بعد ان کو باضابطہ نکاح کرنا پڑے گا۔ یہ وہی چیز ہے جس کا نام روس میں آزاد محبت (Free love) ہے۔

---

[۱] Revolt of Modern Yuoth P. 211-14

قومی خودکشی | نفس پرستی، ازدواجی ذمہ داریوں سے نفرت، خاندانی زندگی سے بیزاری، اور ازدواجی تعلقات کی ناپائیداری۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے عورت کے دل سے اُس جذبۂ مادری کو فنا کر دیا ہے جو نسوانی جذبات میں سب سے زیادہ اشرف و اعلیٰ روحانی جذبہ ہے اور جس کے بقاء پر نہ صرف تمدن و تہذیب بلکہ انسانیت کے بقا کا انحصار ہے۔ برتھ کنٹرول، اسقاطِ حمل اور قتلِ اطفال اسی جذبہ کی موت سے پیدا ہوئے ہیں۔ برتھ کنٹرول کی معلومات ہر قسم کی قانونی پابندیوں کے باوجود ممالکِ متحدہ امریکہ میں ہر جوان لڑکی اور لڑکے کو حاصل ہیں۔ منعِ حمل کا سامان بھی آزادی کے ساتھ دوکانوں پر فروخت ہوتا ہے۔ عام آزاد عورتیں تو درکنار مدرسوں اور کالجوں کی لڑکیاں بھی اس سامان کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہیں، تاکہ اگر ان کا دوست اتفاقاً اپنا سامان بھول آئے تو ایک پرلطف شام ضائع نہ ہونے پائے۔ جج لینڈسے لکھتا ہے:۔

"ہائی اسکول کی عمر والی ۴۹۵ لڑکیاں جنہوں نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ انکو لڑکوں سے صنفی تعلقات کا تجربہ ہو چکا ہے، ان میں سے صرف ۲۵ ایسی تھیں جن کو حمل ٹھیر گیا تھا۔ ان میں سے بعض تو اتفاقاً بچ گئی تھیں لیکن اکثر کو منعِ حمل کی ہوشمندانہ تدابیر کا کافی علم تھا۔ یہ واقفیت ان میں اتنی عام ہو چکی ہے کہ لوگوں کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے"[1]

کنواری لڑکیاں ان تدابیر کو اس لیے استعمال کرتی ہیں کہ ان کا عیب چھپا رہے۔ شادی شدہ عورتیں اس لیے ان سے استفادہ کرتی ہیں کہ بچہ کی پیدائش سے نہ صرف ان پر تربیت اور تعلیم کا بار پڑ جاتا ہے، بلکہ شوہر کو طلاق دینے کی آزادی میں بھی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، اور تمام عورتیں اس لیے ماں بننے سے نفرت کرنے لگی ہیں کہ زندگی کا پورا پورا لطف اٹھانے کے لیے

[1] Revolt of Modern Yuoth. P. 64

ان کو اس جنجال سے بچنے کی ضرورت ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ ان کے نزدیک بچے جننے سے ان کے حسن میں فرق آجاتا ہے[ے]۔ بہرحال اسباب خواہ کچھ بھی ہوں۔ ۹۵ فی صدی تعلقات مرد و زن ایسے ہی جن میں اس تعلق کے فطری نتیجہ کو منع حمل کی تدبیروں سے روک دیا جاتا ہے۔

باقی ماندہ پانچ فی صدی حوادث جن میں اتفاقاً حمل قرار پا جاتا ہے، ان کے لیے اسقاط اور قتل اطفال کی تدبیریں موجود ہیں۔ جج لنڈسے کا بیان ہے کہ امریکہ میں ہر سال کم از کم ۱۵ لاکھ حمل ساقط کیے جاتے ہیں۔ اور ہزار ہا بچے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیے جاتے ہیں[لے]۔

روس کی مثال یہ ہیں اس نظام معاشرت کے ثمرات جو مساوات مرد و زن، اور عورتوں کے معاشی استقلال، اور حریت نسوان کی تثلیث پر تعمیر کیا گیا ہے۔ ہم نے صرف امریکہ کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے لیکن کم و بیش یہی حال ان تمام ممالک کا ہے جنہوں نے ان اصول ثلاثہ پر اپنی معاشرت کی تنظیم کی ہے، خواہ وہ انگلستان ہو یا فرانس، یا جرمنی بلکہ ان سب سے زیادہ بدتر اخلاقی حالت روس کی ہے کیونکہ وہاں اس نظام معاشرت کی پشت پر ایک انتہا درجہ کا مادہ پرستانہ فلسفہ بھی موجود ہے جس نے تمام ان اخلاقی معیاروں کا خاتمہ کر دیا ہے جن پر ابتدائے آفرینش سے لیکر اب تک انسانی تہذیب و شرافت کی بنیاد قائم تھی۔ امریکہ اور یورپ ابھی تک برائے نام مسیحی ہیں اور مسیحی اخلاقیات کا کچھ نہ کچھ اثر وہاں موجود ہے۔ مگر روس اس چوغے کو بھی اتار کر کمیونسٹ ہو چکا ہے۔ ایک پکا کمیونسٹ مادیت کے سوا کسی مذہب یا کسی اخلاقی فلسفہ کا قائل نہیں، اور مادیت کی نگاہ میں اخلاق کوئی چیز نہیں۔ اخلاقی تصورات محض وہم ہیں جنکو بورژوا طبقہ نے اختراع کر لیا ہے۔ طبعی خواہشات اور ان کو پورا کرنے کے طبعی وسائل

[ے] Manhood and Marriage. by Macfaddan. P 82

[لے] Revolt of M[illegible]ern Youth. P. 220

ایک مادی حقیقت ہیں، اور ایک مادی حقیقت کو اپنے طبعی ڈھنگ پر ہی ظاہر ہونا چاہیے اس جدید فلسفہ نے روس میں جو نیا اخلاقی بلکہ درحقیقت غیر اخلاقی نظریہ پیدا کیا ہے اس کا نتیجہ آزاد محبت (Free Love) کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یعنی مرد اور عورت کے شہوانی تعلق میں قریب قریب وہی آزادی جو حیوانات کو حاصل ہے۔ لڑکیاں اور لڑکے بہائم کی طرح آزادی سے ساتھ ملیں۔ اگر چاہیں تو اپنے اس تعلق کو باضابطہ درج رجسٹر کرالیں، اور جب دل بھر جائے تین روبل (تقریباً ۴ آنہ) فیس داخل کرکے Zags office سے علیحدگی کا پروانہ حاصل کرلیں نکاح اور سفاح میں درحقیقت کوئی قانونی یا اخلاقی امتیاز نہیں، نہ ایک حلالی بچہ کسی حیثیت سے حرامی بچے سے ممتاز ہے۔

راستہ کدھر جارہا ہے | یہ آخری منزل ہے اس سفر کی جس کا آغاز محض منہ اور ہاتھ کھولنے کی شرعی اجازت سے کیا جارہا ہے۔ اسلام میں آزادی کی جو آخری حد ہے، وہ اس سفر کا پہلا قدم ہے، اور اس کا آخری قدم دوزخ کے دروازے پر ہے۔ آزادی نسواں کے حامی یہ سب کچھ سن کر ضرور کہینگے کہ حاشا وکلا، ہم اس حد تک جانے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتے مگر ہم کہتے ہیں آپ ارادہ فرمائیں یا نہ فرمائیں، جس ٹرین پر آپ سوار ہو رہے ہیں وہ تو اسی طرف جارہی ہے اور آخری منزل تک پہنچے بغیر نہ رکے گی۔ انیسویں صدی میں یورپ کے جن مفکرین نے اس تحریک کو جاری کیا تھا ان کے بھی حاشیہ خیال میں نہ تھا کہ یہ ٹرین اس منزل تک جائے گی۔ وہ سب اپنے مذہب کے بلند اخلاقی معیارات کو مانتے تھے اور ان کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ ان کی سوسائٹی اخلاقی پستی کے اس جہنم میں اتر جائے۔ لیکن انسانی فطرت کی اہم حقیقتوں کو نظر انداز کرکے جس غیر متوازن طرز معاشرت کی انہوں نے بنا ڈالی تھی اس کا طبعی انجام یہی تھا، اور اب اس انجام کو دیکھ لینے کے بعد جو لوگ اس راستے

چلیں گے وہ بھی خواہ کتنے ہی معصوم ارادوں کے ساتھ چلیں، آخر کار اسی انجام تک پہنچ کر رہیں گے۔ گذشتہ تیس چالیس سال کے اندر مغرب کی اس اندھی تقلید کے طفیل سے ابتدائی مراحل تو آپ طے کر چکے ہیں۔ آپ کی سوسائٹی میں بھی ایک اچھا خاصا ہیجان انگیز ماحول تیار ہو چکا ہے آپ کے پریس بدترین قسم کا فحش لٹریچر شائع کر رہے ہیں جس کو آپ کی نوجوان نسلیں شوق سے پڑھ رہی ہیں۔ عریاں تصویریں اور آبرو باختہ عورتوں کی شبیہیں ہر جوان لڑکے اور لڑکی تک پہنچتی ہیں۔ آپ کے گھروں میں گراموفون پر نہایت رکیک اور گندے بازاری گیت بج رہے ہیں۔ سینما میں روزانہ فحش کاری کا سبق دیا جا رہا ہے جہاں سے ہر جوان دل اپنے اندر عشق اور رومان کا بےچین ولولہ لے کر آتا ہے۔ آپ کی خواتین کے لباس میں آہستہ آہستہ عریانی بڑھ رہی ہے "سوشل لائف" میں عملی حصہ لینے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ معاشی استقلال کا سبق بھی ان کو دیا جا رہا ہے۔ سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کی طرف ان کے دل "ابھار" رہے ہیں۔ آپ کی خواتین اپنی ہر ادا سے ظاہر کر رہی ہیں کہ گھر کی چار دیواری سے نکل آنے کے لیے ان کے دل بےتاب ہیں۔ بہت سی خواتین اپنی فرنگی بہنوں کی طرح باہر آ چکی ہیں، اور جو نہیں آئی ہیں ان کے دل سے بھی حجاب اٹھتا جا رہا ہے۔ پردے میں رہنے کے باوجود اپنی زینت اور اپنے حسن کو مردوں کے سامنے ظاہر کر دینے کا کوئی امکانی موقع ہاتھ سے نہیں دیا جاتا۔ یہ سب آثار شہادت دے رہے ہیں کہ آپ کی ٹرین بھی اسی منزل مقصود کی طرف چل پڑی ہے جس کی طرف امریکہ اور یورپ کی ٹرین جا چکی ہے۔ پھر جب یا آپ کا راستہ ہے اور اس راستہ کی وہ منزل مقصود ہے، تو آپ اس کے لیے قرآن و حدیث سے پروانہ راہداری حاصل کرنے کی سعی کیوں فرماتے ہیں۔ جو قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا وہ تو اس راستہ پر ایک قدم بھی آپ کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ جو حدیث نبی عربی

علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے اس کو ساتھ لے کر تو آپ اس راستہ کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے۔ اگر آپ کو اسی طرف جانا ہے تو ایک دوسرا قرآن تصنیف کرنا ہوگا۔ ایک نیا مجموعہ احادیث وضع کرنا ہوگا۔ لیکن یہ تکلیف آخر آپ کیوں اٹھائیں۔ آسمان مغرب سے جو وحی نازل ہو رہی ہے کیا وہ کافی نہیں؟ (باقی)

مطبوعات

طلوع اسلام ماہوار رسالہ۔ زیر ادارت جناب سید نذیر نیازی صاحب۔ چندہ سالانہ صہ۔ نمبر ۲۵ میکلوڈ روڈ۔ لاہور۔

اردو زبان کی صحافت میں طلوع اسلام کے اجراء سے ایک بلند پایہ رسالہ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ ان تنوع پسند رسالوں میں سے نہیں ہے جن میں ہر رطب و یابس کو جمع کر دیا جاتا ہے بلکہ اس کا ایک خاص دائرۂ بحث اور ایک مخصوص خط مشی ہے جس کی پوری پابندی کی جاتی ہے۔ اس کا خاص موضوع عمرانیات ہے جو سیاسیات، معاشیات، تمدن و معاشرت اور تاریخ پر حاوی ہے۔ اس کی پالیسی عمرانی مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر کی نمایندگی ہے جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سید نذیر نیازی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بہترین پیداوار میں سے ہیں اور ان سے ہم امید کرتے ہیں کہ یہ رسالہ ان کی ادارت میں اپنے مقصد کو باحسن وجوہ پورا کرے گا۔ ترتیب اور مضامین کے انتخاب میں ابھی بہت کچھ اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے، خصوصاً جو بلند مقصد ان کے پیش نظر ہے وہ ایسے مضامین چاہتا ہے جو زیادہ تحقیق اور زیادہ غور و فکر کے بعد لکھے جائیں۔ عمرانیات پر معلومات فراہم کرنا اور رائج الوقت نظریات کی ترجمانی کر دینا آسان تر ہے۔ مگر عمرانی مسائل میں اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنا اور عمرانیات کو اسلامی سانچے میں ڈھال دینا بڑی وقت نظر اور اجتہادی قوت چاہتا ہے۔ یہ کام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف حکمت اسلامی اور اسرار شریعت پر گہری نظر ہو اور دوسری طرف عمرانیات

جدید یا محققانہ مقالہ کیا گیا ہو۔ لیکن یہ سب امور اس پر منحصر ہیں کہ ایڈیٹر کو ہم خیال مددگاروں کی ایک جماعت قلمی امداد کے لیے اور خوش مذاق اہل علم کی ایک وسیع تر جماعت رسالہ کی خریداری کے لیے بہم پہنچ جائے۔ بدقسمتی سے یہی دو چیزیں ہماری قوم میں مفقود ہیں اور انہی کا فقدان کام کرنے والوں کی ہمتیں پست کر رہا ہے۔ خدا کرے کہ اس باب میں سید نذیر نیازی صاحب کچھ خوش قسمت ثابت ہوں۔ (ا۔م)۔

Genuine Islam آل ملایا مسلم مشنری سوسائٹی کا ماہوار رسالہ۔ قیمت سالانہ پانچ روپیہ ملنے کا پتہ ۱۰۴۔ بی وکٹوریہ اسٹریٹ، سنگاپور۔

یہ ایک اعلیٰ معیار کا انگریزی رسالہ ہے۔ جو اپنی شان میں یورپ کے کسی بلند پایہ رسالہ سے کم نہیں ہے۔ مضامین کا معیار بھی بلند ہے۔ اور ان میں اچھے مضمون نگاروں نے صحیح اسلامی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ مارچ کے پرچہ میں جج پر دو مفید مقالے۔ ایک نومسلم مغربی خاتون الورا لائق سیلونی مسلمان کے قلم سے ہیں کلمہ طیبہ کے حقائق پر جسٹس ایم ٹی۔ اکبر کا مقالہ پڑھنے کے لائق ہے۔ مسٹر خالد لطیف گوبا کا مضمون "مشعل صداقت" اور مولنا عبدالعلیم صدیقی کا خطبہ "محاسن اسلام" اور ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر برلاس کا مقالہ "اخوت اسلامی" اور ڈاکٹر خیری کا مقالہ "کیا گوئٹے مسلمان تھا" بھی قابل دید ہیں۔ رسالہ کے آخر میں تمام عالم اسلام کی خبروں کے خلاصے ہوتے ہیں۔ (ا۔م)۔

The Islam انجمن خدام الدین لاہور کا نیم ماہی رسالہ۔ چندہ سالانہ دو روپیہ۔

مولنا احمد علی صاحب ناظم انجمن خدام الدین کئی سال سے تعلیمات اسلامی کی اشاعت کے لیے جو مخلصانہ کوششیں کر رہے ہیں، ان میں ایک تازہ اضافہ اس انگریزی ہفتہ وار پرچہ کا اجراء ہے۔ اس میں دینی تبلیغ کے علاوہ سیاسی معاملات میں بھی اسلامی نقطۂ نظر کی نمائندگی کی جاتی ہے۔

اور اسلامی تہذیب کے متعلق مفید علمی مضامین اس پر مزید ہیں۔ (ا-م)

سالنامہ شاہکار رسالہ شاہکار مذکور جس پر اس سے قبل ان صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے حال میں اپنا سالنامہ شائع کیا ہے۔ ۱۶۰ صفحات کا ضخیم پرچہ جو علمی و ادبی مضامین، افسانوں، نظموں، غزلوں اور تصویروں کی گوناگونی سے لبریز ہے۔ افسانوں میں خواجہ غلام السیدین صاحب کا افسانہ "قانونی مجرم" اپنے پاکیزہ اور بلند خیالات اور شایستہ انداز بیان کے لحاظ سے نہایت خوب ہے کاش ہمارے ادبی پرچے ایسے ہی افسانے شائع کیا کریں۔ شاہکار جیسے ستھرے رسالہ میں بعض ادنیٰ درجہ کی تصویریں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ خصوصاً "وادی گلفروش" والی تصویر تو اس قابل نہ تھی کہ اسے اس رسالہ میں جگہ دی جاتی۔ "آرٹ" انسان کے لطیف جذبات کو ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ ضرور ہے، مگر لطافت کا لازمی عنصر پاکیزگی ہے۔ بے حیائی اور عریانی ہرگز "آرٹ" نہیں ہے۔ اہل مغرب کی نفس پرستی نے جہاں دوسری بہت سی لطیف چیزوں کو گندہ کیا ہے، آرٹ بھی اسی گندگی میں آلودہ ہو کر رہ گیا ہے۔ وہاں ہر بے حیائی کا نام آرٹ ہے، اور جب کسی چیز کو اس مقدس نام سے موسوم کر دیا جائے تو وہ خواہ کتنی ہی پایۂ تہذیب سے گری ہوئی ہو، کوئی اس پر حرف گیری نہیں کر سکتا۔ برہنہ تصویریں، ننگے ناچ رکیک جذبات کو انتہائی شدت کے ساتھ ظاہر کرنے والی ایکٹنگ اور ایسی ہی بہت سی چیزیں محض آرٹ کا لیبل لگ جانے کی بدولت اخلاقی احتساب کی گرفت سے آزاد ہو گئی ہیں لیکن ہماری درماندہ قوم کو ابھی بہت کچھ تعمیری کام کرنا ہے۔ اسے ایک زوال پذیر تہذیب کے ان تباہ کن کھلونوں سے دور ہی رکھنا بہتر ہے قیمت ۸؍ علاوہ محصول ڈاک۔ ملنے کا پتہ دفتر شاہکار، لاہور۔ (ا-م)۔

استقلال ہفتہ وار، زیر ادارت مولانا سلطان الحق صاحب قاسمی وغیرہ۔ چندہ سالانہ تین روپیہ مقام اشاعت دیوبند ضلع سہارنپور۔

ماہنامہ دیوبند کی صحافی سرگرمیوں میں اس اخبار کا اجرا ایک جدید اضافہ ہے۔ مذہبی اور سیاسی مسائل پر سنجیدہ اظہار خیال اور دارالعلوم کے مقاصد کی حمایت اس کا مسلک ہے۔ (ا-م)

الرضوان ماہوار۔ زیر ادارت جناب محمد عسکری صاحب نقوی۔ چندہ سالانہ چار روپیہ مقام اشاعت لکھنؤ

حضرات اہل تشیع کی جانب سے یہ رسالہ حال میں جاری ہوا ہے زیادہ تر مذہبی مضامین ہوتے ہیں، اور دوسرے علمی و سیاسی مضامین کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ مولانا سید علی نقی صاحب کا ایک مسلسل مضمون "تفسیر القرآن" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ (ا-م)۔

اجتماع ہفتہ وار۔ زیر ادارت جناب ہلال احمد صاحب زبیری۔ چندہ سالانہ تین روپیہ مقام اشاعت: دہلی۔

ایک متوسط درجہ کا سیاسی و ادبی پرچہ ہے۔ مضامین میں کافی تنوع پایا جاتا ہے بعض مضامین مفید معلومات پر مشتمل ہوتے ہیں، اور بعض دلچسپ، تقریباً چار صفحات تصویروں کے لیے وقف ہیں، مگر افسوس کہ فلم اسٹاروں کی تصویروں اور سینما کے مناظر کو یہاں بھی جلب انظار و جذب توجہات کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ "الجمعیت" کے ایڈیٹر سے تو دنیا یہ توقع نہیں رکھتی کہ وہ بھی اس فتنہ کی اشاعت میں حصہ لیں گے۔ (ا-م)۔

ندائے دہلی ہفتہ وار۔ زیر نگرانی جناب اشفاق احمد صاحب زاہدی۔ چندہ سالانہ پانچ روپیہ مقام اشاعت قرول باغ۔ دہلی۔

ایک مصور سیاسی و اجتماعی پرچہ ہے جو حال میں دہلی سے جاری ہوا ہے۔ سیاسی خیالات میں کافی آزاد خیالی پائی جاتی ہے۔ مفید علمی مضامین اور دلچسپ افسانے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں (ا-م)

تسکین الفواد بذکر المیلاد از حضرت مولانا شاہ حبیب حیدر، ضخامت ۲۰ صفحے ملنے کا پتہ قاضی احتشام علی خاں صاحب، محلہ قاضی گڑھی، کاکوری، ضلع لکھنؤ۔

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ جلد ۸ ۔ عدد (۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"عقلیت" اور "فطریت"، یہ دو چیزیں ہیں جن کا اشتہار گذشتہ دو صدیوں سے مغربی تہذیب بڑے زور شور سے دے رہی ہے۔ اشتہار کی طاقت سے کون انکار کرسکتا ہے جس چیز کو پیہم اور مسلسل اور بکثرت نگاہوں کے سامنے لایا جائے اور کانوں پر مسلط کیا جائے، اس کے اثر سے انسان اپنے دل اور دماغ کو آخر کہاں تک بچائیگا اور کب تک بچاتا رہے گا۔ بالآخر اشتہار کے زور سے دنیا نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ مغربی علوم اور مغربی تمدن کی بنیاد سراسر عقلیت اور فطریت پر ہے حالانکہ مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ اس کی بنیاد نہ تو عقلیت پر ہے اور نہ اصول فطرت کی متابعت پر، بلکہ اس کے برعکس اس کا پورا ڈھانچہ حس اور خواہش اور ضرورت پر قائم ہے۔ مغرب کی نشاۃ جدیدہ دراصل عقل اور فطرت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اس نے معقولات کو چھوڑ کر محسوسات اور مادیات کی طرف رجوع کیا۔ عقل کے بجائے حس پر اعتماد کیا۔ عقلی ہدایت اور منطقی استدلال اور فطری وجدان کو رد کر کے محسوس مادی نتائج کو علم و یقین کا معیار قرار دیا۔ فطرت کی رہنمائی کو مردود ٹھیرا کر خواہش اور ضرورت [illegible] جو چیز [illegible] چھونے، جانچنے، ناپنے اور تول میں نہ آسکتی ہو۔ ہر اس شئے کو [illegible] کوئی محسوس [illegible] منفعت مترتب نہ ہوتی ہو [illegible]

حقیقت خود اہل مغرب سے چھپی ہوئی تھی، اس لیے وہ عقل اور فطرت کے خلاف چلنے کے باوجود یہی سمجھتے رہے کہ انہوں نے جس "روشن خیالی" کے دورِ جدید کا افتتاح کیا ہے اس کی بنا "عقلیت" اور "فطریت" پر ہے۔ بعد میں اصل حقیقت کھلی مگر اعتراف کی جرأت نہ ہوئی۔ منافقت کے ساتھ مادہ پرستی اور خواہشات کی غلامی، اور مطالبات نفس وجسد کی بندگی پر عقلی استدلال اور ادعائے فطریت کے پردے ڈالے جاتے رہے لیکن اب انگریزی محاورے کے مطابق "بلی تھیلے سے بالکل باہر آچکی ہے"۔ غیر معقولیت اور خلاف ورزی فطرت کی لے اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس لیے اب کھلم کھلا عقل اور فطرت دونوں سے بغاوت کا اعلان کیا جارہا ہے، علم اور حکمت کی مقدس فضا سے لے کر معاشرت، معیشت، اور سیاست تک ہر شعبہ بغاوت کا علم بلند ہو چکا ہے، اور "قدامت پرست" منافقین کی ایک جماعت کو مستثنیٰ کرکے دنیائے جدید کے تمام رہنما اپنی تہذیب پر صرف خواہش اور ضرورت کی حکمرانی تسلیم کر رہے ہیں۔

مشرقی متغربین و متفرنجین اپنے پیشواؤں سے ابھی چند قدم پیچھے ہیں۔ ان کا دماغی نشوونما جس تعلیم اور جس ذہنی فضا اور جن عوامل تہذیب و تمدن کے زیر اثر ہوا ہے ان کا تقاضا یہی ہے کہ وہی محسوسات و مادیات کی پرستش اور خواہشات و ضرویات کی غلامی ان میں بھی پیدا ہو، اور فی الواقع ایسا ہی ہو رہا ہے، مگر ابھی تک یہ اس منزل پر نہیں پہنچے ہیں جہاں بلی تھیلے سے باہر آجاتی ہے۔ اپنی تحریر و تقریر میں یہ اب بھی کہے جارہے ہیں کہ ہم صرف عقل اور فطرت کی رہنمائی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے صرف عقلی استدلال پیش کرو۔ ہم کسی ایسی چیز کو نہ مانیں گے جو عقلی دلائل اور فطری شواہد سے ثابت نہ کردی جائے۔ لیکن ان تمام بلند آہنگیوں کے تھیلے میں وہی بلی چھپی ہوئی ہے جو نہ عقلی ہے نہ فطری۔ ان کے مقالات کا تجزیہ کیجیے تو صاف معلوم

ہو جائیگا کہ معقولات اور فطری وجدانیات کے ادراک سے ان کے ذہن عاجز ہیں۔ جس کو یہ "عقلی فائدہ" کہتے ہیں، اس کی حقیقت پوچھیے تو معلوم ہوگا کہ اس سے مراد "تجربی فائدہ" ہے۔ اور تجربی فائدہ وہ ہے جو محسوس ہو، وزنی ہو، شمار اور پیمائش میں آسکے۔ کوئی چیز جس کا فائدہ ان کو حساب اعداد سے گن کر یا ترازو کے پلڑوں سے تول کر یا گز سے ناپ کر نہ بتایا جا سکے اس کو یہ مفید نہیں مان سکتے، اور جب تک اس معنی خاص میں اس کی افادیت ثابت نہ کر دی جائے اس پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا ان کے نزدیک ایسا فعل ہے جس کو یہ "غیر معقولیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ فطرت کی رہنمائی جس کی پیروی کا ان کو دعویٰ ہے اس کی حقیقت بھی تھوڑی سی جرح میں کھل جاتی ہے۔ فطرت سے مراد ان کے نزدیک انسانی فطرت نہیں بلکہ حیوانی فطرت ہے جو وجدان اور شہادت قلبیہ سے خالی ہے، اور صرف حس، خواہش اور مطالبات نفس و جسد رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک اعتبار کے قابل صرف وہی چیزیں ہیں جو حواس کو متاثر کر سکیں، خواہشات کو تسکین دے سکیں، مادی یا نفسانی مطالبات کو پورا کر سکیں، جن کا فائدہ فوراً مشاہدہ میں آجائے اور جن کا نقصان نظروں سے اوجھل ہو یا فائدہ کے مقابلے میں ان کو کم نظر آئے۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو فطرتِ انسانی کے مقتضیات سے ہیں جن کی اہمیت کو انسان اپنے وجدان میں پاتا ہے، جن کے فوائد یا نقصانات مادی اور حسی نہیں بلکہ نفسی اور روحانی ہیں، سو ان کی نگاہ میں وہ اوہام اور خرافات ہیں، اور وہ ناقابلِ اعتنا ہیں۔ ان کو کسی قسم کی اہمیت دینا، بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی تاریک خیالی، وہم پرستی اور دقیانوسیت ہے۔ ایک طرف عقل و فطرت سے یہ انحراف ہے، دوسری طرف عقلیت اور فطریت کا دعویٰ ہے، اور عقل کے دیوالیہ پن کا حال یہ ہے کہ وہ اس اجتماع ضدین کو محسوس تک نہیں کرتی۔

تعلیم و تہذیب فکر کا کم سے کم اتنا فائدہ ہر انسان کو حاصل ہونا چاہیئے کہ اس کے خیالات میں الجھاؤ باقی نہ رہے، افکار میں پراگندگی اور ژولیدگی نہ ہو، وہ صاف اور سیدھا طریق فکر اختیار کر سکے، مقدمات کو صحیح ترتیب دے کر صحیح نتیجہ اخذ کر سکے، تناقض اور خلط بحث جیسی صریح غلطیوں سے بچ سکے۔ لیکن مستثنیات کو چھوڑ کر ہم اپنے عام تعلیم یافتہ حضرات کو دماغی تربیت کے ان ابتدائی ثمرات سے بھی محروم پاتے ہیں۔ ان میں اتنی تمیز بھی تو نہیں ہوتی کہ کسی مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے اپنی صحیح حیثیت متعین کر لیں، پھر اس حیثیت کے عقلی لوازم کو سمجھیں، اور ان کو ملحوظ رکھ کر ایسا طریق استدلال اختیار کریں جو اس حیثیت سے مناسبت رکھتا ہو۔ ان سے گفتگو کیجئے، یا ان کی تحریریں دیکھئے، پہلی نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ ان کے خیالات میں سخت الجھاؤ ہے۔ بحث کی ابتدا ایک حیثیت سے کی تھی، چند قدم چل کر حیثیت بدل دی، آگے بڑھے تو ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی۔ اثبات مدعا کے لئے مقدمات کو سمجھ بوجھ کر انتخاب کرنا اور ان کو منطقی اسلوب پر مرتب کرنا تک نہ آیا۔ آغاز سے لیکر اختتام تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ دراصل آپ کا مدعا کیا ہے، کس مسئلے کی تحقیق پیش نظر تھی اور کیا آپ نے ثابت کیا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کے اثر سے موجودہ تعلیم کا میلان زیادہ تر حسیات اور مادیات کی طرف ہے۔ وہ خواہشات کو بیدار کر دیتی ہے، مطلوبات اور ضروریات کے احساس کو ابھار دیتی ہے، محسوسات کی اہمیت کو دلوں میں بٹھا دیتی ہے، مگر عقل اور ذہن کی تربیت نہیں کرتی، تنقید اور تفکر کی صلاحیتوں کو نہیں چمکاتی، تہذیب نفس اور تنویر افکار سے غفلت برتتی ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ مادیات کی طرف غیر معتدل میلان پیدا کر کے ذہن کا توازن بگاڑ دیتی ہے۔ اس تعلیم سے مزین ہو کر جو لوگ نکلتے ہیں ان میں تعقل اور تفکر کا پندار تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اور یہی پندار ان کو ہر چیز پر عقلی تنقید کرنے اور ہر اس چیز سے انکار کر دینے پر آمادہ کرتا ہے جو ان کی عقل میں نہ سمائے، مگر درحقیقت

ان کا ذہن عقلیت سے منحرف ہوتا ہے، اور صحیح عقلی طریق پر کسی مسئلے کو سلجھانے یا کسی امر میں رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔

اس غیر معقول "نقلیت" کا اظہار سب سے زیادہ ان مسائل میں ہوتا ہے جو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ یہی وہ مسائل ہیں جن کے روحانی و اخلاقی اور اجتماعی و عمرانی مبادی مغرب کے نظریات سے ہر ہر نقطہ پر متصادم ہوتے ہیں۔

آپ کسی جدید تعلیم یافتہ شخص سے کسی مذہبی مسئلے پر گفتگو کیجئے اور اس کی ذہنی کیفیت کا امتحان لینے کے لئے پہلے اس سے مسلمان ہونے کا اقرار کرا لیجئے، پھر اس کے سامنے مجرد حکم شریعت بیان کر کے سند پیش کیجئے۔ وہ فوراً اپنے شانے ہلائیگا اور بڑے عقل پرستانہ انداز میں کہے گا کہ "یہ ملائیت ہے۔ میرے سامنے عقلی دلیل لاؤ اگر تمہارے پاس معقولات نہیں، صرف منقولات ہی منقولات ہیں تو میں تمہاری بات نہیں مان سکتا"۔ بس انہی چند فقروں سے یہ راز فاش ہو جائے گا کہ اس شخص کو عقلیت کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری ہے۔ اس غریب کو برسوں کی تعلیم اور تربیت علمی کے بعد اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ طلب حجت کے عقلی لوازم کیا ہیں اور طالب حجت کی صحیح پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اسلام کی نسبت سے عقلاً انسان کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ یا وہ مسلمان ہوگا یا کافر ہوگا۔ اگر مسلمان ہے تو مسلمان ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ خدا کو خدا، اور رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر چکا ہے اور یہ بھی اقرار کر چکا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسول جو کچھ حکم پہنچائے گا اس کی اطاعت وہ بے چون و چرا کرے گا۔ اب فرداً فرداً ایک ایک حکم پر حجت عقلی طلب کرنے کا اسے حق ہی نہیں۔ بامسلم ہونے کی حیثیت سے اس کا کام صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ کوئی خاص حکم رسول خدا نے دیا ہے یا نہیں۔ جب حجت نقلی سے یہ ثابت کر دیا گیا تو اس کو فوراً اطاعت کرنی چاہیے

وہ اپنے اطمینانِ قلب اور حصول بصیرت کے لئے حجتِ عقلی کی درخواست کرسکتا ہے مگر اُس وقت جبکہ وہ امتثالِ امر کرچکا ہو۔ امتثالِ امر کے لئے حجتِ عقلی کو شرط قرار دینا، اور حجت نہ ملنے یا اطمینانِ قلب نہ ہونے پر اطاعت سے انکار کردینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل رسولِ خدا کی حاکمیت (اقتدارِ علیٰ) کا انکار کررہا ہے، اور یہ انکار مستلزم کفر ہے۔ حالانکہ ابتدا میں اس نے خود مسلم ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اب اگر وہ کافر کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے صحیح جائے قیام دائرۂ اسلام کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔ سب سے پہلے اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ جس مذہب پر درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتا اس سے نکل جائے۔ اس کے بعد وہ اس لائق سمجھا جائیگا کہ حجتِ عقلی طلب کرے اور اس کی طلب کا جواب دیا جائے۔

یہ قاعدہ عقلِ سلیم کے مقتضیات میں سے ہے اور دنیا میں کوئی نظم اور کوئی ضابطہ اس کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔ کوئی حکومت ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی رعایا کا ہر فرد اس کے ہر حکم پر حجتِ عقلی کا مطالبہ کرے اور حجت کے بغیر اطاعت امر سے انکار کردے۔ کوئی فوج درحقیقت ایک فوج ہی نہیں بن سکتی اگر اس کا ہر سپاہی اپنے جنرل کے ہر حکم کی وجہ دریافت کرے اور ہر معاملہ میں اپنے اطمینانِ قلب کو اطاعت کے لئے شرط قرار دے۔ کوئی مدرسہ، کوئی کالج کوئی انجمن غرض کوئی اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں بن سکتا کہ ہر ہر جزئی حکم پر ہر ہر فرد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے، اور جب تک ایک ایک شخص کو اطمینان حاصل نہ ہوجائے اس وقت تک کسی حکم کی اطاعت نہ کی جائے۔ انسان جس نظام میں بھی داخل ہوتا ہے اس ابتدائی اور بنیادی مفروضہ کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اس نظام کے اقتدارِ اعلیٰ پر کلی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے۔ اور اس کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے۔ اب جس وقت تک وہ اس نظام کا ایک جزء رہے اس کا فرض

ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی اطاعت کرے، خواہ کسی جزئی حکم پر اس کو اطمینان ہو یا نہ ہو۔ مجرمانہ حیثیت سے کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا امر دیگر ہے۔ ایک شخص جزئیات میں نافرمانی کرکے بھی ایک نظام میں شامل رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ میں بھی اپنے ذاتی اطمینان کو اطاعت کے لئے شرط قرار دیتا ہے تو دراصل وہ اقتدار اعلیٰ کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور یہ صریح بغاوت ہے۔ حکومت میں یہ طرز عمل اختیار کیا جائیگا تو اس پر بغاوت کا مقدمہ قائم کردیا جائے گا۔ فوج میں اس کا کورٹ مارشل ہو گا۔ مدرسہ اور کالج میں فوری اخراج کی کارروائی کی جائیگی۔ مذہب میں اس پر کفر کا حکم جاری ہوگا۔ اس لئے کہ اس نوع کے طلب حجت کا حق کسی نظام کے اندر رہ کر کسی شخص کو نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے طالب حجت کا صحیح مقام اندر نہیں باہر ہے پہلے وہ باہر نکل جائے پھر جو چاہے اعتراض کرے۔

اسلام کی تنظیم میں یہ قاعدہ اصل اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پہلے احکام نہیں دیتا بلکہ سب سے پہلے اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ جتنی حجتیں ہیں سب اسی ایک چیز پر تمام کی گئی ہیں۔ ہر عقلی دلیل اور فطری شہادت سے انسان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدائے واحد ہی اس کا "الٰہ" ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ آپ جس قدر عقلی جانچ پڑتال کرنا چاہتے ہیں اس بنیادی مسئلہ پر صرف کیجئے۔ اگر کسی دلیل اور کسی حجت سے آپ کا دل اس پر مطمئن نہ ہو، تو آپ کو داخل اسلام ہونے پر مجبور نہیں کیا جائیگا۔ اور نہ احکام اسلامی میں سے کوئی حکم آپ پر جاری ہوگا۔ لیکن جب آپ نے اس کو قبول کر لیا تو آپ کی حیثیت ایک "مسلم" کی ہوگئی اور مسلم کے معنی ہی مطیع کے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے ہر ہر حکم پر آپ کے سامنے دلیل و حجت پیش کی جائے اور احکام کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا انحصار آپ کے اطمینان قلب پر ہو۔ مسلم

مان جانے کے بعد آپ کا فرض یہ ہے کہ جو حکم آپ کو خدا اور رسول کی طرف سے پہنچے بے چون وچرا اس کی اطاعت کریں۔

اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (۲۴:۷)

ایمان لانے والوں کا قول صرف یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان حکم کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ایمان، اور ایسی طلب حجت جو تسلیم و اطاعت کے لئے شرط ہو باہم متناقض ہیں اور ان دونوں کا اجتماع صریح عقل سلیم کے خلاف ہے۔ جو مومن ہے وہ اس حیثیت سے طالب حجت نہیں ہوسکتا اور جو ایسا طالب حجت ہے وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ (۳۳:۵)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کردے تو ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔

اسلام نے اصلاح اور تنظیم کا جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے وہ سب اسی قاعدہ کی وجہ سے ہے۔ دلوں میں ایمان بٹھا دینے کے بعد جس چیز سے روکا گیا تمام اہل ایمان اس سے رک گئے، اور جس چیز کا حکم دیا گیا وہ ایک اشارے پر لاکھوں کروڑوں انسانوں میں رائج ہوگئی۔ اگر ایک ایک چیز کے لئے عقلی حجتیں پیش کرنا ضروری ہوتا اور ہر امر و نہی کی حکمتیں اور مصلحتیں سمجھانے پر اطاعت احکام موقوف ہوتی تو قیامت تک انسانی اخلاق کی اصلاح اور اعمال کی وہ تنظیم نہ ہوسکتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں انجام دے دی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام کے احکام خلاف عقل ہیں یا اس کا کوئی جزئی سے جزئی حکم بھی حکمت و مصلحت سے خالی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ اسلام اپنے پیرؤں سے اندھوں کی سی تقلید چاہتا ہے اور احکام کی عقلی و فطری بنیادوں کو تلاش کرنے اور ان کے مصالح و حکم کو سمجھنے سے روکتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام کی صحیح پیروی کے لئے تفقّہ اور تدبر ضروری ہے جو شخص احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو جتنا زیادہ سمجھے گا وہ اتنا ہی زیادہ صحیح اتباع کرسکے گا۔ ایسے فہم اور ایسی بصیرت سے اسلام روکتا نہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لیکن زمین و آسمان کا فرق ہے اُس عقلی تجسس میں جو اطاعت کے بعد ہو اور اس عقلی امتحان میں جو اطاعت سے پہلے اور اطاعت کے لئے شرط ہو۔ مسلم سب سے پہلے غیر مشروط اطاعت کرتا ہے پھر احکام کی مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم کی مصلحت اس کی سمجھ میں آجائے۔ اس کو تو دراصل خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر اطمینان کلّی حاصل ہے۔ اس کے بعد وہ بصیرتِ تامّہ حاصل کرنے کے لئے جزئیات پر مزید اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ اطمینان بھی حاصل ہو جائے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر حاصل نہ ہو تو اُس اطمینان کلّی کی بنا پر جو اسے خدا اور رسول پر ہے بلا تامّل احکام کی اطاعت کئے چلا جاتا ہے۔ اس قسم کی طلب حجت کو اس طلب حجت سے کیا نسبت جو ہر ہر قدم پر پیش کی جائے اور اس دعوے کے ساتھ پیش کی جائے کہ اگر میرا اطمینان کرتے ہو تو قدم اٹھاتا ہوں ورنہ پیچھے پلٹا جاتا ہوں۔

حال میں ایک تحریر ہماری نظر سے گذری جو ایک "مسلم" جماعت کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ یہ جماعت اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مذہب سے منحرف بھی نہیں، بلکہ اپنی دانست میں بڑی مذہبی خدمت انجام دے رہی ہے۔ "مذہبی اصلاح" کے نام سے جن امور کی تبلیغ وہ کرتی ہے اُن

سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر سال بقرعید کے موقع پر مسلمانوں کو قربانی سے روکا جاتا ہے، اور انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ جو روپیہ وہ جانوروں کو ذبح کرنے پر صرف کرتے ہیں اسے قومی ادارات کی اعانت، یتیموں اور بیواؤں کی پرورش اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے میں صرف کریں۔ اس تبلیغ پر کسی مسلمان نے اعتراض کیا جس کی پوری عبارت ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ مگر اس اعتراض کے جواب میں جو کچھ کہا گیا وہ یہ ہے کہ:

"سوائے نقل و تقلید کے آج تک کسی صاحب نے قربانی کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی نہیں ڈالی ... اگر کوئی صاحب اس سے پہلے ہم کو اپنے عقیدۂ قربانی کے عقلی پہلو سے آگاہ فرمائیں تو وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہوں گے۔"

یہ تحریر نمونہ ہے اُن لوگوں کی دماغی حالت کا جو اپنے آپ کو "تعلیم یافتہ" کہتے ہیں۔ ایک طرف "عقلیت" کا اس قدر زبردست دعویٰ ہے، اور دوسری طرف "غیر عقلیت" کا ایسا شدید مظاہرہ ہے صرف یہی دو فقرے جو قلم مبارک سے نکلے ہیں، اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ آپ نے اپنی صحیح حیثیت ہی متعین نہیں کی۔ اگر آپ مسلم کی حیثیت سے بول رہے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے "نقل" کے آگے سر جھکانا چاہیے، پھر عقلی حجت کا مطالبہ کرنے کا آپ کو حق ہوگا، اور وہ بھی شرطِ اطاعت کے طور پر نہیں بلکہ محض اطمینانِ قلب کے لئے، اور اگر آپ اطاعت سے پہلے حجت عقلی کے طالب ہیں اور یہ شرطِ اطاعت ہے تو آپ کو "مسلم" کی حیثیت سے بولنے کا حق ہی نہیں۔ اس نوع کے طالب حجت کو پہلے ایک غیر مسلم کی حیثیت اختیار کرنی چاہیئے پھر اس کو یہ حق تو حاصل ہوگا کہ جس مسئلے پر چاہے اعتراض کرے، مگر یہ حق نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے کسی امر دینی میں مفتی اسلام بن کر فتویٰ صادر کرے۔ آپ ایک ہی وقت میں ان دونوں متضاد حیثیتوں کو اختیار کرتے ہیں اور ایک حیثیت کے بھی عقلی لوازم پورے نہیں کرتے۔ ایک طرف آپ نہ صرف "مسلم" بلکہ مفتی اسلام بنتے ہیں۔ دوسری طرف آپ کا عال

ہے کہ "نقل" کو آپ صحیح سمجھتے ہیں۔ حکم کا "حکم" ہونا آپ پر نقل کے ذریعہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ مگر آپ اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ شرط پیش فرماتے ہیں کہ پہلے اس حکم کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی ڈالی جائے۔ بالفاظ دیگر آپ کسی حکم کو محض حکم خدا و رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں مانیں گے بلکہ اس کے عقلی و تجربی فوائد کی بنا پر مانیں گے۔ اگر ایسے فوائد معلوم نہ ہو سکیں یا آپ کے معیار پر وہ فوائد ثابت نہ ہوں تو آپ حکم کو رد کر دیں گے بلکہ اس کے خلاف پروپیگنڈا بھی کریں گے، اس کو بے محل "بے معنی" "فضول بلکہ مضر" اور "مسرفانہ رسم" قرار دیں گے اور مسلمانوں کو اس کے اتباع سے روکنے میں اپنی قوت صرف کریں گے۔ کونسی عقل ہے جو اس متناقض طرز عمل اور متضاد حیثیات کے اختلاط کو جائز رکھتی ہے۔ حجت عقلی کا مطالبہ بجا و درست۔ مگر پہلے یہ تو ثابت کیجئے کہ آپ ذوی العقول میں سے ہیں۔

عقلی اور "تجربی" فائدہ کسی ایک مخصوص اور متعین چیز کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک نسبی و اضافی چیز ہے۔ ایک شخص کی عقل ایک چیز کو مفید سمجھتی ہے دوسرے کی عقل اس کے خلاف حکم لگاتی ہے۔ تیسرا شخص اس میں کسی نوع کا فائدہ تسلیم کرتا ہے مگر اس کو اہمیت نہیں دیتا اور ایک دوسری چیز کو اس سے زیادہ مفید ٹھیراتا ہے تجربی فوائد میں اس سے بھی زیادہ اختلاف کی گنجایش ہے۔ فائدے کے متعلق ہر شخص کا نظریہ الگ ہے، اور اسی نظریہ کے لحاظ سے وہ اپنے یا دوسروں کے تجربات کو مرتب کرکے مفید یا غیر مفید ہونے کا حکم لگاتا ہے ایک شخص نفع عاجل کا طالب ہے اور صرف ضرر عاجل کو قابل حذر سمجھتا ہے۔ اس کا انتخاب ایسے شخص کے انتخاب سے یقیناً مختلف ہوگا جس کی نظر مآل کار پر ہو۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں ایک نوع کا فائدہ اور دوسری نوع کی مضرت ہے۔ ایک شخص ان کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ وہ فائدہ کی خاطر مضرت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ دوسرا شخص ان سے اجتناب کرتا ہے کیونکہ اس کی رائے میں ان کی مضرت ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ پھر عقلی اور تجربی فوائد میں بھی بسا اوقات تخالف پایا جاتا ہے۔ ایک چیز تجربی حیثیت

مضر ہے مگر عقل فیصلہ کرتی ہے کہ کسی بڑے عقلی فائدے کے لئے اس مضرت کو برداشت کرنا چاہیئے۔ ایک دوسری چیز ہے جو تجربی حیثیت سے مفید ہے مگر عقل یہ فتویٰ دیتی ہے کہ کسی عقلی مضرت سے بچنے کے لئے اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ایسے اختلافات کی موجودگی میں کسی چیز کے "عقلی اور تجربی" فوائد پر کوئی ایسی روشنی ڈالنی ممکن ہی نہیں ہے جس سے تمام لوگ اس کے مفید ہونے پر متفق ہو جائیں اور انکار کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ محض ایک قربانی پر کیا موقوف ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور اوامر ونواہی شریعت میں سے کونسی چیز ایسی ہے جس کے عقلی اور تجربی فوائد پر ایسی روشنی ڈال دی گئی ہو کہ وہ کالشمس فی النہار نظر آنے لگے ہوں اور تمام لوگوں نے ان کو تسلیم کر کے ان کی پابندی اختیار کر لی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ایک شخص بھی دنیا میں تارک صوم وصلوٰۃ اور منکر حج وزکوٰۃ نہ ہوتا۔ اسی لئے اسلام نے اپنے احکام کو ہر شخص کی عقل اور اور تجربہ کے فتوے پر موقوف نہیں رکھا ہے بلکہ ایمان اور اطاعت کو اساس بنایا ہے۔ مسلم عقلی اور تجربی فوائد پر ایمان نہیں لاتا بلکہ خدا اور رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اس کا مذہب یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کا فائدہ عقل وتجربہ سے ثابت ہو جائے تب وہ اس کو قبول کرے، اور کسی چیز کی مضرت عقلی وتجربی حیثیت سے مبرہن ہو جائے تب وہ اس سے اجتناب کرے بلکہ اس کا مذہب یہ ہے کہ جو حکم خدا اور رسول سے ثابت ہو جائے وہ قابل اتباع ہے، اور جو حکم ثابت نہ ہو وہ قابل اتباع نہیں ہے۔

پس یہاں اصلی سوال یہی ہے کہ آپ کا ایمان عقل اور تجربہ پر ہے یا خدا اور اس کے رسول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو آپ کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ پھر آپ کو مسلمان بن کر گفتگو کرنے اور مسلمانوں کو غرض غیر ذی زرع کی نام نہاد سنت سے اجتناب کا مشورہ دینے کا کیا حق ہے؟ اور اگر دوسری بات ہے تو مدار بحث عقلی وتجربی فوائد نہ ہونے چاہئیں بلکہ یہ سوال ہونا چاہیئے کہ آیا قربانی محض ایک رسم ہے جس کو مسلمانوں نے گھڑ لیا ہے یا ایک عبادت ہے جس کو اللہ نے پسند فرمایا اور اللہ کے رسول نے اپنی امت میں جاری کیا؟

مقالات

بشارات الانبیاءؑ

نبوت محمدی صلعم کے متعلق انبیائے سابقین کی پیشین گوئیاں

(۳)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

گذشتہ دو اشاعتوں میں جو آٹھ مقدمات بیان کئے گئے ہیں، امید ہے کہ وہ ناظرین کے پیش نظر ہوں گے۔ اب ہم ان اٹھارہ بشارتوں کو نقل کرکے ہر ایک پر مفصل کلام کریں گے، جو اہل کتاب کی معتبر کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

پہلی بشارت

کتاب استثناء باب ۱۸ میں ہے:۔

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا۔ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جاوے۔ اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں

کیوں کر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں۔ تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈر (آیت ۱۷-۲۲)۔

اس کا مصداق کون ہے | احبار یہود کہتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت یوشع علیہ السلام کے حق میں ہے۔ پروٹسٹنٹ علما حضرت عیسیٰ کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ لیکن بشارت کے الفاظ اور دوسرے قرائن بتا رہے ہیں کہ اس کا مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اپنے تیسرے مقدمہ میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں بھی یہودی اس نبی کی آمد کے منتظر تھے جس کی بشارت اس باب میں دی گئی ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ یوشع علیہ السلام کو اس پیشین گوئی کا مصداق ٹھیرانے کا خیال حضرت عیسیٰ کے زمانے تک یہودیوں کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ بعد میں جب عیسائیوں نے اس کو جناب مسیح پر چسپاں کیا تو یہودیوں نے ان کی ضد میں حضرت یوشع کو اس کا مصداق قرار دینے کی کوشش کی۔

۲۔ بشارت میں لفظ "تجھ سا" استعمال کیا گیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ وہ آنے والا نبی حضرت موسیٰ کے مانند ہوگا مگر حضرت یوشع اور حضرت عیسیٰ دونوں میں سے کوئی بھی حضرت موسیٰ کے مانند نہیں ہے۔ اول تو خود توراۃ ہی میں یہ تصریح ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ علیہ السلام کے مانند نہیں اٹھا۔

"اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا۔ (استثنا، باب ۳۴، آیت ۱۰)۔

دوسرے یوشع علیہ السلام کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں اور موسیٰ علیہ السلام میں

کوئی مماثلت نہیں کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ایک کتاب اور نئی شریعت لائے جو امر و نہی کے احکام پر مشتمل تھی، اور یوشع علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں لائے بلکہ شریعت موسوی کے تابع رہے اسی طرح حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ میں بھی پوری مماثلت نہیں پائی جاتی، کیونکہ نصاریٰ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام تو بالفعل خداوند تھے اور موسیٰ علیہ السلام خداوند کے بندے تھے عیسیٰ علیہ السلام اپنے پیرووں کے اعتقادکی رو سے اپنی امت کے بدلے میں لعنت کیے گئے، جیساکہ پولوس نے گلتیوں کے نام اپنے خط میں تصریح کہا ہے (دیکھو گلتیوں باب ۳ - آیت ۱۳) مگر موسیٰ علیہ السلام کبھی لعنت نہیں کیے گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام مرنے کے بعد دوزخ میں ڈالے گئے جیساکہ اہل تثلیث کے عقائد میں بالفاظ صریح بیان کیا گیا ہے، مگر موسیٰ علیہ السلام دوزخ میں نہیں گئے حضرت عیسیٰ کو حسب اعتقاد نصاریٰ صلیب دی گئی تاکہ وہ اپنی امت کے لیے کفارہ بنیں، لیکن حضرت موسیٰ کو نہ صلیب دی گئی اور نہ وہ کسی کے لیے کفارہ بنے۔ سب سے بڑی چیز جو ان دونوں میں مثلیت کی نفی کرتی ہے، یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی شریعت لائے جو حدود اور تعزیرات اور احکام غسل و طہارت اور امتیاز حلال و حرام پر مشتمل تھی۔ بخلاف اس کے عیسیٰ علیہ السلام کا مذہب ان سب چیزوں سے خالی ہے، جیساکہ عیسائیوں کی انجیلوں سے ظاہر ہے۔ پھر یہ فرق بھی نمایاں ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم میں فرمانروا تھے اور ان کے امر و نہی کا نفاذ ایک بادشاہ کے احکام کی طرح ہوتا تھا۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام ایسے نہ تھے۔

۲۔ اس بشارت میں نبی موعود کی دوسری علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ "اُن کے بھائیوں میں سے" ہوگا۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی ہے اس وقت ۱۲ اسباط سب کے سب موسیٰ علیہ السلام کے پاس موجود تھے۔ پس اگر مقصود یہ ہوتا کہ نبی موعود انہی میں سے کسی کی نسل میں پیدا ہوگا تو اُن کے بھائیوں میں سے نہ کہا جاتا بلکہ "اُن میں سے" کہا جاتا۔ ان کے بھائیوں میں سے کہنے کے صاف

معنی یہ ہیں کہ نبی موعود ۱۲ اسباط میں سے کسی کی بھی صلب سے نہ ہوگا۔ بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد توراۃ میں متعدد مقامات پر حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد ہیں۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۶۔ آیت ۱۲ میں حضرت ہاجرہ سے اللہ تعالیٰ کے جس وعدہ کا ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں :۔

"وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بودوباش کرے گا"

اسی کتاب کے باب ۲۵۔ آیت ۱۸ میں اولاد اسماعیل کے نام گنانے کے بعد لکھا ہے:

"اور وے حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اُس راہ میں ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں بستے تھے ان کا قطعہ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا"

یہاں اولاد اسماعیل کے بھائیوں سے مراد بنی اسحاق ہیں۔

پھر کتاب گنتی کے باب ۲۰ آیت ۱۴ میں ہے۔

"تب موسیٰ نے قادس سے ادوم کے بادشاہ کو ایلچی کے ہاتھ یوں کہلا بھیجا کہ تیرے بھائی اسرائیل نے کہا ہے کہ وے سب تکلیفیں جو ہم پر آن پڑیں تو جانتا ہے"۔

اور استثنا، باب دوم میں ہے :۔

"پھر خداوند نے مجھے خطاب کرکے فرمایا...... اور تو ان لوگوں سے کہہ کہ تم کو اب اپنے بھائیوں بنی عیسو کے سوانوں پر ہو کے گذرنا ہوگا۔ وے شعیر میں رہتے ہیں اور وے تم سے ہراساں ہوں گے........ سو جب ہم اپنے بھائیوں بنی عیسو کے سامنے سے جو شعیر میں رہتے ہیں میدان کی راہ سے ایلات اور عصیون جبر سے ہو کے گذر گئے الخ" (آیت ۲-۴-۸)۔

یہاں بنی اسرائیل کے بھائیوں سے بنی عیسو بن اسحاق مراد ہیں مگر اس میں کوئی شک

نہیں کہ بنی عیسو بھی بنی اسرائیل ہی میں سے ہیں، اور ان کے لیے بنی اسرائیل کے بھائیوں کا لفظ جو توراۃ کے بعض مقامات میں استعمال ہوا ہے، محض ایک مجازی استعمال ہے، اور حقیقت کو چھوڑ کر مجازی معنی لینا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ لفظ کو معنی حقیقی پر محمول کرنے میں کوئی مانع قوی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں کوئی قوی کیا ضعیف مانع بھی نہیں ہے، لہٰذا یوشع اور عیسیٰ علیہما السلام جو خود بنی اسرائیل میں سے تھے، وہ نبی موعود نہیں ہو سکتے جو بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے آنے والا تھا۔

۴۔ بشارت میں کہا گیا ہے کہ "ایک نبی برپا کروں گا"، لیکن یوشع علیہ السلام اس وقت حضرت موسیٰ کے پاس حاضر، اور بنی اسرائیل میں داخل، اور نبوت سے سرفراز تھے۔ پھر ان پر لفظ "برپا کروں گا" کیسے صادق آسکتا ہے۔

۵۔ بشارت میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا"۔ یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ اس نبی پر کتاب نازل ہوگی اور وہ امی ہوگا جس کو کلام زبانی یاد کرایا جائے گا۔ یہ دونوں باتیں حضرت یوشع میں نہیں پائی جاتیں۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی یہ بشارت ان سے متعلق نہیں ہو سکتی۔

۶۔ بشارت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ "جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا"۔ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمے میں "حساب لوں گا" کے بجائے اکون المنتقم من ذالک لکھا ہے، یعنی میں اس سے اس کا انتقام لوں گا۔ انگریزی ترجمہ میں (I will require it of him.) کے الفاظ لکھے ہیں، یعنی "میں اس سے اس کا محاسبہ کروں گا"۔ یہ بات اُن امتیازی خصوصیات میں سے ہے جن کو موعود کی علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، یعنی اولاً وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے

ہوگا۔ ثانیاً وہ موسیٰ کے مانند ہوگا۔ ثالثاً اس کے منہ میں اللہ اپنا کلام ڈالے گا۔ رابعاً جو کوئی اس کی بات نہ سنے گا اس سے اللہ تعالیٰ انتقام لے گا یا محاسبہ کرے گا۔ اس کے بعد دوسری علامتیں بھی بتائی گئی ہیں اور یہ سب ایسی علامتیں ہیں اور ہونی چاہئیں جن کا ظہور لوگوں کے سامنے ہو تاکہ وہ اس نبی کو دوسرے انبیاء سے ممتاز کر سکیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین سے اللہ تعالیٰ کے جس انتقام یا محاسبہ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد اخروی عذاب نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ نہ تو انکار نبی پر آخرت کا عذاب کسی خاص نبی کے منکرین کے لیے مختص ہے (وہ تو تمام انبیاء کے منکرین کے لیے عام ہے) اور نہ منکرین پر آخرت کا عذاب کوئی ایسی علامت ہے جس سے اس دنیا میں کسی نبی کو دوسرے انبیاء سے ممتاز کیا جاسکتا ہو۔ لہٰذا یہاں انتقام اور محاسبہ سے مراد لازماً اسی دنیا کے اندر انتقام اور محاسبہ ہونا چاہیے۔ اور یہ ناقابل انکار واقعہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو وہ قوت دی ہی نہیں گئی تھی جس سے وہ انکار کرنے والوں کو کسی قسم کی سزا دے سکتے۔ ان کی شریعت احکام حدود و قصاص اور تعزیر و جہاد سے خالی ہے۔

۷۔ کتاب الاعمال کے باب سوم میں ہے۔

"پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند کے حضور سے تازگی بخش ایام آویں۔ اور یسوع مسیح کو بھیجے جس کی منادی تم لوگوں کے درمیان آگے سے ہوئی۔ ضرور ہے کہ آسمان اسے لیے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی میرے مانند اٹھاوے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اس نبی کی نہ سنے وہ قوم میں سے نیست کیا جائیگا۔ (آیت ۱۹-۲۳)

یہ عبارت صاف دلالت کر رہی ہے کہ یہ نبی موعود عیسیٰ علیہ السلام کے اسوا ہے، اور یہ کہ اس نبی کے ظہور تک ضرور ہے کہ آسمان عیسیٰ علیہ السلام کو لیے رہے۔ جو کوئی مسیحیت کے باطل تعصب سے خالی ہو کر پطرس کی اس عبارت پر غور کرے گا اس پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ پطرس کا یہی قول مسیحی علماء کے اس دعوے کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ بشارت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ہے۔ یہ ساتوں وجوہ جن کا ذکر ہم نے کیا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری طرح صادق آتی ہیں اولاً آنحضرت صلعم بہت سے امور میں موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہیں۔ مثلاً آپ اللہ کے بندے اور رسول ہیں جس طرح موسیٰ علیہ السلام تھے۔ آپ ماں اور باپ سے پیدا ہوئے۔ نکاح کیے اور صاحب اولاد ہوئے۔ آپ کی شریعت سیاسات مدنیہ پر مشتمل ہے۔ آپ جہاد پر مامور ہوئے۔ آپ کی شریعت میں عبادت کے لیے طہارت لازم کی گئی۔ آپ کی شریعت میں جنبی اور حائضہ اور نفساء کے لیے غسل واجب کیا گیا۔ آپ کے یہاں لباس کو بول و براز سے پاک رکھنے کا حکم دیا گیا۔ آپ کی شریعت میں اس جانور کا کھانا حرام کیا گیا جو ذبح نہ کیا گیا ہو یا جس کو بتوں پر قربان کیا گیا ہو۔ آپ کے ہاں بدنی عبادات اور جسمانی ریاضات کا حکم دیا گیا۔ آپ کو زنا کی حد جاری کرنے کا حکم دیا گیا۔ حدود اور تعزیرات اور قصاص کے احکام دیے گئے اجرائے حدود کی قوت آپ کو دی گئی۔ سود حرام کیا گیا۔ اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف دعوت دینے والوں سے مقابلہ پر آپ مامور ہوئے۔ توحید خالص کی تعلیم آپ کے ذریعہ سے دی گئی۔ آپ کی امت کو حکم دیا گیا کہ وہ آپ کو اللہ کا بندہ اور رسول کہے نہ کہ ابن اللہ یا خداوند۔ آپ نے طبعی موت سے وفات پائی اور موسیٰ علیہ السلام کی طرح دفن کیے گئے۔ آپ اپنی امت کی خاطر لعنت نہیں کیے گئے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن میں عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مماثلت

پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔ یعنی ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر نگران ہے اسی طرح جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول (یعنی موسیٰ علیہ السلام) کو بھیجا تھا۔

ثانیاً۔ آپ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔

ثالثاً آپ پر کتاب نازل ہوی اور اللہ کا کلام آپ کے منہ میں ڈالا گیا کیونکہ آپ امی تھے۔

رابعاً آپ نے اپنی طرف سے کچھ نہ کہا بلکہ جو کچھ آپ پر وحی کیا گیا وہی کہا۔ وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔

خامساً آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا اور اسی ذریعہ سے اللہ نے صنادید قریش اور قیاصرہ واکاسرہ اور ان سب سے انتقام لیا جنہوں نے وہ باتیں نہ سنیں جو آپ نے اللہ کی طرف سے ان کو سنائی تھیں۔

سادساً آپ نزول مسیح سے قبل تشریف لائے اور آسمان کے لیے ضرور ہوا کہ آپ کے ظہور تک حضرت مسیح کو لیے رہے۔

سابعاً آپ ہی کے ذریعہ سے وہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا تھا اپنی حالت پر پلٹ آئیں۔ شرک اور بت پرستی کی جڑ اس طرح کٹ گئی کہ دنیا میں اب کوئی مذہب فروغ نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ توحید کو بطور اصل الاصول کے تسلیم نہ کرے۔

۸۔ اس بشارت میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ جو نبی اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرے گا جن کا اسے حکم نہیں دیا گیا ہے وہ قتل کیا جائیگا۔ آپ دیکھو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ

اللہ تعالیٰ کے نام سے کہا وہ اگر نبی الواقع اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو آپ ضرور قتل کیے جاتے۔ خود قرآن میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو توراۃ میں ارشاد ہوئی ہے۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ۔ لیکن چونکہ آپ نے سب کچھ سچ سچ اللہ ہی کی طرف سے کہا اس لیے آپ قتل نہ کیے گئے، اللہ نے آپ کو لوگوں کے شر سے بچانے کا ذمہ لیا۔ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ آپ کے ہزاروں لاکھوں دشمنوں میں سے کوئی بھی آپ پر قابو نہ پا سکا یہاں تک کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ بخلاف اس کے خود عیسائیوں کے قول کے بموجب عیسیٰ علیہ السلام قتل کیے گئے اور صلیب پر چڑھائے گئے۔ اس سے بڑھ کر غیر معقول بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک طرف مسیحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول و مصلوب ہونے کا بھی اقرار کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ پیشین گوئی بھی آپ کے حق میں چسپاں کرتے ہیں جس میں صاف کہا گیا ہے کہ جھوٹا نبی قتل کیا جائیگا۔

۹ اس بشارت میں نبی کاذب کی ایک علامت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ خدا کے نام سے جو خبریں وہ دیگا وہ پوری نہ ہوں گی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی خبریں دیں وہ سب پوری ہوئیں۔ بعض کا ظہور آپ کے زمانہ ہی میں ہو گیا مثلاً ایران پر روم کا غلبہ، مشرکین پر خود آپکا فتحیاب ہونا، مسجد حرام میں مسلمانوں کا داخل ہونا۔ اور بعض کی صداقت آپ کے صحابہ کے دور میں ظاہر ہوئی، مثلاً مصر اور بلاد قیصر و کسریٰ کی فتح، اور فئة باغیہ کی سرکوبی۔ اور بکثرت خبریں ایسی ہیں جن کو آپ کے زمانے کے لوگ سمجھ بھی نہ سکے تھے مگر از منہ مابعد میں پے درپے ان کی صداقت ظاہر ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ لہٰذا اس معیار پر بھی آپ کی نبوت پوری اترتی ہے۔

۱۰ علماء یہود میں سے بہتوں نے تسلیم کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں جن کی بشارت توراۃ میں دی گئی ہے۔ ان میں سے جو حق پسند تھے وہ مسلمان بھی ہو گئے اگرچہ جن پر نسلی

تعصب کا غلبہ تھا انہوں نے یہ جان لینے کے باوجود آپ پر ایمان لانے سے انکار کیا بالکل اسی طرح جس طرح قیافانے (جو کاہنوں کا رئیس اور یوحنا کے بقول نبی تھا) عیسیٰ علیہ السلام کا مسیح ہونا جان لینے کے باوجود آپ سے کفر کیا اور آپ کے قتل کا فتویٰ دیا (ملاحظہ ہو یوحنا باب ۱۱ و باب ۱۸) حدیث میں مخیریق یہودی کے متعلق مروی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی صفات اور آثار نبوت سے پہچان لیا تھا۔ مگر اس پر اپنے مذہب کی الفت غالب آگئی اور وہ اسی کا تبع رہا یہاں تک کہ جب احد کی لڑائی کا دن آیا۔ (اور وہ یوم السبت تھا) تو اس نے کہا کہ اے قوم یہود خدا کی قسم تم کو معلوم ہو جائیگا کہ تم پر محمد کی فتح یقیناً ہوگی۔ لوگوں نے کہا کیا اس وجہ سے کہ آج سبت کا دن ہے۔ اس نے کہا سبت کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور لڑنے نکلا چلتے چلتے اس نے وصیت کی کہ اگر میں آج مارا جاؤں تو میرا مال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالہ کر دیا جائے۔ وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق اسے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ جب وہ مارا گیا تو حضور نے فرمایا مخیریق بہترین یہودی تھا اس کے اموال آپ کے قبضہ میں آئے اور مدینہ میں صدقات رسول اللہ صلعم کا بیشتر حصہ انہی پر مشتمل تھا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المدراس تشریف لے گئے اور فرمایا تم میں جو سب سے زیادہ عالم ہو اس کو لاؤ۔ انہوں نے کہا وہ عبد اللہ بن صوریا ہے۔ آنحضرت صلعم اس کو خلوت میں لے گئے اور اس کو دین موسیٰ اور ان نعمتوں کی قسم دی جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں اور اس سے پوچھا کیا تو جانتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ اس نے کہا یقیناً آپ رسول اللہ ہیں اور جو کچھ میں سمجھتا ہوں وہی دوسرے یہودی بھی سمجھتے ہیں آپ کی صفات اور نشانیاں توراۃ میں صاف مذکور ہیں، مگر وہ آپ سے حسد رکھتے ہیں۔ حضور نے فرمایا پھر تجھ کو کس چیز نے

روک رکھا ہے۔ اس نے کہا میں اپنی قوم کے خلاف عمل کرنا نہیں چاہتا ایسا نہیں کہ وہ آپکا اتباع قبول کر کے مسلمان ہوجائیں، پھر میں بھی اسلام لے آؤنگا۔

حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور قبا پر اترے تو میرے باپ اور چچا حیی بن اخطب اور ابویاسر بن اخطب دوسرے روز صبح سویرے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آفتاب غروب ہوئے تک وہیں رہے مغرب کے بعد وہ پلٹے تو اس طرح کہ تکان اور ضعف کے مارے گرے پڑتے تھے۔ میں دوڑکر ان کے پاس گئی۔ مگر ان میں سے کسی نے میری طرف التفات نہیں کیا کیوں کہ ان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میرے چچا ابویاسر نے میرے باپ سے کہا کیا واقعی یہ شخص وہی نبی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں واللہ۔ اس نے پوچھا کیا تم اس کو اچھی طرح پہچان گئے اور تم کو یقین ہو گیا؟ اس نے جواب دیا ہاں۔ اس نے پوچھا پھر کیا ارادہ ہے؟ اس نے جواب دیا جب تک زندہ ہوں اس کی دشمنی پر قائم رہوں گا۔

چند اعتراضات | اب ہم ان اعتراضات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو اس پیشین گوئی کی مذکورۂ بالا تعبیر پر دوسروں کی طرف سے کیے گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی صرف بنی اسمٰعیل ہی تو نہیں ہیں۔ بنی عیسو بھی ان کے بھائی ہیں حضرت ابراہیم کی بیوی قطورا کی اولاد بھی ان کے بھائیوں میں تھے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب بھی ان کے بھائیوں میں سے ہیں مگر ان میں کون ایسا پیدا ہوا جس پر اس پیشینگوئی کی دوسری علامتیں صادق آتی ہوں؟ پھر توراۃ میں کسی جگہ بھی ان کے متعلق کوئی وعدہ نہیں کیا گیا بخلاف اس کے بنی اسمٰعیل کے حق میں اللہ نے حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ دونوں سے وعدے کیے ہیں جو توراۃ میں مذکور ہیں۔

علاوہ بریں بنی عیسو میں کوئی شخص اس پیشین گوئی کا مصداق نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت اسحاق نے حضرت یعقوب اور ان کی اولاد کو برکت دی اور عیسو اور اس کی اولاد کو برکت نہ دی۔ (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش) (باب ۲۷)

علماء پروٹسٹنٹ نے دو اعتراض اور کیے ہیں جن کو صاحب المیزان نے اپنی کتاب حل الاشکال فی جواب الاستفسار میں نقل کیا ہے۔

اول یہ کہ کتاب الاستثناء کے باب ۱۸ آیت پندرہ میں جو پیشین گوئی مذکور ہے اس میں آنے والے نبی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا" پس لفظ "تیرے ہی درمیان سے" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ نبی اولاد اسرائیل میں سے ہونا چاہیے نہ کہ اولاد اسمٰعیل میں سے۔

دوم یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام نے خود اس پیشین گوئی کا مصداق اپنے آپ کو ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ انجیل یوحنا باب ۵ آیت ۴۶ میں ان کا یہ قول مذکور ہے کہ "اگر تم موسیٰ پر ایمان لاتے تو مجھ پر بھی ایمان لاتے اس لیے کہ اس نے میرے حق میں لکھا ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ "تیرے ہی درمیان سے" کہنے کے بعد "تیرے ہی بھائیوں میں سے" جب کہا گیا تو صاف ظاہر ہو گیا کہ "تیرے ہی درمیان سے" کہنے کا مقصود دراصل "بنی اسرائیل کے درمیان سے" نہیں ہے بلکہ "ان کے بھائیوں میں سے" ہی ہے۔ پھر یہ بات آگے چل کر اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ آیت اٹھارہ میں جب دوبارہ اس وعدے کو حضرت موسیٰ نے دہرایا تو یوں کہا کہ "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" یہاں "ان کے درمیان سے" نہیں کہا گیا پطرس حواری نے جہاں اس پیشینگوئی کو نقل کیا ہے وہاں بھی صرف "تمہارے بھائیوں میں سے" کہا گیا ہے "تمہارے درمیان سے" نہیں کہا گیا۔

(ملاحظہ کتاب الاعمال باب ۳ آیت ۲۲) استفانوس نے بھی یہ پیشینگوئی اسی طرح نقل کی ہے، چنانچہ کتاب الاعمال کے باب ۷ آیت ۳۷ میں اس کا یہ قول مذکور ہے :-

"یہ وہی موسیٰ ہے جس نے بنی اسرائیل سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے مجھ سا ایک نبی ظاہر کرے گا اس کی سنو"۔

ان تمام حوالوں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کتاب استثناء باب ۱۸ کی آیت ۱۵ میں "تیرے ہی درمیان سے" جو کہا گیا ہے اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ آنے والا نبی اولاد اسرائیل سے ہوگا۔ اہل کتاب کی عادت جاریہ کو دیکھتے ہوئے یہ بھی بعید نہیں کہ آیت مذکورہ میں "تیرے ہی درمیان سے" کا اضافہ بعد میں کر دیا گیا ہو۔

رہا دوسرا اعتراض تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا جو قول یوحنا نے نقل کیا ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ "اس نے میرے حق میں لکھا ہے"۔ یہاں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ موسیٰ نے میرے حق میں فلاں موقع پر فلاں پیشینگوئی کی ہے۔ یہ مجمل بیان حضرت موسیٰ کی کسی خاص پیشینگوئی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس میں مطلقاً صرف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ مجھ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام میرے حق میں لکھ گئے ہیں۔ اس کو کس دلیل سے استثناء باب ۱۸ کی پیشینگوئی کے لیے خاص کیا جاتا ہے؟

دوسری بشارت

کتاب الاستثناء باب ۳۲ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے کس طرح خدا کی ناشکری کی، اور خدا نے جو انعامات ان پر کیے تھے ان سب کو بھلا دیا، اپنے خالق کو چھوڑ بیٹھے اجنبی معبودوں کی پرستش کی، شیطانوں کے لیے قربانیاں کیں خدا کے

مقابلے میں کج روی اور گردن کشی اختیار کی، یہاں تک کہ غیرت الٰہی جوش میں آگئی اور ان کے قابل نفرت کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا۔ پھر یہ سب بیان کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"اور جب خداوند نے یہ دیکھا تو ان سے نفرت کی اس لیے کہ اس کے بیٹوں اور اس کی بیٹیوں نے اسے غصہ دلایا۔ اور اس نے یہ فرمایا کہ میں ان سے اپنا منہ چھپاؤں گا تاکہ میں دیکھوں کہ ان کا انجام کیا ہوگا اس لیے کہ وے کج نسل ہیں ایسے لڑکے جن میں امانت نہیں۔ انہوں نے اس کے سبب سے جو خدا نہیں مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا سو میں بھی انہیں اس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا۔ اور ایک بے عقل قوم سے انہیں خفا کروں گا"

(آیت ۱۹—۲۱)۔

اس پیشینگوئی کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ان کے اعمال کی سزا یہ دی جائے گی کہ ان کو گرا کر ایک دوسری قوم کو اٹھایا جائیگا جس کی وجہ سے ان کی غیرت کو صدمہ پہنچے گا اور ان کی آتش حسد بھڑکے گی۔ یہ قوم جس کو بنی اسرائیل کے بعد اللہ تعالیٰ برگزیدہ کرنے والا تھا، اس کی دو علامتیں بیان کی گئی ہیں:—

پہلی علامت یہ ہے کہ وہ "گروہ نہیں"۔ عربی ترجموں میں غیر شعب اور لیس شعباً کے الفاظ سے اس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔ انگریزی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں۔

I will move them to jealousy with those which are not a people ;

ان سب ترجموں کو ملا کر پڑھنے سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک منتشر و پراگندہ

قوم ہے جس پر "ایک قوم" کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔ اقوام عالم میں وہ کسی شمار و قطار میں نہیں
دوسری علامت یہ ہے کہ وہ ایک "بے عقل" قوم ہے۔ عربی ترجموں میں شعب جاہل
اور امة غبية کے الفاظ سے اس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے انگریزی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

I will provoke them to anger with a foolish nation

ان ترجموں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا
گیا تھا جو "جہالت" اور "ضلالت" کے معانی پر حاوی تھا۔

ان دو علامتوں کے سوا اشارۃ النص سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی قوم ہونی
چاہئے جس کو یہودی حقیر و ذلیل سمجھتے ہوں، تاکہ جب اپنے مقابلہ میں اس کو بڑھتے دیکھیں تو
ان کی غیرت کو سخت صدمہ پہنچے اور ان کی آتش حسد بُری طرح بھڑکنے لگے۔

اب تاریخ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ زوال بنی اسرائیل کے بعد جتنی
قومیں ابھری ہیں ان میں سے بجز قوم عرب کے اور کسی پر یہ علامتیں راست نہیں آتیں۔ بابل
یونان اور روم میں سے کوئی ان کا مصداق نہیں ہوسکتا۔ صرف اہل عرب ہی تھے جن کو
قبائل اور بطون کی عصبیت نے اس قدر منتشر کر رکھا تھا کہ ان میں درحقیقت کوئی قومیت نہ
پائی جاتی تھی۔ (اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا) ان
کی جہالت و ضلالت بھی انتہائی حدود تک پہنچی ہوئی تھی (هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّيّٖنَ
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ
اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ)۔ نیز چونکہ وہ لونڈی (حضرت حاجرہ) کی اولاد سے
تھے۔ اس لیے یہودی ان کو بہت حقیر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم ان میں مبعوث ہوئے تو یہودی مارے حسد کے جلے جاتے تھے اور ان میں سے

بہتوں نے آپ کی نبوت کو پہچان لینے کے باوجود اسلام لانے سے محض اس بنا پر اعتراض کیا کہ بنی اسماعیل کے نبی کو ماننا ان کو گوارا نہ تھا۔

تیسری بشارت

کتاب استثناء، باب ۳۳ ۔میں ہے۔

"اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔ (آیت ۱-۲)

یہاں خداوند کا سینا سے آنا حضرت موسیٰ کو تورات عطا کرنا ہے اور اس کا شعیر سے طلوع ہونا عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا کرنا ہے اور اس کا فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہونا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کرنا ہے کیونکہ فاران کے متعلق تحقیق ہے کہ وہ مکہ کے پہاڑوں میں سے ہے عیسائی مصنفین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو سینا کے مشرق میں واقع ہے اس بحث کا تصفیہ جغرافی تحقیقات سے تعلق رکھتا ہے جس کا یہاں موقع نہیں مصنفین اسلام ان کے اس دعوے کا ابطال پوری قوت کے ساتھ کر چکے ہیں، جو شخص اس باب میں اپنی تشفی چاہتا ہو وہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرے مگر ہم کہتے ہیں کہ خود اس آیت میں جو اشارات پائے جاتے ہیں وہ بھی عیسائی مصنفین کے دعوے کی تائید نہیں کرتے خدا کے آنے اور اس کے طلوع ہونے اور اس کے جلوہ گر ہونے کا مفہوم بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی طرف سے علم و عرفان کی روشنی نازل ہو۔

بالفاظ دیگر اس سے مراد نزول وحی اور تنزیل کتاب اور اعطائے شریعت ہے۔ اب دیکھیے اس اشراق ربانی کے تین مقام بتائے گئے ہیں۔ سینا، شعیر، اور کوہ فاران۔ ان میں سے پہلا مقام بالاتفاق وہ ہے جہاں حضرت موسیٰ پر سب سے پہلے نور خداوندی ظاہر ہوا۔ دوسرا مقام سعایرکوہ سعیر ہے۔ یہ جنوبی علاقہ جلیل (Galilee) کے عین سرے پر واقع ہے۔ جہاں مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے اور جہاں انہوں نے اپنی دعوت پھیلائی۔ رہا تیسرا مقام تو اس کے لیے آیت زیر بحث میں جبل یا پہاڑی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ عیسائی مصنفین زیادہ سے زیادہ اسی قدر دعوے کرسکے ہیں کہ جزیرہ نمائے سینا میں فاران ایک ریگستان ہے۔ کسی جبل فاران کا نشان انہوں نے اس ریگستان میں نہیں دیا۔ بخلاف اس کے مکہ کی پہاڑیوں میں جبل فاران ایک مشہور چیز ہے۔ نیز وہ یہ بھی نہیں بتا سکے کہ ان کے فارانِ مزعوم سے نور ربانی کا اشراق کب ہوا اور کس پر ہوا؟ وہ کون تھا جو وہاں دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا؟ اس ریگستان میں کس کے دہنے ہاتھ پر آتشی شریعت رکھی گئی؟ ان علامتوں پر انصاف اور بے تعصبی کے ساتھ غور کیا جائیگا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کو ان کا مصداق نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔ کیونکہ آپ ہی جبل فاران کے جوار میں پیدا ہوئے۔ پھر آپ ہی فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار قدسیوں کے ساتھ اس مقام پر جلوہ گر ہوئے اور آپ ہی کا ہاتھ تھا جو "آتشی شریعت" یعنی مجاہدانہ شریعت کا حامل ہوا۔

(باقی)

قرآنی نظریۂ سلطنت

اس کے مقدمات اور اس کی روح

از پروفیسر ہارون خان شروانی ایم اے (آکسن) بار ایٹ لا استاذ جامعہ عثمانیہ

مترجمہ جناب مولوی سعید الحق صاحب عبّادی بی۔ اے (علیگ)

پانچ سال سے زیادہ مدت گذری کہ میں نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "علم السیاست کے میدان میں فکر مشرقی کا مقام" تھا، اس تصور سلطنت کے مطالعہ کی ابتدا کی جو مسلمانوں میں پایا جاتا ہے میں نے اس مضمون میں دوسرے مشرقی مفکرین کے ساتھ نظام الملک طوسی اور ابن خلدون کا بھی مختصر ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے الماوردی اور صاحب قابوس نامہ اور نظام الملک طوسی جیسے مختلف مصنفین کے افکار پر تنقیدی تبصرے کئے جو رسالۂ "اسلامک کلچر" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں مجھ کو اپنے رفقائے شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ کی معیت میں اسلامی فلسفۂ سیاست کی تاریخ کا ایک مفصل خاکہ بنانے کا موقع ملا جو اس کے آغاز عہد سے لیکر موجودہ لامرکزی رجحانات کے زمانہ تک کی پوری تاریخ پر حاوی ہے۔ یہ خاکہ ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے بنایا گیا ہے جو تاریخ سیاسیات اسلامی پر اس عظیم الشان تالیف کا کام اپنے ہاتھ میں لیں گے جسے طیار کرنے کا حکم جامعہ عثمانیہ نے دیا ہے۔

موضوع کی اہمیت | جب انسان اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والے مختلف النوع مباحث کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ان سیدھی سادھی صداقتوں کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے جن سے سیاسیات کا

ایک زبردست دریا پھوٹ نکلا، قرنوں اور صدیوں کے دوران میں دشت و جبل اور نشیب و فراز سے گذرتا اور ہزارہا شکلوں میں ڈھلتا رہا، مگر اپنی ظاہری صورت میں زمین کے عوارض یا عارضی تشکلات کے مطابق بدلتے رہنے کے باوجود اس کی جوہری خصوصیات وہی کی وہی رہیں جو پہلے تھیں۔ اس مسئلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جائے یہ احساس اتنا ہی زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ ادھر ادھر سے مختلف مصنفین کے خیالات کو جمع کر لینا لاحاصل ہے، جب تک کہ سب سے پہلے ان کے اصل مبادی کا سراغ نہ لگایا جائے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ اول تو جب موضوع بحث ایک ایسی سوسائٹی ہو جیسی کہ قدیم عربوں کی تھی اور ایک ایسی کتاب ہو جیسا کہ قرآن ہے، تو سیاسی تصورات کو ان دوسرے تصورات سے جدا کرنا بہت مشکل ہے جنہوں نے ایک وقت میں عرب کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بنا دیا کیونکہ سیاسی اور غیر سیاسی عوامل کی یہ نازک امتیازات تو بہرحال جدید زمانہ ہی کی پیداوار ہیں۔ صدیوں پہلے جو لوگ دنیا میں بستے تھے وہ ان سے آشنا نہ تھے۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ضبط اور تنظیم جو امکانی آزادی حاصل کرنے کے واحد ذرائع ہیں اور جن کو عام محاورہ میں "سیاست" کہا جاتا ہے، اگرچہ ایک سوسائٹی کی فلاح و بہبود میں ان کا بہت کچھ دخل ہے، مگر پھر بھی ایک قوم کی زندگی کے دوسرے عوامل سے قطع نظر کر کے صرف یہی دو چیزیں پورے پس منظر پر حاوی ہونے کے لئے کافی نہیں ہیں، اور جو تصویر اس طور سے بنے گی وہ غیر حقیقی و نامکمل ہو گی۔ بہرحال جہاں تک قرآن مجید کے سیاسی پہلو کا تعلق ہے، میرے علم کی حد تک اس کو نمایاں کرنے کی اب تک کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں ہم قرآن مجید کے اسی سیاسی پہلو کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے مگر چونکہ وقت کم ہے اس لیے ہم معلومات کے اس بڑے ماخذ کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں گے۔ جو حدیث کے ذخیرہ میں موجود ہے۔

مقدمات | بغیر اس کے کہ قرآنی سلطنت اور ان سیاسی نظاموں کے درمیان جو رسالت محمدی صلعم کے زمانہ میں جزیرۃ العرب کے اطراف میں قائم تھے، کوئی ربط تجویز کرنے کی کوشش کی جائے اگر ہم ان کے متعلق بھی کچھ واقفیت بہم پہنچا لیں اور اس کے ساتھ عربوں کے بھی ان سیاسی حالات پر ایک نظر ڈال لیں جو چھٹی صدی کے اختتام اور اس کے قریبی زمانہ میں تھے، تو یہ توضیح بیان کے لیے مفید ہوگا۔

اس زمانہ میں عرب کی شمالی سرحد پر دو طاقتور سلطنتیں تھیں، یعنی ایران اور Nova Roma یعنی بازنطیم۔ ایران نے مغربی اور وسطی ایشیا کی تہذیب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور مشرقی رومن امپائر قدیم یونان و روما کی بلا واسطہ جانشین تھی۔ ان دونوں بڑی سلطنتوں کے نظم اور ان کے ساتھ ساتھ قدیم عرب کے سیاسی حالات کے متعلق کچھ واقفیت بہم پہنچا لینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، اور یہی واقفیت ہم کو مماثلات اور مباینات کے سمجھنے میں مدد دے گی، جن کی تمیز کسی دوسرے ذریعہ سے ہونی مشکل ہے۔

ایران | ایران اپنی ایک مربوط تاریخ رکھتا ہے جو یونان اور روم کی معلوم تاریخ سے سینکڑوں برس پہلے شروع ہوتی ہے، اور ابتدا ہی سے اس میں ایسی زبردست وحدت اور مرکزیت کی مثال ملتی ہے جس کا حاصل ہونا ایسے قدیم زمانہ میں مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایران کی صرف اسی حالت سے بحث کرنا کافی ہوگا جو چھٹی صدی عیسوی کے آخر زمانہ میں تھی، یعنی خسرو انوشیروان کے دور میں تمام قدیم آریہ قوموں کی طرح ایرانی بھی چار طبقوں میں منقسم تھے جن کے درمیان قطعی اور واضح امتیاز پایا جاتا تھا۔ ان میں سے تین اونچے طبقے اسب فرو تر چوتھے طبقے سے بالکل الگ تھے۔ اونچی ذات کے تین طبقے یہ تھے:-

۱۔ مذہبی پیشوا اور قضاۃ۔ یہ صرف قبیلہ مجی سے لئے جاتے تھے، اس لیے اُن کو

بھی پت یا موبد کہا جاتا تھا۔

۲۔ اہل سیف۔

۳۔ اہل قلم یا عمال حکومت۔

چوتھا طبقہ اہل عرفہ اور مزارعین پر مشتمل تھا۔

شاہنشاہ کی ذات سیاسی وحدت اور نظم کا خارجی مظہر تھی، اور اس کو شاہنشاہ اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ نہ صرف صوبہ داروں کا حاکم اعلیٰ تھا، بلکہ ان بادشاہوں پر بھی اقتدار رکھتا تھا جو سلطنت کے دور دراز علاقوں پر فرمانروا تھے، مثلاً عراق عرب میں حیرہ کا بادشاہ۔ امرا کے سب سے اونچے طبقے میں جن کا شمار ہوتا تھا وہ مرزبان اور پہلوی تھے۔ یہ لوگ ایران اسپہبد (سپہ سالار اعظم) اور اسپہبد (سپہ سالار) کے عہدوں پر سرفراز ہوتے تھے، بڑی بڑی جاگیریں ان کو ملتی تھیں جن کے محاصل تمام تر ان کی جیبوں میں جاتے اور کوئی خاص فرض ان سے متعلق نہ تھا[1]۔ یہ تو خاندانی امرا تھے۔ ان کے علاوہ ایک طبقہ سرکاری امراء کا بھی تھا اور وہ بھی ملک کو لوٹنے میں کچھ کم نہ تھا۔ عام باشندے یا تو آزاد شہری تھے یا غلام کاشتکار جنہیں کسی انعام یا معاوضہ کے بغیر مزارع یا لشکروں میں خدمت بجا لانی پڑتی تھی۔ یہ لوگ بالکل منقطع تھے اور دہقانوں یا زمینداروں کے مرتبہ تک بھی پہنچنے کی امید نہ کرسکتے تھے، کیونکہ ان کو ناقابل عبور امتیازات نے دہقانوں سے جدا کر دیا تھا اور دہقان صرف ان کی محنت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ دہقانوں سے اوپر پدگوش بن یعنی وائسرائے ہوتے تھے جو سلطنت کے چار بڑے اقطاع کے دیوانی اور فوجی زمام دار تھے۔ مقدمین کے اس پورے گروہ سے بالاتر شاہی مجلس وزرا تھی جو ہزار پت (وزیر اعظم) موبدان موبد (راج گرو) ہربد (آتش کدہ

[1] ان کی حیثیت سلطنت مغلیہ کے منصبداروں کی سی تھی جو موجودہ زمانہ میں حیدرآباد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

کا محافظ) دبیر پد (میر منشی) اور اصلی سپہپدا (سپہ سالار) پر مشتمل تھی۔

شاہنشاہ تمام نظم حکومت کا مرکز تھا۔ وہ بیک وقت قوم کا ظہور مجسم بھی تھا، مدار حکومت بھی تھا اور وہ منبع بھی تھا جس سے تمام عزتوں اور حرمتوں کے چشمے نکلتے تھے۔ شاذ و نادر کسی موقع پر وہ عوام کو اپنے درشن دکھاتا تھا، اور جب کبھی ایسا ہوتا تو بڑے جشن اور شان و شوکت کے ساتھ ہوتا۔ ملبوسات فاخرہ زیب تن ہوتے، نہایت بھاری تاج ایک طلائی زنجیر کے ساتھ چھت میں لٹکا ہوا ہوتا۔ سونے کے تخت پر شاہنشاہ جلوہ گر ہوتا۔ خانوادہ شاہی کے شاہزادے ایک بڑے مطلاّ و مذہب سراپردے کو تھام کر کھڑے ہوتے اور یہ پردہ اس وقت تک پڑا رہتا جب تک کہ حاضرین کی خوش قسمتی سے وہ وقت نہ آجاتا جو شہنشاہ کے دیدار سے ان کو سرفراز کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔

قدیم جماعتوں میں ارادی وضع قانون کا فقدان تھا۔ ایران بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ تاہم جو تھوڑی بہت قانون سازی بھی ہوئی، اس کے لیے موبدوں کی جماعت سے منظوری حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ لوگ پرانے مزدی مذہب کے حاملان شریعت تھے اور قدیم مجی قبیلہ سے لیے جاتے تھے۔ تعلیم کی خدمت بھی ان سے بلکہ شاید انہی سے متعلق تھی، اور یہی ان لوگوں پر جرمانے کرتے تھے جو خلاف ورزی قانون کے مرتکب ہوتے تھے۔ دین سے انحراف اور بغاوت کی سزا موت تھی اور بسا اوقات آنکھیں نکالنے، سولی پر چڑھانے، سنگسار کرنے اور بھوکا مار دینے کے طریقے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ جب مسیحیت کا ظہور ہوا، تو صلیب کے پرستاروں کو خاص طور پر سلطنت کے غضب و انتقام کا ہدف بنا لیا گیا۔ چونکہ یہ لوگ ایران کی ہمسایہ اور دشمن سلطنت، بازنطیم کے ساتھ قریبی علاقہ رکھتے تھے اس لیے ان کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کیا جاتا تھا۔

ایرانی محاصل | دوسری بڑی سلطنت یعنی بائزنطیم کے نظم ونسق کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ان محاصل کے متعلق بھی کچھ کہنا مناسب ہوگا جو قریب قریب جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے رونما ہونے سے پہلے ایران میں وصول کیے جاتے تھے، کیونکہ ان کا عکس دورِ خلافت میں نظر آتا ہے۔ ان میں سب سے مقدم زمین کا محصول تھا جس کا نام "خراج" ہے۔ یہ زمین کی پیمائش اور پیداوار کے لحاظ سے ہر پرگنہ پر بحیثیت مجموعی عائد کیا جاتا، اور پھر عائد کردہ مقدار خراج کو پرگنہ کی آبادی پر مساویانہ تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ خراج کی مقدار کل پیداوار کا ۱/۶ سے ۱/۳ تک حصہ ہوتی تھی۔ دوسرا اہم محصول گزیت (عربی جزیہ) تھا۔ یہ ایک مقررہ سالانہ محصول تھا جو باشندوں سے اس طرح وصول کیا جاتا تھا کہ جو جتنا زیادہ مالدار ہو وہ اتنا ہی زیادہ دے، اور اس کا بار زیادہ تر ان لوگوں پر عائد ہوتا تھا جو اراضی کے مالک نہ تھے یا نہ ہو سکتے تھے، مثلاً یہودی عیسائی اور دوسرے باشندے جن کی عمر ۲۰ اور ۵۰ برس کے درمیان ہو۔ ان دو بڑے محاصل کے علاوہ بادشاہ کی خدمت میں نذریں پیش کرنے کا بھی دستور رہا، خصوصاً ہر سال اعتدال ربیع وخریفی کے تہواروں کے موقع پر۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش (۵۷۱ء) سے پہلے ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں کے تخت پر دو ایسے فرمانروا متمکن تھے جنہوں نے تاریخ میں نمایاں جگہ پائی ہے یعنی ایران میں خسرو انوشیروان اور بائزنطیم یا قسطنطنیہ میں جسٹنین (۵۲۷ء تا ۵۶۵ء)۔ اب ہم موخر الذکر سلطنت کے نظم ونسق پر ایک نظر ڈالیں گے جس کے مقبوضات تھوڑے ہی عرصہ بعد اسلامی سلطنت کے علمبرداروں کی زد میں آگئے۔

مشرقی سلطنت روما | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پانچ ہی سال قبل جسٹنین ۳۸ سال کی فرمانروائی کے بعد وفات پا چکا تھا۔ آنحضرت صلعم کی بعثت سے قبل ۴۰ سال

کی مدت میں قسطنطنیہ کے تخت پر چار فرمانروا متمکن ہوئے جسٹن ثانی (۵۶۵ء تا ۵۷۸ء) ٹبریس ثانی (۵۷۸ء تا ۵۸۲ء) ماریس (۵۸۲ء تا ۶۰۲ء) فوکس (۶۰۲ء تا ۶۱۰ء) ان کے بعد ہرقل تخت نشین ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے پورے زمانہ میں وہی حکمران رہا۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ قسطنطنیہ کی دستوری تاریخ کا وہی حصہ یہاں پیش کیا جائے جو اس اقعات سے لبریز دور میں گذرا ہے۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ وہ سب کچھ جو درحقیقت رومن تھا، اسے خود اسی فرقہ نے برباد کیا جو اپنے آپ کو رومن کہلانا پسند کرتا تھا۔ بجائے اس کے کہ سلطنت کا نظم و نسق جمہور یا ان کی سینٹ کے ہاتھ میں رہتا وہ اب تمام تر ایک ممتاز طبقہ پر مشتمل ہوگیا جو بالکل فرمانروا کی مرضی کا تابع اور جمہور سے کلیۃً الگ تھا۔ خود باشندے بھی چند طبقوں میں منقسم ہوگئے تھے۔

۱۔ اہل زمین (Curule caste) جو مالکان اراضی تھے اور وہ کبھی سپاہی یا تاجر نہیں بن سکتے تھے۔

۲۔ اہل حرفہ جو یا ان کے ایسے ہی طبقہ کی طرح ان آزاد باشندوں پر مشتمل تھے جو زمین کے مالک نہ تھے۔ اور جزیہ کی طرح کا ایک ٹیکس ان سے لیا جاتا تھا۔ مختلف پیشہ ور گروہ ان میں شامل تھے اور ہر گروہ کی رکنیت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی۔

۳۔ اہل سیف۔

مگر یہ تمام طبقات اس جابرانہ تحصیل پالیسی کے شکار ہوگئے تھے جو اس سلطنت کے لیے آخرکار ایک بلائے عظیم ثابت ہوئی۔ ایک مصنف جس نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ لکھتا ہے کہ کاشتکاروں کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ شاہی دربار اور لشکر کو خورش و پوشش بہم پہونچانے کے آلات تھے۔ قیاصرہ صرف جائز محاصل ہی پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ اکثر نذرانے

اور پیش کش بھی وصول کرتے رہتے تھے، جو ابتدا میں تو اختیاری تھے مگر بعد میں ان کو ایک مستقل ذریعۂ آمدنی بنا لیا گیا تھا۔

بازنطینی طرز حکومت | جہاں تک حکومت کے واقعی نظم ونسق کا تعلق ہے، وہ گویا قیصر کا ایک خانگی معاملہ بن گیا تھا۔ اگرچہ ایک مدت تک سینٹ برائے نام باقی رہنے دی گئی تھی، اور اس کی زندگی کا قطعی خاتمہ جسٹنین کے عہد سے پہلے نہ ہوا تھا، لیکن جب وہ قائم تھی اس زمانہ میں بھی اس کا عدم وجود برابر ہی سا تھا۔ آخر کار جسٹنین نے اپنی صحیح بربری اصلیت سے کام لے کر قدیم سیاسی نظام کا نام ونشان تک مٹا دیا اور حکومت کی تنظیم اس طور پر کی کہ دربار کی زینت کے لیے ہر چیز کو جرمانہ اور تاوان بنایا جا سکتا تھا۔ جائے تعجب ہے کہ جو شخص قدیم رومی قانون کے مدوّن کی حیثیت سے اتنا مشہور رہے اس کا نامۂ اعمال کس قدر سیاہ کاریوں سے لبریز ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم یورپ کے ادوار میں سے کسی دور میں بھی جمہور پر اس قدر مصائب نازل نہیں ہوئے جتنے اس "مقنن" کے دور میں ہوئے ہیں۔ آزاد شہریوں کو پکڑ پکڑ کر فروخت کیا جاتا تھا۔ لوگ ٹیکسوں سے بچنے کے لیے اپنے تاکستانوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتے اور عمارتیں مسمار کر دیتے تھے۔ ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے کہ جس علاقہ کے محاصل وصول نہ ہو سکتے وہاں کے دولتمند باشندوں کی املاک ضبط کر لی جاتیں حتیٰ کہ ان کو بالکل قلاش کر کے چھوڑ دیا جاتا۔ جسٹنین اعظم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کے زمانہ میں سرکاری عہدے علانیہ فروخت کیے جاتے تھے۔ اور احکام جاری کیے گئے تھے کہ قیمت یا تو خود بادشاہ کو ادا کی جائے یا اس کی بیگم، ملکہ تھیوڈورا کو۔

مذہبی تعصب | مذہبی معاملات میں کوئی رواداری نہ تھی۔ جب تک مسیحیت قبول نہ کی گئی تھی مسیحیوں پر ظلم کیا جاتا تھا، جب بادشاہ نے یہی مذہب اختیار کر لیا، تو علوم مدرسی، اور دین یہود اور

ہر اس چیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی، جو بادشاہ کے مذہب سے انحراف کا ادنیٰ شائبہ بھی رکھتی ہو۔ ۵۲۹ء میں جسٹینین نے علوم بلاغت اور فلسفہ کے مدارس کو قطعی طور پر بند کر دیا ان کے جتنے اوقاف تھے سب ضبط کر لیے۔ اور فلاطون کی اکاڈیمی، ارسطو کے بیت التعلیم اور زینو کی درسگاہ کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ تھیوڈوسیس (۳۷۹ء - ۳۹۵ء) جس کے نام کے ساتھ "اعظم" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس سے پہلے ہی ان المپین کھیلوں Olympian games کو موقوف کر چکا تھا جو ہزار سال سے جاری تھے۔ اس کے زمانہ میں ایتھنز کو اس حد تک فکری غلامی میں مبتلا کر دیا گیا تھا کہ بجز ان خیالات کے جن کی تصریح عمال شاہی کے عطا کردہ اجازت نامہ میں کر دی جاتی تھی، کسی دوسرے خیال کی تعلیم دینا ممنوع تھا۔ مشرقی سلطنت میں مذہبی جبر و ظلم کا جو حال تھا اس کی مثال میں ہم ایک رومی امیر فوکس (Phocas) کا واقعہ پیش کر سکتے ہیں جس نے بجبر عیسائی بنائے جانے سے بچنے کے لیے زہر کھا لیا۔ اس کے چند ہی سال بعد اسی نام کے دوسرے فوکس نے جو قیصر تھا تمام سلطنت کے یہودیوں کو بجبر عیسائی بنا لینے کا حکم دیا۔ اس کا جانشین اگرچہ اس کا ایسا دشمن نکلا کہ اس نے فوکس کو قتل کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا ڈالے، مگر یہ دشمن کا دشمن بھی یہودیوں کے حق میں دوست ثابت نہ ہوا۔ اس نے ان کو بیت المقدس سے نکال باہر کیا اور حکم دیا کہ یہ لوگ اس مقدس شہر سے تین تین ہزار فیٹ تک کی حد میں قدم نہ رکھنے پائیں۔ سلطنت کی اخلاقی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ قیصر ہرقل کی شادی خود اس کی اپنی بھتیجی سے ہوئی اور نکاح پڑھانے والے کوئی اور بزرگ نہیں، خود قسطنطنیہ کے اسقف اعظم تھے۔

یہ حال تھا ایران اور مشرقی روم کی سیاست کا چھٹی صدی عیسوی کے آخری زمانے میں اور ہمیں اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتا کہ مشرق اوسط کے ایک بڑے مورخ (Finley

کی عبارت نقل کردوں جو خود یونانی روایات کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ وہ حالات کا خلاصہ اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"شاید تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں ہے جس میں سوسائٹی کا اخلاقی انحطاط اس قدر عالمگیر ہو، اور جس میں تمام وہ قومیں جن سے رومی اور یونانی واقف تھے قوت عمل اور نیکی سے اس درجہ عاری ہوگئی ہوں، جیسا کہ جسٹینین کی وفات سے محمدؐ کے ظہور تک کا دور گذرا ہے۔

"تلافی مافات کا وقت آنا ضرور تھا۔ ایسے واقعات نے جنہیں کوئی انسانی فراست پہلے سے نہ دیکھ سکتی تھی، جن کے خلاف کوئی انسانی حکمت نہ لڑسکتی تھی، جن کی توجیہ میں ایک فلسفی بجز اس کے اور کچھ نہیں کرسکتا کہ ان کو تقدیر الٰہی اور قسمت (ایزدی) کی طرف منسوب کردے جس کا نمایاں اثر پوری انسانی تاریخ میں نظر آتا ہے، آخرکار مشرق کے بہت سے علاقوں میں رومی اقتدار کا خاتمہ کردیا۔

عربی ریاستیں اب ہم سرزمین عرب کی طرف آتے ہیں جو دین اسلام کا گہوارا بننے والی تھی۔ ہم دیکھیں گے کہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی پیدائش اور بعثت کے وقت اس سرزمین کی سیاسی حالت کیا تھی۔

عرب اپنے آپ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

۱۔ عرب البائدہ، یعنی شمال کی حامی آبادیاں۔

۲۔ عرب العاربہ، یعنی وہ سامی النسل لوگ جو قحطان یا یقطان کی اولاد سے تھے اور جنہوں نے بہت قدیم زمانہ میں عرب العاربہ پر تسلط جما لیا تھا۔

۳۔ عرب المستعربہ، یعنی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد جو ابتداءً شمال سے آئی اور عرب العاربہ کے درمیان رہ بس گئی۔

عرب البائدہ کا وجود ایک مستقل جمعیت کی حیثیت سے بہت پہلے ہی فنا ہو چکا تھا، اور جزیرۃ العرب باقی ماندہ دونوں گروہوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ قحطانیوں کا وطن جنوب میں یمن کا علاقہ تھا، اور ابراہیمی جیسا کہ اوپر بیان ہوا، شمال سے آئے تھے۔ قحطانی جنوب سے شمال کی طرف چلے اور حجاز، یمامہ اور یثرب میں پھیل گئے۔ پھر وہ شمال کی طرف اور آگے بڑھ کر شام تک پہنچے جہاں انہوں نے مسیحی دور کے آغاز میں دمشق کے قریب غسان کی ریاست قائم کی۔ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ یہ ریاست مشرقی سلطنت روما کے زیر اثر آگئی، اس کا بادشاہ عیسائی ہو گیا، اور خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک اس کا وجود برقرار رہا۔ قحطانیوں کی ایک اور شاخ شمال مشرق کی طرف گئی جہاں اُس نے سنہ ۱۹۵ء کے قریب زمانے میں بابل قدیم سے متصل فرات کے کناروں پر حیرہ کی ریاست قائم کی۔ غسان کی طرح یہ ریاست بھی زیادہ مدت تک آزاد نہ رہ سکی اور اس پر ایران کی سیادت قائم ہو گئی۔ تاریخ میں ہم کو حیرہ کے ایک بادشاہ منذر کا یہ حال ملتا ہے کہ شاہنشاہ ایران نے اس کو "شہنشاہ" (اعظم) کا خطاب عطا کیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چالیس سال قبل نعمان بن منذر نے ایرانی سیادت سے آزاد ہونے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار سنہ ۶۰۲ء میں خسرو پرویز نے حیرہ کی ریاست کو سلطنت ایران میں ضم کر لیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ حیرہ اور غسان کی یہ چھوٹی چھوٹی امارتیں اس قدر حقیر اور مغلوب تھیں کہ ملک عرب کے نظم و نسق کی تاریخ میں ان کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔ مشرقی وسط عرب بھی کچھ بہتر حال میں نہ تھا، کیونکہ وہاں کے یمنی زمام دار بھی ایرانی سیادت کے تابع تھے۔ اگرچہ ایرانی تہذیب کے مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کو نسبتاً کچھ زیادہ استقلال میسر تھا۔ جنوب میں قحطانیوں کا وطن اصلی، اپنے ہمسایہ یعنی حبش کے نجاشی (Negus

سے آزادی کی جنگ میں مبتلا تھا اس جھگڑے کی ابتدا اس مذہبی عداوت سے ہوئی جو ۵۲۵ء کے قریب یمن میں یمن کے یہودی فرمانروا یوسف ذونواس اور حبشی عیسائیوں کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں فریقوں کے درمیان قسمت کے پلڑے اٹھتے اور جھکتے رہے حبشیوں نے رومی امداد سے یمن پر قبضہ کر لیا۔ ایران نے یمنی فرمانروا سیف بن ذی یزن حمیری کی مدد کی اور اس نے حبشیوں کو نکال باہر کیا سیف کے بعد اس کا بیٹا معدی کرب ایرانیوں کی مدد سے تخت نشین ہوا، اور یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ مختلف عربی علاقوں سے جو سفرا اس کو مبارکباد دینے کے لیے گئے ان میں جمہوریہ مکہ کے سفیر عبدالمطلب بھی تھے۔ یہ پیغمبر اسلام کے دادا تھے۔

قبائلی نظام قبل اس کے کہ ہم عرب کے ان باقی ماندہ علاقوں کی سیاسی حالت بیان کریں جو عنقریب تمام دنیا کے نہیں تو کم از کم جزیرہ نمائے عرب کے مرکز بننے والے تھے، مناسب ہو گا کہ عربی قبائل کی سیاسی زندگی کے چند خصائص پر نظر ڈال لی جائے۔ سامی قبائل میں عموماً اور عربوں میں خصوصاً ایک غیر معلوم زمانے سے انفرادیت کا نہایت شدید جذبہ کارفرما رہا ہے۔ اُن کی نگاہ میں خاندان نہیں بلکہ فرد اور قبیلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ عربی معاشرت کی ساخت خونی رشتوں پر قائم تھی۔ قدیم یونانیوں کی طرح ہر خاندان کا ایک الگ خدا تھا اور ہر عرب قبیلہ کے افراد ایک مشترک معبود کی عبادت کے رشتہ سے باہم مربوط ہوتے تھے ان کے ہاں احساس قومیت کے بجائے تمام تر اہمیت صرف نسب نامہ کی تھی۔ ہر قبیلہ اپنا ایک خاندانی لقب، ایک مشترک مورث اعلیٰ رکھتا تھا جس سے تمام افراد خاندان مرد اور عورت اپنا سلسلہ نسب ملاتے تھے۔ یہ سوسائٹی "آبائی" Patriarchal کہی جا سکتی ہے، اس لیے کہ اس میں سلسلۂ نسب صرف مرد سے چلتا ہے۔ قبیلہ کا سردار شیخ کہلاتا تھا۔ مگر ہم کو یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ یہ شیخ دراصل کوئی موروثی عہدہ دار

نہ تھا بلکہ اپنے پیش رو کی وفات کے بعد اس کا انتخاب ہوتا تھا، البتہ مرورِ ایام کے ساتھ اس اعزاز میں بھی موروثیت کا رنگ آجایا کرتا تھا۔ وہ کسی حیثیت سے بھی رومی بزرگ خاندان (Paterfamilias) کے مشابہ نہ تھا۔ اور نہ اس کے اختیارات وہ تھے جو رومی ابو العائلہ (Patria potestas) کے تھے وہ محض ایک ثالث بالخیر یا حَکَم تھا جس کا کام صلح کرانا ہوتا تھا۔ وہ متنازعین کے درمیان صلح کی بات چیت کرتا اور جس کی زیادتی ہوتی اس پر اپنا اخلاقی اثر استعمال کرتا تھا اس میں شک نہیں کہ اس کا اثر بہت زیادہ تھا، مگر اقتدارِ اعلیٰ اس کو حاصل نہ تھا۔ ایک معین ضابطۂ قانون نہ ہونے کی وجہ سے افراد کے ظن و تخمین کے لیے بہت گنجائش تھی قبائل کے درمیان جو کچھ بھی سیاسی تعلقات تھے ان کا تمام تر انحصار محض فریقین کے اخلاقی احساس پر تھا۔ اور چونکہ عربوں میں خودداری اور عزتِ نفس کا جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا، اس لیے قبائل کے درمیان مناقشات کا ایک غیر مختتم سلسلہ چلتا تھا۔ یونانیوں کی طرح عربوں کے ہاں بھی بڑے بڑے میلے لگتے تھے جن میں اطراف و اکنافِ ملک سے لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ مثلاً دومۃ الجندل کے، عمان، حضرموت اور صنعاء کے میلے۔ مگر وحدت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے ان سے عربوں کے مختلف گروہوں میں مزید سیاسی اختلافات کی بنا پڑتی تھی۔

یہ امر معنی خیز ہے کہ اوپر جن ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے تو کوئی بھی خود مختار نہ تھی۔ کسی پر رومی اقتدار قائم تھا۔ کوئی ایران کے اثر میں تھی، اور کوئی حبش کے اثر میں۔ مگر عرب کی فطری خود مختاری کی شان ان مختلف عربی قبائل میں نظر آتی ہے جو زیادہ تر مغربی عرب میں رہتے تھے۔ ان حالات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے تاکہ ان سے اندازہ کیا جاسکے کہ ایسی سوسائٹی میں انفرادیت کو دبا کر ایک مستحکم ضابطۂ آئین و قانون

قائم کرنا کس درجہ محنت طلب کام تھا۔

مکہ کا سیاسی نظام اب ہم خاص طور پر مکہ کی حالت بیان کریں گے جو پیغمبر اسلام کا مولد، اور بعد میں دنیائے اسلام کا مرکز بننے والا تھا۔ مکہ تیسری صدی عیسوی تک یمن کے خاندان بنی جرہم کے قبضہ میں تھا۔ ان کے بعد ایک قحطانی خاندان، بنی خزاعہ نے مکہ اور جنوبی حجاز پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ پھر قصی بن کلاب نے اس کو نکال باہر کیا۔ یہ قصی، فہر کی ساتویں پشت میں تھا، اور فہر وہ شخص ہے جس کا لقب قریش تھا اور جس سے مشہور خاندان قریش کی بنا پڑی۔ قصی نے مکہ کا انتظام بڑے سائنٹفک انداز میں کیا۔ اس نے حکومت کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا تھا:-

۱۔ دار الندوہ، جس میں ندوہ یعنے سینٹ کا اجلاس ہوتا تھا۔ حکمران خاندان کے افراد اور شہریوں میں سے وہ لوگ اس مجلس شوریٰ میں شریک ہوتے تھے جن کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہوتی۔

۲۔ لواء یعنی حکمران کی فوجی طاقت کا نشان جو لڑائی کے موقع پر سالار فوج کو دیا جاتا تھا۔

۳۔ رفادہ، غربا کی امداد کا ایک محصول جو زیادہ تر منیٰ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر غریب حاجیوں کو کھانا کھلانے کے لیے وصول کیا جاتا تھا۔

۴۔ سقایہ، آبرسانی کا انتظام جو اہل عرب کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۵۔ حجابہ، یعنی کعبہ کی کلید برداری، جو اس قدیم معبد کی حفاظت اور پوجا پاٹ کے انتظ[illegible] پر مشتمل تھی۔

[illegible] میں جب قصی کا انتقال ہوا تو اس کی اولاد میں ان اہم

عہدوں کی تقسیم کے لیے کشمکش شروع ہوی۔ اور پھر یہ عہدے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہے، یہاں تک کہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں حکومت کے شعبوں کی از سرِ نو تقسیم ہوی اور ان کو کعب کی اولاد میں بانٹ دیا گیا جو قریش کی چوتھی پشت میں گذرا ہے۔ اس جدید تقسیم کا بیان بھی فائدے سے خالی نہیں ہے کیونکہ ان عہدہ داروں میں سے بعض کے نام اسلامی تاریخ میں بھی بڑے حرفوں سے لکھے ہوئے ملتے ہیں:۔

۱۔ بنی عدی میں سے عمر بن الخطاب کو سفارت کا عہدہ دیا گیا دوسرے قبائل اور ریاستوں کے ساتھ معاملات میں قریش کی نیابت کرنا ان کا کام تھا۔

۲۔ بنی جمیص میں سے حارث بن قیس کو خزینہ یعنی فینانس اور پبلک ٹرژری کی نظارت دی گئی۔

بقیہ آٹھ عہدے کعب کے دوسرے بیٹے مرہ کی اولاد میں اس طرح تقسیم کیے گئے:۔

۳۔ قبہ جو فوجی کیمپ کے نظم اور جنگ کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنے سے متعلق تھا۔ یہ عہدہ خالد بن ولید کو دیا گیا۔

۴۔ دیت، یعنی خونبہا، جرمانے اور مالی تاوان کا انتظام۔ یہ عبداللہ بن عثمان سے متعلق تھا جو بعد میں ابوبکر کے نام سے مشہور ہوئے۔

بقیہ تمام عہدے قصی کی اولاد کو دیے گئے جو مرہ کا پوتا تھا اور جس نے مکہ کو بنوخزاعہ سے آزادی دلوائی تھی۔ ان کی تفصیل یہ ہے:۔

۵۔ اس کے پوتے اسد بن عبد العزی کو ندوہ کا صدر بنایا گیا۔

۶۔ عثمان بن طلحہ کو حجابت دی گئی۔ اس طرح وہ کلید بردار کعبہ ہوگئے۔

۷۔ عباس بن عبد المطلب سقایہ پر مقرر کیے گئے۔

۸۔ حارث بن عامر کے سپرد رفادہ کی خدمت کی گئی۔ یہ بنی نوفل میں سے تھے۔

۹۔ لواء کی خدمت جو دراصل قریش کی سپہ سالاری تھی، ابو سفیان کو دی گئی جو بنو امیہ میں سے تھا۔

۱۰۔ ازلام یا ایسار یعنی بتوں سے استخارہ کرنے کی خدمت صفوان کے سپرد کی گئی جو بنو جمح میں سے تھا۔

یہ ایک مقرر قاعدہ تھا کہ ان دسوں سرداروں میں جو سب سے زیادہ معمر ہو اس کو رئیس کہا جائے۔ مگر عبد المطلب کی وفات کے بعد درحقیقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو باقی سب لوگوں پر فوقیت رکھتا ہو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو عنقریب انسانی افکار میں انقلاب عظیم برپا کرنے والے تھے عبد اللہ بن عبد المطلب کے ہاں ان کی زوجۂ محترمہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف کے بطن سے، اس مشہور حملہ کے چند ہفتوں بعد پیدا ہوئے جو یمن کے عیسائی فرمانروا ابرہۃ الاشرم نے مکہ پر کیا تھا۔ آپ کے والد، والدہ اور دادا کی وفات نے بچپن ہی میں آپ کو ان ہستیوں سے محروم کر دیا جو آپ کی دنیوی محافظ و مربی ہو سکتی تھیں۔ عبد المطلب کی وفات کے بعد مکہ کے سیاسی معاملات بہت خراب ہو گئے۔ بنی کعب کے مختلف خاندانوں کی باہمی رقابت کے سبب سے سرداران قریش میں مسلسل جھگڑے برپا ہونے لگے۔ مکہ کے بازاروں میں آئے دن سخت فتنہ و فساد کے مظاہرے ہوتے رہتے تھے، اور مرور ایام کے ساتھ یہ سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سرداران قریش کے درمیان کسی طرح مفاہمت ہی ہونے میں نہ آتی تھی، یہاں تک کہ آخرکار عبد المطلب ہی کے پوتے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سن رشد کو پہنچنے کے بعد ان کے درمیان ایک ایسی مصالحت کرا دی جس سے لوگوں کی املاک اور جانیں محفوظ ہو گئیں۔ یہ مفاہمت

حلف الفضول کے نام سے مشہور ہے، جو ۵۹۵ء میں ہوئی اور اس کے ذریعہ سے اہل مکہ کو ظالموں کے دست تطاول سے بچانے کے لیے ایک جتھا قائم کیا گیا۔ اس کے چند سال بعد ہم دوبارہ ۶۰۵ء میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بازنطینیوں کی ایک سازش کا خاتمہ کیا جس کا مقصد مکہ پر قبضہ کرنا تھا، اور جس کے لیے ایک عرب عثمان بن حویرث کو رشوت دی گئی تھی۔ آخری قابل ذکر واقعہ تعمیر کعبہ کا ہے جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی دور اندیشی اور فراست اور حسن تدبیر کا کیا حال تھا اور آپ نے کس طرح مکہ کی سوسائٹی کا شیرازہ بندھا رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس موقع پر ایک فتنۂ عظیم جو بھڑکنے کے لیے بالکل تیار تھا آپ ہی کی تدبیر سے فرو ہوا۔ یہ واقعات نزول قرآن سے پہلے کے ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی فراست، تدبر، قوت فیصلہ اور پر اثر شخصیت کس طرح نمایاں ہوچکی تھی۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

۲

از جناب مولانا طاہر بن احمد صاحب (دار العلوم دیوبند)

۱۳۔ اور یہ تو ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ انسان کی حفاظت کے لیے ملائکہ کی بے شمار جماعتیں مقرر ہیں جو ملکیت و بہیمیت کے ہر اسٹیشن پر اپنی چھاؤنی ڈالے ہوئے انسان کی حفاظت کرتی ہیں۔ مسلمان اپنی دعا میں ان کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

۱۴۔ اور دو فرشتے تو انسان کے لیے مستقلاً و انتا کراماً کاتبین ایسے امور ہیں جو اس کے تمام اعمال کو لکھتے ہیں پس نعبد و نستعین سے اشارہ اس طرف بھی ہے کہ بندۂ مومن اس معنی کر بھی اپنے کو اکیلا نہ سمجھے بلکہ ان ملائکہ کی طرف سے بھی جن کا مقام عبادت زمین کے بجائے آسمان ہے ان کی طرف سے وکیل بن کر کہے إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔

۱۵۔ نیز حسب ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم المرء مع من احب جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے وہ بقاعدۂ الارواح جنود مجندۃ ایک ہی سلسلہ میں منسلک شمار ہوتا ہے پس مومن قانت اپنے تمام محب اور محبوب افراد کو بھی شامل کرکے کہتا ہے۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔

پھر جب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان کے ہر جز وکل سے حتی کہ اس کے ہر بن مو سے نعبد و نستعین کی یہی مقدس دعا و ندا بار بار بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتی رہتی ہے اور جو

اقرارِ ربوبیت ازل میں کیا گیا تھا یہ عمر مستعار اسی کے اعادہ و تکرار میں ختم کرنے کے لیے دی گئی ہے جیسا کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ سے ظاہر ہے اور اس اسلوب جمعیت سے جسم و روح کے جملہ لوازمات و متعلقات کا استحضار مطلوب الٰہی ہے تو یقیناً اس کے تمام اجزائے نامیہ کا جن پر دعائے مسلم کا ہمہ وقت نزول رہتا ہے مقصود صراط تک پہنچنا ایک فطری امر ہوگا جس کی پہلی منزل دربار کعبہ ہے اور دوسری منزل عرش اعظم اور دربار آخرت ہے۔ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ۔ اور جبکہ نعبد و نستعین و اہدنا میں اس قدر حیثیات ملحوظ باری تعالیٰ ہیں جن سب کا احاطہ بشری طاقت سے باہر ہے اور صرف نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ میں الف کے بجائے نونؔ۔ رکھدئے جانے سے بلاغت و جامعیت کا وہ مرتبۂ لطیف و اعلیٰ پیدا ہوگیا ہے جس کے بیان پر بشر کو پوری قوت و قدرت بھی نہیں ہے۔ تو اگر ہم اس عموم اعجاز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس اسلوب جمعیت کو دیگر مقامات قرآن کی مدد سے اس طرح تعبیر کریں کہ جہاں کہیں یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے وہاں ذات مع صفات مراد ہوا کرتی ہے تو غالباً یہ وجہ لطیف بھی درجۂ بداہت کو پہنچے بغیر نہ رہے گی۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ انسان خدا کا نائب اور خلیفہ ہے جو جو صفتیں خدا میں ذاتی اور اصلی ہیں وہی انسان میں اس کی عطا کردہ ظلی اور مستعار ہیں اور جیسے خدا کی حکومت و ربوبیت میں ہزاروں مستقل عالم ہیں گویا ہر ہر صفت کا ایک جدا عالم ہے اور ذات واجب تعالیٰ سب کو محیط اور جامع ہے اسی طرح انسان میں بھی ایک ایک صفت کا ظہور گویا ایک مستقل عالم سمجھنا چاہیے۔ پس اس لحاظ سے بھی مومن قانت کو اِهْدِنَا اور نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ کے صیغوں سے استدعا اور عرض حال کا حکم دیا گیا ہے یعنی جس طرح خداوند رب العالمین جب

اپنے کو جمع کے صیغوں سے ظاہر فرماتا ہے تو وہاں ذات واجب تعالیٰ کو مع صفات کے ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی خدا نے اپنی بارگاہ میں استدعا پیش کرتے وقت یہ ہدایت فرمائی ہے اور ایسے جملے انسان کے لیے تجویز فرمائے ہیں جن میں نہ صرف انسان کی ذات ہی مراد ہو بلکہ اس کی ذات مع صفات کے مراد ہوا کرے۔

حضرات اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ آیت الکرسی میں خدا نے اپنی چار اعلیٰ صفتوں یعنی علم حیات قیومیت اور قدرت کا ذکر فرمایا ہے اور تمام عالموں کے قیام و بقا میں یہی چار صفتیں اصل الاصل ہیں اور باہمدگر اسی طرح مربوط و مانوس ہیں جیسے کرسی کے چار ایک پائے ایک دوسرے سے مربوط ہوا کرتے ہیں اور ان چاروں صفتوں میں کچھ ایسا مخصوص ربط اور ارتباط اور علاقہ ہے کہ بلا تشبیہ ایک صفت دوسری صفت کا رنگ اختیار کرتی ہے تو دوسری صفت تیسری صفت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں نہ صرف صفت علم ہی اس عالم میں قرآن کی مربی و محافظ ہے بلکہ صفت قدرت و قیام اور صفت حیات بھی حفاظت میں مساوی رنگ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ بہرحال انہی صفتوں کا ظہور ہے جو انسان و حیوان اور کل مخلوق کے انواع و افراد درجہ بدرجہ زندہ و قائم اور عالم و قادر نظر آتے ہیں پس کلام پاک میں جہاں جہاں ان صفات جلیلہ کی کارفرمائیوں کا ذکر ہے وہاں اکثر و بیشتر حق تعالیٰ نے اپنے کو جمع ہی کے صیغوں اور ضمیروں سے تعبیر فرمایا ہے جس سے نہ صرف ذات واجب تعالیٰ کی طرف اشارہ منظور ہوتا ہے بلکہ ذات واجب تعالیٰ مع صفات کے مراد ہوا کرتی ہے لیکن اگر یہ نظریہ تسلیم نہ کیا جائے تو پھر جن مقامات میں خدا نے اپنے کو واحد متکلم کے صیغوں سے یا ضمیروں سے تعبیر فرمایا ہے جیسے اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ، وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ اور اِنِّیْ مَعَكُمْ

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ الخ تو یہ دونوں قسم کی تعبیرات خالی از حکمت ہو جائینگی حالانکہ کلام حکیم فعل حکیم کیطرح کبھی خالی از حکمت نہیں ہو سکتا اور بلا شبہ کلام حکیم کا ایک ایک نقطہ اور اس کا ایک ایک شوشہ بھی بلاغت و منفعت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کہا جائے کہ جہاں خدا نے اپنے کو جمع کے صیغوں سے تعبیر فرمایا ہے وہاں اس کو محض اپنی تعظیم کا اظہار مقصود ہے تو اس قسم کی تعظیم کا اسلوب بھی خدا کے لیے قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے کہ خدا وحدہٗ لاشریک اگر اس قسم کی تعبیر سے تعظیم کا ارادہ فرماتا تو وہاں فرماتا جہاں اس نے اپنے اسم ذات کو ذکر فرمایا ہے چنانچہ اسی نظریہ کے بموجب اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ کے بجائے اِنَّنَا نَحْنُ اللّٰہُ ہونا چاہیے تھا حالانکہ انا کی ضمیر ہی یہاں زینت کلام کی موجب ہے۔ اور اس قسم کی جملہ تعبیرات سے خداوند قدوس وحمید منزہ و مبرا ہے معلوم ہوا کہ جہاں جمع کے صیغوں سے خدا نے اپنے کو تعبیر فرمایا ہے وہاں تو اس نے اپنی ذات پاک کو مع اپنی صفات متعددہ کے مراد لیا ہے اور جہاں واحد کی ضمیروں یا صیغوں سے اس نے اپنے کو تعبیر فرمایا ہے۔ وہاں صرف مرتبۂ ذات ہی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ پھر حمید و مجید اور غنی عن العالمین کو ایسی تعبیروں کی جن سے محض تعظیم کا اظہار ہو ضرورت بھی نہیں ہے اس لیے کہ خود وہ حمید و مجید ہے۔ البتہ اس نے جہاں اپنی عظمت و کبریائی کا اظہار فرمایا ہے وہ محض بندوں کی آگاہی کے لیے فرمایا ہے جب دنیا کے صاحبان کمال اپنے کمال کو چھپانے کی سعی کیا کرتے ہیں اور جو اظہار بھی کرتے ہیں تو محض نفع رسانی کے لئے تو خدا تو سرچشمہ کمالات ہے اور بہت سے کمالات تو صرف اسی کے لیے مختص ہیں پھر وہ کیسے اس کو گوارا فرما سکتا ہے۔ ہاں اس نے اپنی عظمت و شان کو جہاں بیان کیا ہے تو اس کا اسلوب اکثر بیشتر یہ ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ۔ اور ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ باقی جیسے ہم اور آپ اپنے لیے جمع کے صیغوں کو بول کر اپنی بڑائی کا اظہار کیا کرتے ہیں مالک الملک کو اس قسم کی تعبیرات کی حاجت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو اپنی تعبیرات پر خدائی تعبیرات کو قیاس نہیں کرنا چاہیے خدا نے جہاں اپنے کو جمع کے صیغوں سے ظاہر فرمایا ہے۔ وہاں اس نے اپنی ذات پاک کو مع اپنی صفات جلیلہ کے مراد لیا ہے لیکن اگر یہ مراد نہ لی جاوے تو پھر اسلوب جمع متکلم سے مخالفین و سفہاء سرے سے خدا کی وحدانیت ہی کا انکار ثابت کرنے لگیں گے اور کہیں گے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ مارنے والا خدا جدا ہے اور جلانے والا جدا ہے اور بارش برسانے والا خدا جدا ہے وہ بالکل صحیح ہے پس ایسے جملہ مواقع قرآنیہ میں ذات واجب تعالیٰ مع لحاظ صفات کمالیہ ہی مراد ہوا کرتی ہے اور یہی اسلوب وقت عبادت بندۂ مومن کو بھی نعبد و نستعین سے سکھلایا گیا ہے تاکہ وقت دعا و استدعا انسان کی ذات مع صفات اربعہ کے مراد ہو تاکہ خدا کی طرف سے بھی جواب میں جو رحمت و برکت دربار الٰہی سے آئے وہ خدا کی ذات اور اس کی صفات دونوں کی طرف سے آئے چنانچہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ۔ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہے دیکھیے انسان کی خلقت علم و حیات و قیام و قدرت کی کرشمہ سازیوں سے عمل میں آئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو لَقَدْ خَلَقْتُ الْاِنْسَانَ سے نہیں بلکہ خَلَقْنَا سے تعبیر فرمایا ہے اور جہاں بندہ کی جسم و روح کو اپنی تجلیات علم و حیات و قیام و قدرت کا مظہر اکمل ظاہر فرمایا تو وہاں بھی نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ فرمایا اَنَا اَقْرَبُ اِلَیْہِ نہ فرمایا۔ اور اس اسلوب جمعیت سے یہ تنبیہ فرما دیا گیا کہ انسان کی ساخت اگر صفات اربعہ کی رہین منت ہے تو اس کا قیام و بقا بھی

انہیں کارہین منت ہے۔

ایک حکمت نعبد ونستعین میں یہ بھی ہے کہ انسان کے دل سے یہ شبہہ بھی مٹ جائے کہ خدا نے جہاں جمع کے صیغوں سے اپنے کو ظاہر فرمایا ہے تو اس سے وہ اپنی وحدانیت کا انکار کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد خود بندہ کو بھی اپنی وحدت کے متعلق جواب سوچنا ایک قدرتی امر ہوگا اب ہم اس اسلوب جمعیت کو کلام پاک کی بکثرت آیتوں میں سے بطور نمونہ چند آیتوں سے دکھلانا چاہتے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ خداوند علام الغیوب باوجودیکہ بے چون وبے ہمتا ہے مگر جہاں اس کو اپنی ذات پاک کا مع صفات اربعۂ متعددہ کے اظہار مقصود ہوتا ہے جن کی حکومت وسیادت واسطہ وبلا واسطہ عناصر اربعہ اور ان کے مجموعہ ہائے مختلفہ پر فائض ومشتمل ہے اور جو صفات اربعہ لبقیہ صفات خداوندی کے لیے نمایندگی میں وہی مرتبۂ فوقیت رکھتی ہیں جو چار فرشتے بقیہ فرشتوں پر رکھتے ہیں یا عناصر اربعہ کو تمام عنصری مخلوق پر حاصل ہے یا مثلاً جیسے خلفاء اربعہ کو تمام صحابہ پر کرامت و فوقیت حاصل ہے یا جو مرتبہ وزرا سلطنت کو حکام سلطنت سے ہوتا ہے تو ایسے تمام مقامات میں خدا نے اپنے کو جمع ہی کے صیغوں یا ضمیر دل سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ کلام پاک میں خود کلام پاک کے متعلق ارشاد ہے إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ۔ اس کا ترجمہ بھی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رح نے بہت ہی عجیب ولطیف فرمایا ہے یعنی ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔ یہاں حفاظت ذکر حکیم کے لیے واحد کا صیغہ بھی لایا جا سکتا تھا لیکن حفاظت وصیانت اور اس قسم کے جملہ امور چونکہ صفات خداوندی ہی سے متعلق ہیں اور مرتبۂ ذات بہت اعلیٰ مرتبہ ہے، اس لیے اس قسم کے جملہ مواقع میں جن کا تعلق اس عالم کے کاروبار سے ہوتا ہے جمع ہی کے صیغوں سے تعبیر ہوتی ہے ۲ اسی لیے آیۃ مذکورۃ الصدر میں فرمایا گیا کہ ہم نے آپ ہی اس

نصیحت و نور کو عرش سے اتارا ہے اور ہم آپ ہی اس کی نگہبانی اس عالم میں کرنے والے ہیں یعنی جس طرح عناصر اربعہ کل اجسام کی تربیت مساوی حیثیت سے کرتے ہیں اور بغیر ان کے سلسلۂ اجسام کا قیام و بقا ناممکن ہے اسی طرح : صرف صفت علم ہی قرآن کی مربی و محافظ نہیں بلکہ صفت قدرت بھی ایک شوشہ کا تغیر اس کے لیے جائز نہیں رکھتی۔ نہ صرف صفت قیام ہی سے ان اساس دین قیم کو عالم میں قائم و باقی رکھا جائے گا بلکہ صفت حیات کی کارفرمائیاں بھی بدرجۂ اتم روح قرآنی کی محافظ بن کر سامان حیات کو عالم میں زیادہ کریں گی اور جس طرح خدا کی تجلیات اربعہ علم و حیات قیام و قدرت نے کعبہ مقدس کو عالم میں امن و جنگ کا مدار ٹھیرا دیا ہے چنانچہ یہی بیت عتیق ایک طرف اگر عالم کے لیے قیاماً للناس ہے تو دوسری طرف یہی مقدس جلوہ گاہ سبحانی اور دربار ارمنی، ظالموں اور سرکشوں کی گردنیں بھی توڑ ڈالنے والا ہے اسی طرح ان تجلیات اربعہ کا مجموعہ اور شئون ذاتیہ کا مخزن قرآن کریم ہے جو قلوب مومنین کے لیے باعث ہدایت اور کافروں کے لیے باعث ضلالت ہے اور جس کو اس کے نازل فرمانے والے کی طرف سے راسخین فی العلم کے سینوں میں محفوظ کرا دیا گیا ہے جہاں تک کسی بڑی سے بڑی حکومت و قوت کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ بَلْ هُوَ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيَاتِنَا اِلَّا الظَّالِمُوْنَ۔ یہی اسلوب جمیعت وہ ہے کہ جب تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم و اسماعیل سے حق تعالیٰ نے عہد لیا تو اس وقت بھی یہی اسلوب ملحوظ و مرعی رکھا گیا۔ کما قال تعالیٰ وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور یہی اسلوب اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ میں بھی ہے۔ یہی انداز وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى میں بھی جاری ہے۔ علیٰ ہذا۔ اِنَّا اَنْزَلْنَا

اِنَّا اَعْطَیْنَا۔ اِنَّا جَعَلْنَاهَا۔ اور دوسرے تمام ایسے مقامات میں بھی یہی دستور جاری ہے
اور یہ اسلوب خاص ہم دنیا میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ بلا تشبیہ بالتمثیل محض اس حقیقت
غامضہ کو ذہن نشین کرنے کے لیے آپ ایسا ہی سمجھیں جیسے مثلاً حکومت وقت میں یہ دستور رائج
ہے کہ جو حکم وائسرائے ہند اپنے اختیارات خاص سے جاری کرتا ہے تو ایسے احکام و اختیارات
تمیزی کے متعلق تو فرامین سلطنت میں لکھا جاتا ہے کہ ما بدولت نے فلاں حکم اپنے اختیارات خاص
سے نافذ کیا ہے یا مثلاً فلاں چیز کو ممنوع قرار دیا ہے اور جو حکم معمولاً بمشورہ کونسل و ارکان خاص
جاری کیا جاتا ہے تو اس کے متعلق اسی شخص واحد کی طرف سے یہ تعبیر ہوتی ہے کہ گورنر جنرل نے
با جلاس کونسل فلاں حکم جاری کیا ہے اور گورنر جنرل با جلاس کونسل فلاں فلاں امور کو ممنوع
قرار دیتے ہیں۔ گویا اس تعبیر سے فرمانروائے ہند کو اپنی ذات خاص کا مع اپنے وزرائے خاص
کے استحضار کے اظہار مقصود ہوتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسلوب فطری و در حقیقت
فانی حکومتوں نے خدا کی حکومت ہی سے سیکھا ہے جس کو خدا نے ابتدائے آفرینش سے اپنے لیے
ملحوظ رکھا ہے اور بندے کو ایما فرمایا کہ جب بھی وہ بجانب رب العرش العظیم دست بستہ کھڑا
ہو کر اپنی معروضات اور حاجتیں پیش کیا کرے تو محض اپنی ذات خاص سے نہ کیا کرے بلکہ اسی
اسلوب عظیم کے موافق اپنے وزرا علم و حیات، قیام و قدرت سمیت بارگاہ الٰہی میں ملتجی
ہوا کرے تاکہ خدائی دربار سے بھی جس قدر رحمت و برکت کا نزول ہو وہ خدا کی ذات و صفات
دونوں کی طرف سے ہو اور اس جامع اسلوب کے اختیار کر لینے سے انسان کا کوئی دینی
یا دنیوی مفاد ایسا نہ باقی رہے جو نعبد و نستعین واحد نا کہہ لینے سے ضائع ہو سکے یا تحت المراد
نہ آجائے اور رب السمٰوٰت و رب الارض و رب العرش الکریم کی طرف سے بھی
بمقابلہ نعبد و نستعین واحد نا کے تین ہی قسم کی رحمتیں انسان کو مقصود اصلی تک پہنچا دیں۔

پس آخر میں اس قسم کی تمام تفاصیل کا خلاصہ صرف حرف نون تک جا کر منتہی ہو جاتا ہے کہ یہ سب درحقیقت الف کے بجائے نون رکھدیے جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔

لیکن اگر انسان اس پر غور کرنے لگے کہ دیگر مواضع قرآنی میں اس حرف سے کیا کیا حکمتیں مراد لی گئی ہیں، اور قرآن حکیم کے تمام حروف کے اندر کس قدر حکمتیں اور اسرار نہاں ہیں تو میرا ایمان ہے کہ انسان کی عمر ختم ہو جائے گی مگر وہ ایک حرف کے بھی پورے اسرار اور اس کی کنہ کو معلوم نہ کر سکے گا۔ ؎

منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۶)

تخلیط و تلبیس اگر کوئی شخص یا گروہ اسلامی تمدن و معاشرت اور مغربی تمدن و معاشرت کے اصولی، مقصدی اور صوری فرق کو اچھی طرح سمجھنے اور دونوں کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اسلام کو چھوڑ کر مغربی تمدن و معاشرت کو اختیار کرلے تو ہم کو اس سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے عمل میں مختار ہے، اور اگر کوئی شہد کو شہد اور زہر کو زہر جان لینے کے بعد زہر کو اختیار کرتا ہے تو شوق سے اختیار کرے لیکن ہمیں جس چیز پر اعتراض ہے وہ خلط مبحث اور تلبیس حق و باطل ہے۔ بعض لوگ ہیں جنہوں نے نہ اسلامی تمدن و معاشرت کے اصول و مقاصد کو سمجھا ہے، نہ مغربی طرز معاشرت کے اصول و مقاصد کو، اور وہ نادانی سے ان دونوں کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ ہیں جو قصداً تلبیس سے کام لیے جا رہے ہیں، کیوں کہ ان کی خواہشات نفس ان کو مغربی تمدن و معاشرت کے طریقے اختیار کرنے پر ابھارتی ہیں، مگر یا تو ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ علانیہ اسلام کو ترک کر دیں، یا وہ عام مسلمانوں کو دھوکہ دیکر اپنے ساتھ اس راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں، اس لیے وہ اسلام کے اصول و مقاصد اور اس کے قوانین کے بالکل خلاف ایک طریقہ اختیار کرتے ہیں، اور پھر قرآن و حدیث کے احکام میں تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی تاویلیں کرکے مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ انہیں کا پسندیدہ طریقہ درحقیقت اسلام کا طریقہ ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے

اس خلط مبحث کو ختم کیا جائے اور تلبیس و تخلیط کے تمام دروازوں کو بند کر کے ان حضرات کو مجبور کر دیا جائے کہ دو واضح اور نمایاں راستوں میں سے کسی ایک کو صاف اور سیدھے طریقے سے اختیار کر لیں، خواہ وہ اسلام کا راستہ ہو یا مغربی تہذیب و تمدن کا راستہ۔

مخالفین حجاب کے تین طبقات اس وقت مسلمانوں کے جس گروہ میں ترک حجاب اور آزادی نسواں کی تحریک پھیل رہی ہے وہ تین مختلف طبقات سے مرکب ہے، اور ہر ایک کا حال جدا گانہ ہے

انتہا پسند ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو مغربی معاشرت کے اصول ثلثہ (یعنی مساوات مرد و زن، عورتوں کے معاشی استقلال اور دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط) پر ایمان لا چکے ہیں اور انہی اصولوں پر اپنی معاشرت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ عملاً شروع کر چکے ہیں۔ ان کے پیش نظر وہی مقاصد ہیں جو اہل مغرب کے پیش نظر ہیں، یعنی مادی فوائد اور حسّی لذتیں۔ ان کے نظریات بھی وہی ہیں جو یورپ سے درآمد ہوئے ہیں۔ عورت کی تعلیم کا منتہا ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ کمانے کی قابلیت بہم پہنچائے اور اس کے ساتھ دل لبھانے کے فنون سے بھی کماحقہ واقف ہو۔ خاندان میں عورت کی صحیح پوزیشن ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ مشترک بجٹ میں اپنا حصہ پورا پورا ادا کرے اور مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا رکن بن جائے۔ سوسائٹی میں عورت کا حقیقی مقام ان کی رائے میں یہ ہے کہ وہ اپنے حسن، اپنی آرائش اور اپنی اداؤں سے سوشل لائف میں ایک عنصر لطیف کا اضافہ کرے، اپنی خوش گفتاری سے دلوں کو حرارت بہم پہنچائے، اپنی موسیقی سے کانوں میں رس بھر دے، اپنے رقص سے روحوں کو وجد میں لائے، اور تھرک تھرک کر اپنے جسم کی ساری خوبیاں آدم کے بیٹوں کو دکھائے تاکہ ان کے دل خوش ہوں، ان کی نگاہیں لذت یاب ہوں، اور ان کے ٹھنڈے خون میں تھوڑی سی گرمی آجائے۔ قوم میں عورت کی صحیح حیثیت ان کے اعتقاد میں یہ ہے کہ وہ سوشل ورک کرتی پھرے،

میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں جائے، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں شریک ہو، سیاسی اور تمدنی اور معاشرتی مسائل کو سلجھانے میں اپنا وقت اور دماغ صرف کرے، ورزشوں اور کھیلوں میں حصہ لے، تیراکی اور دوڑ اور کود پھاند اور لمبی لمبی اڑانوں کے ریکارڈ توڑے، غرض وہ سب کچھ کرے جو گھر سے باہر ہے، اور اس سے کچھ غرض نہ رکھے جو گھر کے اندر ہے۔ عورت کی زندگی کا یہ سارا پروگرام جو اپنے اصول و مقاصد سے لے کر اپنی عملی جزئیات تک بعینہٖ وہی ہے جو یورپ اور امریکہ میں مرتب ہوا ہے، ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہو کر آئیڈیل پروگرام سمجھ کر اخذ کیا گیا ہے، اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کو عین مطابق اسلام قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ اسلام مادی ترقی میں مانع نہیں ہے، اور مادی ترقی کی کوئی صورت اِس صورت خاص کے سوا متصور نہیں!

معتدلین | دوسرا طبقہ اعتدال پسندوں کا ہے جن میں آجکل نیم حجاب اور نیم بے حجابی کی ایک عجیب معجون مرکب استعمال کی جا رہی ہے۔ یہ لوگ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ کے صحیح مصداق ہیں۔ ایک طرف تو یہ اپنے دلوں میں اسلامی جذبات رکھتے ہیں۔ اخلاق تہذیب شرافت اور حسن سیرت کے اُن معیاروں کو مانتے ہیں جن کو اسلام نے پیش کیا ہے، اپنی عورتوں کو حیا اور عصمت کے زیوروں سے آراستہ اور اپنے گھروں کو اخلاقی نجاستوں سے پاک رکھنے کے خواہشمند ہیں، اور ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو مغربی تمدن و معاشرت کے اصولوں کی پیروی سے رونما ہوئے ہیں اور ہونے چاہئیں، مگر دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے اصول و قوانین کو توڑ کر کچھ رکھتے، کچھ جھجکتے اُسی راستہ کی طرف اپنی بیویوں، بہنوں، اور بیٹیوں کو لیے چلے جا رہے ہیں جو مغربی تہذیب کا راستہ ہے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ آدھے مغربی اور آدھے اسلامی طریقوں کو جمع کر کے

یہ دونوں تہذیبوں کے فوائد و منافع اکٹھے کریں گے، یعنی ان کے گھروں میں اسلامی اخلاق بھی محفوظ رہیں گے، ان کی عائلی زندگی کا نظم بھی برقرار رہیگا، اور اس کے ساتھ ان کی معاشرت بلحاظ مغربی معاشرت کی پابندیوں کو چھوڑ کر صرف اس کی دلفریبیاں، اس کی لذتیں اور اس کی مادی منفعتیں بھی جمع کرے گی۔ لیکن اول تو دو مختلف الاصل اور مختلف المقصد تہذیبوں کی آدھی آدھی شاخیں کاٹ کر پیوند لگانا ہی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح کے بے جوڑ امتزاج سے دونوں کے فوائد جمع ہونے کے بجائے دونوں کے نقصانات جمع ہو جانا زیادہ قریب از قیاس ہے۔ دوسرے یہ بھی خلاف عقل اور خلاف فطرت ہے کہ ایک مرتبہ اسلام کے شدید تر اخلاقی نظام کی بندشیں ڈھیلی کرنے اور نفوس کو قانون شکنی سے لذت آشنا کر دینے کے بعد آپ اس سلسلہ کو اسی حد پر روک رکھیں گے جس کو آپ نے خالی از مضرت سمجھ رکھا ہے۔ یہ نیم عریاں لباسوں کا رواج، یہ زینت و آرائش کا شوق، یہ دوستوں کی محفلوں میں بے باکی کے ابتدائی سبق، یہ سینما اور برہنہ تصویروں اور عشقی افسانوں سے بڑھتی ہوئی دلچسپی، یہ مغربی ڈھنگ پر لڑکیوں کی تعلیم، بہت ممکن ہے کہ اپنا فوری اثر نہ دکھائے، بہت ممکن ہے کہ موجودہ نسل اس کی مضرتوں سے محفوظ رہ جائے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ آئندہ نسلیں بھی اس سے محفوظ رہیں گی ایک صریح نادانی ہے۔ تمدن اور معاشرت میں ہر غلط طریقہ کی ابتدا بہت معصوم ہوتی ہے۔ مگر ایک نسل سے دوسری نسل اور دوسری سے تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے وہی ترقی کر کے ایک خوفناک غلطی بن جاتی ہے۔ خود یورپ اور امریکہ میں بھی جن غلط بنیادوں پر معاشرت کی تنظیم جدید کی گئی تھی اس کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اس کے پورے پورے نتائج اب تیسری اور چوتھی پشت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ پس یہ مغربی اور اسلامی طریقوں کا امتزاج اور نیم بے حجابی دراصل کوئی مستقل اور پائدار چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا فطری رجحان انتہائی مغربیت کی طرف ہے اور جو لوگ

اس طریقہ پر چل رہے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ انہوں نے دراصل اُس سفر کی ابتدا کی ہے جس کی آخری منزلوں تک اگر وہ نہیں تو ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد پہنچ کر رہے گی۔

منفعلین | تیسرا گروہ سفہا، او رمنفعلین کا ہے جن میں خود سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ دوسروں کو جیسا کرتے دیکھتے ہیں ویسا ہی خود بھی کرنے لگتے ہیں، اور چونکہ خفیف العقل ہیں اس لیے طبعًا ان کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہوتا ہے جو انہیں خوشنما نظر آتے ہیں، اور جن پر چلنے والوں کو وہ خوش حال اور ترقی یافتہ پاتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت سب سے زیادہ خطرے میں ہیں، مگر ان کا وبال پہلے اور دوسرے طبقہ پر ہے، اور انہی دونوں طبقوں کے درست ہونے یا بگڑ جانے پر ان کے بھی درست ہونے یا بگڑ جانے کا انحصار ہے۔

فیصلہ کن سوال | اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے دو راستے الگ ہوتے ہیں۔ ایک راستہ مغربی تہذیب کا ہے، اور دوسرا راستہ اسلامی تہذیب کا۔ یہاں ہم کو فیصلہ کرنا ہے کہ کون کس راستہ کی طرف جانا چاہتا ہے، اور اس فیصلہ کا انحصار ایک بنیادی سوال پر ہے۔ سوال یہ ہے:۔

کیا آپ مغربی معاشرت کے اُن نتائج کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں جو یورپ اور امریکہ میں رونما ہو چکے ہیں، اور جو اس طرز معاشرت کے طبعی اور یقینی نتائج ہیں؟ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ آپ کی سوسائٹی میں بھی وہی ہیجان انگیز اور شہوانی ماحول پیدا ہو؟ آپ کی قوم میں بھی اسی طرح بے حیائی، بے عصمتی، اور فواحش کی کثرت ہو؟ امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں؟ خاندان اور عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے؟ طلاق اور تفریق کا زور ہو؟ نوجوان مرد اور عورتیں آزاد شہوت رانی کی خوگر ہو جائیں؟ برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اولاد سے نسلیں منقطع کی جائیں؟ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حداعتدال سے بڑھی ہوئی

شہوانیت میں اپنی بہترین عملی قوتوں کو ضائع اور اپنی صحتوں کو برباد کریں؟ حتیٰ کہ کم سن بچوں تک میں قبل از وقت جنسی میلانات پیدا ہونے لگیں اور اس سے ان کے دماغی و جسمانی نشوونما میں ابتدا ہی سے فتور برپا ہو جایا کرے؟ -

اگر مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کی خاطر آپ ان سب چیزوں کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں تو بلا تأمل مغربی راستے پر تشریف لے جائیے اور اسلام کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لائیے اس راستہ پر جانے سے پہلے آپ کو اسلام سے قطع تعلق کا اعلان کرنا پڑے گا تاکہ آپ بعد میں اس نام کو استعمال کر کے کسی کو دھوکہ نہ دے سکیں، اور آپ کی رسوائیاں اسلام اور مسلمانوں کے لیے موجب ننگ و عار نہ بن سکیں۔

لیکن اگر آپ ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور آپ کو ایک ایسے صالح اور پاکیزہ تمدن کی ضرورت ہے جس میں اخلاق فاضلہ اور ملکات شریفہ پرورش پا سکیں، جس میں انسان کو اپنی عقلی اور روحانی اور مادی ترقی کے لیے ایک پرسکون ماحول مل سکے، جس میں عورت اور مرد اپنے اپنے تمدنی فرائض کو ہیجی جذبات کی خلل اندازی سے محفوظ رہ کر اپنی بہترین استعداد کے مطابق انجام دے سکیں، جس میں تمدن کا سنگ بنیاد یعنی خاندان پورے استحکام کے ساتھ قائم ہو، جس میں نسلیں محفوظ رہیں اور اختلاط انساب کا فتنہ برپا نہ ہو، جس میں انسان کی خانگی زندگی اس کے لیے سکون و راحت کی جنت اور اس کی اولاد کے لیے مشفقانہ تربیت کا گہوارہ، اور خاندان کے تمام افراد کے لیے اشتراک عمل اور امداد باہمی کی انجمن ہو، تو ان مقاصد کے لیے آپ کو مغربی راستہ کا رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ بالکل مخالف سمت کو جا رہا ہے اور مغرب کی طرف چل کر مشرق کو پہنچ جانا عقلاً محال ہے اگر فی الحقیقت آپ کے مقاصد یہی ہیں تو آپ کو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہیے لیکن اس راستہ پر قدم رکھنے سے

پہلے آپ کو ان غیر معتدل مادّی منفعتوں اور حسی لذتوں کی طلب اپنے دل سے نکالنی ہوگی جو مغربی تمدن کے دلفریب مظاہر کو دیکھکر پیدا ہوگئی ہے۔ ان نظریات اور تخیلات سے بھی اپنے دماغ کو خالی کرنا ہوگا جو یورپ سے آپ نے مستعار لے رکھے ہیں۔ ان تمام اصولوں اور مقصدوں کو بھی طلاق دینا پڑے گا جو مغربی تمدن و معاشرت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اسلام اپنے الگ اصول اور مقاصد رکھتا ہے، اس کے اپنے مستقل عمرانی نظریات ہیں۔ اس نے وہی ایک نظام معاشرت وضع کیا ہے جیسا کہ اس کے مقاصد اور اس کے اصول اور اس کے عمرانی نظریات کا طبعی اقتضا ہے۔ پھر اس نظام معاشرت کا تحفظ وہ ایک خاص ڈسپلن اور ایک خاص ضابطہ کے ذریعہ سے کرتا ہے جس کے مقرر کرنے میں غایت درجہ کی حکمت اور نفسیات انسانی کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، اور جس کے بغیر یہ نظام معاشرت اختلال و برہمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ افلاطون کی جمہوریت کی طرح کوئی خیالی اور وہمی نظام نہیں ہے، بلکہ ساڑھے تیرہ صدیوں کے زبردست امتحان میں پورا اتر چکا ہے، اور اس طویل مدت میں کسی ملک اور کسی قوم کے اندر بھی اس کے اثر سے ان خرابیوں کا عشرِ عشیر بھی رونما نہیں ہوا ہے جو مغربی تمدن کے اثر سے صرف ایک صدی کے اندر پیدا ہو چکی ہیں۔ پس اگر اس محکم اور آزمودہ نظام معاشرت سے آپ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے ضابطہ اور اس کے ڈسپلن کی پوری پوری پابندی کرنی ہوگی، اور یہ حق آپ کو ہرگز حاصل نہ ہوگا کہ اپنی عقل سے نکالے ہوئے یا دوسروں سے سیکھے ہوئے نیم پختہ خیالات اور غیر آزمودہ طریقوں کو، جو اس نظام معاشرت کی طبیعت اور اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہوں، خواہ مخواہ اس میں ٹھونسنے کی کوشش کریں۔

اب وہ گروہ جو مغربی تمدن کا راستہ علی وجہ البصیرت اختیار کرتا ہے، ہمارا مخاطب نہیں ہے۔ ہمارا خطاب صرف ان لوگوں سے ہے جو اسلام کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور ان

شرائط کی پابندی پر آمادہ ہیں جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تفہیم ہمارے فرائض میں سے ہے، اور ان کو اسلامی نظم معاشرت کی روح، اس کے مقاصد، اس کے اصول، اس کے تحفظات اور اس کے ضوابط سے اچھی طرح روشناس کرا دینا ضروری ہے، تاکہ وہ بصیرت کی روشنی میں اس راستہ پر چل سکیں اور ان میں خود اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ جب کوئی خلاف اسلام طریقہ ان کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اس کو پہچان لیں اور بلا تأمل رد کر دیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ اسلامی نظام معاشرت کی فطری اور سائنٹفک بنیاد کیا ہے۔

صنفی کشش کی گہرائی فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی "زوجین" یعنی دو ایسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب طبعی میلان رکھتی ہیں، دوسری انواع کا جس حد تک مطالعہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس تقسیم اور اس طبعی یا صنفی میلان کا مقصد محض بقائے نوع ہے۔ اسی لیے ان میں یہ میلان صرف اس حد تک رکھا گیا ہے جس حد تک یہ نوع کے بقا کے لیے ضروری ہے، اور ان کی جبلت میں ایسی قوت ضابطہ رکھ دی گئی ہے جو انہیں صنفی تعلق میں اس حد مقرر سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ بخلاف اس کے انسان میں یہ میلان غیر محدود اور غیر منضبط اور تمام دوسری انواع سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کے لیے وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ اس کی جبلت میں کوئی ایسی قوت ضابطہ بھی نہیں جو اسے کسی حد پر روک دے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ ان کے اندر ایک دوسرے کی طرف جذب و انجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ ان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ ان کے جسم کی ساخت اور اس کے تناسب اور اس کے رنگ روپ اور اس کے لمس اور اس کے ایک ایک جز میں

کشش پائی جاتی ہے، ان کی آواز، رفتار، گفتار، انداز و ادا ہر ایک میں کھینچ لینے کی قوت موجود ہے۔ گرد و پیش کی دنیا میں بھی بے شمار اسباب پھیلے ہوئے ہیں جو دونوں کے داعیات صنفی کو حرکت میں لاتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں، جمال فطرت کا کوئی مظہر اور حسن کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تحریک کا سبب نہ بنتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے جس دور میں انسان صنفی تعلق کے قابل نہیں ہوتا، اس میں نہ تو محبت اور عشق کے ولولے ہوتے ہیں، نہ مظاہر جمال میں سے کوئی چیز اس کے جذبات کو اپیل کرتی ہے، اور نہ وہ کسی شے میں کوئی کشش پاتا ہے۔ پھر انسان کے نظام جسمانی کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں طاقت کا جو زبردست خزانہ رکھا گیا ہے وہ بیک وقت قوت حیات اور قوت عمل بھی ہے، اور صنفی تعلق کی قوت بھی۔ وہی غدود جو اس کے اعضاء کو جیون رس (ہارمون) بہم پہنچاتے ہیں جس سے ان میں حیات اور توانائی اور ذہانت اور عمل کی طاقت پیدا ہوتی ہے، انہی کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی ہے کہ اس میں صنفی تعلق کی قوت پیدا کریں، اس قوت کو حرکت میں لانے والے جذبات کی تخلیق کریں، ان جذبات کو ابھارنے کے لیے حسن اور روپ اور نکھار اور بھبن کے گوناگوں آلات بہم پہنچائیں، اور ان آلات سے متاثر ہونے کی قابلیت اس کی آنکھوں اور اس کے کانوں اور اس کی شامہ اور لامسہ حتیٰ کہ اس کی قوت متخیلہ تک میں فراہم کر دیں۔ قدرت کی یہی کارفرمائی انسان کے قوائے نفسانی میں بھی نظر آتی ہے اس کے نفس میں جتنی محرک قوتیں پائی جاتی ہیں ان سب کا سررشتہ دو زبردست داعیوں سے ملتا ہے۔ ایک وہ داعیہ جو اسے خود اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ذات کی خدمت پر ابھارتا ہے۔ دوسرا وہ داعیہ جو اس کو اپنے مقابل کی صنف سے تعلق پر مجبور کرتا ہے۔ انسان کے شباب کا زمانہ جو دراصل اس کے عمل کا زمانہ ہے، اس میں یہ دوسرا داعیہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ

بسا اوقات وہ پہلے داعیہ کو دبا لیتا ہے اور اس کے اثر سے انسان اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی جان تک دے دینے اور اپنے آپ کو جانتے بوجھتے ہلاکت میں ڈال دینے میں بھی تأمل نہیں ہوتا۔

تمدن کی تخلیق میں صنفی کشش کا اثر | یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ کیا محض بقائے نوع کے لیے؟ نہیں۔ کیونکہ نوع انسانی کو باقی رکھنے کے لیے اُس قدر تناسل کی بھی ضرورت نہیں جس قدر مچھلی اور بکری اور ایسی ہی دوسری انواع کے لیے ہے پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت نے ان سب انواع سے زیادہ صنفی میلان انسان میں رکھا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اسباب فراہم کیے ہیں؟ کیا یہ محض انسان کے لطف اور لذت کے لیے ہے؟ یہ بھی نہیں۔ فطرت نے کہیں بھی لطف اور لذت کو مقصود بالذات نہیں بنایا ہے، بلکہ وہ کسی بڑے مقصد کی خدمت پر انسان اور حیوان کو مجبور کرنے کے لیے لطف اور لذت کو محض چاشنی کے طور پر لگا دیتی ہے تاکہ وہ اس خدمت کو غیر کا نہیں بلکہ اپنا کام سمجھ کر انجام دیں۔ اب غور کیجیے کہ اس معاملہ میں کونسا بڑا مقصد فطرت کے پیش نظر ہے؟ آپ جتنا غور کریں گے کوئی اور وجہ اس کے سوا سمجھ میں نہ آئے گی کہ فطرت، دوسری تمام انواع کے خلاف، نوع انسانی کو متمدن بنانا چاہتی ہے۔

اسی لیے انسان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا جو داعیہ رکھا گیا ہے وہ محض جسمانی اتصال اور فعل تناسل کا طالب نہیں ہے بلکہ ایک دائمی معیت اور قلبی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا طالب ہے۔

اسی لیے انسان میں صنفی میلان، اس کی قوت مباشرت سے بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔ اس میں جتنی خواہش اور جتنی صنفی کشش رکھی گئی ہے، اگر اُسی نسبت سے، بلکہ ایک اور دس کی نسبت سے بھی وہ فعل تناسل کا ارتکاب کرے تو اس کی صحت جواب دے دے، اور عمر طبعی کو پہنچنے

سے پہلے اس کی جسمانی قوتیں ختم ہو جائیں۔ یہ بات بھی اس امر کی دلیل ہے کہ انسان میں صنفی کشش کی زیادتی کا مقصود یہ نہیں کہ وہ تمام حیوانات سے بڑھ کر صنفی عمل کرے بلکہ اس سے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا اور ان کے باہمی تعلق میں استمرار و استقلال پیدا کرنا ہے۔

اسی لیے عورت کی فطرت میں صنفی کشش اور صنفی خواہش کے ساتھ ساتھ شرم و حیا، اور تمانع اور فرار اور رکاوٹ کا مادہ رکھا گیا ہے، جو کم و بیش ہر عورت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرار اور منع کی کیفیت اگرچہ دوسرے حیوانات کے اناث میں بھی نظر آتی ہے، مگر انسان کی صنف اناث میں اس کی قوت و کمیت بہت زیادہ ہے اور اس کو جذبۂ شرم و حیا کے ذریعہ سے اور زیادہ شدید کر دیا گیا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں صنفی مقناطیسیت کا مقصد ایک مستقل وابستگی ہے، نہ یہ کہ ہر صنفی کشش ایک صنفی عمل پر منتج ہو۔

اسی لیے انسان کے بچے کو تمام حیوانات کے بچوں سے زیادہ کمزور اور بے بس پیدا کیا گیا ہے۔ بخلاف دوسرے حیوانات کے انسان کا بچہ کئی سال تک ماں باپ کی حفاظت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے، اور اس میں اپنے کو سنبھالنے اور اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بھی یہ مقصود ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق محض تعلق صنفی کی حد تک نہ رہے بلکہ اس تعلق کا نتیجہ ان کو باہمی تعاون اور تعامل پر مجبور کر دے۔

اسی لیے انسان کے دل میں اولاد کی محبت تمام حیوانات سے زیادہ رکھی گئی ہے حیوانات ایک قلیل مدت تک اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے بعد ان سے الگ ہو جاتے ہیں پھر ان میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔ بخلاف اس کے انسان ابتدائی پرورش کا زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اولاد کی محبت میں گرفتار رہتا ہے،

تمام عمر گرفتار رہتا ہے، حتیٰ کہ یہ محبت اولاد کی اولاد تک منتقل ہوتی ہے، اور انسان کی خود غرض حیوانیت اس کے اثر سے اس درجہ مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ اپنی اولاد کے لیے چاہتا ہے اور اس کے دل میں اندر سے اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ اپنی حد امکان تک اولاد کے لیے بہتر سے بہتر اسباب زندگی بہم پہنچا سکے اور اپنی محنتوں کے نتائج صرف انہی کے لیے چھوڑ جائے۔ اس شدید جذبۂ محبت کی تخلیق سے فطرت کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو ایک دائمی رابطہ میں تبدیل کر دے، پھر اس دائمی رابطہ کو ایک خاندان کی ترکیب کا ذریعہ بنائے، پھر خونی رشتوں کی محبت کا سلسلہ بہت سے خاندانوں کو مصاہرت کے تعلق سے مربوط کرتا چلا جائے، پھر محبتوں اور محبوبوں کا اشتراک ان کے درمیان تعاون اور معاملت کا تعلق پیدا کر دے، اور اس طرح ایک نظام تمدن وجود میں آجائے۔

تمدن کا بنیادی مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ صنفی میلان جو انسانی جسم کے ریشے ریشے اور اس کے قلب و روح کے گوشے گوشے میں رکھا گیا ہے، اور جس کی مدد کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر کائنات کے چپے چپے میں اسباب و محرکات فراہم کیے گئے ہیں، اس کا مقصد انسان کی انفرادیت کو اجتماعیت کی طرف مائل کرنا ہے، فطرت حق نے اس کو تمدن انسانی کی اصلی قوت محرکہ بنایا ہے، اور اسی میلان و کشش کے ذریعہ سے وہ انسان کی دونوں صنفوں کو محبت اور تعاون کے رشتہ میں وابستہ کر کے ہیئت اجتماعی (سوسائٹی) اور معاشرت (سوشل لائف) کی بنیاد رکھتی ہے۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا، تو یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ عورت اور مرد کے تعلق کا مسئلہ دراصل تمدن کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی کے صحیح حل پر تمدن کی صلاح و فساد اور اس کی بہتری و بدتری، اور اس کے استحکام و ضعف کا انحصار ہے۔ نوع انسانی کے ان دونوں صنفوں

میں ایک تعلق تو محض حیوانی اور خالص صنفی اور سراسر شہوانی ہے، جس کا مقصود بقائے نوع کے سوا کچھ نہیں۔ دوسرا تعلق انسانی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں مل کر مشترک اغراض کے لیے اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعاون کریں، اور باہمی تعاون میں ان کی صنفی محبت ایک واسطۂ اتصال کے طور پر کام دے۔ یہ دونوں قسم کے تعلقات بجائے خود ضروری ہیں، مگر تمدن کی صلاح و فساد کا مدار اس پر ہے کہ ان دونوں کا امتزاج نہایت متناسب اور معتدل ہو۔

تمدنِ صالحہ کے لوازم آئیے اب ہم اس مسئلہ کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کریں کہ ایک صالح تمدن کے لیے عورت اور مرد کے بہیمی اور انسانی تعلق میں معتدل اور متناسب امتزاج کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور اس امتزاج پر بے اعتدالی کی کن کن صورتوں سے تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔

میلانِ صنفی کی تعدیل سب سے اہم اور مقدم سوال خود اس صنفی کشش اور میلان کا ہے جس کے متعلق اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ انسان پر اندر سے بھی محیط ہے اور باہر سے بھی، اور اس کے معلوم اور غیر معلوم محرکات و دواعی فطرت نے اس کثرت سے فراہم کیے ہیں کہ انسان ان کا شمار بھی نہیں کر سکتا۔ یہ چیز جس کے لیے فطرت نے خود اتنے انتظامات کیے ہیں اگر انسان بھی اپنی توجہ اور قوتِ ایجاد سے کام لے کر اس کی پرورش اور اس کی تحریک کے اسباب مہیا کرے، اور ایسا طرزِ تمدن اختیار کرے جس میں اس کی صنفی پیاس بڑھتی چلی جائے، اور پھر اس پیاس کو بجھانے کی آسانیاں بھی پیدا کی جاتی رہیں تو یہ چیز بڑھتے بڑھتے ایک ایسی دوزخ بن سکتی ہے جو انسان اور اس کے تمدن دونوں کو کھا جائے۔ صنفی تعلق اور اس کے مبادی اور اس کے محرکات میں سے ہر چیز کو فطرت نے لذیذ بنایا ہے، مگر جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اس نے یہ لذت کی چاٹ محض اپنے مقصد یعنی تعمیرِ تمدن کے لیے لگائی

لگائی ہے۔ اس چاٹ کا حد سے بڑھ جانا اور اسی میں انسان کا منہمک ہو جانا نہ صرف تمدن بلکہ خود انسان کی بھی تخریب و ہلاکت کا موجب ہو سکتا ہے، اور ہو رہا ہے، اور بارہا ہو چکا ہے۔ جو قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کے آثار اور ان کی تاریخ کو دیکھیے۔ شہوانیت ان میں حد سے متجاوز ہو چکی تھی۔ ان کے لٹریچر اسی قسم کے ہیجان انگیز مضامین سے لبریز پائے جاتے ہیں۔ ان کے تخیلات، ان کے افسانے، ان کے اشعار، ان کی تصویریں، ان کے مجسمے، ان کے عبادت خانے، ان کے محلات سب کے سب اس پر شاہد ہیں۔ جو قومیں اب تباہی کی طرف جا رہی ہیں ان کے حالات بھی دیکھ لیجیے۔ وہ اپنی شہوانیت کو آرٹ، اور لائٹ لٹریچر، اور جمالیت اور ایسے کتنے ہی خوش نما اور معصوم ناموں سے موسوم کریں مگر تعبیر کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ یہ کیا چیز ہے کہ سوسائٹی میں عورت کو عورتوں سے زیادہ مرد کی صحبت اور مرد کو مردوں سے زیادہ عورت کی معیت مرغوب ہے؟ یہ کیوں ہے کہ عورتوں اور مردوں میں تزئین و آرائش کا ذوق بڑھتا چلا جا رہا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ مخلوط سوسائٹی میں عورت کا جسم لباس سے باہر ہوا جاتا ہے؟ وہ کونسی شے ہے جس کے سبب سے عورت اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو کھول کھول کر پیش کر رہی ہے اور مردوں کی طرف سے ہل من مزید کا تقاضا ہے؟ اس کی کیا علت ہے کہ برہنہ تصویریں، ننگے مجسمے اور عریاں ناچ سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے کہ سینما میں اس وقت تک لطف ہی نہیں آتا جب تک کہ عشق و محبت کی چاشنی نہ ہو اور اس پر صنفی تعلقات کے بہت سے قولی اور فعلی مبادی کا اضافہ نہ کیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے مظاہر اگر شہوانیت کے مظاہر نہیں تو کس چیز کے ہیں؟ جس تمدن میں ایسا غیر معتدل شہوانی ماحول پیدا ہو جائے اس کا انجام تباہی اور یقینی تباہی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے ماحول میں صنفی میلان کی شدت ...

اور مسلسل تحریک سے نسلیں کمزور ہو جائیں گی، جسمانی اور عقلی قوتوں کا نشو و نما بگڑ جائے گا، قوائے ذہنی پراگندہ ہو جائیں گے، فواحش کی کثرت ہو گی، امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں گی، برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اطفال جیسی تحریکیں وجود میں آئیں گی، مرد اور عورت بہائم کی طرح ملیں گے، بلکہ فطرت نے ان کے اندر جو صنفی میلان تمام حیوانات سے بڑھ کر رکھا ہے اس کو مقاصد فطرت کے خلاف استعمال کر کے وہ اپنی بہیمیت میں تمام حیوانات سے بازی لے جائیں گے، حتیٰ کہ بندروں اور بکروں کو بھی مات کر دیں گے۔ ان کی بہیمیت انسانی تمدن و تہذیب بلکہ خود انسانیت کو بھی غارت کر دے گی، اور ان کا اخلاقی انحطاط ان کو ایسی پستی میں گرائے گا جہاں سے وہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔

ایسا ہی انجام اس تمدن کا بھی ہو گا جو تفریط کا پہلو اختیار کرے گا۔ جس طرح صنفی میلان کو حد اعتدال سے زیادہ بڑھانا مضر ہے اسی طرح اس کو حد سے زیادہ دبانا اور کچل دینا بھی مضر ہے۔ جو نظام تمدن انسان کو سنیاس اور برہمچرج اور رہبانیت کی طرف لیجانا چاہتا ہے وہ فطرت سے لڑتا ہے، اور فطرت اپنے مدمقابل سے کبھی شکست نہیں کھاتی بلکہ خود اسی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خالص رہبانیت کا تصور تو کسی تمدن کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ در اصل تمدن و تہذیب کی نفی ہے۔ تاہم اس قسم کے تصورات کو دلوں میں راسخ کر کے انہی کے زیر اثر ایک شدید غیر صنفی ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں صنفی تعلق ایک ذلیل اور قابل نفرت اور گھناؤنی چیز سمجھی جائے اور اس سے اجتناب کو پسندیدہ قرار دیا جائے، اور ہر ممکن طریقے سے اس میلان کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ مگر صنفی میلان کا دبنا در اصل انسانیت کا دبنا ہے۔ وہ خود ہی نہ دبے گا بلکہ انسان کی ذہانت اور قوت عمل، اور عقلی استعداد، اور حوصلہ و عزم، اور ہمت و شجاعت سب کو لے کر دب جائیگا۔

اس کی ساری قوتیں ٹھٹھر کر رہ جائیں گی۔ اس کا خون سرد اور منجمد ہو جائے گا۔ اس میں ابھرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہے گی، کیونکہ انسان کی سب سے بڑی قوتِ محرکہ یہی صنفی قوت ہے۔

پس صنفی میلان کو افراط و تفریط سے روک کر توسط و اعتدال کی حالت پر لانا، اور اسے ایک مناسب ضابطہ سے منضبط کرنا ایک صالح تمدن کا اولین فریضہ ہے۔ اس کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ایک طرف ہیجان و تحریک کے ان تمام اسباب کو روک دے جن کو انسان خود اپنے ارادے اور اپنی لذت پرستی سے پیدا کرتا ہے، اور دوسری طرف طبعی و فطری تحریک کے لیے ایسا راستہ کھول دے جو خود منشاء فطرت کے مطابق ہے۔ یعنی مرد اور عورت کی مستقل وابستگی جو ایک خاندان کی اساس بن جائے۔

نظام عائلی کا تحفظ | خاندان کی تاسیس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نظام عائلی کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور ایسے تمام اسباب کی روک تھام کی جائے جو اس نظام میں برہمی پیدا کرتے ہیں۔ مجرد فطرت حیوانی کے اعتبار سے دیکھیے تو مرد اور عورت کی صنفی کشش بجائے خود کسی ضابطہ سے آشنا نہیں ہے جس طرح ہر آگ جلانے اور ہر آتش پذیر شئے جل جانے کے لیے مستعد ہے، اور دونوں کا اجتماع اس کا مقتضی ہے کہ فعل سوزش واقع ہو، اسی طرح ہر مرد اور ہر عورت کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش موجود ہے اور یہ کشش ان کے اتصال کا اقتضا کرتی ہے۔ یہ فطرت حیوانی انسان کی جبلت میں پیوستہ ہے اور اصل و اساس کا حکم رکھتی ہے۔ اس کے اوپر فطرت انسانی ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ صنفی تعلق میں استحکام اور پائداری ہو، بہائم کا سا انتشار نہ ہو کہ بلا امتیاز ہر کشش ایک اتصال کی صورت اختیار کرے، انساب مخلوط نہ ہونے پائیں، اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو تاکہ والدین ان کی پرورش میں تعاون

گئیں اور ان کے درمیان خونی رشتے قائم ہوں جو باہمی محبت و معاونت اور انتقال میراث کا ذریعہ بنیں۔ مگر فطرت انسانی کا یہ اقتضا اتنا طاقتور نہیں ہے کہ تنہا یہی انسان کو اس عقلی طریقہ کا پابند رکھنے کے لیے کافی ہو۔ فطرت حیوانی اس سے زیادہ طاقتور ہے، اور وہ اس سے جنگ کرنے پر آمادہ ہے۔ دنیا میں جس کثرت سے زنا کا ارتکاب ہو رہا ہے اور جس کثرت سے تعلقات صنفی میں انتشار کی مثالیں ملتی ہیں وہ سب اسی فطرت حیوانی کے کرشمے ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر معمولی "انسانیت" رکھنے والے آدمیوں کے سوا (جو بہت ہی کم ہوتے ہیں) عام انسان خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، اس طاقت کو بالکل دبا دینے اور اپنے جذبات و افعال کو سراسر فطرت انسانی کے مقتضیات کا تابع رکھنے پر قادر نہیں ہیں پس ایک صالح تمدن کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ تعلقات صنفی کے لیے ازدواج کا ایک معروف طریقہ مقرر کر دے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ اس طریقہ کی حفاظت کا انتظام کرے تاکہ دائرۂ ازدواج سے باہر صنفی تعلقات کا انتشار روک دیا جائے اور دائرۂ ازدواج کے اندر دوسروں کی مداخلت بند کر دی جائے۔ فطرت حیوانی کے مقابلہ میں فطرت انسانی کو ہر موقع پر تمدن و تہذیب کے نظام سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے، چوری، لوٹ مار، قتل و خون، دغا و فریب، غصب حقوق اور دوسرے کثیر التعداد افعال جن کا ارتکاب فطرت حیوانی کے اثر سے کیا جاتا ہے، اس کی روک تھام کے لیے نظام تمدن ہی فطرت انسانی کی مدد کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جو فعل تمدن کی عین بنیاد پر حملہ کرتا ہے، اور جس کے محرکات ان تمام جرائم کے محرکات سے زیادہ قوی ہیں، اس کی روک تھام میں مدد دینے سے خود تمدن ہی انکار کر دے؟ جو تمدن اس معاملہ کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کو محض ایک "خوش وقتی"[1] قرار دیتا ہے۔ اور "آزادانہ تخم ریزی"[2] کے ساتھ نہ صرف رواداری

[1] تہذیب جدید میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے آزادانہ تعلق کو Having a good time سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
[2] Sowing wild oats یہ بھی تہذیب جدید کا ایک معروف محاورہ ہے۔

بڑھتا ہے، بلکہ اس کی اشاعت میں خود مددگار ہوتا ہے وہ دراصل آپ اپنا دشمن ہے۔ وہ ہرگز ایک صالح تمدّن نہیں ہے۔ صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو اپنی اخلاقی تعلیم سے دلوں میں اس چیز کی نفرت بٹھائے، اپنے قانون کی طاقت سے اس کو سختی کے ساتھ روکے اور نظام معاشرت کے ضوابط سے مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر ایسی پابندیاں عائد کر دے کہ اگر وہ دائرۂ ازدواج کے باہر صنفی تعلق پیدا کرنے کی طرف مائل بھی ہوں تو ان کی راہ میں بہت سے مضبوط حجابات حائل ہو جائیں۔

اس معاملہ کو محض افراد کے اپنے باطنی احساس اور ان کے ضمیر کی آواز، اور ان کے اخلاقی وجدان اور تعلیم و تربیت کے اثرات پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بلاشبہ تہذیب کی غایت یہی ہے کہ افراد کے باطن میں اتنی قوت پیدا کر دے کہ وہ خود بخود سوسائٹی کے قوانین کا احترام کریں، اور خود ان کا اپنا ضمیر ان کو اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی سے روک دے۔ اسی غرض کے لیے افراد کی تعلیم و تربیت کے لیے اتنی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر کیا آج تک تعلیم و تہذیب اپنی اس غایت کو پہنچنے میں اس حد تک کامیاب ہو سکی ہے کہ سوسائٹی کے نظام اور اخلاقی ضوابط کی حفاظت کے لیے خارج میں کسی انسدادی اور تعزیری تدبیر کی ضرورت باقی نہ رہی ہو؟ زمانہ قدیم اور "قرونِ مظلمہ" کو چھوڑیے۔ یہ بیسویں صدی، یہ "قرنِ منوّر" آپ کے سامنے موجود ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے مہذب ترین ممالک کو دیکھیے جن کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہے، جن کو اپنے شہریوں کی اعلیٰ تربیت پر ناز ہے۔ کیا وہاں اس تعلیم اور تربیت اور تہذیب نے جرائم اور قانون شکنی کو روک دیا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور اس روشن زمانہ میں بھی سوسائٹی کے نظم و آئین کو محض افراد کے اخلاقی وجدان پر نہیں چھوڑا جا سکا ہے، اور ہر اس فعل کو جسے جرم سمجھا جاتا ہے انسدادی اور تعزیری دونوں قسم کی تدبیروں سے روکنے کی

کوششیں اب بھی کی جارہی ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ صرف صنفی تعلقات ہی کو اس عام قاعدے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے؟ حالانکہ ان تعلقات کا انتشار تمدن کے لیے تمام جرائم سے زیادہ خطرناک ہے، اور اس جرم کے محرکات تمام جرائم کے محرکات سے زیادہ قوی اور کثیر ہیں۔ ہاں اگر یہ فعل جرم ہی نہیں ہے، بلکہ محض ایک "خوش وقتی" ہے جس کو برٹرینڈ رسل کے بقول تھوڑی سی فراخ حوصلگی برت کر گوارا کر لینا چاہیے، تو اس کے لیے انسداد اور تعزیر کی بلاشبہ ضرورت نہیں، بلکہ ایسی ذرا سی چیز کے لیے ضمیر اور اخلاقی وجدان میں بھی کوئی گرفتگی کیوں ہو؟

بعض حضرات کا ارشاد ہے کہ ناجائز صنفی تعلقات کو روکنے کے لیے عورتوں اور مردوں کے درمیان حجابات حائل کرنا، اور معاشرت میں ان کے آزادانہ اختلاط پر پابندیاں لگانا دراصل ان کے اخلاق اور ان کی سیرت پر ایک حملہ ہے۔ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ گویا تمام افراد کو بدچلن فرض کر لیا گیا ہے، اور ایسی پابندیاں عائد کرنے والوں کو نہ اپنی عورتوں پر اعتبار ہے، نہ مردوں پر۔ بات نہایت معقول ہے۔ مگر اسی طرز استدلال کو ذرا آگے بڑھائیے۔ ہر قفل جو کسی دروازے پر لگایا جاتا ہے، گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اس کے مالک نے تمام دنیا کو چور فرض کر لیا ہے۔ ہر پولیس مین کا وجود اس بات پر شاہد ہے کہ حکومت اپنی تمام رعایا کو بدمعاش سمجھتی ہے۔ ہر لین دین میں جو دستاویز لکھوائی جاتی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو خائن قرار دیا ہے۔ ہر وہ انسدادی تدبیر جو ارتکاب جرائم کی روک تھام کے لیے اختیار کی جاتی ہے اس کے عین وجود میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ان سب لوگوں کو امکانی مجرم فرض کیا گیا ہے جن پر اس تدبیر کا اثر پڑتا ہے۔ اس طرز استدلال کے مطابق تو آپ ہر آن چور، بدمعاش، خائن اور مجرم قرار دیے جاتے ہیں مگر آپ کی عزت نفس کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں لگتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف اسی ایک معاملہ میں آپ کے احساسات

اس قدر نازک ہو گئے ہیں؟

درحقیقت یہ سب بہانے اس لیے گھڑے گئے ہیں کہ نفسِ شریر صنفی تعلقات میں آزادی اور اختلاط کے لیے بے تاب ہے اور اس پر کوئی پابندی اُسے گوارا نہیں ہے۔ مگر اسی شرارتِ نفس کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اساسِ تمدن کی حفاظت کے لیے امتناعی تدابیر بھی اختیار کی جائیں اور تعزیری تدابیر بھی۔ انسان جب تک انسان ہے، اور اس کی جبلت میں بہیمیت موجود ہے اس وقت تک کوئی ایسا تمدن ان تدابیر سے غافل نہیں ہو سکتا جو اشخاص کی خواہشات اور ان کے لطف و لذت سے بڑھ کر سوسائٹی کی صلاح کو عزیز رکھتا ہو۔

تعلق زوجین کی صحیح صورت | نظامِ عائلی کے تحفظ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مرد اور عورت کے تعلق کی صحیح نوعیت متعین ہو، ان کے حقوق و فرائض عدل کے ساتھ مقرر کیے جائیں، ذمہ داریاں ان پر ٹھیک ٹھیک تقسیم ہوں اور خاندان میں ان کے مراتب اور ان کے وظائف کا تقرر اس طور پر ہو کہ اعتدال اور تناسب میں فرق نہ آنے پائے۔ تمدن و معاشرت کے جملہ مسائل میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کے صحیح حل پر نہ صرف نظامِ عائلی بلکہ پورے نظامِ تمدن و تہذیب کی صحت و صلاح کا مدار ہے، اور بڑے بڑے تمدن اس کے حل میں ناکام ہوئے ہیں۔

بعض قومیں ایسی ہیں جن میں عورت کو مرد پر قوّام بنایا گیا ہے مگر تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ ان قوموں میں سے کوئی قوم اعلیٰ درجہ کی تہذیب کی مالک ہوئی ہو۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ایسی ایک قوم بھی آج تک دنیا میں نہیں ابھر سکی۔ اس نے کوئی عزت اور طاقت حاصل کی۔ نہ کوئی کارِ نمایاں انجام دیا۔

بیشتر اقوامِ عالم میں مرد کو عورت پر قوّام بنایا گیا ہے، مگر اس ترجیح نے اکثر ظلم کی شکل اختیار کر لی۔ عورت کو لونڈی بنا کر رکھا گیا۔ اس کی تذلیل و تحقیر کی گئی۔ اس کو کسی

قسم کے معاشی اور تمدنی حقوق نہ دیے گئے۔ اس کو خاندان میں ایک ادنیٰ خدمت گار اور مرد کے لیے آلۂ شہوت رانی بنا کر رکھا گیا۔ خاندان سے باہر عورتوں کے ایک گروہ کو کسی حد تک علم اور تہذیب کے زیوروں سے آراستہ بھی کیا گیا تو اس لیے کہ وہ مردوں کے صنفی تعلقات زیادہ دلاویز طریقہ سے پورے کریں، ان کے لیے اپنی موسیقی سے لذت گوش، اور اپنے رقص اور ناز و ادا سے لذت نظر، اور اپنے صنفی کمالات سے لذت جسم بن جائیں۔ یہ عورت کی توہین و تذلیل کا سب سے زیادہ شرمناک طریقہ تھا جو مرد کی نفس پرستی نے ایجاد کیا۔

مغربی تمدن نے تیسرا پہلو اختیار کیا ہے، یعنی مردوں اور عورتوں میں مساوات ہو، دونوں کی ذمہ داریاں یکساں اور قریب قریب ایک ہی طرح کی ہوں، دونوں ایک ہی حلقۂ عمل میں مسابقت کریں، دونوں اپنی روزی آپ کمائیں اور اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوں۔ معاشرت کی تنظیم کا یہ قاعدہ بالکل جدید ہے، اور ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچا ہے کیونکہ مرد کی فضیلت و برتری اب بھی نمایاں ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی عورت مرد کی ہم پلہ نہیں ہے نہ اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوئے ہیں جو کامل مساوات کی صورت میں اس کو ملنے چاہییں۔ لیکن جس حد تک مساوات قائم کی گئی ہے اس نے ابھی سے نظام تمدن میں فساد برپا کر دیا ہے، حالانکہ ابھی اس جدید تنظیم کو شروع ہوئے پوری ایک قرن بھی نہیں گذری ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں ہم تفصیل کے ساتھ اس کے نتائج بیان کر چکے ہیں، لہٰذا اس کی کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

یہ تینوں قسم کے تمدن عدل اور توازن اور تناسب سے خالی ہیں کیونکہ انہوں نے فطرت کی رہنمائی کو سمجھنے اور ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق طریقہ اختیار کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اگر عقل سلیم سے کام لے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فطرت خود ان مسائل کا صحیح حل

تا رہی ہے بلکہ یہ بھی دراصل فطرت ہی کی زبردست طاقت ہے جس کے اثر سے عورت نہ تو اس حد تک گر سکی جس حد تک اسے گرانے کی کوشش کی گئی، اور نہ اس حد تک بڑھ سکی جس حد تک اس نے بڑھنا چاہا یا مرد نے اسے بڑھانے کی کوشش کی۔ افراط و تفریط کے دونوں پہلو انسان نے غلط اندیش عقل اور اپنے بہکے ہوئے تخیلات کے اثر سے اختیار کئے ہیں، مگر فطرت عدل اور تناسب چاہتی ہے، اور خود اس کی صورت بتاتی ہے۔

اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں۔ دونوں نوع انسانی کے دو مساوی حصے ہیں۔ تمدن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل، اور انسانیت کی خدمت میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دل، دماغ، عقل، جذبات، خواہشات اور بشری ضروریات دونوں رکھتے ہیں۔ تمدن کی صلاح و فلاح کے لیے دونوں کی تہذیب نفس، دماغی تربیت اور عقلی و فکری نشوونما یکساں ضروری ہے تاکہ تمدن کی خدمت میں ہر ایک اپنا اپنا پورا حصہ ادا کر سکے۔ اس اعتبار سے مساوات کا دعویٰ بالکل صحیح ہے، اور ہر صالح تمدن کا فرض یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اپنی فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع دے، ان کو علم اور اعلیٰ تربیت سے مزین کرے، انھیں بھی مردوں کی طرح تمدنی و معاشی حقوق ادا کرے، اور معاشرت میں عزت کا مقام ان کو بخشے تاکہ ان میں عزت نفس کا احساس پیدا ہو اور ان کے اندر وہ بہترین بشری صفات پیدا ہو سکیں جو صرف عزت نفس ہی کے احساس سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن قوموں نے اس قسم کی مساوات سے انکار کیا ہے، جنہوں نے اپنی عورتوں کو جاہل، ناتربیت یافتہ، ذلیل اور حقوق مدنیت سے محروم رکھا ہے وہ خود پستی کے گڑھے میں گر گئی ہیں، کیونکہ انسانیت کے پورے نصف حصہ کو گرا دینے کے معنی خود انسانیت کو گرا دینے کے ہیں۔ ذلیل ماؤں کی

گودیوں سے عزت والے اور ناتربیت یافتہ ماؤں کی آغوش سے اعلیٰ تربیت والے اور پست خیال ماؤں کے گہوارے سے اونچے خیال والے انسان نہیں نکل سکتے۔

لیکن مساوات کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا حلقۂ عمل ایک ہی ہو، دونوں ایک ہی سے کام کریں، دونوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی ذمہ داریاں یکساں عائد کر دی جائیں، اور نظام تمدن میں دونوں کی حیثیتیں بالکل ایک سی ہوں۔ اس کی تائید میں سائنس کے مشاہدات اور تجربات سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ عورت اور مرد اپنی جسمانی استعداد و قوت کے لحاظ سے مساوی (equipotential) ہیں مگر صرف یہ امر کہ ان دونوں میں اس قسم کی مساوات پائی جاتی ہے، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ فطرت کا مقصود بھی دونوں سے ایک ہی طرح کے کام لینا ہے۔ ایسی رائے قائم کرنا اُس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ دونوں کے نظام جسمانی بھی یکساں ہیں، دونوں پر فطرت نے ایک ہی جیسی خدمات کا بار بھی ڈالا ہے۔ اور دونوں کی نفسی کیفیات بھی ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ انسان نے اب تک جتنی سائنٹیفک تحقیقات کی ہے اس سے ان تینوں تنقیحات کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

علم الحیات (Biology) کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت اپنی نمایاں جسدی خصوصیات سے لے کر جسمی خلایا کے پروٹینی ذرات (Protein molecules of tissue cells) تک میں مرد سے مختلف ہے۔ جس وقت رحم میں بچے کے اندر صنفی تشکیل (Sex formation) واقع ہوتی ہے اسی وقت سے دونوں صنفوں کا جسدی ارتقاء بالکل ایک دوسرے سے مختلف صورت میں ہوتا ہے۔ عورت کا پورا نظام جسمانی اس طور پر بنایا جاتا ہے کہ وہ بچہ جننے اور اس کی پرورش کرنے کے لیے مستعد ہو۔ ابتدائی

جنینی تشکیل سے لے کر سن بلوغ کو پہنچنے تک اس کے جسم کا پورا نشوونما اسی استعداد کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے، اور یہی چیز اس کی آیندہ زندگی کا راستہ متعین کرتی ہے۔ بالغ ہونے پر ایام ماہواری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے اثر سے اس کے جسم کے تمام اعضاء کی فعلیت متاثر ہو جاتی ہے۔ ماہرین فن حیاتیات و عضویات کے مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام ماہواری میں عورت کے اندر حسب ذیل تغیرات ہوتے ہیں۔

۱۔ درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے جسم میں حرارت کو روکنے کی قوت کم ہو جاتی ہے اس لیے حرارت زیادہ مقدار میں خارج ہوتی ہے۔

۲۔ نبض سست ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ خلایائے دم کی تعداد میں فرق واقع ہوتا ہے۔

۳۔ Lymphatic glands, tonsils & endocrines میں تغیر واقع ہوتا ہے۔

۴۔ پروٹینی تحول Protein metabolism میں کمی آجاتی ہے۔

۵۔ فاسفیٹس اور کلورائیڈس کے اخراج میں کمی اور ہوائی تحول (Gaseous metabolism) میں انحطاط رونما ہوتا ہے۔

۶۔ ہضم، اور غذا کے پروٹینی اجزاء اور چربی کے جزو بدن بننے میں کمی ہو جاتی ہے۔

۷۔ تنفس کی قابلیت میں کمی اور گویائی کے اعضاء میں خاص تغیرات واقع ہوتے ہیں۔

۸۔ عضلات میں سستی اور احساسات میں بلادت آجاتی ہے۔

۹۔ ذہانت، اور خیالات کو مرکوز کرنے کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔

یہ تغیرات ایک تندرست عورت کو بیماری کی حالت سے اس قدر قریب کر دیتے ہیں کہ درحقیقت اس وقت صحت اور مرض کے درمیان کوئی واضح خط کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے

زیادہ شدید وہ تغیرات ہیں جو نظام عصبی کے اعلیٰ مراکز اور دروں افرازی غدد (endocrine glands) میں ہوتے ہیں۔ انہی اعضاء کے صحیح فعل پر تندرستی کا انحصار ہے۔ مگر ایام ماہواری میں ان کے فعل میں اختلال واقع ہو جاتا ہے۔ اور ایک مضطربانہ کیفیت رہتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر (Voicechevsky) نے گہرے مشاہدہ کے بعد یہ نتیجہ ظاہر کیا تھا کہ اس زمانہ میں عورت کے اندر مرکزیت خیال اور دماغی محنت کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ پروفیسر (Krschiskovsky) نفسیاتی مشاہدات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس زمانہ میں عورت کا نظام عصبی نہایت اشتعال پذیر ہو جاتا ہے۔ احساسات میں بلادت اور ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے مرتب انعکاسات کو قبول کرنے کی صلاحیت کم اور بسا اوقات باطل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پہلے سے حاصل شدہ مرتب انعکاسات میں بھی بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے وہ افعال بھی درست نہیں رہتے جن کی وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں خوگر ہوتی ہے۔ ایک عورت جو ٹرام کی کنڈکٹر ہے اس زمانہ میں غلط ٹکٹ کاٹ دے گی اور ریزگاری گننے میں الجھے گی۔ ایک موٹر ڈرائیور عورت گاڑی آہستہ اور ڈرتے ڈرتے چلائے گی اور ہر موڑ پر گھبرا جائے گی۔ ایک لیڈی ٹائپسٹ غلط ٹائپ کرے گی، دیر میں کرے گی اور کوشش کے باوجود الفاظ چھوڑ جائے گی، غلط جملے بنا جائیگی، کسی حرف پر انگلی مارنی چاہے گی اور ہاتھ کسی حرف پر جا پڑے گا۔ ایک بیرسٹر عورت کی قوت استدلال درست نہ رہے گی اور اپنے مقدمہ کو پیش کرنے میں اس کا دماغ اور اس کی قوت بیان دونوں غلطی کریں گے۔ ایک مجسٹریٹ عورت کی قوت فہم اور قوت فیصلہ دونوں متاثر ہو جائیں گی۔ ایک دندان ساز عورت کو اپنا کام کرتے وقت مطلوبہ اوزار مشکل سے ملینگے۔ ایک گانے والی عورت اپنے لہجہ اور آواز کی خوبی کو کھو دے گی، حتی کہ ایک ماہر نطقیات

محض آوازسن کر بتا سکتا ہے کہ گانے والی اس وقت حالت حیض میں ہے۔ غرض یہ کہ اس زمانہ میں عورت کے دماغ اور اعصاب کی مشین بڑی حد تک سست اور غیر مرتب ہوجاتی ہے۔ اس کے اعضاء پوری طرح اس کے ارادہ کے تحت عمل نہیں کر سکتے، بلکہ اندر سے ایک اضطراری حرکت اس کے ارادے پر غالب آکر اس کی قوت ارادی اور قوت فیصلہ کو ماؤف کردیتی ہے، اور اس سے مجبورانہ افعال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کی آزادی عمل باقی نہیں رہتی، اور وہ کوئی ذمہ دارانہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔

پروفیسر لاپنسکی Lapinsky اپنی کتاب The Development of Personality in woman میں لکھتا ہے کہ زمانہ حیض عورت کو اس کی آزادی عمل سے محروم کردیتا ہے۔ وہ اس وقت اضطراری حرکات کی غلام ہوتی ہے اور اس میں بالارادہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قوت بہت کم ہوجاتی ہے۔

یہ سب تغیرات ایک تندرست عورت میں ہوتے ہیں، اور بآسانی ترقی کرکے مرض کی صورت اختیار کرسکتے ہیں۔ ریکارڈ پر ایسے واقعات بکثرت موجود ہیں کہ اس حالت میں عورتیں دیوانی سی ہوجاتی ہیں۔ ذرا سے اشتعال پر غضبناک ہوجانا، وحشیانہ اور احمقانہ حرکات کر بیٹھنا حتٰی کہ خودکشی تک کر گذرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ڈاکٹر (Krafft-Ebing) لکھتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو عورتیں نرم مزاج، سلیقہ مند اور خوش خلق ہوتی ہیں ان کی حالت ایام ماہواری کے آتے ہی یکایک بدل جاتی ہے۔ یہ زمانہ ان کے اوپر گویا ایک طوفان کی طرح آتا ہے۔ وہ چڑچڑی اور جھگڑالو اور کٹ کھنی ہوجاتی ہیں، نوکر اور بچے اور شوہر ان سے نالاں ہوتے ہیں، حتٰی کہ وہ اجنبی لوگوں سے بھی بری طرح پیش آتی ہیں۔ بعض دوسرے اہل فن گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عورتوں سے

اکثر جرائم حالت حیض میں سرزد ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہوتیں ایک اچھی خاصی نیک عورت اس زمانے میں چوری کر گذرے گی اور بعد میں خود اس کو اپنے فعل پر شرم آئے گی (Weinberg اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے کہ خودکشی کرنے والی عورتوں میں ۵۰ فیصدی ایسی پائی گئی ہیں جنہوں نے حالت حیض میں یہ فعل کیا ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ کی رائے یہ ہے کہ بالغ عورتوں پر جب کسی جرم کی پاداش میں مقدمہ چلایا جائے تو عدالت کو اس امر کی تحقیق کر لینی چاہیے کہ آیا یہ جرم حالت حیض میں تو نہیں کیا گیا ہے۔

ایام ماہواری سے بھی بڑھ کر حمل کا زمانہ عورت پر سخت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ریپریف (Reprev) لکھتا ہے کہ حمل کے زمانہ میں عورت کے جسم سے فضلات کا اخراج بسا اوقات فاقہ زدگی کی حالت سے بھی زیادہ کم مقدار میں ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں عورت کا نظام کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا وہ بار نہیں سنبھال سکتا جو حمل کے ماسوا ایام میں سنبھال سکتا ہے۔ جو حالات اس زمانہ میں عورت پر گذرتے ہیں وہ اگر مرد پر گذریں یا غیر زمانہ حمل میں خود عورت پر گذریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے۔ اس زمانہ میں کئی مہینے تک اس کا نظام عصبی مختل رہتا ہے۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کے تمام عناصر روحی ایک مسلسل بدنظمی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ وہ مرض اور صحت کے درمیان معلق رہتی ہے اور ایک ادنیٰ سی وجہ اس کو بیماری کی سرحد میں پہنچا سکتی ہے۔ ڈاکٹر فشر کا بیان ہے کہ ایک تندرست عورت بھی حمل کے زمانہ میں سخت نفسی اضطراب میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس میں تلون پیدا ہو جاتا ہے۔ خیالات پریشان رہتے ہیں۔ ذہن پراگندہ ہوتا ہے۔ شعور اور غور و فکر اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بہت کم ہو جاتی ہے۔

وضع حمل کے بعد متعدد بیماریوں کے رونما ہونے اور ترقی کرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ زچگی کے زخم زہریلے اثرات قبول کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ قبل حمل کی حالت کی طرف واپس جانے کے لیے اعضا میں ایک حرکت شروع ہوتی ہے جو سارے نظام جسمانی کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اگر کوئی خطرہ نہ بھی پیش آئے تب بھی کئی ہفتے اس کو اپنی اصلی حالت پر آنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح استقرار حمل کے بعد سے پورے ایک سال تک عورت درحقیقت اس قابل نہیں ہوتی کہ اس پر کسی جسمانی یا دماغی محنت کا بار ڈالا جائے۔

پھر رضاعت کا زمانہ ایسا ہوتا ہے جس میں درحقیقت وہ اپنے لیے نہیں جیتی بلکہ اس امانت کے لیے جیتی ہے جو فطرت نے اس کے سپرد کی ہے۔ اس کے جسم کا جوہر اس کے بچے کے لیے دودھ بنتا ہے۔ جو کچھ غذا وہ کھاتی ہے اس میں سے صرف اس قدر حصہ اس کے جسم کو ملتا ہے جس قدر اسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ باقی سب کا سب دودھ کی پیدائش میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی ایک مدت دراز تک بچہ کی پرورش، نگہداشت اور تربیت پر اس کو تمام تر اپنی توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسئلہ رضاعت کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ بچوں کو خارجی غذاؤں پر رکھا جائے لیکن یہ کوئی صحیح حل نہیں ہے۔ اس لیے کہ فطرت نے بچہ کی پرورش کا جو سامان ماں کے سینے میں رکھ دیا ہے اس کا صحیح بدل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بچے کو اس سے محروم کرنا ظلم اور خودغرضی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح تربیت اطفال کے لیے بھی نرسنگ ہوم اور تربیت گاہ اطفال کی تجویزیں نکالی گئی ہیں تاکہ مائیں اپنے بچوں سے بے فکر ہو کر بیرون خانہ کے مشاغل میں منہمک ہو سکیں لیکن کسی نرسنگ ہوم اور کسی تربیت گاہ میں شفقت مادری فراہم نہیں کی جا سکتی۔ طفولیت کا ابتدائی زمانہ جس محبت جس دردمندی اور جس خیرسگالی کا محتاج ہے وہ کرایہ کی پالنے پوسنے والیوں کے سینے میں

کہاں سے آسکتی ہے۔ تربیت اطفال کے یہ جدید طریقے ابھی تک آزمودہ نہیں ہیں۔ ابھی وہ نسلیں پھل پھول بھی نہیں لائی ہیں جو بچے پالنے کے ان نئے کارخانوں میں تیار کی گئی ہیں۔ ابھی تک ان کی سیرت ان کے اخلاق، ان کے کارنامے دنیا کے سامنے نہیں آئے ہیں کہ اس تجربے کی کامیابی و ناکامی کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکے۔ لہٰذا اس طریقہ کے متعلق یہ دعویٰ کرنا قبل از وقت ہے کہ دنیا نے ماں کی آغوش کا صحیح بدل پالیا ہے۔ کم از کم اس وقت تک تو یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ بچے کی فطری تربیت گاہ اس کی ماں کی آغوش ہی ہے۔

اب یہ بات ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں کی جسمانی اور دماغی قوت و استعداد بالکل مساوی بھی ہے، تب بھی فطرت نے دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا ہے۔ بقائے نوع کی خدمت میں تخم ریزی کے سوا اور کوئی کام مرد کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد وہ بالکل آزاد ہے کہ زندگی کے جس شعبے میں چاہے کام کرے۔ بخلاف اس کے اس خدمت کا پورا بار عورت پر ڈالدیا گیا ہے۔ اسی بار کے سنبھالنے کے لیے اس کو اس وقت سے مستعد کیا جاتا ہے جب کہ وہ ماں کے پیٹ میں محض ایک مضغۂ گوشت ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس میں انفعال و تاثر، نرمی و نزاکت، رحم و شفقت، ذکاوت حس اور لطافت جذبات کی صفتیں پیدا کی گئی ہیں جو اسے زندگی کے صرف منفعلانہ پہلو کو قبول کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں، اور ایسے کاموں کے قابل نہیں بناتیں جو شدت اور سختی اور تحکم اور مزاحمت کے طالب ہیں۔ اسی کے لیے اس پر جوانی کے پورے زمانے میں ایام ماہواری کے دورے آتے ہیں جو ہر مہینے میں تین سے لیکر دس دن تک اس کو کسی بڑی ذمہ داری کا بار سنبھالنے اور کوئی اہم جسمانی یا دماغی محنت کرنے کے قابل نہیں رکھتے۔ اسی کے لیے اس پر حمل اور ما بعد حمل کا پورا ایک سال سختیاں جھیلتے گذرتا ہے جس میں وہ درحقیقت نیم جان ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر رضاعت

کے پورے دو سال اس طرح گذرتے ہیں کہ وہ اپنے خون سے انسانیت کی کھیتی کو سینچتی اور اپنے سینے کی نہروں سے اس کو سیراب کرتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر بچے کی ابتدائی پرورش کے کئی سال اس محنت و مشقت میں گذرتے ہیں کہ اس پر رات کی نیند اور دن کی آسائش حرام ہوتی ہے اور وہ اپنی راحت، اپنے لطف، اپنی خوشی، اپنی خواہشات، غرض ہر چیز کو آنے والی نسل پر قربان کر دیتی ہے۔ جب حال یہ ہے تو غور کیجیے کہ عدل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا عدل یہی ہے کہ عورت سے اُن فطری ذمہ داریوں کی بجا آوری کا مطالبہ بھی کیا جائے جن میں مرد اس کا شریک نہیں ہے، اور پھر اُن تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اس پر مرد کے برابر ڈال دیا جائے جن کو سنبھالنے کے لیے مرد فطرت کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہے؟ اُس سے کہا جائے کہ تو وہ ساری مصیبتیں بھی برداشت کر جو فطرت نے تیرے اوپر ڈالی ہیں اور ہمارے ساتھ آکر روزی کمانے کی شقتیں بھی اُٹھا، سیاست اور عدالت اور صنعت و حرفت، اور تجارت و زراعت اور قیام امن اور مدافعتِ وطن کی خدمتوں میں بھی برابر کا حصہ لے، ہماری سوسائٹی میں آکر ہمارا دل بھی بھلا، ہمارے لیے عیش و مسرت اور لطف و لذت کے سامان بھی فراہم کر؟ یہ عدل نہیں ظلم ہے، مساوات نہیں صریح نامساوات ہے۔ عدل کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ جس پر فطرت نے بہت زیادہ بار ڈالا ہے اس کو تمدن کے ہلکے اور سبک کام سپرد کیے جائیں۔ اور جس پر فطرت نے کوئی بار نہیں ڈالا اس پر تمدن کی اہم اور زیادہ محنت طلب ذمہ داریوں کا بار ڈالا جائے، اور اسی کے سپرد یہ خدمت بھی کی جائے کہ وہ خاندان کی پرورش اور اس کی حفاظت کرے۔

یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے اس فطری تقسیم کے لحاظ سے ایک صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو عورت کو معاشرت میں عزت کا مقام

اور تمدن و معیشت میں جائز حقوق دینے کے ساتھ اس پر صرف گھر کی ذمہ داریوں کا بار ڈالتا ہے، اور مرد کو بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوامیت سپرد کرتا ہے جو تمدن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ ممکن ہے کہ عارضی طور پر مادی حیثیت سے ترقی اور شان و شوکت کے کچھ مظاہر پیش کر دے، لیکن ایسے تمدن کی بربادی یقینی ہے، کیونکہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائے گا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکے گی، اور اس کا نتیجہ نہ صرف تمدن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہوگا عورت اپنی افتاد طبع اور فطری ساخت کے خلاف اگر کوشش کرے تو کسی بڑی حد تک مرد کے سب کاموں کا بوجھ سنبھال لے جائے گی۔ لیکن مرد کسی طرح بھی اپنے آپ کو بچے جننے اور بچے پالنے کے قابل نہیں بنا سکتا۔

اب اگر فطرت کی اس تقسیم عمل کو ملحوظ رکھکر خاندان کی تنظیم اور معاشرت میں مرد اور عورت کے مراتب و وظائف کی تعیین کی جائے تو اس کے ضروری ارکان یہ ہوں گے ۔

۱۔ خاندان کے لیے روزی کمانا، اس کی حفاظت و حمایت کرنا، اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مرد کا کام ہو۔ اور اس کی تعلیم و تربیت ایسی ہو کہ وہ ان اغراض کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

۲۔ خانہ داری کے فرائض، بچوں کی پرورش اور گھر کی زندگی کو سکون و راحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہو اور انہی اغراض کے لیے اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے تیار کیا جائے۔

۳۔ خاندان کے نظم کو برقرار رکھنے اور اس کو انارکی سے بچانے کے لیے ایک فرد کو ضروری حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں تاکہ خاندان ایک بن سری فوج نہ بن جائے۔ ایسا فرد صرف مرد ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ جس کن خاندان کی دماغی اور قلبی حالت بار بار ایام ماہواری اور حمل کے زمانہ میں بگڑتی رہتی ہو وہ ان اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ تمدن کے نظام میں اس تقسیم اور اس ترتیب و تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے تحفظات رکھے جائیں جن سے عورتوں اور مردوں کے حلقہائے عمل مخلوط نہ ہو سکیں۔ (باقی)

مطبوعات

الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطان | تالیف علامہ ابن تیمیہ۔ ترجمہ مولوی غلام ربانی صاحب ضخامت تقریباً پونے تین سو صفحات۔ قیمت ۱۲؍۔ محمد شریف عبدالغنی صاحبان تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔

علامہ ابن تیمیہ نے اس کتاب میں خدا کے سچے اولیاء اور دنیا کے جھوٹے پیروں میں امتیاز کی علامات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ انہوں نے آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ سے استدلال کر کے ثابت کیا ہے کہ صراط مستقیم اس راستہ کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے۔ ولایت اور تقرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عقیدہ وہی ہو جو قرآن نے بتایا ہے۔ اور طریقہ وہی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے۔ اس تعلیم اور اس سنت کے خلاف نہ کسی کا الہام قابل اعتبار ہے، نہ کسی کا قول و عمل۔ اگر کوئی شخص آگ پر چلتا اور ہوا پر اڑتا ہے مگر اس کا عقیدہ قرآن کے خلاف اور اس کا طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ سے مختلف ہے تو سمجھ لو کہ وہ ہرگز اللہ کا ولی نہیں۔ حق کا معیار ہر حال میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے۔ دوسرے اشخاص خواہ وہ کتنے ہی بڑے اور نامور کیوں نہ ہوں خطا سے معصوم نہیں ہیں۔ ان کا اتباع مسلمانوں کے لیے واجب نہیں کیا گیا ہے۔ وہ جو کچھ کریں اور جو کچھ کہیں اس کو کتاب و سنت کے معیار پر جانچ کر دیکھنا چاہیے۔ جو شخص ان کی شخصیت اور ان کے کمالات سے مرعوب ہو کر ان کا اتباع کرے گا وہ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیگا۔

دوران تقریر میں علامہ نے بہت سے ضمنی مسائل پر بھی بحث کی ہے جو صدیوں سے امت میں بنائے نزاع ہیں مثلاً توسّل، شفاعت، سماع، وحدت الوجود، مشیت و رضا اور طریقت و شریعت وغیرہ۔ ان مسائل میں علامہ کا مسلک معلوم و مشہور ہے اور حضرات اہل تصوف اس پر ان سے سخت ناراض ہیں، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے ان کو کافر تک ٹھیرایا ہے۔ لیکن ابن تیمیہ کی اس خصوصیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ہمیشہ قرآن کے محکمات اور احادیث کے صحاح سے استدلال کرتا ہے، اور اپنے استدلال میں تاویلات سے کام نہیں لیتا بلکہ نصوص کے صاف اور کھلے ہوئے معنی لیتا ہے۔ نیز یہ بات بھی اس کی کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ صوفیہ کا دشمن نہیں ہے۔ حضرات فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، معروف کرخی، جنید بن محمد بغدادی، سہل بن عبداللہ تستری، ابو سلیمان دارانی اور شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہم سے اس کو عقیدت ہے اور جگہ جگہ ان بزرگوں کے اقوال سے استشہاد کرتا ہے۔ البتہ وہ ان لوگوں کا سخت مخالف ہے جنہوں نے تصوف کی بنیاد قرآن و حدیث کے بجائے اشراقی فلسفہ پر رکھی ہے، طریقت کے راستہ کو علانیہ شریعت کے راستہ سے الگ قرار دیا ہے، روحانی ارتقار کے لیے اتباع سنت کے خلاف طریقے نکالے ہیں، رضا اور مشیت کو خلط ملط کر کے اباحت و استلذاذ نفس کے راستے کھولے ہیں اور معرفت اس کا نام رکھا ہے کہ خالق و مخلوق کو ایک ٹھیرا کر طاعت و معصیت کا امتیاز ہی اڑا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کو نہ اس بنا پر قبول کیجیے اور نہ رد کیجیے کہ وہ ابن تیمیہ کے اقوال ہیں، بلکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے معیار پر جانچ کر دیکھیے۔ اگر حق ہے تو مانیے خواہ وہ کسی کے خلاف پڑے، اور اگر باطل ہے تو دیوار پر کھینچ ماریے۔

کتاب کا ترجمہ صاف اور رواں ہے، مگر نظر ثانی کا محتاج ہے۔ بعض مقامات پر مترجم نے اصل کتاب کی عبارتوں کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اصل عبارت یہ تھی فالعقل

عندھم جوھرٌ قائمٌ بنفسہٖ کالعاقل۔ مترجم نے اس کا ترجمہ یہ کیا "فلسفیوں کے نزدیک عقل ایک جوہر ہے جو بنفسہٖ قائم ہے مثلاً عاقل"۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں، اور معنی بھی غلط ہے۔ صحیح مفہوم یہ ہے کہ فلاسفہ کے نزدیک جس طرح عاقل ایک جوہر قائم بنفسہٖ ہے اسی طرح عقل بھی بجائے خود ایک مستقل بالذات جوہر ہے۔

صفحہ ۱۱۱ پر یہ فقرہ نظر آیا: "یہ لوگ ... اتحاد کے لفظ سے اس لیے گریزاں ہیں کہ وہ دو چیزوں سے متلزم ہے جن میں سے ایک دوسرے سے متحد ہو گئی ہو۔ حالانکہ ان کے نزدیک وجود صرف ایک کا ہے"۔ اصل عبارت نکال کر دیکھی گئی تو وہ یہ تھی لانہ یقتضی شیئین اتحد احدھما بالآخر وعندھم الوجود واحد۔ یعنی اتحاد کا مقتضی یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہوں پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جائیں مگر یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ وجود ایک ہی ہے اس لیے وہ اتحاد کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

صفحہ ۱۱۳ پر یہ عبارت بے معنی نظر آئی: "میں اس پروردگار کا منکر ہوں جو کہ نافرمانی کرے"۔ اصل عربی فقرہ نکالا گیا تو یہ تھا: انا کافر برب یُعصیٰ۔ یعنی میں ایسے خدا کو نہیں مانتا جس کی نافرمانی کی جا سکتی ہو۔ مترجم نے یُعصیٰ کو یَعصِی پڑھا اور ترجمہ غلط کر دیا، حالانکہ عبارت کے سیاق و سباق کو دیکھنے سے خود معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یَعصِی کہنے کا کوئی موقع نہیں۔

کتابت کی غلطیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ناشرین کو اگر اس کتاب کی دوسری اشاعت کا موقع ملے تو ان غلطیوں کی اصلاح کر دینی چاہیے۔ (ا۔م)۔

زیارۃ القبور [تالیف علامہ ابن تیمیہ۔ مترجم کا نام نہیں دیا گیا۔ ضخامت ۹۰ صفحات۔ قیمت ۸ آنے۔ ناشر: محمد شریف عبد الغنی تاجر کتب کشمیری بازار۔ لاہور۔

یہ رسالہ زیارت قبور اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل پر ہے۔ مصنف نے سب سے پہلے آیات قرآنی سے تعلیم توحید کا اصل مقصود واضح کیا ہے یعنی عبادت اور استعانت کو اللہ کے لیے خاص کر دینا، اسی کو نافع وضار اور مجیب الدعوات سمجھنا، اور تمام توجہات کو اسی ایک مرکز پر جمع کر دینا۔ پھر وہ شرک کی توضیح کرتا ہے۔ شرک محض شرک فی الذات ہی نہیں ہے، بلکہ عبادت، اور دعا اور استعانت میں غیر کو شریک کرنا بھی شرک ہے اور سب سے زیادہ جن راستوں میں انسان کے قدم ٹھوکر کھاتے ہیں وہ یہی راستے ہیں۔ مشرکین بھی یہ نہیں کہتے کہ "اللہ" جس ذات کا نام ہے وہ ایک نہیں ہے۔ وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اصل خالق یا رازق یا نفع اور نقصان پہنچانے والا اس کے سوا کوئی اور ہے۔ عموماً شرک کی جس صورت میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا کے کاموں میں دوسروں کو کسی نہ کسی حیثیت سے دخیل سمجھا جاتا ہے، اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا کے ہاں تقرب، یا دعاؤں کی مقبولیت، یا جلب منفعت و دفع مضرت کے لیے اُن کو خوش کرنا اور ان کو سفارشی بنانا ضروری ہے۔ اگر ان کا ذریعہ اختیار نہ کیا گیا تو خدا اپنے بندوں کی طرف التفات نہ فرمائے گا۔ یہی چیز بنائے فساد ہے، کیونکہ اس سے بندوں کی توجہ خدا سے ہٹ کر مخلوقات کی طرف لگ جاتی ہے، عبد و معبود میں وہ تعلق قائم نہیں ہوتا جو در اصل ہونا چاہیے، بندگی اور توکل اور رضاجوئی اور دعا و عبادت میں جو مرکزیت پیدا کرنا تعلیم توحید کا مقصد اصلی ہے وہ اس سے باطل ہو جاتی ہے۔

ان اصول کو ثابت کر دینے کے بعد مصنف ان مقاصد سے بحث کرتا ہے جن کے لیے قبروں کی زیارت کی جاتی ہے۔ اگر اہل قبور سے براہ راست طلب حاجت کی جائے تو یہ شرک صریح ہے۔ اگر زائر ان کو مقرب بارگاہ سمجھ کر انھیں شفیع قرار دیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ان کی سفارش کے بغیر خدا اس کی بات نہ سنے گا تو یہ ضلالت ہے، کیونکہ خدا کو سنانے کے لیے

کسی واسطہ کی ضرورت نہیں (فَإِنِّیْ قَرِیْبٌ أُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ) اور خدا کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کی جرأت نہیں کر سکتا (مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ إِلَّا بِإِذْنِهٖ) اگر وہ ان سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کے لیے خدا سے دعا کریں، تو اہل قبور سے اس قسم کی درخواست مشروع نہیں ہے۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غرض سے زیارت قبور کی اجازت دی، نہ صحابہ اور تابعین اور ائمۂ اسلام نے کبھی ایسا کیا۔ اگر وہ ان کے عمل نیک اور ان کی سیرت صالحہ کا واسطہ دیکر خدا سے دعا کرتا ہے تو یہ ایسا عمل ہے جس کے جواز وعدم جواز میں ابن تیمیہ نے سکوت کیا ہے۔ اگرچہ صحابہ و تابعین وائمہ سے یہ فعل بھی ثابت نہیں ہے، لیکن اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دینے کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں۔ رہی زیارت مشروعہ جس کی اجازت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ صاحب قبر پر سلام بھیجا جائے، دعائے رحمت کی جائے، اور خود اپنی موت کو یاد کیا جائے۔

اس سلسلہ میں مصنف نے ضمناً بہت سے مسائل پر بحث کی ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

قوالی علامہ ابن تیمیہ کے رسالہ السماع والرقص کا ترجمہ از مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ضخامت ۷۰ صفحات قیمت ۶ر۔ محمد شریف عبدالغنی تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔

مصنف علام نے اس رسالہ میں سماع کے مشہور مسئلہ پر بحث کی ہے جو مدتوں سے علماء اور صوفیہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ وہ ان تمام احادیث پر کلام کرتا ہے جس سے جواز سماع پر استدلال کیا جاتا ہے، پھر تحلیل کر کے گانے کی ایک ایک قسم اور اس کے مقصود اور اس کے اثرات پر الگ الگ گفتگو کرتا ہے، اور دلائل شرعی سے ثابت کرتا ہے کہ ان میں سے کونسی قسم مباح ہے اور کون سی ممنوع۔ سب سے زیادہ پر لطف بات جو اس نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص درحقیقت قرب الٰہی اور پاکیزگی قلب اور طہارت نفس اور لطافت روح کے

سماع چاہتا ہے تو وہ قرآن سُنے، اس سے بہتر اور کونسی چیز ہے جو ان مقاصد کو پورا کر سکتی ہو۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کا کلام گویوں کی زبان سے سن کر بے تاب ہو جاتے ہیں، دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں، شدّت وجد میں کپڑے تک پھاڑ ڈالتے ہیں ان پر اللہ کا کلام سن کر کوئی اثر نہیں ہوتا، نہ آنکھ سے ایک آنسو نکلتا ہے، نہ گریبان کا ایک تار الگ ہوتا ہے، نہ دل میں کوئی ایسی تپش پیدا ہوتی ہے جو انھیں بے قرار کر دے۔ حالانکہ یہ قرآن وہ چیز ہے کہ اگر پہاڑ کو بھی اس کے معنی کا ادراک بخش دیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لرز اُٹھے (ا-م)

الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید | تالیف علامہ محمد بن علی الشوکانی۔ ترجمہ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے کیمنٹب۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۲ار۔ محمد شریف عبد الغنی تاجران کتب کشمیری بازار۔ لاہور۔

قاضی شوکانی نے اس رسالہ میں توسّل اور شفاعت اور استغاثہ اور زیارت قبور کے مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا مسلک بھی قریب قریب وہی ہے جو علامہ ابن تیمیہ کا ہے۔ جگہ جگہ علامہ رشید رضا مرحوم اور فاضل مترجم نے حواشی کا اضافہ کیا ہے جن میں بعض مقامات پر بے جا تشدد سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مسائل میں مسلمان عموماً سخت غلطیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں، لیکن جن امور کی حرمت یا کراہت کتاب و سنت سے ثابت نہیں ہے ان پر تاویلات سے حرمت یا کراہت کا حکم لگانا، اور پھر اس میں تشدد برتنا نہ صرف ناجائز ہے بلکہ موجب فتنہ بھی ہے، کیونکہ اس قسم کے تشدد سے دوسرے گروہ میں ضد پیدا ہوتی ہے، پھر وہ حق بات کو بھی نہیں مانتا۔ مثال کے طور پر قاضی شوکانی اہل فضل وعلم سے توسّل کو جائز رکھتے ہیں۔ یہ ایک معقول بات ہے، کیونکہ اس کی حرمت یا کراہت پر کتاب وسنت میں کوئی دلیل نہیں۔ اسی لیے ابن تیمیہ نے بھی اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا ہے لیکن علامہ رشید رضا اور لائق مترجم

اس کو بھی ناجائز ٹھیرانے کی کوشش کی ہے اور دلیل میں جو بات پیش کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کا عمل صالح اس کی اپنی اولاد کے سوا دوسروں کے لیے وسیلہ نہیں بن سکتا۔ اگر ایسا ہی ہے تو حضرت عمر نے حضرت عباس کو اپنی دعائے استسقاء میں کیوں وسیلہ بنایا، اور کیوں تمام صحابہ نے اس کو جائز رکھا؟ اس معاملہ میں زندہ اور مردہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے بھی کوئی معقول وجہ موجود نہیں، کیونکہ جس ذات پاک کے پاس توسل کیا جا رہا ہے اُس کے پاس تو زندوں اور مردوں کے اعمال اور ان کی ارواح یکساں حاضر ہیں۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ صحابہ نے کسی مردہ بزرگ سے توسّل نہیں کیا لہٰذا یہ فعل ناجائز ہے۔ اگر ایسا ہو تو ہر وہ فعل ناجائز قرار پائے گا جو زمانۂ رسالت یا عہد صحابہ میں نہیں ہوا، اور اس طرح مباحات کا دائرہ بہت ہی تنگ ہو جائے گا۔ جن امور کے متعلق نفیاً و اثباتاً کوئی حکم وارد نہیں ہوا ہے اور جن کا رواج عہد صحابہ میں بھی ثابت نہیں ہے ان کو زیادہ سے زیادہ امور مسکوت عنہا میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مگر قطعیت کے ساتھ ان کے عدم جواز کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ اہل اصول میں سے جو لوگ اباحت کو اصل قرار دیتے ہیں وہ تو ایسے امور میں جواز کی طرف جائیں گے۔ آیت لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى الخ سے بھی استدلال درست نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے معنی زیادہ صحیح سمجھتے تھے۔ آپ نے حج بدل کو جائز قرار دیا اور اس کی دلیل میں ارشاد فرمایا کہ اگر تیرے باپ پر قرض ہو اور تو اس کو ادا کر دے تو یہ تیرے باپ کے لیے نافع ہوگا۔ اسی طرح آپ نے متوفی کی طرف سے قربانی کرنے کو بھی جائز و نافع قرار دیا اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی کہ ایک قربانی آپ کی طرف سے کیا کریں۔ روزے کے متعلق بھی آپ کا ارشاد ہے کہ من مات وعلیہ صیام صام عنہ ولیہ (جو شخص مرجائے اور اس کے روزے چھوٹ گئے ہوں، اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے)

اگر آیت مذکورہ کا مفہوم یہی ہوتا کہ ایک شخص کا عمل صالح اس کی اپنی ذات کے سوا دوسروں کے لیے نافع نہیں ہو سکتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے احکام ہرگز نہ دیتے۔ پس مردہ بزرگوں کے عمل صالح اور ان کی حرمت کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کے ناجائز ہونے پر کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں، اور جس چیز سے خدا و رسول نے منع نہ کیا ہو اس کو ممنوع قرار دینا گویا شریعت میں اضافہ کرنا ہے۔ یہ بھی بدعت کی ایک قسم ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محرّم الحلال کمستحل الحرام (حلال کو حرام قرار دینے والا ایسا ہی ہے جیسا حرام کو حلال قرار دینے والا)

اس طرح کے تشدد کی بعض اور مثالیں بھی اس کتاب میں نظر پڑیں۔ مگر ان سب کا ذکر اس مختصر تبصرے میں نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا مقصد صرف اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ استیصال بدعات کے جوش میں حد سے گذر جانا مناسب نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جوش میں آپ خود ایک جوابی بدعت کے مرتکب ہو جائیں۔ (ا۔م)

خزینۃ المیراث تالیف مولوی فتح الدین صاحب خوشابی ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍ محمد شریف عبدالغنی صاحب تاجر کتب کشمیری بازار۔ لاہور۔

اس کتاب میں اسلامی قانون وراثت کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور قریب قریب تمام ممکن الوقوع صورتیں فرض کر کے تقسیم وراثت کے جزئیات درج کر دیے گئے ہیں۔ آخر میں مذہب شیعہ کے احکام وراثت اور ہندو دھرم شاستر کے قانون توریث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ کاغذ اور کتابت دونوں بہت ناقص ہیں (ا۔م)

قادیانی مذہب تالیف جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی۔ (ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ) ضخامت ۴۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍ ۔ کمال احمد صاحب فاروقی۔ بیت السلام۔ حیدرآباد دکن۔

اس کتاب کا ارتقا حیرت انگیز ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۴۰ صفحات کا تھا۔ دوسرا ۲۸۰ صفحات کا تھا، تیسرا ۶۰۰ صفحات تک پہنچ گیا۔ اور اب یہ چوتھا ایڈیشن ہے جس کو اگر الفیہ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کا مواد مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کے خلفاء و "صحابہ" (بلا تشبیہ) اور ائمہ قادیانیت کی تقریباً ۱۰۰ کتابوں اور صحیفوں سے اخذ کیا ہے۔ ان میں بکثرت ایسی کتابیں بھی ہیں جو قادیانی مذہب میں راسخ ہو جانے سے قبل کسی کو نہیں دکھائی جاتیں۔ مؤلف نے کافی جہاد کے بعد اس محفوظ ذخیرہ کا ایک معتد بہ حصہ نکلوایا ہے، اور اس سے عام پبلک کو استفادہ کا موقع دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب قادیانی مذہب کے متعلق معلومات کا بہترین مجموعہ بن گئی ہے، اور معلومات بھی ایسی ہیں جن کے مستند ہونے میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس میں مرزا صاحب اور ان کے اکابر متبعین کی عبارتیں لفظ بلفظ نقل کر دی گئی ہیں اور ان کے مآخذ کے پورے پورے حوالے دیے گئے ہیں۔ مؤلف کا حصہ اس کتاب میں اگر کچھ ہے تو وہ صرف اس کی سائنٹیفک ترتیب ہے۔ ایک تعلیم یافتہ اور معقول آدمی کسی مذہب اور اس کے بانی کے متعلق حقیقی رائے قائم کرنے کے لیے جس قدر معلومات حاصل کرنا چاہے گا وہ قریب قریب سب یہاں موجود ہیں اور ایسی مرتب اور مفصل ہیں کہ ایک ایک پہلو اپنے اپنے مقام پر نمایاں ہو گیا ہے۔ مرزا صاحب کی سیرت، ان کے دعووں کا تدریجی ارتقاء، ان کی مذہبی تعلیمات، ان کے الہامات، انگریزی حکومت کے ساتھ ان کے سیاسی تعلقات، غیر قادیانی مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کے متعلق ان کا مسلک، ان کے خلفاء اور اکابر "صحابہ" کی سیرتیں، ان کے متبعین کے مختلف فرقے اور ہر ایک کے عقائد و مسالک اس طرح واضح کر دیے گئے کہ شاید اب اس سے زیادہ توضیح ممکن نہیں۔ مؤلف نے کہیں بحث و استدلال کی کوشش نہیں کی اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ مرزا صاحب اپنے منہ سے آپ بول رہے ہیں۔ قادیانیت خود اپنا [illegible] آپ کر رہی ہے۔ اب یہ کتاب دیکھ لینے کے بعد بھی اگر کسی شخص کا ضمیر ایسے مدعی نبوت کو نبی ماننے اور اس کے مذہب کو مذہب حق تسلیم کرنے پر آمادہ ہو تو اس سے بحث بیکار ہے۔ وہ ایک ناقابل علاج مریض ہے جس کا مداوا نہیں کیا جا سکتا۔ (ا-م)
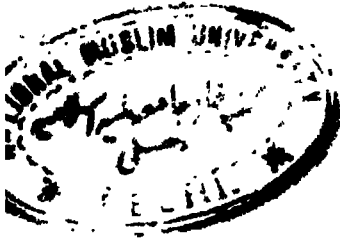
جلد ۱۰ (عدد ۱)
بابت جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۳
رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۹۱۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (عہ)
قیمت فی پرچہ ۸ر

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت | اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقایق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ | وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ | اصلاحی جنگ کے اصول ومقاصد کی تشریح اوران اعتراضات کا مدلل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیئے جاتے ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار | دعوت وتبلیغ سے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ | اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اوران میں اسلام کی اصلاحات

جنگ دوسرے مذاہب میں | جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھمت مسیحیت اور عیسائیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

جنگ اور تہذیب جدید | بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت مجلد ([illegible]) انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ غیر مجلد [illegible] انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن۔ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ جلد ۸ عدد ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

چند مہینوں سے اس رسالہ کے بیشتر صفحات، اور مرتب رسالہ کے تمام تر اوقات کو بعض اہم شرعی مسائل نے گھیر لیا ہے، جس کی وجہ سے اُن استفسارات کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا جو وقتاً فوقتاً باہر سے آتے رہے ہیں۔ خود مستفسرین کو بھی اس کا احساس ہے کہ جن مسائل پر اس وقت بحث ہو رہی ہے وہ زیادہ اہم ہیں۔ اسی لیے انہوں نے عدم توجہ کی شکایت نہیں کی۔ مگر اس مشغولیت کا سلسلہ نہ معلوم کب تک جاری رہے، لہٰذا تفصیلی تحقیق کا خیال چھوڑ کر اشارات میں ان شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

سورۂ نمل کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کا ذکر آیا ہے۔ اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ آنحضرت علیہ السلام کو جب "ہد ہد" کے ذریعہ سے قوم سبا کے شرک اور ان کی آفتاب پرستی کا حال معلوم ہوا تو آپ نے اس قوم کی ملکہ کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ ملکہ نے اس باب میں اپنے امرا و اعیان سلطنت سے مشورہ لیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی زور باز و رکھتے ہیں۔ جنگ کیے بغیر اطاعت نہ کریں گے۔ مگر ملکہ نے جنگ کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور اس کے بُرے نتائج سے آگاہ کر کے مصالحانہ روش اختیار کرنے کی رائے دی۔ چنانچہ سب کے اتفاق سے ایک بیش قیمت ہدیہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت

بھیں بھیجا گیا۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ مجھے تمہارے ہدیے کی ضرورت نہیں، میں تمہارے اسلام یا اطاعت کا طالب ہوں۔ غرض جنگ کا اعلان ہوگیا۔ اس اعلان کے بعد آنحضرت اپنے اعیان دولت کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس ملکہ کا تخت میرے پاس اٹھا لائے۔ ایک جن نے عرض کیا کہ میں دربار کے برخاست ہونے سے پہلے اُس کو لے آؤں گا۔ ایک دوسرے شخص نے جو "کتاب کا علم رکھتا تھا" کہا کہ میں چشم زدن میں اس کو حاضر کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے فی الواقع پلک جھپکاتے تخت لا حاضر کیا۔ اس موقع پر حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں لکھتے ہیں:۔

"کافر جو اپنے ایمان میں نہیں اس کا مال زبردستی حلال ہے جب وہ مسلمان ہوا پھر حلال نہیں۔"

پھر جب حضرت سلیمان نے ملکہ کو اپنے سامنے حاضر پایا تو بے اختیار بول اٹھے کہ یہ میرے رب کا فضل ہے۔ وہ مجھ کو آزماتا ہے کہ میں شاکر بندوں کی طرح اس کی نعمتوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرتا ہوں، یا کافروں کی طرح کفران نعمت کرتا ہوں۔ یہاں حضرت مرحوم نے پھر شرح فرماتے ہوئے لکھا ہے:۔

"یعنی ظاہر کے اسباب سے نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میرے رفیق اس حد کو پہنچے جن سے کرامت ہونے لگی ...... اور اس کے پاس ایک علم تھا کتاب کا یعنی اللہ کے اسماء اور کلام کی تاثیر کا وہ شخص آصف تھا ان کا وزیر۔"

آیات مذکورۂ بالا اور ان کے متعلق حضرت شاہ صاحب رحمہ کے حواشی پر ایک عزیز نے حسب ذیل شبہات ظاہر کیے ہیں۔

وشل صالح کے اعتبار سے نہ صرف کفار پر بلکہ عام مومنین پر بھی برتری عطا فرمائی ہے۔ الحمد للہ الذی فضلنا علی کثیر من عبادہ المؤمنین۔ النمل۔ ۲)۔ ان میں وہ تمام اوصاف جمع ہیں جن کی بنا پر قانون الٰہی کے مطابق ایک شخص حکمرانی کا سب سے زیادہ حق دار ہوتا ہے۔ (اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ البقرہ ۳۲) خود ان کے پدر گرامی قدر حضرت داؤد علیہ السلام کو جو کتاب حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اس میں یہ قاعدۂ کلیہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ زمین کی حقیقی وراثت صرف صالحین کو پہنچتی ہے، یعنی جو صالح نہیں ہیں وہ حکومت کے جائز حق دار نہیں بلکہ غاصب ہیں (وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۔ الانبیاء۔۷)۔ اب ان کو خبر ملتی ہے کہ ایک قوم آفتاب کی پرستار، شیطان کی تبع اور راہ راست سے ہٹی ہوئی ہے (یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ فَصَدَّھُمْ عَنِ السَّبِیْلِ فَھُمْ لَا یَھْتَدُوْنَ۔ النمل۔ ۲)۔ قاعدۂ اسلامی کے مطابق حضرت سلیمان اس کو دعوت دیتے ہیں کہ یا اسلام قبول کرو یا حکومتِ صالحہ کے مطیع ہو جاؤ کیونکہ شیطانی طریقہ کے پیرو رہتے ہوئے تم کو حکومت کا حق نہیں، عام اس سے کہ تمہاری حکومت خود اختیاری ہو یا جہانگیرانہ (اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ۔ النمل: ۲)۔ اس قوم کی ملکہ اس نامۂ گرامی کو دیکھ کر ایمان کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ (وَاُوْتِیْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِھَا وَکُنَّا مُسْلِمِیْنَ۔ النمل: ۳)۔ مگر قومی عصبیت اور دین آبائی کی محبت اس کو ایمان لانے سے روک دیتی ہے (وَصَدَّھَا مَا کَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنَّھَا کَانَتْ مِنْ قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ (النمل۔۳)۔ اپنی سلطنت کے امرا و اعیان سے رائے لیتی ہے، وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ملکہ ان کو روکتی ہے

اور حضرت سلیمان کو ہدیہ بھیج کر راضی کرنا چاہتی ہے، لیکن حضرت سلیمان اس پیشکش کو رد فرما دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ دنیوی بادشاہوں کی طرح نہ تھے جن کا مقصود محض مال و دولت ہوتا ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے اس کام پر مامور تھے کہ لوگوں کو دین الٰہی کا پیرو بنائیں یا کم از کم ان حکومتوں کو جو عصیان و طغیان پر قائم ہوں، مٹا کر الٰہی قانون کی حکومت قائم کر دیں۔ اس غرض کے لیے وہ اعلان جنگ کر دیتے ہیں اور ایک فوج ملک سبا کی طرف بھیجتے ہیں۔ اب ان کی پیغمبرانہ حکمت اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ ملکہ کے گرفتار ہو کر آنے سے پہلے اس کا تخت اٹھوا منگائیں۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ اصل مقصود ملک فتح کرنا نہ تھا بلکہ اس ملکہ اور اس کی قوم کو مسلمان کرنا تھا۔ فوج کی چڑھائی سے ملک کا مسخر ہو جانا تو یقینی تھا، مگر اس امر کا یقین نہ تھا کہ محض افہام و تفہیم سے یہ لوگ اس مشرکانہ مذہب کو چھوڑ دیں گے جس پر صدیوں سے وہ اور ان کے آباؤ اجداد جمے ہوئے تھے۔ اس غرض کے لیے خدائی طاقت کے ایک مظاہرہ کی بھی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے معبود کی بے بسی اور خدائے واحد کی قدرت بے پایاں کا ایک ادنیٰ کرشمہ بچشم سر دیکھ لیں۔ چنانچہ تخت منگالیا گیا اور جب ملکہ حاضر ہوئی تو اس کے سامنے بالکل انجان بن کر پیش کیا گیا۔ (قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ۔ النمل-۳) ملکہ نے تخت کو دیکھا تو پہچان گئی اور اب وہ ایمان جو حضرت سلیمان کی پہلی دعوت پر محض ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گیا تھا اپنی پوری روشنی کے ساتھ اس کے دل میں اتر گیا۔ (وَقَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ۔

اس تشریح سے یہ شبہہ رفع ہو جاتا ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر نے "دوسرے کی

ملک" پر "بلاضرورت" تصرف کیا۔ وہ ملک خدا کی تھی۔ دوسرا اس پر حق کی راہ سے نہیں ظلم اور غصب کی راہ سے قابض تھا، قانون الٰہی کے مطابق اس کو بے دخل کر دینے کی ضرورت تھی تاکہ وہ یا تو قانون الٰہی کا اتباع قبول کرے یا کم از کم دنیوی امور میں حکومت صالحہ کا مطیع ہو جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدا پرستی اور نفسانی اغراض سے پاکیزگی کا کمال تو دیکھیے۔ مال و دولت کو یہ کہکر ٹھکرا دیتے ہیں کہ میرے خدا نے جو کچھ مجھکو دیا ہے وہ تمہارے مال سے بہتر ہے۔ مخالف قوم کی ملکہ کا تخت جب آن کی آن میں اپنے قدموں کے نیچے دیکھتے ہیں تو اپنی طاقت و شوکت کی تعریف میں ایک حرف بھی زبان پر نہیں آتا۔ زبان کھلتی ہے تو اپنے پروردگار کے فضل و احسان کی تعریف میں اور سر جھکتا ہے تو اپنے آقا کے شکر میں۔ جو وقت ایک بادشاہ کے لیے انتہائی فخر و مباہات کا تھا اس وقت یہ عجز و نیاز اور یہ شکر و سپاس! پھر سبا کی ملکہ مغلوب ہو کر آتی ہے تو اس کے ملک کا کوئی حصہ نہیں مانگا جاتا اس سے تجارتی اور معاشی امتیازات طلب نہیں کیے جاتے۔ اس پر انتداب (مینڈیٹ) یا حمایت (پروٹیکٹوریٹ) قائم کرنے کی تجویز نہیں کی جاتی اس کے ہاں ریزیڈنسی اور ہائی کمشنری قائم کرنے کا ذکر بھی درمیان میں نہیں آتا۔ پیش کیا جاتا ہے اس کے سامنے کلمۂ حق۔ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشان (یعنی خود اس کا تخت) اس کو دکھایا جاتا ہے تاکہ اس کی ہدایت ہو۔ اس معجزہ کو دیکھ کر ادھر اس کی زبان پر یہ کلام جاری ہوتا ہے کہ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اور ادھر بادشاہ اسلام مطمئن ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ وہ اپنی ذات یا قوم کے لیے کسی چیز کا طالب نہ تھا۔ اس کو تو صرف اس بات کی لگن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح ان کے دین اور دنیا کو خرابی سے بچا لے جس فرمانروائی

حیثیت ہو جس کا یہ طرزِ عمل ہو، اگر وہ زمین کی حکومت کا جائز وارث نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے۔

جائز اور حلال کی بحث تو آپ ہی آپ طے ہو گئی پیغمبر کا تقوٰی اُس سے بھی بڑھ کر نکلا جس کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ کافر کا مال لوٹنا تو درکنار، اس کا مال اسی کو سونپا اور اپنے پاس سے سب سے زیادہ قیمتی دولت اس پر اضافہ کی معجزے سے مرعوب کرنے کی حکمت و مصلحت بھی ظاہر ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس معجزانہ قوت کو اللہ کے دیئے ہوئے علم سے، اللہ ہی کے کام میں خالص اور پاک نیت کے ساتھ استعمال کیا گیا' لہٰذا اس میں نہ کوئی چیز جاہلانہ ہے، نہ خلاف شرع اور نہ قابل نکیر اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ حضرت سلیمان کے بجائے اس معجزہ کا صدور ایک دوسرے شخص کے ذریعہ سے کیوں کرایا گیا؟ یہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو یہی کام خود آنحضرت علیہ السلام سے بھی لے سکتا تھا۔ مگر جب اسنے ان کے بجائے ایک دوسرے شخص کو اس کے لیے انتخاب کیا تو ضرور ہے کہ اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔

میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، مگر غور کرنے سے جو مصلحت میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں جن کی قوت ناریہ اور انسان کی قوت علمیہ کا فرق ظاہر کرنا مقصود تھا۔ انسان اگرچہ قید جسمانی میں گرا ہی محدود مادی طاقت سے کوئی فوق العادہ کام نہیں کر سکتا، اور اس حیثیت سے جن کا وجود ناری اس کے وجود خاکی سے بہت زیادہ قوی ہے، لیکن جب علم کتاب کی قوت انسان کے ساتھ ہو' تو وہ تمام طاقت والوں سے بڑھ کر طاقت ور ہو جاتا ہے۔ اس قوت علمیہ کا مظاہرہ اگر پیغمبر کے ذریعہ سے کرایا جاتا، تو اس شبہ کی گنجایش نکل سکتی تھی کہ پیغمبر تو جن وانس میں سب سے افضل ہے ہی۔ اس کی فوقیت اگر ثابت ہو گئی تو اس سے بشر من حیث البشر کا علمی تفوق ظاہر نہیں ہوا۔ اس لیے اللہ تعالٰی نے ایک معمولی غیر نبی انسان سے اس علمی طاقت کا مظاہرہ کرا دیا تاکہ حقیقت بالکل

عیاں ہوجائے۔ ادنیٰ شبہ بھی باقی نہ رہے۔

توریت اور تالمود میں یہ قصہ کیوں نہیں ہے؟ اس کا جواب آپ کو قرآن اور توریت کے تقابل سے خود مل جائیگا توریت تاریخی افسانوں کی ایک کتاب بن کر رہ گئی ہے جس میں غیر ضروری تفصیلات بہت ملیں گی مگر بہت ہی کم کوئی ایسی چیز پائی جائے گی جو اپنے اندر کوئی حکمت، کوئی موعظت، کوئی دینی، اخلاقی، شرعی یا سیاسی سبق رکھتی ہو۔ بخلاف اس کے قرآن میں تمام غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ کر انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کا عطر نکال لیا گیا ہے اور صرف وہ چیزیں پیش کی گئی ہیں جو ہر زمانے اور ہر قوم کے انسانوں کے لیے اپنے اندر بے حد و حساب ہدایتیں رکھتی ہیں۔ بے کار تاریخی جزئیات توریت میں بہت ہیں اور قرآن میں کہیں نہیں ہیں۔ سبق آموز واقعات تمام تر قرآن میں بیان ہوئے ہیں، توریت میں اکثر و بیشتر تو ملتے ہی نہیں اور اگر ملتے ہیں تو ان کو خشک اور غیر تعلیمی انداز بیان سے اس درجہ مسخ کر دیا گیا ہے کہ قلب پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ بات یہیں تک نہیں، اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ بعض پیغمبروں کی زندگیوں کو توریت اور دوسری اسرائیلی روایات میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان کو پیغمبر ماننا تو درکنار، کوئی اعلیٰ درجہ کا شریف انسان تسلیم کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ فخر صرف قرآن کو حاصل ہے کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کو ان اسرائیلی نجاستوں سے پاک کیا ہے، اور از سر نو دنیا میں ان پاک شخصیتوں کی وہ عظمت و حرمت قائم کی ہے جس کے وہ در اصل مستحق تھے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے حالات توریت میں پڑھیے، کتنے ہی سیاہ دھبے آپ کو وہاں نظر آئیں گے۔ قرآن میں دیکھیے۔ آسمان عزّ و شرف کے چمکتے ہوئے مہ و انجم دکھائی دیں گے۔ خود حضرت سلیمان کو اسرائیلیات میں نبوت کیا معنی ایمان سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ نعوذ باللہ وہ کافر بت پرست اور جادوگری

حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں۔ قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے دنیا کو بتایا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے مومن اور اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔

بنی اسرائیل کا مذاق اخلاقی و روحانی معاملات میں کچھ اس درجہ پست واقع ہوا تھا کہ انہوں نے نہ صرف اپنی کتابوں میں خود اپنے انبیاء کی سیرتوں کو جھوٹے افسانوں سے داغدار بنایا، بلکہ جب قرآن مجید نے ان کے ملکات فاضلہ، اخلاق حسنہ اور ان کے بلند پایہ کارناموں کی صحیح تصویر کھینچی تو ان کو یقین نہ آیا کہ انسانی سیرت اتنی پاکیزہ بھی ہو سکتی ہے، بشری اخلاق اتنے بلند بھی ہو سکتے ہیں، آب و گل کے بنے ہوئے آدمی اس قدر پاک نفس عالی حوصلہ اور فانی فی اللہ بھی ہو سکتے ہیں! ان کے تصور سے یہ چیزیں بہت بالا و برتر تھیں اسی لیے نزول قرآن کے بعد اسرائیلی مذاق کی کارفرمائی پھر شروع ہو گئی۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصے بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک ایک پر ہاتھ صاف کیا گیا اور ہر ایک کی جان نکال لی گئی۔ قرآن کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ قصوں کی غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ کر صرف کام کی باتیں لے لیتا ہے، اس طرح واقعات کے درمیان جو خلا چھوٹ جاتا ہے اس کو پڑھنے والا خود اپنے تصور یا بیرونی معلومات سے (اگر ہوں تو) بھر سکتا ہے مگر اسرائیلی مذاق رکھنے والوں نے اس خلا کو افسانوں سے پر کیا اور افسانے بھی ایسے پست درجے کے کہ ان کے ساتھ مل کر اصل قصے کی تعلیم ہی باطل ہو گئی۔ بدقسمتی سے قصص القرآن کی تفسیروں میں یہی اسرائیلیات کثرت سے رائج ہو گئے ہیں اور قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کو اکثر شبہات انہی کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔

اسی قصہ سلیمانؑ و ملکۂ سبا کو دیکھیے۔ قرآن کے صاف اور سادہ بیان میں حضرت سلیمان کی سیرت پاک کا کتنا اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مگر اسرائیلی مذاق کی کارفرمائی نے اس کی اہم خصوصیات میں سے ایک ایک کو مٹا کر چھوڑا اور اس کو اپنے بلند مقام سے گرا کر ایسی پستی میں پھینک دیا کہ اس میں کوئی تعلیمی روح باقی ہی نہ رہی، بلکہ پڑھنے والا اگر اس روشنی میں اس قصے کو پڑھے تو اس کو تعجب ہوگا کہ قرآن میں اس قصہ کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ملکۂ سبا کے ہدیے کو واپس کرنے کی وجہ اوپر بیان ہو چکی ہے۔ مگر اسرائیلی مذاق نے اس کی جو توجیہ کی ہے وہ بھی سنیے۔ ملکہ

نے دو سو غلاموں اور دو سو لونڈیوں کو ایک سا لباس پہنا کر بھیجا تھا جس میں تمیز نہ ہوتی تھی کہ غلام کون ہے اور لونڈی کون۔ وہ اس سے حضرت سلیمان کی عقل کا اندازہ کرنا چاہتی تھی۔ حضرت سلیمان کے پاس یہ جماعت پہنچی تو انہوں نے لونڈیوں کو الگ اور غلاموں کو الگ کر دیا اور کہا کہ ان کو لے جاؤ یا یہ ہدیہ تمہیں کو مبارک ہے۔ اس توجیہ کے بعد حضرت سلیمان کے جواب پر نظر ڈالیے کیا اب بھی اس میں کوئی جان، کوئی بلند اخلاقی روح پائی جاتی ہے؟

"تخت اٹھوا کر منگانے کی مصلحت بھی آپ کو اوپر معلوم ہو چکی ہے۔ اب ذرا اس توجیہ کو بھی دیکھیے جو اسرائیلیات کے زیر اثر گھڑی گئی ہے۔ ہدہد نے حضرت سلیمان سے سبا کے تخت شاہی کی بڑی تعریف کی تھی، بڑا تخت سونے اور بیش قیمت جواہرات کا بنا ہوا ہے، کاریگری کا عجیب نمونہ ہے، ایک بے بہا چیز ہے۔ حضرت سلیمان ان تعریفوں کو سن کر بے تاب ہو گئے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ملکہ سبا اور اس کے اعیان سلطنت کو لیے آتی ہے تو انہیں خیال ہوا کہ اگر یہ لوگ مسلمان ہو گئے یا انہوں نے اطاعت قبول کر لی تو پھر یہ چیز ہاتھ نہ آسکے گی۔ لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ ان کے آنے سے پہلے تخت یہاں لے آؤ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ کہاں وہ پاک نیت اور کہاں یہ طمع و حرص۔ کس بلندی سے کس پستی میں اس واقعہ کو پھینکا گیا ہے۔

تخت کو ملکہ کے سامنے پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا تھا کہ تو جس متاع عزیز کو قفلوں میں بند کر کے بڑے چوکی پہروں میں رکھ آئی تھی وہ یہاں حاضر ہے۔ یہ الٰہی علم کی طاقت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے اور تیری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ دلائل عقلی کے ساتھ اس دلیل مادی کو محض اس لیے پیش کیا گیا تھا کہ کسی طرح اس عورت کو ہدایت نصیب ہو جائے تو حضرت سلیمان نے اس فعل کی غرض یہی بتائی ہے کہ نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ۔ مگر ایسی کھلی ہوئی بات بھی افسانہ طلب حضرات کے ذہن کی رسائی سے بالاتر ثابت ہوئی۔ انہوں نے تخت کو پیش کرنے کی توجیہ یہ کی کہ حضرت سلیمان اس کی عقل کا امتحان لینا چاہتے تھے اس لیے تخت کی ساخت میں کچھ ترمیم کرا دی اور اس کے سامنے رکھوا دیا تاکہ دیکھیں کہ وہ اس کو پہچانتی ہے یا نہیں۔ انبیاء کے کاموں کو جب عامیانہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ اسی طرح بلند مقاصد اور اعلیٰ درجہ کے مصالح و حکم سے خالی نظر آتے ہیں۔

سب سے زیادہ رکیک بات جو اس سلسلہ میں کہی گئی ہے وہ شیش محل میں ملکۂ سبا کی حاضری سے متعلق ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ حضرت سلیمان نے ملکہ کے سامنے اس کا تخت پیش کرنے کے بعد اسے اپنا شیش محل دکھایا جس کا فرش بھی شیشے یا بلور کا تھا۔ ملکہ جب وہاں پہنچی تو شیشے کے فرش کو پانی سمجھ کر اپنے پائینچے اٹھانے لگی۔ حضرت سلیمان نے کہا کہ یہ شیشے کا فرش ہے! اب ملکہ کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں اس کے دل نے گواہی دی کہ جس شخص کے پاس اتنی بڑی سلطنت ہے، اتنی دولت ہے اس قدر اسباب عیش و نعمت ہیں، ایسی غیر معمولی طاقتیں ہیں کہ چشم زدن میں تخت ہزاروں میل سے اٹھوا منگاتا ہے، اور پھر ان سب چیزوں کے باوجود اس کے اخلاق، اس کی طہارت نفس، اس کے تقویٰ اور خلوص و للّٰہیت کا یہ حال ہے وہ یقیناً ایک سچا آدمی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کے دعوئے نبوت کی تکذیب کی جائے! اسی لیے بے اختیار وہ بول اٹھی کہ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اے میرے پروردگار میں نے اپنے اوپر ظلم کیا کہ اب تک تجھے چھوڑ کر آفتاب کی پرستش کرتی رہی۔ اب میں سلیمان کے ساتھ اس اللہ کی پرستش کرتی ہوں جو سارے جہان کا رب ہے۔

اب ذرا اسرائیلی مذاق کی تفسیر دیکھیے جو شیاطین اور جن حضرت سلیمان کے تابع فرمان تھے انہیں خوف ہوا کہ حضرت سلیمان کہیں ملکۂ سبا کو پسند نہ فرما لیں اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ عورت ایک جنّی عورت کے پیٹ سے ہے اور اس کے پاؤں انسان کے سے پاؤں نہیں ہیں بلکہ گدھے کے کھر ہیں۔ حضرت سلیمان نے اس بات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے حکم دیا کہ ایک شیش محل بنایا جائے جس کا فرش بھی شیشے کا ہو اور فرش کے نیچے پانی بھر دیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ملکہ جب داخل ہوگی تو پانی دیکھ کر اپنے پائینچے اٹھالے گی، اور یوں اس کی پنڈلیاں دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ نعوذ باللہ من ذالک یہ ایک نبی کا قصہ ہے یا کسی نفس پرست دنی الطبع بادشاہ کا؟

یہ چند نمونے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی مذاق اور اسرائیلی ذہنیت نے توریت کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے بعد قرآن کی تعلیمات کو بھی مسخ کرنے، اور انبیاء علیہم السلام کی پاک زندگیوں پر اپنے تخیل کے سیاہ دھبے ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے قرآن کو اپنی اصلی صورت میں محفوظ کر دیا جس کی طرف رجوع کر کے ہر حق پسند انسان صحیح سبق اور صحیح علم حاصل کر سکتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص قرآن کی موجودگی میں بھی اسرائیلیات سے شغف رکھے اور توریت و تالمود ہی کو قرآن کی تعبیر و تفسیر کا ذریعہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے۔

مقالات

بشارات الانبیاء

نبوت محمدی کے متعلق انبیاء سابقین کی پیشگوئیاں

(۴)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

چوتھی بشارت

کتاب پیدائش باب ۱۷، آیت ۲۰ میں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کے حق میں یہ وعدہ فرماتا ہے:-

"اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کرونگا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔"

آخری فقرے کا ترجمہ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمہ میں یہ کیا گیا ہے واجعلہ لشعب کبیر (یعنی میں اس کو ایک بڑی قوم کے لیے بناؤں گا) بعد کے جدید ترجمہ میں اس کو اجعلہ امۃً کبیرۃً کر دیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اشارہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ کیونکہ اولاد اسمٰعیل میں آپ کے سوا کوئی ایسا نہیں جس نے ایک بڑی قوم بنائی ہو تا آپ سے پہلے بنی اسمٰعیل کوئی بڑی قوم نہ تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا نقل فرمائی ہے جو انہوں نے

حضرت اسمٰعیل کے حق میں کی تھی اور وہ یہ ہے۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (البقرہ: ۱۵)۔

امام قرطبی اپنی کتاب کے حصہ دوم فصل اول میں لکھتے ہیں۔ بعض خبردار لوگ جو یہودیوں کی زبان میں مہارت رکھتے ہیں۔ اور جنہوں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لکھتے ہیں کہ تورات کی اس عبارت میں دو مقامات پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی اعداد کے طریق پر نکلتا ہے، جو یہودیوں میں مستعمل ہے۔

(۱) "میں اسے بہت بڑھاؤں گا" یہاں اصل لفظ جو استعمال کیا گیا تھا "بماد ماد" ہے ان حروف کے اعداد ۹۲ ہیں۔ اسی طرح لفظ محمدؐ کے اعداد بھی ۹۲ ہیں۔

(۲) لشعب کبیر۔ اصل میں "لغوی غداول" تھا۔ یہودیوں کی ابجد میں حرف غ کے عدد تین ہیں۔ (کیونکہ غ ان کے ہاں ج کی جگہ پر ہے) اس لحاظ سے ان الفاظ کے مجموعی اعداد بھی وہی ۹۲ ہیں۔

احبار یہود میں سے ایک شخص عبدالسلام تھا جو سلطان بایزید کے زمانے میں مسلمان ہوا۔ اس نے ایک چھوٹا سا رسالہ الرسالۃ الھادیۃ کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں کہتا ہے کہ احبار یہود میں حروف ابجد سے دلائل و اشارات نکالنے کا قاعدہ عام طور پر رائج تھا۔ جب حضرت سلیمان نے بیت المقدس تعمیر کیا تو احبار یہود جمع ہوئے اور کہا کہ یہ عمارت چار سو دس سال قائم رہے گی پھر تباہ ہو جائے گی۔ یہ پیشنگوئی لفظ بذأت کے اعداد سے نکالی گئی تھی۔ پھر کہتا ہے:۔

"یہودیوں نے لفظ بماد ماد سے استدلال کرنے کو اس لیے غلط ٹھیرایا ہے کہ اسا

لفظ میں ب نفس کلمہ کا جز نہیں ہے بلکہ ایک حرف ہے جو صلہ کے طور پر لایا گیا ہے۔ اگر اس کو الگ کر دیا جائے تو محمدؐ نام نکالنے کے لیے ایک اور ب کی ضرورت ہوگی اور بماد ماد کہنا پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تمہاری زبان میں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ جب دو ب ایک جگہ جمع ہو جائیں، ایک حرف ہو اور دوسری نفس کلمہ کا جزء ہو تو حرف کو اڑا کر نفس کلمہ کے جزء کو باقی رکھا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں اتنی کثیر ہیں کہ ان کو بیان کرنے کی ہم حاجت نہیں"۔

یہ تحقیق اتنی معتبر ہے کہ علماء نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی میں ایک نام ماد ماد بھی لکھا ہے، جیسا کہ قاضی عیاض کی شفا میں مذکور ہے

پانچویں بشارت

کتاب پیدائش باب ۴۹ آیت ۱۰ میں ہے:-

"یہوداہ سے ریاست کا عصا جدا نہ ہوگا اور نہ حاکم اس کے پاؤں کے درمیان سے جاتا رہے گا جب تک کہ سیلا نہ آوے اور قومیں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی۔"

(انگریزی ترجمہ میں سیلا کو اس کے صحیح تلفظ کے ساتھ شیلوہ (Shileh) لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ بعض عربی تراجم میں الذی لہ الکل کیا گیا ہے یعنی وہ جس کے لیے سب کچھ ہے)۔ اور بعض ترجموں میں الذی ھو لہ سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے (یعنی وہ کہ یہ ریاست کا عصا اسی کے لیے ہے) اس آیت میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی شریعتوں کے دور ختم ہونے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دور دورہ شروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ عبدالسلام نے الرسالۃ الھادیہ میں آیت کے ابتدائی فقرے کا صحیح ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

لایزول الحاکم من یهودا ولا راسم من بین رجلیه ۔

پھر وہ کہتا ہے کہ حاکم سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ حضرت یعقوب کے بعد وہی ایک صاحب شریعت نبی آئے ہیں ۔ اور راسم سے مراد حضرت عیسیٰ ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وہی صاحب شریعت نبی آئے ہیں۔ ان دونوں کے بعد کوئی ایسا شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا نہیں آیا جس کی شریعت تمام دنیا پر چھائی ہو اور جس نے اسلام نہ لانے والوں کے خیالات، عوائد اور قوانین پر بھی گہرا اثر ڈالا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ اس پیشگوئی میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے "شیلوہ" سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حاکم اور راسم کے بعد آپ ہی تشریف لائے۔ آپ ہی کو دنیا کی ریاست عطا ہوئی، اور آپ ہی کی طرف قومیں اکٹھی ہوئیں ۔ دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کو اس کا مصداق نہیں ٹھیرایا جا سکتا کیونکہ وہ صاحب شریعت نہ تھے اور یہاں حضرت یعقوب کی مراد صاحب احکام و شریعت ہی سے ہے ۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں اور ایک نکتہ بھی ہے ۔ حضرت یعقوب نے حضرت موسیٰ کے لیے حاکم کا ہم معنی لفظ استعمال فرمایا کیونکہ ان کی شریعت جبری و انتقامی ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کو راسم کہا کیونکہ ان کی شریعت نہ جبری ہے نہ انتقامی۔ اس کے بعد "شیلوہ" کا ذکر کیا جس کا مفہوم ان دونوں کا جامع ہے، یعنی اس کو دنیوی سلطنت بھی حاصل ہوگی جس کے لیے جبر و انتقام ضروری ہے اور پھر اس میں عفو و رحمت کی شان بھی ہوگی۔ ان دونوں کا جامع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہے؟ یہ بات نہ مسیح یہود پر صادق آتی ہے جیسا کہ یہودیوں کا گمان ہے، اور نہ عیسیٰ علیہ السلام پر جیسا کہ مسیحی کہتے ہیں۔ یہودیوں کی دنیوی سلطنت کو زائل ہوئے ڈھائی ہزار برس سے زیادہ ہو گئے۔ اور آج تک ان کے مسیح مزعوم کا پتہ نہیں ۔ رہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ان کے ظہور سے ۶ سو برس پہلے ہی یہودیوں کی دنیوی سلطنت ختم ہو چکی تھی ۔ وہ اس وقت پیدا ہوئے جب ان کی قوم رومیوں کی بدترین غلامی میں مبتلا تھی۔ خود انہوں نے "یہودا" کی دنیوی سلطنت واپس لینے کی کوشش نہیں کی

بلکہ جس غلامی کی حالت میں پیدا ہوئے تھے اسی میں دنیا سے اٹھ گئے اُن کے بعد بھی یہود کو ریاست نصیب نہیں ہوئی، بلکہ وہ آج تک اس سے مسلوب ہے۔ اس میں شک نہیں ان کے جانے کے سالہاسال بعد ان کا نام لینے والوں کو دنیوی سلطنت ملی مگر ان کی شریعت کے اتباع سے نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی سے۔ خود حضرت عیسیٰ نے کوئی ایسی تعلیم نہیں دی جو دنیوی سلطنت کے حصول میں کسی حیثیت سے بھی مددگار ہو "شیلوہ" کے مصداق وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

چھٹی بشارت

زبورہ ۴ کی پوری عبارت ایک پیشنگوئی ہے اور وہ یہاں لفظ بلفظ نقل کی جاتی ہے :-

۱- میرے دل میں اچھا مضمون جوش مارتا ہے میں ان چیزوں کو جو میں نے بادشاہ کے حق میں بنائی ہیں بیان کرتا ہوں۔ میری زبان ماہر لکھنے والے کا قلم ہے۔

۲- تو حسن میں بنی آدم[۱] سے کہیں زیادہ ہے[۲] تیرے ہونٹوں میں لطف بٹایا گیا ہے اسی لیے خدا نے ابد تک تجھ کو مبارک کیا۔

۳- اے پہلوان[۳] اپنی تلوار کو جو تیری حشمت اور بزرگواری ہے حمائل کر کے اپنی ران پر لٹکا۔

۴- اور اپنی بزرگواری سے سوار ہو اور سچائی اور ملائمت اور صداقت کے واسطے اقبالمندی سے آگے بڑھ اور تیرا داہنا ہاتھ تجھ کو مہیب کام سکھلاویگا۔

---

[۱] عربی میں بنی البشر اور انگریزی میں (Children of men) لکھا ہے۔ پس بنی آدم سے مراد یہ ہے کہ تو عام انسانوں سے حسن میں زیادہ ہے، یا تیرا حسن غیر معمولی ہے۔

[۲] یہ ترجمہ مہمل ہے۔ انگریزی میں صحیح مفہوم ادا کیا گیا ہے (Grace is poured into Thy lips) یعنی تیرے ہونٹوں پر کرم پھیلا گیا ہے۔ یعنما رحمۃ بین الشفتین تعمر

[۳] پہلوان کا لفظ مترجم کا طبعزاد معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی ترجمہ میں (Most mighty) لکھا ہے۔ عربی کے قدیم ترجمہ میں القوی اور جدید ترجمہ میں الجبار ہے۔

۵۔ تیرے تیکھے تیز ہیں۔ لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں وے بادشاہ کے دشمنوں کے دل میں لگ جاتے ہیں۔

۶۔ تیرا تخت اے خدا ابد الآباد تک ہے تیری سلطنت کا عصا راستی کا عصا ہے۔

۷۔ تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے اس سبب سے خدا تیرے خدا نے تیرے ساتھیوں سے بڑھ کر تیرے سر پر خوشی کے تیل سے مسح کیا۔

۸۔ تیرے سارے لباس سے مُر اور عود اور تج کی خوشبو آتی ہے کہ جن سے ہاتھی دانت کے محلوں کے درمیان انہوں نے تجھ کو خوش کیا ہے۔

۹۔ بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں، تیرے داہنے ہاتھ پر اوفیر کے سونے سے آراستہ ملکہ کھڑی ہے۔

۱۰۔ اے بیٹی سن لے اور سوچ اور اپنے کان ادھر کر اور اپنے لوگوں اور اپنے باپ کے گھر کو بھول جا۔

۱۱۔ تاکہ بادشاہ تیرے جمال کا نہایت مشتاق ہو کہ وہ تیرا خداوند ہے تو اسے سجدہ کر۔

۱۲۔ اور صور کی بیٹی ہدیے لاوے گی قوم کے دولت مند تیری خوشامد کریں گے۔

۱۳۔ شاہزادی گھر کے اندر کُل[1] جلوہ گر ہے۔ اس کا لباس سراسر تاش کا ہے۔

۱۴۔ وہ سوزنی کپڑے پہنے بادشاہ پاس لائی جاتی ہے کنواری عورتیں جو اس کی سہیلیاں ہیں اس کے پیچھے پیچھے تیرے پاس پہنچائی جاتی ہیں۔

۱۵۔ خوشی اور شادمانی سے وے پہنچائی جاتی ہیں۔ وے بادشاہ کے محل میں داخل ہوتی ہیں۔

---

[1] صحیح مفہوم "پوری شان سے جلوہ گر" ہے۔ یا گھر اس کے جلووں سے معمور ہے۔ انگریزی میں یہ مفہوم All glorious سے ادا کیا گیا ہے۔

"۱۶۔ تیرے بیٹے تیرے باپ دادوں کے قائم مقام ہوں گے تو انہیں تمام زمین کے سردار مقرر کرے گا۔

۱۷۔ میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا۔ پس سارے لوگ ابدالآباد تیری ستائش کریں گے"

تمام اہل کتاب تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس زبور میں کسی نبی کی خبر دی ہے جو ان کے بعد آنے والا تھا۔ یہودیوں کے نزدیک ایسا نبی اب تک نہیں آیا جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں۔ پروٹسٹنٹ علماء کہتے ہیں کہ یہ نبی عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور اہل اسلام بالاتفاق اس کا مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ جو صفات اس زبور میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک ایک کو لیجئے اور دیکھیے کہ درحقیقت کون ان سب سے متصف ہے۔

(۱) حسن صورت اور ایسا حسن صورت جو عام انسانوں سے بالاتر ہو۔ مسیح علیہ السلام کے متعلق اس قسم کی کوئی روایت نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے مارأیت شیئا احسن من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان الشمس تجری فی وجھہ واذا ضحک یتلألأ فی الجدار۔ میں نے کوئی چیز آنحضرت صلعم سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھی آپ کی صورت ایسی تھی گویا آفتاب ہے اور جب آپ ہنستے تو موتیوں کی لڑی سی چمکتی نظر آتی۔ ام معبد رضی اللہ عنہا آپ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتی ہیں اجمال الناس من بعید واحسنہم واحلاہم من قریب۔ دور سے دیکھو تو آپ سب لوگوں سے زیادہ جمیل اور قریب سے دیکھو تو سب سے زیادہ حسین و شیریں۔ براء ابن عازب کہتے ہیں ما رأیت شیئا قط احسن منہ میں نے حضور سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی۔ حضرت علی فرماتے ہیں لم ار قبلہ ولا بعدہ مثلہ میں نے نہ حضور سے پہلے کوئی آدمی آپ جیسا دیکھا اور نہ آپ کے بعد۔ دوسرے موقع پر حضرت علی فرماتے

ہیں۔ اجود الناس صدرا واصدق الناس لھجۃ والینھم عریکۃ واکرمھم عشیرۃ من راٰہ بدیھۃ ھابہ ومن خالطہ معرفۃ احبہ۔ آپ سب سے زیادہ دریادل، سب سے بڑھ کر خوش بیان، سب سے زیادہ نرم خو، سب سے بڑھ کر ملنسار تھے جو آپ کو پہلی مرتبہ دیکھتا وہ آپ کی شخصیت سے مرعوب ہوجاتا اور جو آپ سے واقف ہونے کے بعد ملتا وہ آپ کا گرویدہ ہوجاتا۔ ھند بن ابی ہالہ کا بیان ہے یتلالأ وجھہ تلألؤ القمر لیلۃ البدر حضور کا چہرہ ایسا چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند۔ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ ایک رات آنحضرت صلعم ایک سرخ حلہ پہنے ہوئے تشریف رکھتے تھے اور چاند نکلا ہوا تھا۔ میں ایک نظر چاند پر ڈالتا اور ایک نظر حضور پر۔ مجھے چاند سے زیادہ حضور حسین معلوم ہو رہے تھے"۔ جن لوگوں نے آپ کو دیکھا ہے وہ آپ کا حلیہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تناسب اعضاء اور حسن و جمال کے اعتبار سے احسن تقویم کا کامل نمونہ تھے۔

(۲) شیرینی بیان۔ اس باب میں بھی مسیح علیہ السلام کے متعلق کچھ منقول نہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دوست و دشمن سب اقرار کرتے ہیں کہ آپ غایت درجہ کے فصیح اللسان اور شیریں کلام تھے حتیٰ کہ آپ کی تقریر سخت سے سخت مخالف تک کے دل میں اتر جاتی تھی۔

(۳) خدا نے ابد تک مبارک کیا۔ اس سے بڑھ کر برکت کیا ہوگی کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔ اور یہی نہیں بلکہ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے بے شمار مخلوق حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر روزانہ کئی کئی بار درود بھیجتی رہی ہے اور قیامت تک بھیجتی رہے گی۔

(۴) ماذی طاقت، تلوار اور قوت قاہرہ۔ یہ چیز حضرت عیسیٰ کو ملی ہی نہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی ملی کہ جس طاقت نے آپ کا مقابلہ کیا اس کو آخر کار نیچا دیکھنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ آپ کی

جسمانی قوت بھی ایسی دی گئی تھی کہ آپ نے عرب کے مشہور پہلوان رکانہ کو اس طرح پچھاڑ دیا گویا وہ آپ کے ہاتھ میں ایک بچہ تھا۔ آپ کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ حضرت علی جیسا بہادر سپاہی کہتا ہے کہ جنگ میں جب ہم پر سخت وقت آتا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ لیتے۔ تمام عمر کبھی لڑائی میں پیٹھ نہیں دکھائی بلکہ اپنے مقام سے ہٹے تک نہیں۔ جنگ حنین میں تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بظاہر شکست ہو چکی تھی۔ مگر ایک اللہ کا رسول تھا کہ میدان جنگ میں پہاڑ کی طرح قائم تھا اور کہہ رہا تھا :-

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

ابن عمر رضی اللہ عنہ وعن ابیہ کا بیان ہے کہ ما رأیت اشجع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ میں نے حضور سے زیادہ بہادر کوئی شخص نہیں دیکھا۔

(۵) امانت، حلم اور صداقت ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خصوصیات ہیں جن کا دشمنوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ کفار قریش سے بڑھ کر آپ کا دشمن کون ہوگا۔ ان کو بھی آپ کی امانت پر بھروسہ تھا۔ ابو سفیان نے اس زمانے میں جب وہ دشمنان اسلام کا سپہ سالار تھا قیصر روم کے سامنے آپ کی راست گوئی کا اقرار کیا۔ حلم کا یہ حال تھا کہ مکہ فتح کرتے ہیں۔ وہ دشمن جنہوں نے آپ کو سخت اذیتیں دیکر وطن سے نکالا اور پھر دار الہجرت میں بھی آپ کو آٹھ برس تک چین سے نہ بیٹھنے دیا، آپ کے بس میں ہیں۔ چاہیں تو ایک ایک سے بدلہ لیں۔ مگر سب کو معاف فرما دیتے ہیں، اور معاف ہی نہیں فرماتے بلکہ احسان اور نوازشات سے اتنا سرفراز فرماتے ہیں کہ پرانے دوستوں اور جاں نثاروں کی زبانوں تک حرف شکایت آجاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر حلم کی مثال یہ ہے کہ جو عورت آپ کے پیارے چچا کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی اس کو بھی معاف کر دیا اور عنایات سے نوازا۔ تاریخ عالم ایسے حلم و عفو اور فراخ دلی کی نظیر پیش کرنے سے

عاجز ہے۔

(۶) تیرے تیر تیز ہیں، دشمنوں کے دل ہیں لگ جاتے ہیں۔ لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں۔ یہ مجازی کلام ہے۔ دل میں لگنے والا تیر در اصل لوہے کا نہیں زبان کا تیر ہوتا ہے۔ یہ تیر قرآن کے تیر تھے کہ بڑے بڑے پتھر کے کلیجے اس کو سن کر پانی ہو گئے۔ مخالفین اسلام اس کو سنتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں دل میں نہ اتر جائے۔ ایک نہیں بیسیوں کفار ایسے تھے کہ دشمنی کے ارادے آئے اور قرآن کے تیر سے مجروح ہو کر رہ گئے۔ اسی کا اثر تھا کہ لوگ فوج در فوج حضور کے قدموں کے نیچے اکٹھے ہوتے چلے جاتے تھے۔ یدخلون فی دین اللہ افواجا۔

(۷) تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسی راست آتی ہے کہ کسی پر نہیں آتی۔ اسی لیے آپ کو اللہ نے ایسی کامیابی عطا کی کہ انبیاء میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

(۸) بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں۔ بادشاہوں سے مراد سرداران قبائل ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر ازواج مطہرات عرب کے معزز سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔

(۹) اوفیر کے سونے سے آراستہ ملکہ حضرت داؤد اس کو اے بیٹی سے خطاب کرتے ہیں اور اس کو نصیحت کرتے ہیں کہ تو اپنے شوہر کی مطیع بن اور اپنے لوگوں کو بھول جا۔ یہ اشارہ ہے حضرت صفیہ ام المومنین کی طرف۔ وہ اسرائیلی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں۔ حرم نبوی میں داخل ہونے کے بعد ذات رسالت پناہ میں ایسی محو ہوئیں کہ پھر ان کو اپنے خاندان اور اپنے عزیزوں کا خیال تک نہ آیا۔

(۱۰) قوم کے دولت مند تیری خوشامد کریں گے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت ابو بکرؓ اور دوسرے دولت مند صحابہ نے اپنی ساری دولتیں حضور کے قدموں میں ڈال دیں۔ باہر کے ملوک اور امراء میں سے نجاشی شاہ حبش، مقوقس مصر، ہرقل قیصر روم، اور ملوک بحرین و عمان نے آپ کے پاس

تحائف اور ہدیے بھیجے۔

(۱۱) تیرے بیٹے تیرے باپ دادوں کے قائم مقام ہوں گے۔ یہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام پر صادق آتی ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان (باستثنا خوارج) ان کی سرداری کو تسلیم کرتے ہیں دینی پرجو اقتدار ان کو حاصل ہوا اور اب تک حاصل ہے وہ بادشاہوں کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔

(۱۲) سارے لوگ ابد الآباد تک تیری ستائش کریں گے مسلم اور غیر مسلم جس کثرت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا کرتے ہیں، نوع انسانی میں سے کسی شخص کی نہیں کرتے۔ آج کروڑوں انسان اذانوں میں آپ کا نام بلند کرتے ہیں، نمازوں میں آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں تحریروں اور تقریروں میں آپکی ثنا و صفت بیان کرتے ہیں آپکے نشان کف پا تک کو سروں پر رکھا جاتا ہے اور جس چیز کو آپ کی ذات سے ادنیٰ سی نسبت بھی حاصل ہے وہ آنکھوں سے لگائی جاتی ہے۔

اب دیکھو کہ دنیا میں کون ایسا شخص گذرا ہے یا آج پایا جاتا ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کی بیان کردہ علامتیں اس قدر ٹھیک ٹھیک صادق آتی ہوں۔ مسیح علیہ السلام نہ حسین و جمیل تھے۔ نہ طاقت ور تھے، نہ تلوار ان کو نصیب ہوئی، نہ ان کے تیروں میں کوئی تیزی تھی؛ نہ لوگ فوج در فوج ان کے قدموں کے نیچے آئے، نہ امرا نے ان کی اطاعت کی، نہ بادشاہوں نے ان کو ہدیے بھیجے، نہ ان کے حرم میں کوئی عورت داخل ہوئی۔ نہ وہ صاحب اولاد ہوئے کہ ان کے بیٹے اپنے بزرگوں کے قائم مقام ہوتے۔

ساتویں بشارت

زبور ۱۴۹ میں ہے:۔

"۱۔ خداوند کی ستائش کرو خداوند کے لیے ایک نیا گیت گاؤ اور اس کی مدح کرو

۲۔ اسرائیل اپنے بنانے والے سے شادمان ہووے بنی صیہون اپنے بادشاہ کے سبب خوشی کریں۔

۳۔ وے اس کے نام کی ستائش کرتے ہوئے رقص کریں وے طبل اور بربط بجاتے ہوئے اس کی ثناخوانی کریں۔

۴۔ کیونکہ خداوند اپنے لوگوں سے خوش ہوتا ہے وہ حلیموں کو نجات کی زینت بخشتا ہے۔

۵۔ پاک لوگ اپنی بزرگواری پر فخر کریں اور اپنے بستروں پر بلند آواز سے گائیں۔

۶۔ خدا کی ستائش بلند آواز سے ان کی زبانوں پر ہووے اور ایک دو دھاری تلوار ان کے ہاتھ میں ہو۔

۷۔ تاکہ غیر امتوں (کفار = Heathen) سے انتقام لیویں اور لوگوں کو سزا دیویں

۸۔ تاکہ ان کے بادشاہوں کو زنجیروں سے اور ان کے امیروں کو لوہے کی بیڑیوں سے جکڑیں۔

۹۔ تاکہ ان پر وہ فتویٰ جو لکھا ہوا ہے جاری کریں کہ اس کے پاک لوگوں کی یہی شوکت ہے۔ خداوند کی ستائش کرو۔

اس زبور میں جس بادشاہ اور جس گروہ کی بشارت دی گئی ہے، اس کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ اللہ کے لوگ (حزب اللہ) ہیں، پاک لوگ (ابراد) ہیں، حلیم اور نرم خو (اَذِلَّةٍ علی المومنین اور رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ) ہیں، خدا کی ستائش بلند آواز سے کرنے والے ہیں (اذان اور صدائے تکبیر) دو دھاری تلوار اُن کے ہاتھ میں ہے، کفار سے انتقام لیتے اور فجار کو سزا دیتے ہیں، ملوک اور امراء کو گرفتار کریں گے اور ان پر خدا کا مقرر کیا ہوا فیصلہ جاری کریں گے۔

یہ تمام صفات محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر صادق آتی ہیں۔ سلیمان علیہ السلام

اس پیشگوئی کے مصداق نہیں ہو سکتے کیونکہ اہل کتاب کا اپنا قول یہ ہے کہ ان کی مملکت حضرت داود علیہ السلام کی مملکت سے زیادہ وسیع نہیں ہوئی۔ نیز یہ بھی انھیں کا قول ہے کہ وہ مرتد ہو گئے تھے اور آخر عمر میں انہوں نے بت پرستی شروع کر دی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس کے مصداق نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ اور ان کے حواری ان اوصاف سے بمراحل دور ہیں بلکہ ان کا عکس ان پر صادق آتا ہے۔ ملوک وامرا کو گرفتار کرنا اور ان کو سزا دینا تو درکنار وہ خود گرفتار ہوے اور سخت ذلت کے ساتھ ان کو سزا دی گئی۔

آٹھویں بشارت

یسعیاہ نبی کی کتاب باب ۴۲ میں ہے:۔

"دیکھو تو سابق پیشینگوئیاں بر آئیں اور میں نئی باتیں بتلاتا ہوں اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ خداوند کے لیے ایک نیا گیت گاؤ اور اس کی حمد کرو زمین کے انتہائی سرے سے، اے تم جو سمندر پر گذرتے ہو اور وہ جو اس میں بستے ہو، جزائر اور ان کے باشندو۔ بیابان اور اسکی بستیاں قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں گے سلع[ل] کے بسنے والے گائیں گے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ وے خداوند کا جلال ظاہر کریں گے اور بحری ممالک میں اس کی ثناخوانی کریں گے خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا وہ ایک جنگی مرد کے مانند اپنی غیرت کو اکسائے گا وہ چلائے گا ہاں، وہ جنگ کے لیے للکاریگا وہ اپنے دشمنوں پر بہادری کرے گا میں

ل۔ انگریزی ترجمہ میں لفظ سلع کی بجائے Rock لکھا گیا ہے اور عربی ترجمہ میں اس کا اتباع کرکے صخرہ یعنی چٹان کا لفظ لکھا ہے۔ مگر اردو ترجمہ میں صاف طور پر سلع لکھا ہے۔

بہت مدت سے چپ رہا میں خاموش ہو رہا اور آپ کو روکتا گیا پر اب میں اس عورت کی طرح جسے درد زہ ہو چلاؤں گا میں کپلوں گا اور یکایک نگل جاؤں گا۔[*] میں پہاڑوں اور ٹیلوں کو ویران کر ڈالونگا ان کے سبزہ زاروں کو خشک کر دوں گا ندیوں کو جزیرے بنا دونگا اور جھیلوں کو سکھا دوں گا۔ اور میں اندھوں کو اُس راہ سے کہ جسے وے نہیں جانتے لیجاونگا۔ میں انھیں ان رستوں پر جن سے وے آگاہ نہیں لے چلونگا۔ میں ان کے آگے تاریکی کو روشنی اور ناہموار کو ہموار کر دونگا میں ان سے یہ سلوک کرونگا اور انہیں ترک نہ کرونگا۔ وہ پیچھے ہٹینگے اور نہایت پشیمان ہوں گے[†] جو تراشی ہوئی مورتوں پر بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں تم ہمارے اِلٰہ ہو" (۹۔۱۷)۔

یسعیاہ علیہ السلام نے اس پیشنگوئی میں جس کے متعلق خود انہوں نے تصریح کر دی ہے کہ اس کا ظہور آیندہ زمانہ میں ہوگا، چند باتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ خدا کی عبادت اور اس کی حمد اور تسبیح ایک نئے طرز پر ہوگی یہ اشارہ ہے نماز کی طرف۔

۲۔ وہ تمام مکان ارض پر عام ہوگی۔ بحر و بر اور دشت و جبل کے باشندوں میں پھیل جائے گی اور زمین کے انتہائی سروں تک پہنچے گی۔ یہ اشارہ ہے عموم دعوت اسلام کی طرف۔

۳۔ قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں گے۔ یہ صریح اشارہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، کیونکہ آپ آل قیدار میں سے ہیں۔ قیدار کی نسل سے آپ کے سوا کوئی نبی نہیں اٹھا، اور آپ ہی کے ذریعہ سے قیدار کی بستیوں کا آوازہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا۔

---

[*] اردو ترجمہ میں "ہانپونگا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس بھی لونگا" لکھا ہے مگر عربی و انگریزی ترجمے اس کے خلاف ہیں عربی ترجمہ میں ابید دوابتلع معاً ہے اور انگریزی ترجمہ یہ ہے۔ I will destroy and devour at once

[†] اردو ترجمہ میں "وے پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیماں ہوں" لکھا ہے۔ مگر انگریزی ترجمہ یوں ہے:۔ They shall be turned back, they shall be greatly ashamed

۴۔ سلع کے بسنے والے گائیں گے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ یہ صاف نشان وہی ہے اس سرزمین کی جہاں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ بلند ہونے والا تھا۔ سلع مدینہ طیبہ کے قریب ایک مشہور پہاڑی ہے۔ اب تک اسی نام سے معروف ہے اور اس کے پاس غزوۂ خندق کے آثار اس وقت تک پائے جاتے ہیں۔

(۵) پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ یہ اشارہ ہے حج کی طرف جس میں ہزار در ہزار انسان لبیک کی آوازیں بلند کرتے ہیں۔

۶۔ "خداوند کا جلال ظاہر کریں گے" اور اس کے بعد جو کچھ ہے اس میں صاف اشارہ ہے کہ یہ لوگ جہاد کریں گے، اور یہ جہاد خدا کے لیے، خدا کی طرف سے اور خدا کی تائید کے ساتھ ہوگا۔

۷۔ "پھلوں گا اور یکایک نگل جاؤں گا" اور اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ اشارہ ہے اس انقلاب عظیم کی طرف جو ظہور دعوت اسلام کے بعد یکایک رونما ہوگا اور دیکھتے دیکھتے دنیا کا رنگ بدل دے گا۔

۸۔ اندھوں کو چلانے اور ان کے لیے تاریکی کو نور سے تبدیل کرنے کا مضمون بعینہٖ وہی ہے جو قرآن میں آیا ہے۔ ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ اور اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور۔ آل قیدار بالکل جاہل گمراہ اور راہ راست سے ناواقف تھے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ان اندھوں کو راستہ دکھایا اور ضلالت کی تاریکی کو ہدایت کے نور سے بدل دیا۔

۹۔ "میں ان سے یہ سلوک کروں گا اور انہیں ترک نہ کروں گا" یہ اشارہ ہے شریعت محمدی کے دوام اور اس کے عدم نسخ کی طرف۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

۱۰۔ آخری فقرہ میں بتایا گیا ہے کہ جب یہ دعوت ظاہر ہوگی تو بت پرستوں کا زور ٹوٹ

جائیگا اور وہ ذلیل وخوار ہوں گے یہ بھی مسلمانوں کے ذریعہ سے پورا ہوا۔ دنیا کے ایک بڑے حصہ میں قوبت پرستی کا نام ونشان ہی مٹ گیا۔ اور جہاں یہ چیز ابھی باقی ہے وہاں بھی دم توڑ رہی ہے۔ تمام دنیا کے افکار پر توحید کا عقیدہ اس طرح چھا گیا ہے کہ کوئی شخص جو علم وعقل سے تھوڑا سا بھی بہرہ رکھتا ہے، اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

نویں بشارت

یسعیاہ نبی کی کتاب کا باب ۵۴ پورا کا پورا ایک پیشینگوئی پر مشتمل ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اے بانجھ تو جو نہیں جنتی تھی خوشی سے للکار۔ تو جو حاملہ نہ ہوتی تھی وجد کر کے گا اور خوشی سے چلا کیونکہ خداوند فرماتا ہے کہ بے کس چھوڑی ہوی کی اولاد شوہر والی کی اولاد سے بھی زیادہ ہے۔ اپنی خیمہ گاہ کو بڑھا دے اں اپنے مسکنوں کے پردے پھیلا دریغ مت کر اپنی ڈوریاں لمبی اور اپنی میخیں مضبوط کر۔ اس لئے کہ تو دہنے اور بائیں طرف بڑھیگی اور تیری نسل قوموں کی وارث ہوگی اور اجاڑ شہروں کو بساوے گی۔ مت ڈر کہ تو پھر پشیمان نہ ہوگی تومت گھبرا کہ تو پھر رسوا نہ ہوگی تو اپنی جوانی کا ننگ بھول جائیگی اور اپنی بیوگی کا عار پھر یاد نہ کرے گی۔ کیونکہ تیرا خالق تیرا شوہر ہے اس کا نام رب الافواج ہے۔ اور تیرا نجات دینے والا اسرائیل کا قدوس ہے۔ وہ ساری زمین کا خدا کہلائیگا کیونکہ تیرا خدا کہتا ہے کہ خداوند نے تجھے جو مطلقہ اور دل آزردہ عورت کی طرح ہے اور جوانی کی منکوحہ کے مانند ہے جسے چھوڑ دیا گیا ہو پھر بلایا ہے۔ میں نے ایک دم کے لیے تجھے چھوڑ دیا لیکن اب میں بہت سی مہربانیوں کے ساتھ تجھے سمیٹ لوں گا۔ قہر کی شدت کے حال میں میں نے اپنا منہ تجھ سے ایک لحظہ چھپایا پر اب میں ابدی عنایت سے تجھ پر رحم کرونگا۔

خداوند تیرا بچانے والا یوں فرماتا ہے۔ میرے آگے یہ نوح کے پانی کا سا معاملہ ہے کہ جس طرح میں نے قسم کھائی تھی کہ پھر زمین پر نوح کا سا طوفان کبھی نہ آئے گا اسی طرح اب میں نے قسم کھائی ہے کہ میں تجھ سے پھر کبھی آزردہ نہ ہوں گا اور تجھ کو نہ جھڑکوں گا پہاڑ ٹل جائیں اور ٹیلے ہل جائیں پر میری رحمت تجھ سے کبھی زائل نہ ہوگی اور میری سلامتی کا عہد جنبش نہ کرے گا۔ خداوند جو تیرا رحم کرنے والا ہے یوں فرماتا ہے۔

" اے تو جو آزردہ خاطر ہے اور آندھی کی اچھالی ہوئی ہے اور تسلی سے محروم ہے دیکھ کہ میں تیرے پتھروں کو اچھے رنگ سے جاؤں گا[1] اور تیری بنیاد نیلموں سے ڈالوں گا۔ میں تیری فصیلوں کو لعلوں سے اور تیرے پھاٹکوں کو چمکتے ہوئے جواہر سے اور تیرا سارا احاطہ بیش قیمت پتھروں سے بناؤں گا۔ اور تیرے سب فرزند بھی خداوند سے تعلیم پائیں گے اور تیرے فرزندوں کی سلامتی کامل ہوگی۔ تو راستبازی سے پائیدار ہو جاوے گی تو ظلم سے دور رہے گی کیونکہ تو نہ ڈرے گی اور گھبراہٹ سے کہ وہ تیرے قریب نہ آئے گی۔ خبردار وہ اکٹھے ضرور آئیں گے پر میرے حکم سے نہیں! جو کوئی تیرے برخلاف جمع ہوں گے وہ اپنوں کو چھوڑ کر تیرے ہو جائیں گے۔ دیکھ میں نے لوہار کو پیدا کیا جو کوئلے آگ میں ڈال کر پھونکتا اور اپنے کام کے لیے اوزار نکالتا ہے اور میں نے ہی غارت گر کو پیدا کیا ہے کہ ہلاک کرے۔

" کوئی ہتھیار جو تیرے خلاف بنایا گیا کام نہ آوے گا۔ اور جو زبان عدالت میں تجھ پر چلے گی تو اسے مجرم کرے گی یہ خداوند کے بندوں کی میراث ہے اور ان کی راستبازی مجھ سے ہے خداوند فرماتا ہے۔"

[1] اردو ترجمہ میں لکھا ہے " تیرے پتھروں کو سرمہ میں لگاؤں گا"۔ انگریزی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں
I will lay thy stones with fair colours:-

اس پیشنگوئی میں بانجھ عورت سے مراد سرزمین عرب ہے جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی کتاب نازل نہ ہوئی تھی اور اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہ آیا تھا۔ وَمَآ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ کُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَھَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْھِمْ قَبْلَکَ مِنْ نَّذِیْرٍ۔ "بے کس چھوڑی ہوئی کی اولاد" سے مراد اہل عرب ہیں جن سے بظاہر صدہا سال تک اللہ تعالیٰ نے منہ موڑ رکھا تھا، اور شوہر والی کی اولاد سے بنی اسرائیل مقصود ہیں، جن کے ہاں بکثرت انبیاء مبعوث ہوئے اور پیہم وحی کا نزول ہوتا رہا۔ اس تشریح کے بعد پوری پیشنگوئی کو پڑھیے اور دیکھیے کہ کس طرح وہ حرف بحرف ارض عرب اور اہل عرب کے حق میں پوری ہوئی۔

اس پیشنگوئی کو اس کے اصل مقصود سے پھیرنے والا صرف ایک فقرہ ہے اور وہ "اسرائیل کا قدوس" ہے۔ مگر اہل کتاب جس طرح اپنی کتابوں میں تحریف کرتے رہے ہیں اس کی نہایت بین مثالیں اس مضمون کی ابتدا ہی میں پیش کی جا چکی ہیں۔ لہٰذا کچھ عجب نہیں کہ بعد میں یہ فقرہ قصداً بڑھایا گیا ہو۔ (باقی)

قرآنی نظریہ سلطنت

اُس کے مقدمات اور اسکی روح

(۲)

از پروفیسر ہارون خان شروانی ایم اے (آکسن) بار ایٹ لا استاذ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

ترجمہ جناب مولوی سید الحق صاحب عمادی بی اے بی ٹی (علیگ)

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں قرآنی نظم سلطنت (Polity) کی روح سے بحث کی جاسکتی ہے، اور جہاں بالفعل تقابل اور موازنہ کئے بغیر ہم سیاسیات عالم کے ارتقاء کو ٹھیک سمجھ سکتے ہیں جس کا ظہور قرآن مجید میں ہوا ہے۔ ابتدا میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اس محدود بحث میں ہم حدیث کے اس وسیع ذخیرہ سے استفادہ نہ کرسکیں گے جو ہمارے پاس پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے متعلق معلومات کا ایک اہم ماخذ ہے، اگرچہ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ آج تک کسی انسان کی زندگی کو اس کے ہمعصروں اور اس کے اخلاف نے اس قدر تفصیل اور ایسی صحت کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا ہے جس کے ساتھ اس ہستی کی زندگی محفوظ رکھی گئی ہے جس نے دنیا کے سامنے قرآن کو پیش کیا۔ قرآن مجید ہدایات اور احکام پر مشتمل ہے جو بعض مقامات پر نہایت مفصل اور بعض مواقع پر بہت مجمل ہیں؛ اور جگہ جگہ ان میں تاریخی واقعات کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم زیادہ تر اس کتاب کے سیاسی پہلو سے بحث کریں گے اور اس کے ساتھ جہاں کہیں کوئی تاریخی

اشارہ ہوگا وہاں دوسرے مشہور و مستند مآخذ سے اصل عبارت کی تشریح کر دیں گے۔

رسول اللہ کے سیاسی کارنامے اس کام کے آغاز سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی کا ایک نہایت مختصر خاکہ ابتدائے نزول وحی سے لے کر آپ کے وصال تک بیان کر دیا جائے جو ۲۳ قمری سنین پر مشتمل ہے۔ آپ کی عمر چالیس سال کی تھی جب آپ پر مکہ سے دو میل دور ایک سنسان غار میں وہ قابل غور آیت نازل ہوئی جس میں ایک امی محض انسان سے کہا گیا تھا کہ تو "پڑھ" اور جس میں ایک طرف انسان کی حقیر اصل اور دوسری طرف انسانی بزرگی و برتری کے سرچشمے یعنی علم کی اہمیت بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کی گئی تھی[1]۔ قرآن کا اصل مقصد یہی تھا کہ اصول فطرت کی تبیین کے ساتھ حقائق کا علم بخشے۔ اس کی تمام ہدایات کا مبنیٰ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے انسان پر کائنات کے ابدی قانون کے اسرار منکشف ہوں، اور غالباً اسی مطمح نظر کے لحاظ سے اس طریق زندگی کو جس کی طرف قرآن نے رہنمائی کی ہے، "قدیم" بھی کہا گیا ہے اور "غیر متبدل" بھی[2]

اسلامی سلطنت کے اساسی اصول بیعت عقبۂ اولیٰ و ثانیہ کے ان میثاقوں میں امتیازی نشانات کے ساتھ نظر آتے ہیں جو ۶۲۰ء اور ۶۲۲ء میں لیے گئے تھے۔ انسان یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ ان نہایت اہم بیعتوں میں سے پہلی بیعت چند مٹھی بھر اشخاص (صرف ۱۲ آدمیوں) سے لی گئی تھی جو مکہ کے باہر پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی خدمت

[1] اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (قرآن سورۂ علق)۔

[2] فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۔ (الروم : رکوع ۴)۔

میں حاضر ہوئے تھے ایک بے یار و مددگار انسان ایک خار دار درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ان چند آدمیوں سے اس امر پر بیعت لے رہا تھا کہ وہ کائنات کے غیر متبدل قانون کی پیروی کریں گے، خدا کے سوا کسی کی پیروی نہ کریں گے، چوری اور زنا اور قتل اولاد اور افتراء سے مجتنب رہیں گے اور ہر حال میں وفاداری پر قائم رہیں گے، خواہ خوشحالی ہو یا تنگ حالی[1]

اس میثاق میں اس تزکیۂ نفس، اصلاح تمدن اور محکم قانونی تدبیر کے ابتدائی جراثیم چھپے ہوئے ہیں، جو بعد میں پوری قوت کے ساتھ روبعمل آنے والی تھی۔ اس کے دو سال بعد دوسری بیعت کے موقع پر اس امر کا قطعی عہد لیا گیا کہ وہ ہر چیز میں رسول خدا کی اطاعت کریں گے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی جانب سے اس امر کی تصریح فرمائی کہ آپ کا مفاد اور ان کا مفاد ایک ہے[2] اسی سال اہل مکہ کی ایذا رسانی اور ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمانوں کی مختصر سی جماعت اپنے ہادی و پیشوا کی معیت میں امن و سلامتی کی اس جنت کی طرف ہجرت کر گئی جس کا نام یثرب تھا اور بعد میں مدینۃ النبی یا اختصار کے ساتھ صرف مدینہ کے نام سے موسوم ہوا۔ وہاں مواخاۃ کے انتہائی حکیمانہ طریقہ کو اختیار کر کے اس جلیل القدر اسلامی برادری کی بنیاد رکھی گئی جو نسلی، لسانی اور جغرافی امتیازات سے قطعاً بیگانہ تھی۔ اس میں مکہ سے آئے ہوئے مہاجر اور ان کے مدنی مددگار (انصار) بالکل ایک دوسرے کے بھائی بھائی بنا دیے گئے[3]

---

[1] ابن ہشام جلد اول حصہ اول۔ (تہذیب و تحشیۂ وستنفیلڈ) ص ۲۸۸۔

[2] " " " " " ص ۲۹۲۔

[3] " " " " ص ۳۴۴۔

مدینہ میں مسلمانوں کو مقامی یہودیوں سے معاملہ کرنا تھا۔ اس نوزائیدہ ریاست کو نہ صرف ان کا لحاظ کرنا پڑا بلکہ مدینہ کے مسلم باشندوں کو بھی اپنی حفاظت وحمایت میں لینا پڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست پیش بینی اور سیاسی تدبیر اس عہدنامہ میں نظر آتی ہے جو آپ نے یہودیوں کو عطا کیا۔ اس میں منجملہ دوسرے امور کے یہ تصریح کی گئی تھی کہ یہودی بھی اس نئی ریاست کے ویسے ہی "وطنی" (Citizen) ہوں گے جیسے مسلمان ہیں، اہل یثرب کی یہ دونوں شاخیں مل کر ایک مرکب قوم بنائیں گی۔ مجرم کو سزا دی جائے گی خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، ضرورت کے وقت دونوں پر ریاست کی مدافعت کا فرض عائد ہوگا، اور آئندہ جو نزاعات پیش آئیں گی ان کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے[1]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر وہ لوگ جن کو نبی صلعم نے اس طرح اپنی حمایت میں لیا تھا، اپنے قول پر قائم رہتے تو آزادی ضمیر اور مشترک وطنیت کا یہ پروانہ اپنی جگہ بدستور قائم رہتا۔ مگر زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ یہودیوں نے گردن کشی شروع کر دی اور نوخیز ریاست کے مقابلہ میں عین اس وقت اٹھ کھڑے ہوئے جب کہ اس کا وجود مکی غارت گروں کے حملے سے خطرے میں مبتلا تھا۔

پیغمبر اسلام (علیہ السلام) نے بے خوف و خطر ایک دوسرا پروانہ آزادی نجران کے عیسائیوں کو عطا کیا جس میں ان کو جان و مال اور دین کی امان دی گئی تھی اور ان کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ انھیں اپنے مذہبی اعمال میں پوری آزادی حاصل ہوگی، کوئی قسیس، راہب اور پادری اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا، کوئی تمثال یا صلیب نہ توڑی جائیگی

---

[1] ابن ہشام جلد اول صلاکہ ۳۔

کوئی عُشر اُن پر عائد نہ کیا جائے گا۔ اور نہ کبھی ان سے فوج طلب کی جائے گی۔[1]

تاریخ گواہ ہے کہ یہ عہدنامے محض اس وجہ سے باطل ہوئے کہ یہودیوں نے اوّلاً اُن کی پیروی میں عیسائیوں نے خود ان کی خلاف ورزی کی۔ اسی طرح نبی صلعم کو غسان کے عیسائیوں کے خلاف ایک فوج صرف اس وجہ سے بھیجنی پڑی کہ انہوں نے ایک سفیر کو جو مدینہ سے بھیجا گیا تھا، بے گناہ قتل کر دیا۔ بہرحال اس معلّم حکمت وسیاست نے اپنی وفات سے پہلے تمام مخالف طاقتوں کو مغلوب کر لیا اور تمام عرب کو ایک حکومت اور ایک قانون کے تحت جمع کر دیا۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس سے اس ملک کی تاریخ کبھی آشنا نہ ہوئی تھی۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ ان ہزارہا بندگانِ خدا کے افکار و اعمال کی کامل وحدت میں نمودار ہوا جو حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ کو سننے کیلئے جمع ہوئے تھے۔ یہ خطبہ جو ۱۰ مارچ ۶۳۲ء کو عرفات کے میدان میں دیا گیا تھا،[2] انسانی تاریخ کے اہم ترین اعلانات میں سے ایک ہے اور درحقیقت وہ نہایت فخر کا موقع تھا جب خدا کے رسول نے اعلان کیا کہ جو کام صرف ۲۰ سال پہلے شروع کیا گیا تھا وہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے ٹھیک دو مہینے بعد اس مبلّغ اعظم نے ۸ جون ۶۳۲ء کو انتقال فرمایا۔

قرآن میں سیاسی استدلال کا طریقہ | جس شخص نے عملاً پوری نوعِ بشری کے طرزِ زندگی کو بدل دیا، اس کے چند اہم ترین سیاسی کارناموں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اب ہم آسانی کے ساتھ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر بحث کر سکتے ہیں۔

---

[1] واقدی بحوالہ میور: "لائف آف محمد" ج ۲ ص ۲۹۹، نیز فتوح البلدان للبلاذری۔ ذکر صلح نجران۔ مجھے طبقات ابن سعد میں اس صلح کا حال نہیں ملا۔

[2] ابن ہشام جلد اول۔ حصہ چہارم۔ ص ۹۶۸۔

ابتدا ہی میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں سیاسی استدلال کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ تاریخی طریقہ ہے۔ نہ صرف عام ہدایات و احکام کی توضیح کے لیے عرب اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی تاریخ سے نظائر پیش کیے گئے ہیں، بلکہ جہاں اس کتاب میں کوئی مجرد خیال (Abstract notion) پیش کیا گیا ہے وہاں بھی قریب قریب ہر موقع پر توضیح و تشریح کے لیے ان اقوام کی تاریخ کے نتائج سے استشہاد کیا گیا ہے جن سے اہل عرب واقف تھے، مثلاً عاد و ثمود اور اہل مصر و فلسطین اور روم، عراق و فارس۔ قرآن واضح طور پر قدیم پادشاہیوں اور دوسری قوموں کے حالات میں امتیاز کرتا ہے، اور ہر ایک کے مخصوص اسباب زوال سے بحث کرتا ہے تاکہ وہ بعد والوں کے لیے سبق ہوں۔ مثال کے طور پر قدیم بادشاہیوں میں سے مصر کو بجا طور پر پیش کیا گیا ہے، کیونکہ وہ ایک نہایت قدیم اور نہایت طاقتور سلطنت ہونے کے ساتھ ایک ایسی سلطنت ہے جو اس وجہ سے پارہ پارہ ہو گئی کہ اس نے انسان کی بے حقیقتی اور قانون خداوندی کی قدرت کاملہ سے، جس کا انکشاف چند برگزیدہ ہستیوں پر ہوا تھا، سخت تغافل برتا۔ موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) کو فرعون مصر کے پاس اس لیے بھیجا گیا کہ اس نے قانون الٰہی کے خلاف سرکشی اختیار کی تھی (اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ طٰہٰ: رکوع ۱) اور اس قانون سے بے پروا ہو کر زمین میں ظلم و استبداد شروع کر دیا تھا۔ (وان فرعون لعال فی الارض۔ یونس، رکوع ۹)۔ اس کے جرائم میں سے ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ پوری قوم کا نمائندہ بننے کے بجائے اس نے قوم کو بہت سے فرقوں میں تقسیم کر کے ایک فرقہ کو برگزیدہ اور دوسرے فرقہ کو ظلم و ستم سے پامال کیا۔ (اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ

القصص ۲۰ رکوع (۱) اس طرح اس نے خدا کی مخلوق کو تفریق واستبداد (Divide and rule) کے اس غیر فطری اور غیر انسانی طریقہ سے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنایا جو عارضی طور پر کچھ مدت کے لیے تو کارآمد ہو سکتا ہے۔ مگر ٹھیک اسی آن ناکام ہو جاتا ہے جس آن لوگوں میں بشری وحدت کا احساس، اور اس تقسیم و تفریق کے نقصان کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ سے نظائر پیش کرتے ہوئے قرآن بتاتا ہے کہ خدا نے ان پر اپنے انعامات کی بارش کی، ان کے لیے خود انہی میں سے نہ صرف انبیاء پیدا کیے بلکہ ان کو بادشاہ بھی بنایا[1]، اور جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات کے بعد وہ اپنے وطن سے نکالے گئے اور ان پر ظلم کیا جانے لگا تو ان کو طالوت کی ذات میں ایک بادشاہ عطا کیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے ضمناً ایک اعلیٰ درجہ کے امیر (ڈکٹیٹر) کی خصوصیات کس خوبی کے ساتھ بیان کی ہیں یعنی علم اور طاقت[2]۔ یہ قاعدہ آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا ہزارہا برس پہلے تھا۔

قومی زوال کے اسباب | قرآن مختلف قوموں کے واقعی طرز حکومت سے بحث کیے بغیر عمومی طور پر

---

[1] وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (المائدہ: رکوع ۴)۔

[2] أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ..... إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ..... إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (بقرہ: ۳۲)۔

قوموں کے اسباب زوال بیان کرتا ہے اور یہ عظیم الشان قاعدۂ کلیہ پیش کرتا ہے کہ:-

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الرعد : ۲) خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے نفس کی کیفیت کو نہیں بدلتی۔

کائنات کے قوانین بجائے خود ظالمانہ نہیں ہیں۔ ہر قوم کو ابتدا میں کرۂ ارض کے حدود بتا دیے گئے ہیں اور ان حدود سے تجاوز ہی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس قوم کو گرا کر ایک دوسری قوم اٹھائی جاتی ہے[۱] اور یہ قانون فطرت ہے کہ انسانی افراد کی طرح انسانی جماعات کی بھی زندگی و موت ہوا کرتی ہے۔ جب کسی قوم کی بیماریاں علاج کی حد سے گذر جاتی ہیں، تو افراد انسانی کی طرح وہ بھی ایک بندھے ہوئے قانون کے تحت مر جاتی ہے اور ایک نئی اور زیادہ طاقتور قوم کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے[۲]۔

حکومت الٰہی اور اس کے نتائج۔ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ قرآن توحید خداوندی کی تعلیم اور نیز خدا کی بادشاہی کے ذکر سے لبریز ہے[۳]۔ اس اصل الاصول میں تین متمیز تصورات شامل

---

[۱] وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (یونس : ۲)۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ۔ (انبیاء : ۲)۔

[۲] لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (یونس : ۵)۔

[۳] مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ (آل عمران : ۳) وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (آل عمران : ۱۹) قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ۔ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (المؤمنون : ۵) أَلَا إِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (النور : ۹) وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الحدید : ۱) يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (الطلاق : ۲) تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ (الملک : ۱) أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ (والتین)۔

ہیں جو اس کتاب کے سیاسی پہلو سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ توحید خداوندی اپنی عین فطرت کے لحاظ سے وحدتِ قانونی کو متضمن ہے، اور جیسا کہ قرآن واضح طور پر بتاتا ہے، اس کے قانونی تصورات، کائنات کے اٹل قوانین کلیہ پر مبنی بلکہ ان کے تابع محض الاصل ہیں[1] اس لیے یہ قانونی وحدت انہی تصورات پر مبنی ہونی چاہیے۔

۲۔ دوسری چیز جس کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ جس طرح ایک بادشاہ کی رعایا کے تمام افراد اس کے ساتھ تعلق رکھنے میں یکساں ہیں اسی طرح خدا کی بادشاہت بھی یعنی یکتی ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد اس کی نسبت سے لازماً ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ انسان قانونِ کلی (Universal Law) کے مقابلہ میں قطعاً بے بس ہے، اور جس چیز کو قانون سازی کہا جاتا ہے اس کے دائرہ میں انسان کا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس قانونِ کلی کے رموز و اسرار کو سمجھنے اور دریافت کرنے کی کوشش کرے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک سائنس داں قوائے طبیعی کا اکتشاف کرنے اور ایک ماہر معاشیات انسان اور معاشی ثروت کے درمیان فطری تعلق دریافت کی کوشش کرتا ہے۔

قانونِ کلی کی حکومت میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ جو لوگ اس کو تسلیم کریں، یا کم از کم اس کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہو جائیں، وہ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ ہوں، اگرچہ اس کی حدود سے تجاوز کریں وہ اسی طرح سلطنت کی حمایت سے محروم ہو جائیں جس طرح آج کل قانون کی

---

[1] فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔ (الروم: ۳۰)۔

حد سے تجاوز کرنے والے سزا، قید، جرمانہ، حتّٰی کہ قتل تک کے متوجب ہو جاتے ہیں۔ خدا پورے جہان کا حقیقی فرمانروا ہے۔ اس کا قانون سب سے برتر اور سب پر محیط ہے۔ انسان اس کا خلیفہ (Vicegerent) ہے[1] اور وہ انسانی افراد میں سے بادشاہ اور حکام مقرر کرتا ہے، جن کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ قانون کے مطابق عدل کریں اور کبھی اپنے نفس کے اتباع میں راہ راست سے نہ ہٹیں[2]۔ یہ تعلیم ہے قرآن کی، یہ بے غرض، بے لاگ، بے نفسانہ انصاف کا انتہائی نصب العین ہے، جس نے زمانہ گذشتہ کے طریق عدالت و حکمرانی کو قطعی طور پر رد کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا، ایسے دور کا جس میں اس قسم کے عدل کو رعیت کا سب سے زیادہ مقدس حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

بدنظمی سے نفرت | بہت کم ایسی چیزیں ہیں جن کو قرآن فتنہ و فساد اور بدنظمی سے بڑھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ یہ چیز جو انسانی جماعت کے سیاسی وجود کے لیے گھن کا حکم رکھتی ہے، اس کی برائی کا ذکر اور اس کے استیصال کا حکم قرآن میں جگہ جگہ نہایت کثرت سے آیا ہے۔ ابتدا ہی میں جب خدا اپنے خلیفہ کی حیثیت سے انسان کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بڑا شبہ جو ملائکہ کے نفوس میں خلش پیدا کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا[3]۔ پھر دیکھیے۔ خدا بنی اسرائیل سے میثاق لیتا ہے کہ وہ خونریزی نہ کریں گے اور نہ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالیں گے[4]۔ یہ فہمائش متعدد مقامات پر دہرائی گئی ہے[5]۔ غالباً اس لیے کہ انسان

---

[1] وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ۔ (النمل ۵)۔ [2] يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (ص : ۲)۔

[3] وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (بقرہ : ۲)

[4] وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ (بقرہ : ۱۰)۔

[5] مثلاً سورۂ عنکبوت میں ہے وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (رکوع ۲)

اور انسان کے درمیان جو فطری عداوت ہے اُس کو دفع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے[1]۔ فتنہ و فساد کو قتل سے زیادہ بڑا کہا گیا ہے[2] اور جو لوگ اس کے محرک ہوں وہ خدا کی لعنت کے مستحق ٹھیرائے گئے ہیں[3] اور سلطنت کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر ممکن ہو تو ان کا زور توڑنے کے لیے پُرامن طریقے سے کوشش کرے اور ضروری ہو جائے تو بزورِ شمشیر ان کی جڑ کاٹ پھینکے[4]۔ جو لوگ سیاسی ضعف برپا کرتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرنی چاہیے[5] بلکہ ان کو یا تو قتل کر دینا چاہیے یا سلطنت کے حدود سے خارج کرنا چاہیے[6]۔ کیونکہ ان کا فعل دراصل خدا اور رسول کے خلاف جنگ کے مترادف ہے۔

ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو اپنا اور اپنی نسل کا وطن بنایا تو پہلی دعا جو انہوں نے اپنے خدا سے مانگی، یہ تھی کہ اس کو امن اور خوشحالی کا گھر بنا دے[7]۔ اسلامی نظم اجتماعی کی کامیابی کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر بھی یہی بتایا گیا ہے کہ اس نے ان لوگوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے[8]۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ بالکل متحد ہو

---

[1] قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (طٰہٰ: ۷)۔ [2] وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (بقرہ: ۲۷)

[3] فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ (محمد: ۳)۔ [4] وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (الانفال)

[5] وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء)

[6] إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (المائدہ)

[7] وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا۔ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ (ابراہیم)

[8] وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران)

(وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا) ایک دوسرے پر مہربان (رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ) اور ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن کر رہیں (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ) ورنہ ان کا انجام بھی انہی باغیوں کا سا ہوگا جو اپنے دعووں میں خواہ کتنے ہی صلح پسند اور امن جو ہوں، مگر در اصل ہر فتنے اور ہر فساد کی جڑ وہی ہیں۔

اسلام کے اصول جنگ، جن کی تشریح، منجملہ دوسرے مقامات کے، سورۂ بقرہ کی چند مسلسل آیات میں کی گئی ہے در اصل فتنہ و فساد کی اسی مخالفت پر مبنی ہیں۔ وہاں صاف طور پر یہ بتادیا گیا ہے کہ جنگ صرف ان کے خلاف کی جائے جو سلطنت کے خلاف جنگ کریں کیونکہ اندرونی فتنہ قتل سے زیادہ برا ہے، اور تلوار اسی وقت نیام میں کرلی جائے جس وقت مفسدین اپنی فتنہ پردازی سے باز آجائیں، اور خدائی قانون کی برتری از سرِنو قائم ہو جائے۔

امن اور اطاعت | اس قاعدہ کا اطلاق، قرآن مجید کی عین روح سے مطابقت رکھتا ہے جن بنیادی تعلیمات کو داعی اسلام نے پیش کیا ہے انھیں صرف دو اصطلاحوں کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے:- ایمان اور اسلام۔ ایک کے مفہوم میں "امن کی حکومت" آجاتی ہے، اور دوسرے کا عین مفہوم ہی "اطاعت" ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک اس تصور کے مطابق ہے جس کو فرمانروائی (Sovereignty) کا جدید تصور سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مرکزی اقتدار کی اطاعت کے بغیر کوئی سلطنت جو سلطنت کہلانے کی مستحق ہو وجود میں نہیں آسکتی۔ مزید برآں جبکہ خدا کے قانون کو محیط الکل اور بالاتر تسلیم کرلیا گیا، تو یہ بالکل ایک طبعی بات تھی کہ انسان کو اسی قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا حکم دیا گیا جو خدا کی طرف سے پیغمبرِ اسلام پر بذریعہ وحی

---

۱ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ (بقرہ: ۲)۔

۲ ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ رکوع ۲۴۔

منکشف ہوا تھا[1] منکرین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ نام نہاد قانون جو اُن کے آباء و اجداد سے ان کو ملا ہے[2] کوئی صحیح اور مناسب قانون نہیں ہے، کیونکہ اس کے بنانے والے کافی دانشمند نہ تھے اور قانون کلی کے متعلق ان کا علم اس قدر ناقص تھا کہ وہ راہ راست نہ پا سکتے تھے۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ اگر ان کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو ان کو اسی قانون کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس کی تشریح پیغمبر اسلام نے کی ہے، اس میں ہر وہ چیز ان کو مل جائیگی جس کی انھیں ضرورت ہے[3] اس قانون کے لیے محض ایک منفعلانہ اطاعت (Passive obedience) ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے متبعین پر یہ فرض بھی عائد کیا گیا ہے کہ خدا کی زمین پر اس کو پھیلانے کی کوشش کریں اور اس کام میں اگر ضرورت پڑے تو اپنا سب کچھ قربان کریں، مصیبتیں برداشت کریں، بھوک اور خوف اور تنگی و سختی کا مقابلہ کریں، اور صبر و ثبات کے ساتھ ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کریں[4]۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے

---

[1] وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ - (آل عمران، ۱۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ (الانفال، ۳) فَإِنْ تُطِيعُوا اللّٰهَ يُؤْتِكُمْ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (الفتح: ۲) مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: ۸)

[2] وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (بقرہ: ۲۱)۔

[3] فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء: ۸)

[4] وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (البقرہ: ۱۹) لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ (النساء، ۱۳)

کہ اس قاعدہ کی سب سے زیادہ پیروی خود اس کے معلم ہی نے کی۔ آپ کی مکی زندگی کے مصیبت بھرے ۱۳ سال، مخالفین کی ایذا رسانی، تنگ باری، ظلم و ستم اور سازشوں کے مقابلے میں بسر ہوئے، آخر کار آپ کو اپنے سچے دوستوں کے ساتھ جو آپ کی ذات میں نیکی و شرافت کا ظہور مجسم دیکھ رہے تھے، مکہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر ہمیشہ کے لیے ہجرت کرنی پڑی۔

فرد اور جماعت | قرآن انسانی ضروریات کا نہایت صحیح اندازہ کرتا ہے جب وہ منجملہ دوسری باتوں کے اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ قانون خداوندی کے اس قاعدہ کی پیروی میں یہ زبردست قربانیاں اگرچہ انفرادی حیثیت سے اشخاص کے لیے کتنی ہی ناگوار اور نامرغوب ہوں، لیکن اس کے باوجود ان کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ مآل کار میں ان کا نتیجہ جماعت کی بھلائی ہے[۱] یہ درحقیقت اشارہ ہے اس لازمی منافات کی طرف جو شخصی ضروریات اور اجتماعی ضروریات کے درمیان پائی جاتی ہے، اور جس کی بنا پر اجتماعی مفاد کے لیے اکثر اوقات یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اشخاص کی جان مال اور ہر وہ چیز جس کو ایک شخص دنیا میں عزیز رکھتا ہے قربان کر دی جائے۔ اسی اصول کو ایک دوسرے موقع پر قرآن اس طرح بیان کرتا ہے کہ قصاص میں ایک شخص کی موت درحقیقت پوری جماعت کی زندگی ہے[۲]۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس جماعت کے بغیر جان کے تحفظ کی کوئی سبیل نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی عام تشریع (Legislation) صرف ایسے جرائم تک محدود نہیں ہے جیسے قتل اور چوری[۳]، یا قصاص اور دیت کا وہ قانون جس نے انتقام کے خوگر عرب قبائل کو ایک قوم بنانے اور مختلف نسلوں اور قوموں کو خدائی قانون

[۱] كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (البقرہ ۲۱۶)

[۲] وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرہ: ۲۲)۔

[۳] السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا (المائدہ: ۶)

کے تحت ایک ملت اسلامی بنا دینے میں بہت مدد دی ہے، بلکہ وہ شہادت کے وسیع اصول اور قانونی انتقال املاک کے قاعدے بھی وضع کرتا ہے، جیسے وہ قاعدہ جس کے تحت یہ حکم دیا گیا ہے کہ قرض اور ایسے ہی دوسرے مالی معاملات کو تحریر میں لانا چاہیئے۔[1] نیز یہ ضروری نہیں کہ روزمرہ کے معاملات خرید و فروخت یا قول و اقرار کے لئے بھی تحریر ہو بلکہ دو گواہ اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایک معاملہ فی الواقع ہوا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نہ صرف ایسے قدیم زمانہ میں جیسا کہ ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے، حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور حیات ہی میں اصول قانون نے اس قدر زبردست ترقی کی، بلکہ جو ترقی یافتہ اصول اس وقت وضع کیے گئے تھے انہوں نے قانون کے اُن عمومی تصورات پر بھی ایک پائدار اثر ڈالا جو آج اس جدید زمانے میں رائج ہیں۔

عدل یہاں پہنچ کر ہماری توجہ خود بخود عدل و انصاف کے اس مسلک کی طرف منعطف ہو جاتی ہے جس کو قرآن کے تجویز کردہ نظام میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ رسالت کی عین بنیاد ہی قرآن کے بیان کے مطابق انسان اور انسان کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ قدیم زمانہ میں شرائع اور کتب آسمانی کے ساتھ انبیاء کی بعثت اسی لیے ہوئی تھی کہ لوگوں کے باہمی اختلافات کا صحیح فیصلہ کریں۔[2] پیغمبر اسلام اعلان کرتے ہیں کہ ان کو ٹھیک ٹھیک عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[3] حکام اور قضاۃ کو سختی کے ساتھ ہدایت کی گئی ہے کہ انصاف پر قائم

---

[1] یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِذَا تَدَایَنتُم بِدَیْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ۔ (البقرہ: ۳۹)

[2] فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِیِّینَ مُبَشِّرِینَ وَمُنذِرِینَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیمَا اخْتَلَفُوا فِیهِ (بقرہ: ۲۶)

[3] وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَیْنَكُمُ (الشوریٰ: ۲)۔

رہیں اور اپنے ذاتی رجحانات اور تعلقات اور اپنی محبت و نفرت کو انصاف میں دخل نہ دیں۔[۱]
گواہوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ پورا پورا حق ظاہر کریں اور اپنی شہادت میں کچھ نہ چھپائیں[۲]
اس کے ساتھ بقائے امن کے لیے یہ قاعدہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ جو شخص کسی پر جھوٹا الزام لگائے
اس کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے[۳]۔ یہ ایسے اصول ہیں جو ہر نظام عدل و قانون کے لیے
زینت بخش ہوں گے، خواہ وہ کسی بنیاد پر قائم ہو، اور جو کوئی تعصب سے خالی الذہن ہو کر ان
غور کرے گا وہ تسلیم کرے گا کہ یہ ایسے اصول کلیہ ہیں جن کا اطلاق تمام جہان کے معاملات پر
ہو سکتا ہے۔

اصلاح تمدن اور سیاسیات اس مضمون کے دائرہ میں ان تمام تمدنی اصلاحات کو بیان کرنا
مشکل ہے جو قرآن نے ایک ایسی سوسائٹی میں انجام دیں جو قبیلہ کی حدود سے باہر کسی حق اور
کسی فرض سے آشنا نہ تھی۔ جو چیز قطعی ناممکن معلوم ہوتی تھی اس کو قرآن نے اس طرح پورا کر دکھایا کہ
جو ایک دوسرے کے دشمن تھے ان کو بھائی بھائی بنا دیا، جن دلوں کو نفرت و عداوت نے
پھاڑ دیا تھا ان کو الفت و محبت سے جوڑ دیا، اور جو ہاتھ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔
ان کو برادرانہ تعاون کے رشتہ میں باندھ دیا[۴]۔ قرآن ان سب لوگوں کو جو خدائی قانون

---

[۱] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ۔ (المائدہ: ۲) إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء)

[۲] وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرہ: ۳۹)۔

[۳] الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا (النور)

[۴] وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔ (آل عمران: ۱۱)۔

کی اطاعت قبول کریں، سختی کے ساتھ ہدایت کرتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔[1] نیز وہ اُن کو تعلیم دیتا ہے کہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت کریں، اور بُرے کاموں میں نہ صرف معاونت سے انکار کردیں، بلکہ جو لوگ اس طرف مائل ہوں اُن کو بھی روکیں۔[2] مختصر یہ کہ مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ ہر اُس چیز کی تائید کریں جو نیک ہو اور ہر اُس چیز کو روکیں جو بری ہو۔[3] اصلاح تمدن و معاشرت میں قرآن کی ہدایات نہایت مفصل ہیں حتیٰ کہ وہ اتنی تفصیلات میں بھی جاتا ہے کہ جو شخص کسی کے مکان میں داخل ہونا چاہتا ہو اس کا فرض ہے کہ پہلے صاحب مکان سے اجازت لے[4] گھر کے لڑکے بھی خاص مواقع پر جبکہ تم کو تخلیہ کی ضرورت ہوتی ہے بلا اجازت تمہارے پاس نہ آئیں۔[5] تاجروں کو تاکید کی گئی ہے کہ ناپ تول میں سخت احتیاط برتیں اور اشیاء کو فروخت کرتے وقت معیاری اوزان اور پیمانے استعمال کریں۔[6] چوری، زنا، قتل اطفال، اور بہتان و افترا کے استیصال پر خاص توجہ کی گئی ہے۔[7] اور ایسی ہی سینکڑوں تمدنی اصلاحات

---

[1] وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران: ۱۱)۔ [2] تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ: ۱) [3] كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۲)۔ [4] لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلٰى أَهْلِهَا (النور: ۴) [5] وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ ..... وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۸)۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آج ان اصولوں کو خود غیر مسلم اہل مغرب نے اپنی تہذیب میں اختیار کرلیا ہے۔

[6] يٰقَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ (ھود: ۸)۔ [7] بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان چیزوں سے احتراز کا عہد لیا گیا تھا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ عورتوں سے بھی بیعت لیتے وقت ان چیزوں سے پرہیز کا اقرار کرائیں (الممتحنہ: ۲)

اس کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں، اور قابل لحاظ امر یہ ہے کہ ان کو محض تخیلات کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ اُن عربوں سے جو فخر و غرور کے نشہ میں سرشار تھے ان کے مطابق عمل کراکے چھوڑا گیا، اور اس طرح جو لوگ پہلے محض وحشی گلہ بان تھے ان کو تہذیب کے ایسے بلند مرتبہ پر پہنچا دیا گیا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے مدبر، سپہ سالار، حاکم، تاجر، اور عصائے سیاست کے مالک بن گئے، حتیٰ کہ ان قوموں سے بھی آگے نکل گئے جو ہزار ہا سال کی پرانی تہذیب کے مالک ہونے پر فخر کرتے تھے۔

شوریٰ | اگرچہ قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ وہ وحی خداوندی اور کشف اسرار وحقائق ہے، لیکن اس کے باوجود قرآنی سلطنت میں شوریٰ کے لیے ایک جگہ اور بہت ہی اہم جگہ ہے جہاں اچھے مسلمانوں کی خصوصیات چند نہایت عمدہ آیتوں میں بیان کی گئی ہیں، جہاں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہیں، جہاں فواحش اور کبائر سے اجتناب پر ان کی تعریف کی گئی ہے، جہاں ان کی بہادری و شجاعت اور اپنے حقوق کے دفاع میں ان کی شہامت کو سراہا گیا ہے وہیں ان کی یہ خصوصیت بھی مدح کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں باہم شورہ کرتے ہیں (وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ) یہی نہیں بلکہ جہاں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب وہ کسی امر کا عزم کرلیں تو خدا کے بھروسہ پر اس کو کر گذریں وہیں آپ کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ مسلمانوں حتیٰ کہ منافقوں تک سے مشورہ لیں۔ یہ وہ ٹھیک ٹھیک جمہوری اسپرٹ ہے جس میں صرف تعداد آراء کا ہی نہیں بلکہ رائے دینے والوں کی اہلیت کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، جس نے قرآن کے مذہب کو تمام دنیا پر چھا جانے کے قابل بنا دیا۔ اگر اسکے الفاظ اور اسکی اصطلاحات کثرت سے نہیں پھیلیں تو کیا ہوا۔

ؕ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (آل عمران: ۱۵۹)۔

اس کے پیش کردہ اصول تو دنیا بھر میں قبول کر لیے گئے۔ اسی اسپرٹ کا مزید اظہار ان اصول سے ہوتا ہے جو قرآنی محاصل (Taxation) کی بنیاد ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام نے خود جیسی سادہ زندگی بسر کی اس کے لحاظ سے قرآن کے تجویز کردہ نظم حکومت کو چلانے کے لیے بہت کم محاصل کی ضرورت تھی اور وہ ہر زمانے کے لیے ایک ایسی حکومت کا بہترین نمونہ تھا جو ایک طرف نہایت اعلیٰ درجہ کی کارپرداز (Efficient) ہو اور دوسری طرف کم سے کم مصارف پر چلائی جائے۔ قرآن میں جن محاصل کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

(۱) زکوٰۃ جو ہر صاحب نصاب مسلمان کی سالانہ بچت میں سے بحساب ۲½ فی صدی جاتی ہے

(۲) جزیہ، جو غیر مسلم رعایا پر فوجی خدمت سے استثناء کے معاوضہ میں عائد کیا جاتا ہے۔

(۳) خراج یعنی زمین کا لگان۔

ان کے علاوہ جنگ کے انفال اور غنائم ہیں جن کو مستقل ذرائع آمدنی میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ زکوٰۃ اور غنائم کے لیے قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ ان کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ مال ایک جگہ جمع نہ ہونے پائے بلکہ سوسائٹی کے مفلس طبقوں میں پھیل جائے ان میں سے صرف ایک حصہ حکومت کے نظم ونسق کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ باقی مصارف کے لیے حکومت کو دوسرے ذرائع آمدنی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

بین الاقوامی معاملات | قرآن کی جامعیت اور مسائل حیات پر اس کی احاطت کا صحیح اندازہ

۱؎ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ۔ (التوبہ: ۸)۔ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ (الانفال: ۵)۔

ہم کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم بین الاقوامی معاملات، قوانینِ جنگ، سفارتی تعلقات اور معاہدات کے متعلق اس کے قوانین پر نظر کرتے ہیں۔ یہاں اُس مبتذل الزام کی تردید میں کچھ کہنا بے محل ہوگا جو اسلام پر لگایا جاتا ہے کہ اس کی اشاعت تلوار سے ہوئی ہے، کیونکہ ایسے امور پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم اپنی گفتگو کو صرف اُن ہدایات تک محدود رکھیں گے جو قرآن نے عام بین الاقوامی تعلقات کے باب میں دی ہیں۔ پہلا قاعدہ جو پیغمبرِ اسلام پر وحی کیا گیا، یہ تھا کہ جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی کہ مسلمانوں پر ان کے مخالفین نے زیادتی کی ہے[1]۔ اور جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کی جائے جنہوں نے ظلم کیا ہے[2]، اور اس وقت تک کی جائے کہ فتنہ باقی نہ رہے[3]۔ اور اگر دشمن صلح کی درخواست کرے تو اس کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا جائے[4]۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ مسلمان کسی حال میں قانونِ کلی کے دشمنوں سے موالات کریں۔ جب ان سے جنگ کا اعلان ہو جائے تو انہیں کوئی پناہ نہ دی جائے تاوقتیکہ ان کا زور ٹوٹ نہ جائے[5]۔ مجاہدین جو ہر اس چیز کی مدافعت پر مامور ہیں جسے وہ مقدس اور عزیز سمجھتے ہیں، بہترین اجر کے امیدوار بنائے گئے ہیں[6]۔

---

[1] اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: ۶)۔ [2] لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ (الممتحنہ)۔ [3] وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرہ: ۲۴)۔ [4] وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال: ۸)۔ [5] يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً۔ (التوبہ: ۱۶)۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۔ (محمد: ۱)۔ [6] فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (النساء: ۱۰)

اس موقع پر یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وحی کی ہدایت سے غیر مسلموں کی دو جماعتوں میں فرق کیا گیا ہے۔ ایک جماعت وہ ہے جو مسلمین اسلام سے کوئی معاہدہ کرے اور اس پر قائم رہے اس کے ساتھ عہد پورا کرنے کا حکم ہے۔ اور مسلمانوں کو سخت تاکید کی گئی ہے کہ کسی حال میں عہد شکنی کا ارتکاب نہ کریں۔ دوسری جماعت وہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ عہد کر کے اسے توڑ دے اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس سے آخر وقت تک لڑنے کا حکم ہے۔[1]

جب ہم اُن فیاضانہ مراعات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو قرآن نے اسیران جنگ کے ساتھ برتنے کی ہدایت کی ہے تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب نے انسانی سوسائٹی کی سیرت کو بلند کرنے میں کس قدر نمایاں کام کیا ہے۔ جنگ بدر پہلی جنگ ہے جس سے اس تعلق کی ابتدا ہوئی کہ اسیران جنگ کو نہ صرف زندہ اور بآرام رکھا جائے بلکہ ان کو ایک قلیل معاوضہ پر چھوڑ بھی دیا جائے، خواہ وہ زر فدیہ ہو یا کوئی ایسی مفید خدمت جیسے بچوں کو پڑھنے لکھنے کی تعلیم دینا۔ وہی عرب جن کے مرد تو مرد، عورتیں تک زخمیوں اور مقتول لاشوں پر بھی رحم نہ کھاتی تھیں، چند سال کے اندر اس قدر مہذب اور شریف طینت بنا دیے گئے کہ جب پیغمبر اللہ

---

[1] بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ..... وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ..... اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ..... وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ..... فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ..... كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ..... وَاِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (التوبہ: ۱-۱۲)

اپنے دس ہزار جان نثاروں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید احکام کی اطاعت میں انہوں نے ان ظالموں میں سے کسی کو ہاتھ تک نہ لگایا جنہوں نے آٹھ سال پہلے انہیں اسی شہر سے سخت ظلم وستم کے ساتھ نکالا تھا۔[1]

رواداری اب ہم رواداری کے اس عظیم قاعدے کی طرف آتے ہیں جس کی نہایت بلند مرتبہ تعلیم قرآن نے دی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی یہ ساتویں صدی عیسوی کا ہی زمانہ تھا، اور دنیا اس زمانہ میں مذہبی اعتقادات میں رواداری کے اصول سے قطعی ناآشنا تھی جیسا کہ ہم اس مقالہ کے ابتدائی حصہ میں بتا چکے ہیں اسی زمانہ میں بازنطیم اور ایران کی عظیم الشان سلطنتیں اپنی رعایا کو جبراً اپنے مذہب کا پیرو بنانے کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھیں جوان کے امکان میں تھا۔ بلکہ ابھی اس کے کئی صدی بعد بھی دنیا کو حروب صلیبیہ، اور جرمنی اور دوسرے ممالک کی مذہبی لڑائیوں اور اسپین کی مذہبی عدالتوں (Inquisition) اور پیکسنی اور دوسرے ممالک فرنگ کے جبری تبدیل مذہب اور انگلستان میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی خون آشامیوں کے دور سے گذرنا تھا۔ پس درحقیقت اصول سیاست کی تاریخ میں یہ ایک نرالی اور حیرت انگیز چیز تھی کہ قرآن نے انسان کے مذہبی معتقدات میں اختلاف اور گوناگونی کو بطور ایک ناقابل تبدیل حالت کے تسلیم کر لیا" اور اس مسئلہ کی بنیاد پر ہر زمانہ کے لیے یہ عظیم الشان قاعدہ کلیہ مقرر کر دیا کہ مذہب کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ۔[5] قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ (الانفال ۸: ۷۰) [6] ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے جنگ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کا کلیجہ نکال کر چبا ڈالا۔ دیکھو ابن ہشام جلد ۲۔ صفحہ ۵۵۵)

حاشیہ صفحہ ہذا۔ [1] فتح مکہ کے حالات میں ملاحظہ ہو ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۸۰۷)۔

معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہ ہونا چاہیئے[1] جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ فرعون کے سامنے نرمی کے ساتھ تلقین تبلیغ کریں[2]۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص ان کا ہم مذہب نہ ہو اس کے سامنے تبلیغ دین میں نہایت شائستہ اور نرم طرز کلام اختیار کریں[3]۔ یہ خیال رہے کہ اس اصول کی تعلیم اس شخص کی زبان سے دی گئی ہے جو خود مذہب ہی کی وجہ سے ہر قسم کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنایا جا رہا تھا! اس نے کہا کہ اگر آبادی کا صرف ایک حصہ اس دین کو قبول کرے جو مجھے اور میرے متبعین کو سب سے بڑھ کر عزیز ہے تو دوسرے حصہ کی روش کے متعلق میں نہایت صبر کے ساتھ خدا کے فیصلے کا انتظار کروں گا[4]۔ اگرچہ مسلمانوں کو ایسے لوگوں کی دوستی سے منع کیا گیا ہے جو مخالف کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں یا اپنی روش میں منافق ہیں[5] لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن ان میں اور ایسے لوگوں میں فرق کرتا ہے جو غیر مذہب کے تبع ہونے کے باوجود اپنے پیشواؤں کی تعلیم کے مطابق منکسر اور حلیم الطبع ہوں جیسے کہ اس زمانہ کے بعض عیسائی تھے[6] کفار مکہ سے ایک

---

[1] لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ: ۳۴) وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ (قٓ: ۳)۔

[2] فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ۔ (طٰہٰ: ۲)۔

[3] اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: ۱۶)

[4] وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا (الاعراف)

[5] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ (آل عمران: ۱۲)

[6] وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔ (المائدہ: ۱۱)۔

پوری سورۃ میں خطاب کیا گیا ہے اور اس کا اختتام اس قاعدۂ عظیم و جلیل پر ہوتا ہے جو ان کے سامنے پیش کیا گیا کہ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ اب یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ اس مصالحانہ قاعدہ کی تعلیم کے بعد سے تمام دنیا کے مذہبی افکار کا میلان اسی کے کلی اطلاق کی طرف ہو گیا ہے، لیکن ہمارے اس جدید دور میں بھی دنیا کے متعدد علاقے ایسے موجود ہیں جو مذہبی جبر و ظلم کی قدیم وحشیانہ اسپرٹ کا اظہار کر رہے ہیں، اور ایک ہی ملک کے باشندوں کو جو ایک ہی زبان بولتے ہیں محض اس لیے دھکے دیے جاتے ہیں کہ اتفاق سے وہ اس مذہب کے معتقد نہیں ہیں جو اکثریت کا مذہب ہے[1]۔

بین الاقوامیت | بین الاقوامیت کا اصول وہ آخری اصول ہے جس کی میں یہاں تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن مجید کے اصول جس زمانہ میں تعلیم کیے گئے وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا متحارب قوموں، فرقوں اور طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس حالت میں قرآن نے انتہائی بین الاقوامیت کی تعلیم دے کر ایک بالکل نئی چیز دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ ایک غایت درجہ کا بےباکانہ اقدام تھا، مگر یہ اسی قسم کے اقدامات میں سے تھا جن کا اظہار قرآن مجید نے اپنے دوسرے اصولوں کی تعلیم میں کیا ہے۔ بلاشبہ قرآن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان طبقات میں تقسیم ہیں اور درجات کی کمی و بیشی حق بجانب ہے تاکہ شخصی قابلیتوں کو آزمائش کا پورا موقع مل سکے[2]۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ فرقوں اور باہم جنگ کرنے والے عناصر

---

[1] آج اس روشن زمانہ میں نازی جرمنی کا یہی حال ہے۔

[2] هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (الانعام:۲۰)
اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (بنی اسرائیل)۔

کا وجود در اصل قانون الٰہی سے انحراف اور تجاوز کرجانے کی سزا ہے۔ جتنے شعوب و قبائل دنیا میں موجود ہیں، اپنی طبیعی اصل کے اعتبار سے یکساں ہیں، اور ان کا تنوع خصائص کا بقا صرف اس غرض کے لیے درست ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان تمیز ہو سکے۔ باقی رہی فضیلت اور شرافت و بزرگی تو قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ کسی نسل، کسی قبیلے، کسی خاندان اور کسی قوم سے تعلق رکھنے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اعلیٰ سیرت اور نیک کردار کی بنا پر ہے۔ جس شخص نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک غلام سے کردی، جو شخص ایک غلام زادے کو اشراف قریش کی فوج کا سپہ سالار بنا سکتا تھا، جو شخص اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں اپنی قوم کے ایک نہایت غریب آدمی کی سی زندگی بسر کرتا تھا، جس کے دل میں کمزوروں اور پست حال لوگوں کی بھلائی کے سوا کوئی اور خیال نہ تھا، ایسے شخص کا طرز عمل خود ہی پرانی حد بندیوں کی شکست کا ایک زندہ نمونہ تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ بین الاقوامی تخیل کے حامیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نسل، زبان اور جغرافی تقسیموں کی بظاہر ناقابل عبور حد بندیاں ہیں۔ اور تخیلات خواہ کتنے ہی مقدس ہوں، مگر انسان اپنے روز افزوں ذرائع کے باوجود آج تک ان رکاوٹوں

لہ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (الانعام: ۶۵)۔

ٹہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳) ٹہ حضرت زینب بنت جحش، عبدالمطلب کی نواسی جن کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ کردی تھی۔

ٹہ سریۂ موتہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ کو اس فوج کا سپہ سالار بنایا جس میں اکابر صحابہ شریک تھے۔

پر غالب آنے اور اُن تصورات کو حقیقت بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے جن کا اشتہار
"انسان کی پارلیمنٹ اور عالمگیر وفاق"
کے دل خوش کن عنوانات سے وہ بڑے زور شور کے ساتھ دے رہا ہے لیکن پیغمبر اسلام نے نوع انسانی کو ایک راستہ دکھایا، قانون کلی کا راستہ، جس کو نسل وطن زبان اور جغرافی اشکال کی تمام شدید حد بندیوں کے باوجود تمام انسان قبول کر سکتے ہیں[۱] اور آپ نے خود روم، حبش، فارس اور عرب کے لوگوں کو اس قانون کی اطاعت میں جمع کر کے نہ صرف ایک بلند تخیل پیش کیا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنا کر بھی دکھا دیا، جس کی نظیر آج تک کوئی دوسرا انسان پیش نہ کر سکا[۲] صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

[۱] اس خاص مسئلہ کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ ترجمان القرآن (حیدرآباد) جلد سوم بابت ماہ رجب و شعبان ۱۳۵۲ھ

[۲] قانونی افکار پر اسلام کے اثرات کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو The Legacy of Islam Clarendon Press. Oxford 1931. میں پروفیسر De Santillana کا مضمون (Law and Society)

کافۃ للناس

بہ تقریب عید میلاد النبیؐ

ازجناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے ہوم ڈپارٹمنٹ شملہ

یوں تو ہر شکار میں ایک لطف ہے لیکن سب سے زیادہ لطف انسان اُس وقت محسوس کرتا ہے جب کہ اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ نوع انسانی کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی سلسلۂ صید وصیاد کی ایک مسلسل داستان ہے تہذیب و تمدن کے بدلنے سے محض جال کی نوعیتیں بدلتی رہی ہیں۔ لیکن جذبہ ہمیشہ وہی کار فرما رہا ہے۔ انسان نے اپنے عہد طفولیت میں شکار اور گلہ بانی کی انفرادی زندگی کے بعد قبائل کی اجتماعی زندگی کی طرف قدم بڑھایا تو اس اجتماعیت اور عمرانیت کا تقاضا تھا کہ آپس میں کچھ کام بانٹ لیے جائیں۔ مختلف لوگ مختلف مقتضیاتِ زندگی کے ذمہ دار ہوں یہ تقسیم عمل تھی جس سے ابتداءً انسانی گروہوں کی تخلیق ہوئی لیکن چونکہ فرائض مفوضہ کی نوعیت میں اختلاف تھا۔ کچھ فروتر تھے کچھ بالاتر۔ جن لوگوں کے حصہ میں بالائی سطح کے فرائض آئے، انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ چوپاؤں کی سیاقت میں ذہنی تعیش کہاں جو خود انسانوں کی سیادت میں ہے۔ درندوں کے شکار میں وہ لذت کہاں جو اپنے ہم جنسوں کے لہو میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تدابیر سے کام لینا شروع کیا کہ ہاتھ آئی ہوئی دولت کبھی چھنی ہی نہ جائے۔ یہیں سے حکومت کی بنیاد پڑی اور ارباب اقتدار نے اپنی سطوت و تغلب کو قائم رکھنے کے لیے مختلف قوتوں کو اپنے اندر

مرکوز کرنا شروع کر دیا۔ اس انداز سے ان کی گرفت مضبوط تو ضرور رہتی لیکن جو کاوشیں اور زحمتیں اس قوت کے حصول اور استبقاء میں برداشت کرنی پڑتیں وہ بشکل "بانداز ۂ خمار" ہوسکتیں لہٰذا ایک دیدہ ور اور دوربین گروہ نے اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے دیکھا کہ عقیدہ انسان کا سب سے زیادہ نازک پہلو ہے اس کے راستہ سے جو چیز ذہن انسانی میں داخل کیجائے گی اس کی گرفت کبھی چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ ادھر مختلف گروہ کچھ وقت سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتے دیتے ان کے خوگر بھی ہو چکے تھے۔ ہنر او پیشہ ورثتہً بھی ملتا چلا آرہا تھا۔ ماحول کا بھی اثر تھا۔ ان حالات کے یکجا اجتماع سے ایک عقیدہ کا وجود میں آجانا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ تقسیم عمل کی وہ حدبندی جس کی ابتدا محض ایک فنی ضرورت تھی مذہبی ایمان کا جزو ہوگئی۔ فروتر گروہ میں پیدا ہونے والے بچہ کے ذہن میں شروع سے ہی یہ بات راسخ ہونے لگجاتی تھی کہ اس گھرانے میں اس کی پیدائش دیوتاؤں کے حکم سے ہے اور کسی انسان کو یہ اختیار باقی نہیں کہ ان کے فیصلے کے خلاف اپیل سن سکے۔ مفلسی اور محتاجی کی صعوبات اور ذلت و رسوائی کی عقوبات جو اس پیشہ اور گھرانے سے متعلق ہونے کی جہت سے اس پر آتیں وہ اطمینان اور قناعت سے ان کو جھیلتا کہ وہ اس کے کسی گذشتہ جنم کے اعمال بد کی پاداش میں آتی ہیں۔ اعلیٰ طبقہ میں پیدا ہونے والا بچہ دنیا کی تمام نعمتوں اور ثروتوں کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا اس لیے کہ وہ اس ورن میں پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ اپنے کسی گذشتہ جنم کے نیک اعمال کا معاوضہ لے۔ یہ تقسیم "الٰہی تقسیم" تھی، جس میں کسی کو شکوہ و شکایت کی گنجائش نہ تھی۔ اعلیٰ طبقہ فروتر گروہوں سے ہر قسم کی خدمت لینا اپنا حق سمجھتا تھا، اور فروتر گروہ ان کی طرف سے ہر قسم کے جور و استبداد کو خدا کا بھیجا ہوا مقدر سمجھتا تھا۔ نہ وہ اس خدمت کا معاوضہ دینا ضروری خیال کرتا، نہ یہ اس استبداد کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت کر سکتا۔ رفتہ رفتہ یہ عقیدہ اس قدر

ہوگیا کہ گروہوں کی تقسیم ابدی اور ازلی قرار پاگئی۔ اب ارباب اقتدار کو ہر طرح کا اطمینان حاصل تھا۔ ان کی بالادستی کے خلاف کسی کے دل میں خیال تک بھی نہیں آسکتا تھا۔ لہذا وہ تغلب جو دنیا بھر کی قوتیں اور ہزاروں سامان فراہم کرنے کے بعد بھی وہ حاصل نہ کرسکتے تھے، اب بلا محنت اور تردد، بلاخدشہ و اندیشہ گھر بیٹھے ان کو حاصل تھا، اور اس اندازے کہ ان کے چھن جانے کا کبھی گمان تک بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ مصر کے عہد اولین کی تاریخ دیکھیے عام انسانوں کے چار طبقوں کے علاوہ جن میں بجائے خود تفوق و برتری کے مدارج کچھ کم متمیز نہ تھے، پانچواں گروہ ارباب حکومت کا تھا۔ بادشاہ دیوتاؤں کی طرف سے بادشاہ ہوتا تھا، اور اس کی اولاد پیدائشی حاکم ہوتی تھی۔ نہ اس کو کبھی یہ دھڑکا ہوتا تھا کہ رعایا میں سے کوئی اس کے خلاف بغاوت کا خیال تک بھی لاسکتا ہے۔ نہ رعایا میں سے کسی کو وہم تک بھی ہوسکتا تھا کہ ان میں سے بھی کبھی کوئی بادشاہ بن سکتا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیے چار ورنوں کی ابتدا کچھ اسی طرح ہوئی ہوگی لیکن رفتہ رفتہ طبقۂ اعلیٰ یعنی برہمنوں کا تسلط تمام قلوب پر چھا گیا۔ شودر اور ویش اپنی اپنی حالت پر مطمئن تھے کہ وہ اپنے دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتے تھے۔ اور ان کا کام ہی طبقۂ اعلیٰ کی خدمت گذاری تھا۔ کھشتری یقیناً سپاہی اور حکمراں تھے لیکن ان کا فریضہ بھی برہمنوں کی حفاظت اور کفالت تھا۔ درحقیقت حکومت تمام برہمنوں ہی کی سرپرستی میں ہوتی تھی۔ اور جو کچھ کھشتری سورماؤں کے پاس تھا، وہ وہی تھا جسے برہمنوں نے دوسری سمجھ کر خود بخود چھوڑ رکھا تھا۔

لیکن انسانوں کی اس غیر فطری تقسیم سے تخلیق انسانی کا مقصد ہی فوت ہو رہا تھا۔ ارادہ و اختیار کا دائرہ جو انسان کو دیگر مخلوقات پر شرف بخشنے کے لیے اسے عطا کیا گیا تھا، وہ اس تقسیم سے یکسر مٹ چکا تھا۔ امکانات انسانی کے تمام راز سربمہر دھرے رکھے تھے۔ ذہن و قلب کی تمام قوتیں معطل اور بیکار تھیں۔ اس لیے کہ نیچی ذات کے لوگ کبھی ترقی کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

پھر قوتوں کے استعمال کا موقع کہاں سے آتا۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنے طبقے کو انسانی ترقیوں کا آخری نقطہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ اس سے آگے بڑھنا اس دنیا کے انسانوں کے بس میں ہی نہیں تو دیولوک (دیوتاؤں کی دنیا) کا کام ہے۔ گویا انسانوں کی تمام جماعتوں پر جمود اور تعطل کے تو بڑے پردے پڑے ہوئے تھے جن کو اتنا مقدس اور پوتر سمجھا جاتا تھا کہ انسانی ہاتھ اُن کو چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ فطرت اسے کب تک گوارا کرتی مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر اس کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں کہیں کم موثر ثابت ہوئیں کہیں زیادہ لیکن رفتہ رفتہ عقیدۂ تناسخ مختلف شکلیں تبدیل کرتا چلا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی پیدائشی امتیازات اس صورت میں باقی رہے جو اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ البتہ اس کے دھندلے سے نشان نسبی امتیازات کے رنگ میں موجود رہے لیکن ہندوستان میں اگرچہ مختلف آوازیں بھی اس کے خلاف پیدا ہوتی رہیں، اس عقیدت اور عقیدے کے لازمی نتائج میں ذرہ بھی فرق نہ آیا۔ ہمیں اس وقت اُن آوازوں کی تفصیل و تاریخ سے بحث نہیں جو اس کے خلاف پیدا ہوئیں لیکن ان کا نتیجہ تو ظاہر ہے۔ مثلاً مہاتما بدھ کی کوشش اس باب میں کچھ کم قابل تحسین نہیں لیکن آخری حاصل تو یہی ہے تاکہ ورن اپنی جگہ قائم رہا اور بدھ مت کو چین اور جاپان کی طرف جانا پڑا۔ ہمیں اس وقت صرف اس آواز کو دیکھنا ہے جو سب سے موثر طریق سے اٹھائی گئی اور سب سے زیادہ موثر نتائج کی حامل ہوئی۔ یہ وہ آواز ہے جو آج سے چودہ سو سال پیشتر عرب کے صحرا سے بلند ہوئی۔

وہ عرب کہ جہاں نسبی تفاخر اپنی انتہا پر تھا۔ عہد جاہلیت کے دواوین اٹھا کر دیکھیے معلوم ہو جائے گا کہ پیدائشی امتیازات ان کے ہاں کس قدر اہمیت رکھتے تھے۔ یہ آواز اس ہستی کی وساطت سے بلند ہوئی جو اس تمام ملک میں سب سے زیادہ ممتاز اور اعلیٰ ترین قبیلہ سے تھی مروجہ عقائد کی رو سے جس کو سب سے بڑھ کر تفوق و امتیاز پیدائشی طور پر حاصل تھا۔ اس

باطل تفوق کے خلاف اگر کوئی آواز سب سے زیادہ موثر ہو سکتی تھی تو کسی ایسی ہی شخصیت کی ہو سکتی تھی۔ اسلام نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ یاد رکھو پیدائش کی رو سے تمام انسان برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ اس لئے کہ تمام انسان ایک نفس واحدہ سے مخلوق ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔۔ (۶/۹۸) وہی ہے جس نے تم کو نفس واحدہ سے پیدا کیا

پھر اس کے بعد بتایا کہ مختلف وطن۔ قبائل۔ قومیں۔ ذاتیں سب اس لئے ہیں کہ ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے۔ ان میں سے کوئی چیز عزت و تکریم کی باعث نہیں۔ نہ شودر کے گھر پیدا ہونے سے ذلیل ہے۔ نہ برہمن برہمن کے ہاں جنم لینے سے پوجیہ پاد۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳) لوگو ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ اور تمہاری برادریاں اور کنبے بنا دیئے کہ آپس میں شناخت کر سکو۔ تم میں سب سے زیادہ بزرگ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

پھر یہ اعلان کیا کہ یاد رکھو اس دنیا میں انسان ایک صاف لوح لے کر آتا ہے کسی گذرے ہوئے جنم کے اعمال کے نتائج اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتے۔ یہ دنیا، یہ کارزار حیات، یہ جہان جہد و عمل ہر انسان کے لئے یکساں وسیع ہے۔ کسی کا کوئی دائرہ نہیں، کوئی حد بندی نہیں۔ جہاں تک جس میں استعداد ہو اٹھتا چلا جائے۔ کوئی روکنے والا نہیں۔ اس شاہراہ عمل پر کہیں یہ سائن بورڈ نہیں کہ "یہ راستہ عام نہیں"۔ یہاں ہر راستہ عام ہے۔ یہ شاہراہ کھلی ہوئی ہے جو کوشش کرے گا جتنی کوشش کریگا ہر اکتسابی شئے اس کے مطابق حاصل کرتا چلا جائے گا۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

پھر چونکہ کوئی تعلیم بلا عمل اور نمونہ کے مؤثر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے خود

ثابت کرکے دکھلایا کہ فطرت نے ہر انسان کے لئے میدان سعی و عمل وسیع چھوڑا ہے اور ایک ہی انسان مختلف کاموں میں ترقی کر سکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے حضور کی پیدائش عرب کے ممتاز ترین خاندان میں ہوئی لیکن ابتدائی پرورش اس ماحول میں ہوئی جسے یہاں کی اصطلاح میں شودر ورن کا ماحول کہنا چاہیئے۔ بکریاں چرانا، مویشی ہانکنا جو نیچ ذاتوں کا پیشہ قرار دیا گیا ہے اپنی زندگی کی ابتدا حضور نے اسی پیشہ سے کی اور اس وظیفۂ زندگی کو اس حسن و خوبی سے انجام دیا کہ حضور کے ساتھی دوسرے بکریاں چرانے والے لڑکے تعجب کیا کرتے تھے۔ ہاشمی خاندان کے اس نونہال یا یوں کہیے کہ عرب کے سب سے اونچی گوت کے برہمن زادہ کو شودروں کے اس پیشہ سے قطعاً عار نہ تھا۔

تجارت اور بیوپار ویش ورن کا پیشہ کہا گیا ہے۔ یہ شودروں سے ذرا اونچے ہوتے ہیں۔ حضور نے جب اگلا قدم اٹھایا تو اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے لیے جانا شروع کیا۔ نہیں۔ بلکہ خود تجارت شروع کی حضرت خدیجہ کا مال تجارت مدتوں بیچا۔ اور اس قدر کامیاب تاجر ثابت ہوئے کہ بڑے بڑے کہنہ مشق تجار انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور حضور نے عملاً ثابت کر دیا کہ ایک شودر کا کام کرنے والا بچہ ویش کی سی تجارت بھی کر سکتا ہے۔

تیسرا ورن سورما سپاہی، کشتریوں کا ہے۔ میدان جنگ اُن کے لئے مخصوص ہے بساط سیاست کے یہ دھنی ہوتے ہیں۔ حضور کی حیات مقدسہ میں جب نبرد آزمائی اور سیاست مدن کا شعبہ دیکھئے تو اس میں بھی آپ وحید ہیں کم و بیش تیس لڑائیوں میں حضور شریک ہوئے اور جرات و بسالت کا یہ عالم تھا کہ صحابہ کا بیان ہے کہ جب کبھی میدان جنگ میں عام سپاہیوں پر کڑا وقت آیا ہم نے ہمیشہ حضور ہی کے پیچھے پناہ لی۔ کہیں شکست نہیں کھائی۔ کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ عرب جیسے وحشی اور خونخوار ملک میں امن و سلامتی کے پرچم لہرا دیے اور خون کے اتنے کم چھینٹوں کے عوض کہ آج ایک فرقہ وارانہ فساد میں اس سے زیادہ خونریزی ہو جاتی ہے۔

پھر حکومت وسلطنت اِس تدبر اور بلند نظری سے کی کہ دنیا بھر کے سیاست دان آج تک معترف ہیں۔ اس سے یہ بتادیا کہ ہاں دیکھ لو شودروں کے ماحول میں تربیت پانے والا بچہ، اگر کامیاب ویش ہوسکتا ہے تو کشتری بھی کم حیثیت کا نہیں ہوسکتا۔

اس سے آگے بڑھیے تو برہمنوں کا درجہ ہے اور یہ ورنوں کی تقسیم کے لحاظ سے گویا انسانیت کا آخری نقطہ ہے۔ یہ گیان اور ودیا اور علم وحکمت کے محافظ ہوتے ہیں۔ اس باب میں تو حضور کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔ دنیا بھر کے فلاسفر تمام جہاں کے عالم بڑے بڑے منطقی مشہور سائنسدان، اس نبی امی اعلم الناس معلم الحکما، مدینۃ العلوم والحکم کے لائے ہوئے پیغام کے ایک ایک ٹکڑے کو لیتے ہیں اور جوں جوں اس کے حقائق بے نقاب ہوتے ہیں، وجد کرتے ہیں، جھومتے ہیں، اور آخر تھک کر بول اُٹھتے ہیں کہ

دفتر تمام گشت وبہ پایاں رسید عمر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ما ہمچنین در اول وصف تو ماندہ ایم

ابن رشد۔ بو علی سینا۔ رازی۔ فارابی۔ جن کو آج یورپ اپنے اپنے فن کا امام مانتا ہے۔ اس مائدہ علم وحکمت کے ریزہ چین، اور اس آفتاب حقایق ومعارف کے مکتسب انوار تھے جن اساتذہ علوم وفنون نے ساری دنیا کو تہذیب وتمدن سے روشناس کرایا وہ اِس بکریاں چرانے والے تاجر اسی سوداگری کرنے والے سپاہی اور اسی شمشیر افگن وقیدان کے مکتب قدس کے ابجد خواں تھے کیا اس سے بڑھکر دنیا کا کوئی مصلح، نوع انسانی کا کوئی ہمدرد، ایسا جامع نمونۂ زندگی پیش کرسکتا ہے، جس میں ہر ورن کے انسان، ہر گوت کے آدمی کے لئے امید وآرزو اور اطمینان ومسرت کا سامان موجود ہو؟ قرآن کریم نے کہا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ ‏ ‏ ‏ (اے نوع انسانی! تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

حضورؐ تمام نوعِ انسانی کے لئے رسولؐ ہیں۔ کافۃ الناس کے لئے رہبر ہیں۔ اور خدا کے آخری پیغمبر ہیں۔ اس لئے حضور کی حیاتِ مقدسہ میں دنیا کے ہر طبقہ کے انسان کے لئے بہترین نمونہ ہونا چاہیئے کیا اس کے بعد انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے لئے ان نقوشِ قدم میں کوئی سامانِ رہنمائی نہیں؟ کیا ایک شودر اس بابِ عالی سے مایوس ہو کر جا سکتا ہے کہ میں ساری دنیا کا ٹھکرایا ہوا انسان امیدوں کی ہزاروں دنیائیں ساتھ لے کر یہاں پہنچا تھا۔ لیکن یہاں بھی میرے لئے پناہ کی جگہ نہیں! نہیں وہ رسولؐ ایک شودر کے لئے بھی ویسے ہی راہ نما ہیں جیسے ایک برہمن کے لئے۔ حضور نے عملاً بتلا دیا کہ شودر کو، ایک ویش کو، ایک کشتری کو کبھی یہ سمجھ کر مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے۔ کہ ان کی ترقیوں کی دنیا انہی کے دائروں تک محدود ہے۔ نہیں! یہ دائرے حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔ ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے۔

———— ⟨+⟩ ————

پھر اس تعلیم و عمل کا دائرہ حضور کی ذاتِ گرامی تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ مساوات نوعِ انسانی اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اسی لئے جہاں جہاں اسلام تھا، وہیں اس عالمگیر اخوت و مساوات کے نظارے آنکھوں کے سامنے تھے خود نبی اکرمؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن یعنی عرب کے سب سے بڑے خاندان کی خاتونِ محترم کی شادی ایک غلام سے کر دی۔ غلام کی پوزیشن عرب جاہلیت میں یہاں کے شودروں سے بھی بدتر تھی۔ اس سے بڑھکر مساوات کی اور کیا عملی مثال ہو سکتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سوسائٹی میں غلاموں کو وہ مدارج عالیہ حاصل ہوئے کہ امرا بھی ان کے سامنے ہیچ تھے۔ بلالؓ ایک ادنیٰ غلام تھے۔ خود جناب صدیق اکبرؓ نے انہیں آزاد کرایا۔ لیکن اسلام میں تہنیت کی سب سے بلند کرسی پر یہی غلام فائز تھے۔ مؤذن رسول اللہ ہونے کا پہلا فخر انہی کو ہے۔ حالت یہ تھی کہ جب یہ دور سے نظر آتے تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ اٹھکر کھڑے ہو جاتے کہ ہمارے

آقا بلالؓ آ رہے ہیں۔ حضرت علی تو فرماتے ہیں کہ بلال خود میرے گھرانے کے ایک فرد ہیں۔ نبی اکرمؐ نے جب آخری فوج تیار فرمائی تو اس میں قریش و عرب کے بڑے بڑے اکابر موجود تھے۔ صحابہ کبار مثل حضرات ابوبکر۔ عمر۔ علی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی جمع تھے لیکن فوج کی سپہ سالاری حضور نے ایک غلام زادہ۔ اسامہ بن زیدؓ کو تفویض فرما دی، اور کسی کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ کیا کوئی شودر اسے ممکنات میں سے تصور کر سکتا ہے کہ اس کو اتنا بلند درجہ بھی مل سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ پیدائش کے اعتبار سے بڑی اونچی ذات کے، پوزیشن کے لحاظ سے امیر المومنین، لیکن اپنی نماز جنازہ کے لیے ایک رومی غلام، حضرت صہیبؓ کو تجویز فرمایا۔ نہیں بلکہ ان سے درخواست کی! کیا یہ سب سے بلند ترین مقام نہیں جو ایک برہمن کو مل سکتا ہے! وہی قریش جن کے نسبی تفاخر کا یہ عالم تھا کہ بدر کی لڑائی میں جب انصار کے چند سپاہی مقابلہ کے لیے نکلے تو انہوں نے ان سے اس بنا پر لڑنے سے انکار کر دیا کہ نسب و پوزیشن کے لحاظ سے وہ ان سے کمتر ہیں۔ یہی قریش تھے کہ جب مسلمان ہوئے تو ایک مرتبہ حضرت بلالؓ نے شادی کی خواہش ظاہر کی تو بڑے بڑے قریشی متمنی تھے کہ وہ ان کے ہاں رشتہ پر راضی ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں جب رجسٹر د مہاجرین و انصار کے وظائف مقرر ہوئے ہیں تو مشاہرہ کا معیار خاندان اور نسب پر نہ تھا بلکہ معیار یہ تھا کہ جو پہلے مسلمان ہوئے تھے ان کو سب سے زیادہ دیا جائے۔ اس کا عملی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ جس قدر غریب پیدائش کے لحاظ سے نیچی برادری کے لوگ تھے ان کو ممتاز حصہ ملا، اور قریش کے بڑے بڑے سردار، جو سب سے آخر مسلمان ہوئے تھے، سب سے فروتر رہے۔ اور آگے بڑھیے۔ یہ مثال صرف آپ کو اسلام میں ہی مل سکتی ہے کہ ہندوستان میں غلاموں نے اور مصر میں مملوکوں نے سلطنت کی۔ غلاموں کا بادشاہ ہو جانا کیا نوع انسانی کی تاریخ میں ورطۂ حیرت میں ڈالنے والا واقعہ نہیں؟ کیا شودروں کو اس سے بلند سطح کہیں اور بھی

ل بھی ہے۔ آج جس کا جی چاہے جا کر دیکھ لے تقسیم عمل کے لحاظ سے عرب میں جو لوگ وہ کام
کرتے ہیں جو یہاں شودروں سے مخصوص ہے، جب نماز کا وقت آتا ہے تو وہ مسجد حرام میں
بڑے بڑے امراء اور اکابر سلطنت سے دوش بدوش، ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں
یہ سب کیا ہے؟ اسلام کی وہی عالمگیر تعلیم فطرت۔ اور اس تعلیم کے مطابق نبی اکرم کا عملی نمونہ
آج وحدت انسانی کا ہر طرف چرچا ہے اخوت و مساوات کی ہر قلب سلیم کو تلاش ہے
انسانی استبداد و تغلب نے اپنے ہم جنس انسانوں کے پاؤں میں غلامی کی جو بوجھل زنجیریں
مختلف نام رکھ کر ڈالی تھیں، انسانی فطرت انہیں توڑنے کے لیے خود بخود مجبور ہو رہی ہے جیسا کہ
پہلے کہا جا چکا ہے۔ ان غیر فطری قیود سے انسانیت کو آزاد کرانے کے لیے مختلف تحریکیں اٹھی
ہیں۔ کئی آوازیں بلند ہوئی ہیں لیکن ہر وہ فطرت سلیم کا انسان جو بصارت کے ساتھ بصیرت
بھی رکھتا ہے اگر ذرا غور و تعمق سے مطالعہ کرے، تو اس پر واضح ہو جائیگا کہ عملاً جس قسم کی مساوات
کے نتائج اسلام نے پیدا کیے ہیں، اور کہیں پیدا نہیں ہو سکے۔ اس لیے کہ داعی اسلام کی بعثت
کا سب سے اہم مقصد قرآن کریم نے انہی طوق و سلاسل کو توڑنا بتایا ہے، تاکہ حضور کی آمد سے
فطرت انسانی پھر اسی آزادی کی فضا میں سانس لے سکے جو اس کی تخلیق کا مقصد ہے، اور
خدا اور بندے کے درمیان کوئی تیسری قوت باقی نہ رہے۔ یہی تھے وہ رسول جن کے متعلق قرآن
کریم کا ارشاد ہے کہ۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷: ۱۵۷)۔	وہ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دے گا اور برائیوں سے روکیگا اور پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال کریگا اور خبیث چیزیں ان پر حرام کریگا اور وہ بوجھ اور وہ طوق و سلاسل ان سے اتار پھینکے گا۔ (جن کے نیچے فطرت انسانی دبی چلی رہی تھی)

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۷)

قانون فطرت کو سمجھنے میں انسان کی کوتاہیاں صفحات گذشتہ میں خالص علمی تحقیق اور سائنٹفک مشاہدات و تجربات کی مدد سے ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسانی فطرت کے تمام مقتضیات اور انسان کی ذہنی افتاد اور جسمانی ساخت کی تمام دلالتوں کا لحاظ کرکے نظام تمدن میں عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو ٹھیک ٹھیک توازن اور تناسب کے ساتھ مرتب کیا جائے: تو اس کے ضروری ارکان کیا ہونے چاہئیں۔ اس بحث میں کوئی چیز ایسی بیان نہیں کی گئی ہے جو متشابہات میں سے ہو، یا جس میں کسی کلام کی گنجائش ہو۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ علم و حکمت کے محکمات میں سے ہے اور عموماً سب ہی اہل علم و عقل اس سے واقف ہیں لیکن انسانی عجز کا کمال دیکھیے کہ جتنے نظام تمدن خود انسان نے وضع کیے ہیں ان میں سے ایک میں بھی فطرت کی ان معلوم و معروف ہدایات کو تمام و کمال اور بحسن تناسب ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کے مقتضیات سے ناواقف نہیں ہے۔ اس سے خود اپنی ذہنی کیفیات اور جسمانی خصوصیات بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ آج تک وہ کوئی ایسا معتدل نظام تمدن وضع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس کے اصول و مناہج میں پورے توازن کے ساتھ ان سب مقتضیات اور خصوصیات اور سب مصالح اور مقاصد کی رعایت کی گئی ہو۔

نارسائی کی حقیقی علت اس کی وجہ کیا ہے؟ انسان کی یہ فطری کمزوری کہ اس کی نظر کسی معاملے

کے تمام پہلوؤں پر من حیث الکل حاوی نہیں ہوسکتی۔ بھی افتادِ مزاج اور رجحانِ طبع کے لحاظ سے کوئی ایک پہلو اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، اور جب وہ ایک طرف مائل ہوجاتا ہے تو دوسرے اطراف یا تو اس کی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہوجاتے ہیں یا وہ قصداً ان کو نظرانداز کردیتا ہے۔ زندگی کے جزئی اور انفرادی معاملات تک میں انسان کی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ تمدن وتہذیب کے وسیع تر مسائل، جن میں سے ہر ایک اپنے اندر بے شمار جلی و خفی گوشے رکھتا ہے، اس کمزوری کے اثر سے محفوظ رہ جائیں۔ علم اور عقل کی دولت سے انسان کو ضرور سرفراز کیا گیا ہے، مگر زندگی کے معاملات میں خالص علم اور خالص عقلیت اس کی رہنما نہیں ہے۔ بلکہ جذبات اور رجحانات پہلے اس کو ایک رخ پر موڑ دیتے ہیں، پھر جب وہ اس خاص رخ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے تب عقل سے استدلال کرتا اور علم سے مدد لیتا ہے۔ اس حالت میں اگر خود اس کا علم اس کو معاملے کے دوسرے رخ دکھائے اور اس کی اپنی عقل اس کی یک رُخی پر متنبہ کرے تب بھی وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا بلکہ علم و عقل کو مجبور کرتا ہے کہ اس کے رجحان کی تائید میں دلائل اور تاویلات فراہم کریں۔

چند نمایاں مثالیں معاشرت کے جس مسئلے سے اس وقت ہم بحث کر رہے ہیں، اس میں بھی انسان کی یہی یک رُخی اپنی افراط و تفریط کی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔

ایک گروہ اخلاق اور روحانیت کے پہلو کی طرف جھکا اور اس میں یہاں تک غلو کر گیا کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق ہی کو سرے سے ایک قابل نفرت چیز قرار دے بیٹھا۔ یہ بے اعتدالی ہم کو بودھ مت، مسیحیت اور بعض ہندو مذاہب میں نظر آتی ہے۔ اور اسی کا اثر ہے کہ اب تک دنیا کے ایک بڑے حصہ میں صنفی تعلق کو بجائے خود ایک بدی سمجھا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ازدواج کے دائرہ میں ہو یا اس سے باہر۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ رہبانیت کی

غیر فطری اور غیر متمدن زندگی کو اخلاق اور طہارت نفس کا نصب العین سمجھا گیا۔ نوع انسانی کے بہت سے افراد نے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو فطرت سے انحراف بلکہ جنگ میں ضائع کر دیا۔ اور جو لوگ اقتضائے فطرت سے مجبور ہو کر باہم ملے بھی تو اس طرح جیسے کوئی شخص مجبوراً اپنی کسی گندی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلق نہ تو زوجین کے درمیان محبت اور تعاون کا تعلق بن سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی صالح اور ترقی پذیر تمدن وجود میں آسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظام معاشرت میں عورت کے مرتبہ کو گرانے کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک اسی نام نہاد اخلاقی تصور پر ہے۔ رہبانیت کے پرستاروں نے صنفی کشش کو شیطانی وسوسہ، اور اس کشش کی محرک یعنی عورت کو شیطان کا ایجنٹ قرار دیا، اور اس کو ایک ایسا ناپاک وجود ٹھیرایا جس سے نفرت کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو طہارت نفس چاہتا ہو۔ مسیحی، بودھ اور ہندو لٹریچر میں عورت کا یہی تصور غالب ہے۔ اور اس تصور کے تحت جو نظام معاشرت مرتب کیا گیا ہو، اس میں عورت کا جیسا کچھ مرتبہ ہو سکتا ہے، اُس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے انسان کے داعیات جسمانی کی رعایت کی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ فطرت انسانی تو درکنار فطرت حیوانی کے مقتضیات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ مغربی تمدن میں یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہو چکی ہے کہ اب چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اس کے قانون میں زنا کوئی جرم ہی نہیں۔ جرم اگر ہے تو جبر و اکراہ ہے۔ یا کسی دوسرے شخص کے قانونی حق میں مداخلت۔ ان دونوں میں سے کسی جرم کی شارکت نہ ہو تو زنا یعنی صنفی تعلقات کا اختلاط بجائے خود کوئی قابل تعزیر جرم، حتیٰ کہ کوئی قابل شرم اخلاقی عیب بھی نہیں۔ یہاں تک تو وہ کم از کم حیوانی فطرت کی حد میں تھا لیکن اس کے بعد وہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے صنفی تعلق کے حیوانی مقصد یعنی تناسل اور بقائے نوع کو بھی نظر انداز کر دیا، اور اسے محض جسمانی

لذت کا ذریعہ بنالیا۔ یہاں پہنچ کر وہی انسان جو احسن تقویم پر پیدا کیا گیا تھا، اسفل سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی انسانی فطرت سے انحراف کر کے حیوانات کا سا صنفی تعلق اختیار کرتا ہے جو کسی تمدن کی بنیاد نہیں بن سکتا پھر وہ اپنی حیوانی فطرت سے بھی انحراف کر کے اس تعلق کے فطری نتیجہ یعنی اولاد کی پیدائش کو بھی روک دیتا ہے تاکہ دنیا میں اس کی تہذیب، اس کے تمدن، اس کے علوم و فنون، اس کے نظام سیاست و معیشت، غرض اس کی کسی چیز کو بھی باقی رکھنے والی نسلیں ہی وجود میں نہ آنے پائیں۔

ایک جماعت نے خاندان کی اہمیت کو محسوس کیا تو اس کی تنظیم اس قدر سخت بندشوں کے ساتھ کی کہ ایک ایک فرد کو جکڑ کر رکھ دیا، اور حقوق و فرائض میں کوئی توازن ہی باقی نہ رکھا۔ اس کی ایک نمایاں مثال ہندوؤں کا خاندانی نظام ہے۔ اس میں عورت کے لیے ارادے اور عمل کی کوئی آزادی نہیں۔ تمدن اور معیشت میں کوئی حق نہیں۔ وہ لڑکی ہے تو لونڈی ہے۔ بیوی ہے تو لونڈی ہے۔ ماں ہے تو لونڈی ہے۔ بیوہ ہے تو لونڈی سے بھی بدتر زندہ درگور ہے۔ اس کے حصہ میں صرف فرائض ہی فرائض ہیں، حقوق کے خانے میں ایک عظیم الشان صفر کے سوا کچھ نہیں۔ اس نظام معاشرت میں عورت کو ابتدا ہی سے ایک بے زبان جانور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس میں سرے سے اپنی خودی کا ہی کوئی شعور پیدا نہ ہو۔ بلاشبہ اس طریقہ سے خاندان کی بنیادوں کو بہت مضبوط کر دیا گیا۔ اور عورت کی بغاوت کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہا۔ لیکن جماعت کے پورے نصف حصہ کو ذلیل کر کے اس نظام معاشرت نے درحقیقت اپنی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت، اور بڑی خطرناک صورت پیدا کر دی جس کے نتائج کو اب خود ہندو بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دوسری جماعت نے عورت کے مرتبے کو بلند کرنے کی کوشش کی اور اس کو

سادہ موقع کی آزادی بخشی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ خاندان کا شیرازہ ہی درہم برہم کر دیا۔ بیوی ہے تو آزاد، بیٹی ہے تو آزاد، بیٹا ہے تو آزاد۔ خاندان کا درحقیقت کوئی سربراہ نہیں، کسی کو کسی پر اقتدار نہیں۔ شوہر نہیں پوچھ سکتا کہ تم نے رات کہاں بسر کی، بیٹی سے باپ نہیں پوچھ سکتا کہ تو کس سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ زوجین درحقیقت دو برابر کے دوست ہیں جو مساوی شرائط کے ساتھ مل کر ایک گھر بنا لیتے ہیں۔ اور اولاد کی حیثیت اس ایسوسی ایشن میں محض جونیر ممبرس کی سی ہے۔ مزاج اور طبائع کی ایک ادنیٰ ناموافقت اس بنے ہوئے گھر کو ہر وقت بگاڑ سکتی ہے، کیونکہ اطاعت کا ضروری عنصر، جو یہ نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر ہے، اس جماعت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ مغربی معاشرت ہے، وہی مغربی معاشرت جس کے علمبردار دنیا کو اصول تمدن و عمران میں پیغمبری کا دعویٰ ہے۔ اس کی پیغمبری کا صحیح حال آپ کو دیکھنا ہو تو یورپ اور امریکہ کی کسی عدالت نکاح و طلاق یا کسی عدالت جرائم اطفال (Juvenile Court) کی روداد اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ابھی حال میں انگلستان کے ہوم آفس سے جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں میں جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خاندان کا ڈسپلن بہت کمزور ہو گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو Blue book of Crime Statistics for 1934)

انسان اور خصوصاً عورت کی فطرت میں شرم و حیا کا جو مادہ رکھا گیا ہے اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور عملاً لباس اور طرز معاشرت کے اندر اس کی صحیح ترجمانی کرنے میں تو کسی انسانی تمدن کو کامیابی نہیں ہوئی۔ شرم و حیا کو انسان اور خاص کر عورت کی بہترین صفات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ مگر لباس و معاشرت میں اس کا ظہور کسی عقلی طریقے اور کسی ہموار ضابطہ کی

صورت میں نہیں ہوا۔ ستر عورت کے صحیح حدود متعین کرنے اور یکسانی کے ساتھ ان کو ملحوظ رکھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ مردوں اور عورتوں کے لباس اور ان کے آداب و اطوار میں حیاداری کی صورتیں کسی اصول کے تحت مقرر نہیں کی گئیں۔ معاشرت میں مرد اور مرد، عورت اور عورت، مرد اور عورت کے درمیان کشف و حجاب کی مناسب اور معقول حدبندی کی ہی نہیں گئی۔ تہذیب و شائستگی اور اخلاق عامہ کے نقطۂ نظر سے یہ معاملہ جتنا اہم تھا، اتنا ہی اس کے ساتھ تغافل برتا گیا۔ اس کو کچھ تو رسم و رواج پر چھوڑ دیا گیا، حالانکہ رسم و رواج اجتماعی حالات کے ساتھ بدل جانے والی چیز ہے، اور کچھ افراد کے ذاتی رجحان و انتخاب پر منحصر کر دیا گیا حالانکہ نہ جذبۂ شرم و حیا کے اعتبار سے تمام اشخاص یکساں ہیں اور نہ ہر شخص اتنی سلامت ذوق اور صحیح قوت انتخاب رکھتا ہے کہ اپنے اس جذبہ کے لحاظ سے خود کوئی مناسب طریقہ اختیار کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف جماعتوں کے لباس اور معاشرت میں حیاداری اور بے حیائی کی عجیب آمیزش نظر آتی ہے جس میں کوئی عقلی مناسبت، کوئی یکسانی اور کوئی ہمواری، کسی اصول کی پابندی نہیں پائی جاتی۔ مشرقی ممالک میں تو یہ چیز صرف بے ڈھنگے پن ہی تک محدود رہی لیکن مغربی قوموں کے لباس اور معاشرت میں جب بے حیائی کا عنصر حد سے زیادہ بڑھا تو انہوں نے سرے سے شرم و حیا کی جڑ ہی کاٹ دی۔ ان کا جدید نظریہ یہ ہے کہ شرم و حیا، دراصل کوئی فطری جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ محض لباس پہننے کی عادت نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ ستر عورت اور حیاداری کا کوئی تعلق اخلاق اور شائستگی سے نہیں ہے بلکہ وہ تو درحقیقت انسان کے داعیات صنفی کو تحریک دینے والے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔[1]

---

[1] یہ لفظ بلفظ وہی خیال ہے جو Westermarck نے اپنی کتاب The History of Human Marriage میں ظاہر کیا ہے۔

اسی فلسفۂ بے حیائی کی عملی تفسیریں ہیں وہ نیم عریاں لباس، وہ جسمانی حسن کے مقابلے، وہ برہنہ ناچ، وہ ننگی تصویریں، وہ اسٹیج پر فاحشانہ مظاہرے، وہ برہنگی (Nudism) کی روز افزوں تحریک، وہ حیوانیت محض کی طرف انسان کی واپسی۔

یہی بے اعتدالی اس مسئلہ کے دوسرے اطراف میں بھی نظر آتی ہے۔ جن لوگوں نے اخلاق اور عصمت کو اہمیت دی انہوں نے عورت کی حفاظت ایک جاندار، ذی عقل، ذی روح وجود کی حیثیت سے نہیں کی بلکہ ایک بے جان زیور، ایک قیمتی پتھر کی طرح کی، اور اس کی تعلیم و تربیت کے سوال کو نظر انداز کر دیا، حالانکہ تہذیب و تمدن کی بہتری کے لیے یہ سوال عورت کے حق میں بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا مرد کے لیے تھا۔ خلاف اس کے جنہوں نے تعلیم و تربیت کی اہمیت کو محسوس کیا انہوں نے اخلاق اور عصمت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ایک دوسری حیثیت سے تمدن و تہذیب کی تباہی کا سامان مہیا کر دیا۔ اسی طرح جن لوگوں نے فطرت کی تقسیم عمل کا لحاظ کیا انہوں نے تمدن و معاشرت کی خدمات میں سے عورت پر صرف خانہ داری اور تربیت اطفال کی ذمہ داریاں عائد کیں اور مرد پر رزق مہیا کرنے کا بار ڈالا لیکن اس تقسیم میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ انہوں نے عورت سے تمام معاشی حقوق سلب کر لیے۔ وراثت میں اس کو کسی قسم کا حق نہ دیا، ملکیت کے تمام حقوق مرد کی طرف منتقل کر دیے، اور اس طرح معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے دست و پا کر کے عورت اور مرد کے درمیان درحقیقت لونڈی اور آقا کا تعلق قائم کر دیا۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ اٹھا جس نے اس بے انصافی کی تلافی کرنی چاہی، اور عورت کو اس کے معاشی و تمدنی حقوق دلانے کا ارادہ کیا، مگر یہ لوگ ایک دوسری غلطی کے مرتکب ہوگئے، ان کے دماغوں پر مادیت کا غلبہ تھا اس لیے انہوں نے عورت کو معاشی و تمدنی غلامی سے نجات دلانے (Emancipation of Woman)

کے معنی یہ سمجھے کہ اس کو بھی مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا فرد بنا دیا جائے، اور تمدن کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں مرد کے ساتھ برابر شریک کیا جائے۔ مادیت کے نقطۂ نظر سے اس طریقہ میں بڑی جاذبیت تھی کیونکہ اس سے نہ صرف مرد کا بار ہلکا ہوگیا بلکہ کسب معیشت میں عورت کے شریک ہوجانے سے دولت کے حصول اور اسباب عیش کی فراہمی میں قریب قریب دو چند اضافہ بھی ہوگیا۔ مزید براں قوم کی معاشی اور عمرانی مشین کو چلانے کے لیے پہلے کے مقابلے میں دو گنے ہاتھ اور دو گنے دماغ مہیا ہوگئے جس سے یکایک تمدن کے ارتقاء کی رفتار تیز ہوگئی لیکن مادی اور معاشی پہلو کی طرف اس قدر حد سے زیادہ مائل ہوجانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پہلو جو درحقیقت اپنی اہمیت میں اس ایک پہلو سے کچھ کم نہ تھے، ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے اور بہت سے پہلوؤں کو انہوں نے جانتے بوجھتے نظر انداز کردیا۔ انہوں نے قانون فطرت کو جاننے کے باوجود قصداً اس کی خلاف ورزی کی جس پر خود انکی اپنی سائنٹفک تحقیقات شہادت دے رہی ہیں۔ انہوں نے عورت کے ساتھ انصاف کرنے کا دعویٰ کیا مگر درحقیقت بے انصافی کے مرتکب ہوئے جس پر خود ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات گواہ ہیں۔ انہوں نے عورت کو مساوات دینے کا ارادہ کیا مگر درحقیقت نامساوات قائم کر بیٹھے جس کا ثبوت خود ان کے اپنے علوم و فنون فراہم کر رہے ہیں۔ انہوں نے تمدن و تہذیب کی اصلاح کرنی چاہی، مگر درحقیقت اس کی تخریب کے نہایت خوفناک اسباب پیدا کردیے جن کی تفصیلات خود انہی کے بیان کردہ واقعات اور خود ان کے اپنے فراہم کردہ اعداد و شمار سے ہم کو معلوم ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان حقائق سے بے خبر نہیں ہیں، مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، یہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے لیے قانون بنانے میں تمام مصلحتوں کی معتدل اور متناسب رعایت ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ ہوائے نفس اس کو افراط کے کسی ایک رخ پر بہالے جاتی ہے، اور جب وہ بہہ جاتا ہے تو بہت سی مصلحتیں اس کی نظر سے چھپ جاتی ہیں، اور بہت سی مصلحتوں اور حقیقتوں کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود وہ ان کی

طرف سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ اس فیصدی والا دی اندھے پن کے ثبوت میں ہم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ خود ایک ایسے اندھے کی شہادت پیش کردیں۔ روس کا ایک ممتاز سائنس دان (Anton Nemilov) جو سو فیصدی کمیونسٹ ہے اپنی کتاب The Biological Tragedy of Woman [1] میں سائنس کے تجربات اور شاہدات سے عورت اور مرد کی فطری نامساوات ثابت کرنے پر تقریباً سو صفحے سیاہ کرتا ہے، اور اس تمام سائنٹفک تحقیق کے بعد لکھتا ہے:-

"آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظام اجتماعی میں محدود حقوق دیے جائیں تو کم آدمی اس کی تائید کریں گے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکہ نہ دینا چاہیے کہ مساوات مرد وزن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی جتنی سوویٹ روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی حقیقی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے" [2]

نہ صرف خاندان میں بلکہ سوسائٹی میں بھی:-

"اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں، بلکہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ سوویٹ طبقوں میں بھی جما ہوا ہے، اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر ان کے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھیں گی،

[1] اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔ [2] کتاب مذکور صفحہ ۱۶۱۔

بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کریں گی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنسٹ، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر، یا کسی سوفی صدی کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلدی یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ وہ عورت کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو، یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائیں گی۔[1]

اس کی وجہ؟

"اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورت واقعی سے ٹکرا جاتے ہیں، یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے، اور دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔[2]

ایک اقتباس اور دیکھ لیجئے پھر نتیجہ آپ خود نکال لیں گے:۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمال (Workers) میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، یہ ایک نہایت پرخطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں۔ میں ہزارہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (Sexual licentiousness.) نہ صرف ناواقف

---

[1] کتاب مذکور، صفحہ ۱۹۵-۱۹۴۔ [2] کتاب مذکور صفحہ ۷۷۔

لوگوں میں بلکہ طبقۂ عمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔[1]

ان عبارتوں کی شہادت کیسی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان خود فطرت نے مساوات نہیں رکھی، عملی زندگی میں بھی مساوات قائم کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں، اور جس حد تک فطرت سے لڑکر اس قسم کی مساوات قائم کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فواحش کا ایک سیلاب امنڈ آیا جس سے سوسائٹی کا سارا نظام خطرہ میں پڑ گیا۔ دوسری طرف یہ دعویٰ ہے کہ نظام اجتماعی میں عورت کے حقوق پر کسی قسم کی حد بندیاں نہ ہونی چاہییں، اور اگر ایسا کیا جائے گا تو ہم اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہوگا کہ انسان، جاہل نہیں عالم، عاقل، نہایت باخبر انسان بھی اپنے نفس کے رجحانات کا آنا غلام ہوتا ہے کہ خود اپنی تحقیق کو جھٹلاتا ہے، اپنے شاہدات کی نفی کرتا ہے، اور سب طرف سے آنکھیں بند کرکے ہوائے نفس کے پیچھے ایک ہی رخ پر انتہا کو پہنچ جاتا ہے خواہ اس افراط کے خلاف اس کے دل و دماغ کتنی ہی محکم دلیلیں پیش کریں، اس کے کان کتنے ہی واقعات سن لیں اور اس کی آنکھیں کتنے ہی بُرے نتائج کا مشاہدہ کرلیں۔ اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ (الجاثیہ: ۲۳)

قانون اسلام کی شان اعتدال | بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی اس دنیا میں صرف ایک نظام تمدن ایسا ہے جس میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے جس میں فطرت انسانی کے ایک ایک پہلو حتیٰ کہ نہایت خفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے۔ انسان کی جسمانی

[1] کتاب مذکور صفحہ ۲۰۳ - ۲۰۲

ساخت اور اس کی حیوانی جبلت، اور اس کی انسانی سرشت، اور اس کی نفسی خصوصیات اور اس کے فطری داعیات کے نہایت مکمل اور تفصیلی علم سے کام لیا گیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک چیز کی تخلیق سے فطرت کا جو مقصد ہے اس کو بتمام و کمال اس طریقہ سے پورا کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے مقصد حتٰی کہ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی نقصان نہیں پہنچا، پھر یہ سب مقاصد مل کر اس بڑے مقصد کی تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں جو خود انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ اعتدال، یہ توازن، یہ تناسب اتنا مکمل ہے کہ کوئی انسان خود اپنی عقل اور کوشش سے اس کو پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ انسان کا وضع کیا ہوا قانون اور اس میں کسی جگہ بھی ایک رتی نہ ظاہر ہو، ناممکن! قطعی ناممکن!! خود وضع کرنا تو درکنار حقیقت یہ ہے کہ معمولی انسان تو اس معتدل و متوازن، اور انتہائی حکیمانہ قانون کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اگر کوئی غیر معمولی سلامت طبع رکھتا ہو، اور اس پر سال ہا سال تک علوم اور تجربات کا اکتساب کرے، اور پھر برسوں غور و خوض کرتا رہے، تب وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس کی حکمتوں کو سمجھے اور اس کے رموز پر مطلع ہو۔ یہی چیز ہم کو یقین دلاتی ہے کہ اس قانون کا واضع وہی ہے جو زمین کا فاطر اور غیب و شہادت کا عالم ہے، اور مختلف سمتوں میں بہک جانے والے بنی آدم کو عدل و توسط کا محکم طریقہ وہی بتا سکتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (الزمر: ۵)۔

اسلامی نظام معاشرت آئیے! اب اسلامی نظام معاشرت کے پورے نقشے پر ایک نظر ڈالیے اس کی حکمتوں اور اس کے اصول و مقاصد کو سمجھیے، اس کے ارکان اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھیے، پھر یہ دیکھیے کہ ارکان کی اس ترکیب میں حجاب کا رکن کس طرح اور کس مصلحت سے نصب کیا گیا ہے، اگر اس ایک رکن کو ساقط کر دیا جائے تو اس سے دوسرے ارکان کی بندش پر کیا اثر

پڑتا ہے، اور اس رُکنِ عظیم کو ہٹا دینے کے بعد کیا اس کی جگہ کوئی ایسا بدل تجویز کیا جا سکتا ہے جو اس پورے نظامِ معاشرت کو گرنے سے بچائے اور اس کے اصول و مقاصد میں سے کسی کو فوت نہ ہونے دے۔

قانونِ معاشرت کے مبادی :۔ یہ بات اسلام کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اپنے قانون کی حکمت پر بھی خود ہی روشنی ڈالتا ہے۔ چنانچہ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے جو قانون اسلام میں پایا جاتا ہے اس کے متعلق بھی خود اسلام ہی نے ہم کو بتا دیا ہے کہ اس قانون کی بنیاد کن اصولِ حکمت اور کن حقائقِ فطرت پر ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جس کی پردہ کشائی کی گئی ہے، یہ ہے کہ۔

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریات) اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

یہ چیز حکمت کے غوامض اور حقائقِ اشیاء کے اسرار میں سے ہے۔ اس میں قانونِ زوجی (Law of sex) کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کارگاہِ عالم کا انجنیر خود اپنی انجنیری کا یہ راز کھول رہا ہے کہ اس نے کائنات کی یہ ساری مشین قاعدۂ زوجیت پر بنائی ہے یعنی اس مشین کے تمام کل پرزے جوڑوں (Pairs) کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اس جہانِ خلق میں جتنی کاریگری تم دیکھتے ہو وہ سب انہی جوڑوں کی تزویج کا کرشمہ ہے۔ اب اس پر غور کرو کہ زوجیت کیا شے ہے۔ زوجیت میں اصل یہ ہے کہ ایک شئے میں فعل ہو اور دوسری شئے میں قبول و انفعال۔ ایک شئے میں تاثیر ہو اور دوسری شئے میں تاثر۔ ایک شئے میں عاقدیت ہو اور دوسری شئے میں منعقدیت۔ یہی عقد و انعقاد، اور فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر اور فاعلیت و قابلیت کا تعلق دو چیزوں کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں۔ اور انہی ترکیبات سے عالمِ خلق کا سارا کارخانہ چلتا ہے۔ کائنات میں جتنی چیزیں

ہیں وہ سب اپنے اپنے طبقہ میں زوج زوج اور جوڑ جوڑ کے طور پر پیدا ہوئی ہیں، اور ہر دو زوجین کے درمیان اصلی اور اساسی حیثیت سے زوجیت کا یہی تعلق پایا جاتا ہے کہ ایک فاعل ہے اور دوسرا قابل و منفعل۔ اگرچہ مخلوقات کے ہر طبقے میں اس تعلق کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے، مثلاً ایک تزویج وہ ہے جو بسائط اور عناصر میں ہوتی ہے، ایک وہ جو مرکبات غیر نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو اجسام نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو انواع حیوانی میں ہوتی ہے۔ یہ سب تزویجیں اپنی نوعیت اور کیفیت اور فطری مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن اصلِ زوجیت ان سب میں وہی ایک ہے اور ہر نوع میں خواہ وہ کسی طبقہ کی ہو، فطرت کے اصل مقصد یعنی وقوع ترکیب او ہیئت ترکیبی کے حصول کے لیے ناگزیر ہے کہ زوجین میں سے ایک میں قوت فعل ہو اور دوسرے میں قوت انفعال۔

آیت مذکورۂ بالا کا یہ مفہوم متعین ہو جانے کے بعد اس سے قانون زوجیت کے تین ابتدائی اصول مستنبط ہوتے ہیں:-

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جس قاعدے پر تمام کائنات کی تخلیق کی ہے اور جس طریقے کو اپنے اس کارخانہ کے چلنے کا ذریعہ بنایا ہے وہ ہرگز ناپاک اور ذلیل نہیں ہو سکتا بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ پاک اور محترم ہی ہے اور ہونا چاہیے۔ کارخانہ کے مخالف اس کو گندہ اور قابل نفرت قرار دے کر اس سے اجتناب کر سکتے ہیں، مگر خود کارخانہ کا صانع اور مالک تو یہ کبھی نہ چاہے گا کہ اس کا کارخانہ بند ہو جائے۔ اس کا منشا تو یہی ہے کہ اس کی مشین کے تمام پرزے چلتے رہیں اور اپنے اپنے حصے کا کام پورا کریں۔

۲۔ فعل اور انفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ فاعل اور منفعل دونوں کا وجود اس کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ نہ فاعل کی حیثیت فعلی میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیت انفعالی میں کوئی ذلت۔ فاعل کا کمال یہی ہے کہ اس

میں قوت فعل اور کیفیات فاعلیہ پائی جائیں تاکہ وہ زوجیت کے فعلی پہلو کا کام بخوبی ادا کرسکے اور منفعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں انفعال اور کیفیات انفعالیہ بدرجۂ اتم موجود ہوں تاکہ وہ زوجیت کے انفعالی اور قبولی پہلو کی خدمت باحسن وجوہ بجا لاسکے۔ ایک معمولی مشین کے پرزے کو بھی اگر کوئی شخص اس کے اصلی مقام سے ہٹا دے اور اس سے وہ کام لینا چاہے جس کے لیے وہ دراصل بنایا ہی نہیں گیا ہے، تو وہ احمق اور اناڑی سمجھا جائیگا۔ اول تو اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی ہی نہ ہوگی، اور اگر وہ بہت زور لگائیگا تو بس اتنا کرسکے گا کہ مشین کو توڑ دے۔ ایسا ہی حال کائنات کی اس عظیم الشان مشین کا بھی ہے۔ جو احمق اور اناڑی ہیں وہ اس کے زوج فاعل کو زوج منفعل کی جگہ یا زوج منفعل کو زوج فاعل کی جگہ رکھنے کا خیال کرسکتے ہیں اور اس کی کوشش کرکے اور اس میں کامیابی کی امید رکھ کر مزید حماقت کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں، مگر اس مشین کا صانع تو ہرگز ایسا نہ کرے گا۔ وہ تو فاعل پرزے کو فعل ہی کی جگہ رکھے گا، اور اسی حیثیت سے اس کی تربیت کرے گا۔ اور منفعل پرزے کو انفعال ہی کی جگہ رکھے گا اور اس میں انفعالی استعداد ہی کو پرورش کرنے کا انتظام کرے گا۔

۴ فعل اپنی ذات میں قبول و انفعال پر ایک فضیلت رکھتا ہے۔ یہ فضیلت عزت کے معنی میں نہیں ہے کہ انفعال اس کے مقابلہ میں ذلیل ہو، بلکہ یہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے۔ جو شئے کسی دوسری شئے پر فعل کرتی ہے وہ اسی وجہ سے کرتی ہے کہ وہ اس پر غالب ہے، اُس کے مقابلہ میں طاقت ور ہے اور اس پر اثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اور جو شئے اس کے فعل کو قبول کرتی اور اس سے منفعل ہوتی ہے اس کے قبول و انفعال کی وجہ یہی ہے کہ وہ مغلوب ہے، اس کے مقابلہ میں کمزور ہے، اور متاثر ہونے کی استعداد رکھتی ہے جس طرح وقوع فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے، اُسی طرح

یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبول اثر کی استعداد ہو کیونکہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ حاصل نہ ہو تو ان میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کرے گا۔ اور سرے سے فعل واقع ہی نہ ہوگا۔ اگر کپڑے میں بھی وہی سختی ہو جو سوئی میں ہے تو سینے کا فعل پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر زمین میں وہ نرمی نہ ہو جس کی وجہ سے وہ کدال اور ہل کا غلبہ قبول کرتی ہے تو زراعت اور تعمیر ناممکن ہے، غرض دنیا میں جتنے فعال واقع ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی واقع نہیں ہو سکتا اگر فاعل کے مقابلہ میں ایک منفعل نہ ہو اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔ پس زوجین میں سے زوج فاعل کی طبیعت کا اقتضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدت اور تحکم ہو جس کو مردانگی اور رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجا لانے کے لیے اس کا ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس زوج منفعل کی فطرت انفعالیہ کا یہی اقتضا ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تاثر ہو جسے انوثت یا نسائیت کہا جاتا ہے، کیونکہ زوجیت کے انفعالی پہلو میں یہی صفات اس کو کامیاب بنا سکتی ہیں جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ یا تو فاعل کی ذاتی فضیلت کو عزت کا ہم معنی سمجھ کر منفعل کو بالذات ذلیل قرار دے بیٹھتے ہیں یا سرے سے اس فضیلت کا انکار کرکے منفعل میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو فاعل میں ہونی چاہئیں لیکن جس انجینیر نے ان دونوں پرزوں کو بنایا ہے وہ ان کو مشین میں اس طور پر نصب کرتا ہے کہ عزت میں دونوں یکساں اور تربیت و عنایت میں دونوں برابر مگر فعل و انفعال کی طبیعت جس غالبیت و مغلوبیت کی مقتضی ہے وہی ان میں پیدا ہو تاکہ وہ تزویج کے منشاء کو پورا کر سکیں، نہ یہ کہ دونوں ایسے پتھر بن جائیں جو ٹکرا تو سکتے ہیں مگر آپس میں کوئی امتزاج اور کوئی ترکیب قبول نہیں کر سکتے

یہ وہ اصول ہیں جو زوجیت کے ابتدائی مفہوم ہی سے حاصل ہوتے ہیں محض ایک ذی وجود ہونے کی حیثیت سے عورت اور

مرد کا زوج زوج ہونا ہی اس کا مقتضی ہے کہ ان کے تعلقات میں یہ اصول مرعی رکھے جائیں
چنانچہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ فاطر السموات والارض نے جو قانون معاشرت بنایا ہے
اس میں ان تینوں کی پوری رعایت کی گئی ہے۔

انسان کی حیوانی فطرت اور اس کے مقتضیات | اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ عورت اور مرد کا وجود محض ایک مادی وجود ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک حیوانی وجود بھی ہے۔ اس حیثیت سے ان کا زوج زوج ہونا کس چیز کا مقتضی ہے؟ قرآن کہتا ہے:۔

جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ (الشوریٰ)	اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں سے بھی جوڑے بنائے اس طریقہ سے وہ تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔
نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (بقرہ: ۲۸)	تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔

پہلی آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے جوڑے بنانے کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس کا مشترک مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے زوجی تعلق سے تناسل کا سلسلہ جاری ہو۔ دوسری آیت میں عام حیوانات سے الگ کرکے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انواع حیوانات میں سے اس خاص نوع کے زوجین میں کھیتی اور کسان کا سا تعلق ہے۔ یہ ایک حیاتی حقیقت Biological fact) ہے، اور حیاتیات کے نقطۂ نظر سے بہترین تشبیہ جو عورت اور مرد کو دی جا سکتی ہے وہ یہی ہے۔ ان دونوں آیتوں سے تین مزید اصول حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کی طرح انسان کے جوڑے بھی اس مقصد کے لیے بنائے ہیں کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ یہ انسان کی حیوانی فطرت کا مقتضا ہے جس کی رعایت ضروری ہے۔ خدا نے نوع انسانی کو اسلیے پیدا نہیں کیا ہے کہ اس کے چند افراد بن

اپنے نفس کی پرورش کریں اور ختم ہو جائیں، بلکہ اس کا ارادہ ایک اجل معین تک اس نوع کو باقی رکھنے کا ہے۔ اور اس نے انسان کی حیوانی فطرت میں صنفی میلان اسی لیے رکھا ہے کہ اس کے زوجین باہم ملیں اور خدا کی زمین کو آباد رکھنے کے لیے اپنی نسل جاری کریں۔ پس جو قانون خدا کی طرف سے ہوگا وہ صنفی میلان کو کچلنے اور فنا کرنے والا نہیں ہو سکتا، اس سے نفرت اور کلی اجتناب کی تعلیم دینے والا نہیں ہو سکتا؛ بلکہ اس میں لازماً ایسی گنجائش رکھی جائے گی کہ انسان اپنی فطرت کے اس اقتضا کو پورا کر سکے۔

۲۔ عورت اور مرد کو کھیتی اور کسان سے تشبیہ دیکر یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زوجین کا تعلق دوسرے حیوانات کے زوجین سے مختلف ہے۔ انسانی حیثیت سے قطع نظر، حیوانی اعتبار سے بھی ان دونوں کی ترکیب جسمانی اس طور پر رکھی گئی ہے کہ ان کے تعلق میں وہ پائداری ہونی چاہیے جو کسان اور اس کے کھیت میں ہوتی ہے۔ جس طرح کھیتی میں کسان کا کام محض تخم ریزی کر دینا نہیں ہے بلکہ اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کو پانی دے، کھاد مہیا کرے اور اس کی حفاظت کرتا رہے، اسی طرح عورت بھی وہ زمین نہیں ہے جس میں ایک جانور چلتے پھرتے کوئی بیج پھینک جائے اور وہ ایک خودرو درخت اگا دے بلکہ جب وہ بار ور ہوتی ہے تو درحقیقت اس کی محتاج ہوتی ہے کہ اس کا کسان اس کی پرورش اور اس کی رکھوالی کا پورا بار سنبھالے۔

۳۔ انسان کے زوجین میں جو صنفی کشش ہے وہ حیاتی اعتبار سے اسی نوع کی ہے جو دوسری انواع حیوانی میں پائی جاتی ہے، ایک صنف کا ہر فرد صنف مقابل کے ہر فرد کی طرف حیوانی میلان رکھتا ہے، اور تناسل کا زبردست داعیہ جو ان کی سرشت میں رکھا گیا ہے، دونوں صنفوں کے ان تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے جن میں تناسل

کی صلاحیت بالفعل موجود ہو۔ پس فاطر کائنات کا بنایا ہوا قانون، انسان کی حیوانی فطرت کے اس کمزور پہلو سے بے پروا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کی طرف ایسا شدید میلان چھپا ہوا ہے جو تحفظ کی خاص تدابیر کے بغیر قابو میں نہیں رکھا جا سکتا، اور ایک مرتبہ اگر وہ بے قابو ہو جائے تو انسان کو پورا حیوان بلکہ حیوانات میں بھی سب سے ارذل بن جانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔

فطرت انسانی اور اس کے مقتضیات جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں طبیعت حیوانیہ، خلقت انسانی کی زمین اور بنیاد کے طور پر ہے، اور اسی زمین پر انسانیت کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ انسان کے جسم اور اس کی نوع کو باقی رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سے ہر ایک کی خواہش اور ہر ایک کے حصول کی استعداد اللہ تعالیٰ نے اس کی سرشت میں رکھ دی ہے اور فطرت الٰہی کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان خواہشات میں سے کسی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا جائے یا ان استعدادات میں سے کسی استعداد کو فنا کر دیا جائے کیونکہ یہ سب چیزیں بہرحال ضروری ہیں اور ان کے بغیر انسان اور اس کی نوع زندہ نہیں رہ سکتی۔ البتہ فطرت حق یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے اور ان استعدادات سے کام لینے میں حیوانی طریقہ نہ اختیار کرے، بلکہ اس کی انسانی سرشت جن امور کی مقتضی ہے اور اس میں جن فوق الحیوانی امور کی طلب رکھی گئی ہے، ان کے لحاظ سے اس کا طریقہ انسانی ہونا چاہیے۔ اسی غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدود شرعی مقرر فرمائی ہیں، تاکہ انسان کے افعال کو ایک ضابطہ کا پابند بنایا جائے، اور اس کے ساتھ یہ تنبیہ کر دی گئی ہے کہ اگر افراط و تفریط کی صورت میں ان حدود سے تجاوز کرو گے تو اپنے آپ کو خود تباہ کر لو گے وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ

ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔ (الطلاق : ۱)۔

اب دیکھیے کہ صنفی معاملات میں قرآن مجید انسانی فطرت کی کن خصوصیات اور کن مقتضیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۱) دونوں صنفوں کے درمیان جس قسم کا تعلق انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اس کی تشریح یہ ہے :۔

خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم : ۲) — اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان مودت اور رحمت رکھ دی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ ۲۳) — وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

اس سے پہلے جس آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے لیے جوڑے بنانے کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا تھا، اس تخلیق زوجین کا مقصد صرف بقائے نسل بتایا گیا تھا۔ اب حیوان سے الگ کرکے انسان کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس میں زوجیت کا ایک اور مقصد بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور انس کا تعلق ہو۔ دل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو، وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریک رنج و راحت ہوں، ان کے درمیان ایسی معیت اور دائمی وابستگی ہو جیسی لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کا یہی تعلق انسانی تمدن کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے جیسا کہ ہم تفصیل بیان کرچکے ہیں۔ اس کے ساتھ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا سے اس طرف بھی اشارہ کردیا گیا کہ عورت کی ذات میں مرد کے لیے سرمایہ سکون و راحت ہے، اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جد و جہد اور ہنگامہ عمل کی مشقتوں بھری دنیا میں سکون و راحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے جس کی اہمیت کو مادی منفعتوں کی خاطر اہل مغرب نے نظرانداز

کر دیا ہے، حالانکہ تمدن و عمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس شعبے کی بھی ہے، اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔

(۲) یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضی نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے جو اولاد پیدا ہو اس کے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلق ہو۔ فطرتِ الٰہی نے اس کے لیے انسان کی اور خصوصاً عورت کی جسمانی ساخت اور حمل و رضاعت کی طبعی صورت ہی میں ایسا انتظام کیا ہے کہ اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہو جاتی ہے، چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهُ فِيْ عَامَيْنِ (لقمٰن : ۲)	اس کی ماں نے اس کو جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر پیٹ میں رکھا پھر دو سال کے بعد وہ اس کی چھاتی سے جدا ہوا
حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف)	اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا، تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھٹانے میں تیس مہینے صرف ہوئے۔

ایسا ہی حال مرد کا ہے، اگرچہ اولاد کی محبت میں وہ عورت سے کمتر ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ (آل عمران : ۲)۔	لوگوں کے لیے خوش آیند ہے ان مرغوب چیزوں کی محبت جیسے عورتیں اور اولاد۔

یہی فطری محبت انسان اور انسان کے درمیان خونی اور صہری رشتے قائم کرتی ہے، ان رشتوں سے خاندان اور خاندانوں سے قبائل اور قومیں بنتی ہیں، اور ان کے تعلقات سے تمدن وجود میں آتا ہے :۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاۗءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ	اور وہ خدا ہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر

نَسَبًا وَّصِهْرًا۔ (الفرقان: ۵) اس کو نسب اور شادی بیاہ کا رشتہ بنایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا (الحجرات: ۲) لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

پس ارحام اور انساب اور مصاہرت کے رشتے دراصل انسانی تمدن کے ابتدائی اور طبعی مؤسسات ہیں اور ان مؤسسات کے قیام کا انحصار اس پر ہے کہ اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو اور انساب محفوظ ہوں۔

۳۔ انسانی فطرت کا اقتضا یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کے نتائج اور اپنی گاڑھی کمائی میں سے اگر کچھ چھوڑے تو اپنی اولاد اور اپنے ان عزیزوں کے لیے چھوڑے، جن کے ساتھ وہ تمام عمر خونی اور رحمی رشتوں میں بندھا رہا ہے۔

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللهِ۔ (الانفال: ۱۰) اور اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حق دار ہیں۔

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ (الاحزاب۔ ۱) جن کو تم منہ بولا بیٹا بنا لیتے ہو اُن کو خدا نے تمہارا بیٹا نہیں بنایا ہے۔

پس تقسیم میراث کے لیے بھی تحفظ انساب کی ضرورت ہے۔

۴۔ انسان کی فطرت میں حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کے جسم کے بعض حصے ایسے ہیں جن کے چھپانے کی خواہش خدا نے اس کی جبلت میں پیدا کی ہے، اور یہی جبلّی خواہش ہے جس نے ابتدا سے انسان کو کسی نہ کسی نوع کا لباس اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس باب میں قرآن قطعیت کے ساتھ جدید نظریہ کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم کے جن حصوں میں مرد

اور عورت کے لیے صنفی جاذبیت ہے، ان کے اظہار میں شرم کرنا اور ان کو چھپانے کی کوشش کرنا، انسانی فطرت کا اقتضا ہے، البتہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ وہ ان کو کھول دے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْآتِهِمَا... فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف: ۲)۔

پھر شیطان نے آدم اور ان کی بیوی کو بہکایا تاکہ ان کے جسم میں سے جو کچھ ان سے چھپایا گیا تھا اس کو ان پر ظاہر کر دے.... پس جب انہوں نے اس شجر کا مزا چکھا تو ان پر ان کے جسم کے پوشیدہ حصے کھل گئے اور وہ ان کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے

پھر قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے لباس اسی لیے اتارا ہے کہ وہ تمہارے لیے ستر پوشی کا ذریعہ بھی ہو اور زینت کا ذریعہ بھی مگر محض ستر چھپا لینا کافی نہیں، اس کے ساتھ ضروری ہے کہ تمہارے دلوں میں تقویٰ بھی ہو۔ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف: ۳)۔

اسلامی نظم معاشرت کے ارکان: اسلامی نظام معاشرت کے اساسی تصورات ہیں، ان تصورات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب اُس نظام معاشرت کی تفصیلی صورت ملاحظہ کیجیے جو ان تصورات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔

ضابطۂ ازدواج: تنظیم معاشرت کے سلسلہ میں سب سے اہم سوال جیسا کہ ہم کسی دوسرے موقع پر بیان کر چکے ہیں، صنفی میلان کو انتشار عمل سے روک کر ایک ضابطہ میں لانے کا ہے، کیونکہ اس کے بغیر تمدن کی شیرازہ بندی ہی نہیں ہو سکتی، اور اگر ہو بھی جائے تو اس شیرازے کو بکھرنے اور انسان کو شدید اخلاقی و ذہنی انحطاط سے بچانے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس غرض کے لیے اسلام نے عورت اور مرد کے تعلقات کو مختلف حدود کا پابند کر کے ایک مرکز پر سمیٹ دیا ہے۔ وہ ان کو نظام

مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کیلیے حرام کرتا ہے جو باہم ملکر رہنے یا نہایت قریبی تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں، مثلاً ماں اور بیٹا، باپ اور بیٹی، بھائی اور بہن، پھوپھی اور بھتیجا، چچا اور بھتیجی، خالہ اور بھانجا، ماموں اور بھانجی، سوتیلا باپ اور بیٹی، سوتیلی ماں اور بیٹا، ساس اور داماد، خسر اور بہو، سالی اور بہنوئی (بہن کی زندگی میں)، اور رضاعی رشتہ دار (سورۂ نساء، رکوع ۴)۔ ان تعلقات کی حرمت قائم کرکے ان کو صنفی میلان سے اس قدر پاک کردیا گیا ہے کہ ان رشتوں کے مرد اور عورت یہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتے ہیں (بجز ایسے خبیث طینت بہائم کے جن کی بہیمت کسی اخلاقی ضابطہ کی حد میں رہنا قبول نہیں کرتی)۔ اس حد بندی کے بعد دوسری قید یہ لگائی گئی کہ ایسی تمام عورتیں بھی حرام ہیں جو بالفعل کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہوں (وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ (سورۃ نساء: ۴)ان کے بعد جو عورتیں باقی بچتی ہیں ان کے ساتھ بھی ہر قسم کے بے ضابطہ صنفی تعلق کو حرام کر دیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۴) زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی برا چلن ہے۔

اس طرح حدود و قیود لگا کر صنفی انتشار کے تمام راستے بند کردیے گئے۔ مگر انسان کی حیوانی سرشت کے اقتضاء اور کارخانۂ قدرت کے مقرر طریقہ کو جاری رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھولنا بھی ضرور تھا، سو وہ دروازہ نکاح کی صورت میں کھولا گیا، اور کہدیا گیا کہ اس ضرورت کو تم پورا کرو، مگر منتشر اور بے ضابطہ تعلقات میں نہیں، چوری چھپے بھی نہیں، کھلے بندوں بے حیائی کے طریقہ پر بھی نہیں، بلکہ باقاعدہ اعلان و اظہار کے ساتھ تاکہ تمہاری سوسائٹی میں یہ بات معلوم اور مسلّم ہوجائے کہ فلاں مرد اور عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ ..... فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (النساء : ۴)۔

ان عورتوں کے سوا جو عورتیں ہیں، تمہارے لیے حلال کیا گیا کہ تم اپنے اموال کے بدلے میں (مہر دے کر) سے احصان (نکاح) کا باضابطہ تعلق قائم کرو کہ آزاد شہوت رانی کا ..... پس ان عورتوں کے متعلقین کی رضامندی سے ان کے ساتھ نکاح ..... اس طرح کہ وہ قید نکاح میں ہوں نہ یہ کہ کھلے بندوں یا چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں

یہاں اسلام کی شان اعتدال دیکھیے کہ جو صنفی تعلق دائرۂ ازدواج کے باہر حرام اور قابل نفرت تھا وہی دائرۂ ازدواج کے اندر نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، کار ثواب ہے، اس کو اختیار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس سے اجتناب کرنے کو ناپسند کیا جاتا ہے اور زوجین کا ایسا تعلق ایک عبادت بن جاتا ہے حتّٰی کہ اگر عورت اپنے شوہر کی جائز خواہش سے بچنے کے لیے نفل روزہ رکھے، یا نماز و تلاوت میں مشغول ہو جائے تو وہ الٹی گنہگار ہوگی۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند حکیمانہ اقوال ملاحظہ ہوں:۔

عَلَیْکُمْ بِالباءۃ فانہ اغضّ للبصر و احصن للفرج فمن لم یستطع منکم الباءۃ فعلیہ بالصوم فان الصوم لہ وجاء (الترمذی ابواب النکاح۔ و فی ھذا المعنی حدیث فی کتاب النکاح للبخاری)۔

تم کو نکاح کرنا چاہیے کیونکہ وہ آنکھوں کو شرارت سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ اور جو شخص تم میں سے نکاح کی قدرت نہ رکھتا ہو اس کو روزہ رکھنا چاہیے کیونکہ وہ شہوت کو دبانے والا ہے۔

واللہ انی لاخشاکم للہ و اتقاکم لہ لکنی اصوم و افطر و اصلی و ارقد

بخدا کہ میں خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے میں تم سب سے بڑھ کر ہوں، مگر مجھے

واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (بخاری کتاب النکاح)۔	دیکھو کہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور راتوں کو سوتا بھی ہوں،

اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ سے اجتناب کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

لاتصوم المرأۃ وبعلها شاهدا لا باذنه (بخاری باب صوم المرأۃ باذن زوجها)	عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کے اذن کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔
اذا باتت المرأۃ مهاجرۃ فراش زوجها لعنتها الملائکة حتی ترجع (بخاری کتاب النکاح)۔	جو عورت اپنے شوہر سے اجتناب کرکے اس سے الگ رات گذارے اس پر ملائکہ لعنت بھیجتے ہیں جب تک کہ وہ رجوع نہ کرے۔
اذا رأی احدکم امرأۃ فاعجبته فلیات اهله فان معها مثل الذی معها (ترمذی۔ باب ما جاء فی الرجل یری المرأۃ فتعجبه)	جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھ لے اور اس کے حسن سے متاثر ہو تو اپنی بیوی کے پاس چلا جائے کیونکہ اس کے پاس بھی وہی ہے جو اس کے پاس تھا۔

ان تمام احکام و ہدایات سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ صنفی انتشار کے تمام دروازے مسدود کیے جائیں، زوجی تعلقات کو دائرۂ ازدواج کے اندر محدود کیا جائے، اس دائرہ کے باہر جس حد تک ممکن ہو کسی قسم کی صنفی تحریکات نہ ہوں، اور جو تحریکات خود طبیعت کے اقتضاء یا اتفاقی حوادث سے پیدا ہوں ان کی تسکین کے لیے ایک مرکز بنا دیا جائے، یعنے عورت کے لیے اس کا شوہر اور مرد کے لیے اس کی بیوی۔ اس طرح انسان تمام غیر طبعی اور خود ساختہ ہیجانات اور انتشار عمل سے بچ کر اپنی مجتمع قوت (Conservated energy) کے ساتھ نظام تمدن کی

خدمت کرے، اور وہ صنفی محبت اور کشش کا مادہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کارخانے کو چلانے کے لیے ہر مرد و عورت میں پیدا کیا ہے، تمام تر ایک خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام میں صرف ہو۔ ازدواج ہر حیثیت سے پسندیدہ کیونکہ وہ فطرت انسانی اور فطرت حیوانی دونوں کے منشا اور قانون الٰہی کے مقصد کو پورا کرتا ہے، اور ترک ازدواج ہر حیثیت سے ناپسندیدہ، کیونکہ وہ دو برائیوں میں سے ایک برائی کا حامل ضرور ہوگا، یا تو انسان قانون فطرت کے منشا کو پورا ہی نہ کرے گا اور اپنی قوتوں کو فطرت سے لڑنے میں ضائع کر دیگا، یا پھر وہ اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر غلط اور ناجائز طریقوں سے اپنی خواہشات کو پورا کرے گا۔ (باقی)

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ

قیمت فی پرچہ

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

ترجمان القرآن [illegible]

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ جلد ۸ ۔ عدد ۵

ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور چلانے کی کونسی خاص ضرورت ہے؟

یہ ایسا سوال تھا جس پر ابتدا ہی میں کافی توجہ کرنے کی ضرورت تھی جب یونیورسٹی قائم کی جارہی تھی اس وقت سب سے پہلے اسی بات پر غور کرنا چاہیے تھا کہ ہم کو ایک علٰحدہ یونیورسٹی کی کیا ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کی کیا سبیل ہے؟ مگر کسی نقاد نے آج کل کے مسلمانوں کی تعریف میں شاید سچ ہی کہا ہے کہ یہ کام پہلے کرتے ہیں اور سوچتے بعد میں ہیں۔ جن لوگوں کو یونیورسٹی بنانے کی دھن تھی انھیں بس یونیورسٹی ہی بنانے کی دھن تھی، اس کا کوئی نقشہ ذہن میں نہ تھا۔ یہ سوال سرے سے پیش نظر ہی نہ تھا کہ ایک "مسلم" یونیورسٹی کیسی ہونی چاہیے اور کن خصوصیات کی بنا پر کسی یونیورسٹی کو "مسلم یونیورسٹی" کہا جاسکتا ہے۔ اس عمل بلا فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بس ویسی ہی ایک یونیورسٹی علیگڈھ میں بھی قائم ہوگئی جیسی ایک آگرہ میں اور دوسری لکھنؤ میں اور تیسری ڈھاکہ میں ہے۔ لفظ "مسلم" کی رعایت سے کچھ دینیات کا حصہ بھی نصاب میں شریک کر دیا گیا۔ تاکہ جب کوئی دریافت کرے کہ اس یونیورسٹی کے نام میں لفظ "مسلم" کیوں رکھا گیا ہے تو اس کے سامنے قدوری اور منیۃ المصلی اور ہدایہ بطور سند اسلامیت پیش کر دی جائیں۔ مگر درحقیقت یونیورسٹی کی تاسیس و تشکیل میں کوئی ایسی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی جس کی بنا پر وہ دوسری سرکاری یونیورسٹیوں سے ممتاز ہوکر حقیقی معنوں میں ایک "اسلامی یونیورسٹی" ہوتی۔

ممکن ہے کہ ابتدا میں تعمیر کے شوق اور جوش نے صحیح اور مناسب نقشہ پر غور کرنے کی مہلت نہ دی ہو لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یونیورسٹی قائم ہوئے پندرہ سال ہوگئے اور اس دوران

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

مسلم یونیورسٹی کورٹ نے اپنے گذشتہ سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء) میں ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے جو ایک عرصہ سے توجہ کا محتاج تھا، یعنی دینیات اور علوم اسلامیہ کے ناقص طرز تعلیم کی اصلاح اور یونیورسٹی کے طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت۔ جہاں تک جدید علوم و فنون اور ادبیات کی تعلیم کا تعلق ہے حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں اس کا بہتر سے بہتر انتظام موجود ہے، کم از کم اتنا ہی بہتر جتنا خود علی گڈھ میں ہے محض اس غرض کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک الگ یونیورسٹی قائم کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ ایک مستقل قومی یونیورسٹی قائم کرنیکا تخیل جس بنا پر مسلمانوں میں پیدا ہوا، اور جس بنا پر اس تخیل کو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ "مسلمان" بھی رہنا چاہتے ہیں۔ یہ غرض سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں سے پوری نہیں ہوتی۔ اسی کیلیے مسلمانوں کو اپنی ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی اپنی یونیورسٹی بھی یہ غرض پوری نہ کرے، اگر وہاں سے بھی ویسے ہی گریجویٹ نکلیں جیسے سرکاری یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں، اگر وہاں بھی محض دیسی "صاحب لوگ" یا ہندی وطن پرست یا اشتراکی ملاحدہ پیدا ہوں، تو لاکھوں روپیہ کے صرف سے

ہیں ہمارے تعلیمی ناخداؤں نے ایک مرتبہ بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کی اصلی منزلِ مقصود کیا تھی اور ان کا راہرو پشت بمنزل کدھر جا رہا ہے۔ ابتدا سے حالات صاف بتا رہے ہیں کہ یہ درسگاہ نہ اس ڈھنگ پر چل رہی ہے جس پر ایک اسلامی درسگاہ کو چلنا چاہیے اور نہ وہ نتائج پیدا کر رہی ہے جو دراصل مطلوب تھے۔ اس کے طلبہ اور ایک سرکاری یونیورسٹی کے طلبہ میں کوئی فرق نہیں۔ اسلامی کیرکٹر، اسلامی اسپرٹ، اسلامی طرزِ عمل مفقود ہے۔ اسلامی تفکر اور اسلامی ذہنیت ناپید ہے۔ ایسے طلبہ کی تعداد شاید ایک فی صدی بھی نہیں جو اس یونیورسٹی سے ایک مسلمان کی سی نظر اور مسلمان کا سا نصب العین لے کر نکلے ہوں اور جن میں یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت نے یہ قابلیت پیدا کی ہو کہ اپنے علم اور اپنے قوائے عقلیہ سے کام لے کر ملت اسلامیہ میں زندگی کی کوئی نئی روح پھونک دیتے، یا کم از کم اپنی قوم کی کوئی قابلِ ذکر علمی و عملی خدمت ہی انجام دیتے۔ نتائج کی نوعیت اگر محض سلبی ہی رہتی تب بھی بساغنیمت ہوتا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور زیرِ تعلیم طلبہ میں ایک بڑی تعداد ایسے نوجوانوں کی پائی جاتی ہے جن کا وجود اسلام اور اسلامی تہذیب اور مسلمان قوم کے لیے نفع نہیں بلکہ الٹا نقصان ہے یہ لوگ روحِ اسلامی سے ناآشنا ہی نہیں بلکہ اس سے قطعاً منحرف ہو چکے ہیں۔ ان میں مذہب کی طرف سے صرف سردمہری ہی نہیں بلکہ نفرت سی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا بنا دیا گیا ہے کہ وہ تشکیک کی حد سے گذر کر انکار کے مقام پر پہنچ گئے ہیں، اور ان اصول اولیہ کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

حال ہی میں خود مسلم یونیورسٹی کے ایک فارغ التحصیل نوجوان نے جو محض اپنی سلامتِ طبع کی وجہ سے "مرتد" ہوتے ہوتے رہ گئے، اپنے ایک پرائیویٹ خط میں وہاں کے حالات

کی طرف چند ضمنی اشارات کیے ہیں۔ یہ خط اشاعت کے لیے نہیں ہے، اور نہ خصوصیت کے ساتھ علیگڈھ کی کیفیت بیان کرنے کے لیے لکھا گیا ہے، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یونیورسٹی کی باطنی کیفیت کا نہایت صحیح مرقع ہے۔ صاحب خط نے خود اپنے ذہنی ارتقار کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"علی گڈھ میں مجھے اسلامی دنیا کے خارجی فتنے یعنی تفیخ کی آخری ارتقائی شکل یعنی کمیونزم سے دوچار ہونا پڑا۔ میں پہلے مغربیت کو کوئی خطرناک چیز دسمجھتا تھا لیکن علیگڈھ کے تجربات نے مجھے حقیقت سے روشناس کرادیا۔ اسلامی ہند کے اس مرکز میں ایک خاصی تعداد ایسے افراد کی موجود ہے جو اسلام سے مرتد ہوکر کمیونزم کے پرجوش مبلغ بن گئے ہیں۔ اس جماعت میں اساتذہ میں سے کافی لوگ شامل ہیں۔ اور یہ اساتذہ تمام ذہین اور ذکی نوخیز طلبہ کو اپنے جال میں پھانستے ہیں۔ ان لوگوں نے کمیونزم اس لیے اختیار نہیں کیا کہ وہ غریبوں اور کسانوں اور مزدوروں کی حمایت اور امداد کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کی عملی مسرفانہ زندگیاں ان کی بناوٹی باتوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ وہ ایک عالمگیر تحریک کے سایہ میں اپنی اخلاقی کمزوریوں اور اپنے لمحدانہ رجحانات طبع اور اپنی Loose-thinking کو Justify کر سکیں۔ کمیونزم نے پہلے مجھے بھی دھوکہ دیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ اسلام ہی کا ایک Unauthorised Edition ہے لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام کے اور اس کے بنیادی نصب العین میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت صرف ناقص ہی نہیں ہے، بلکہ ان مقاصد کے بالکل برعکس نتائج پیدا کر رہی ہے جن کے لیے سید احمد خاں

اور محسن الملک اور وقار الملک نے ایک مسلم یونیورسٹی کا خواب دیکھا تھا اور جن کے لیے مسلمانوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر جوش وخروش کے ساتھ اس خواب کی عملی تعبیر کا خیر مقدم کیا تھا۔

آپ اُس انجنیر کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جس کی بنائی ہوئی موٹر آگے چلنے کے بجائے پیچھے کی جانب دوڑتی ہو؟ اور وہ انجنیر آپ کی نگاہ میں کیسا ماہر فن ہوگا جو اپنی بنائی ہوئی موٹر کو مسلسل اور پیہم الٹی حرکت کرتے دیکھتا رہے اور پھر بھی محسوس نہ کرے کہ اس کے نقشے میں کوئی خرابی ہے؟ غالباً ان صفات کا کوئی میکانیکل انجنیر تو آپ کو نہ مل سکے گا۔ لیکن آپ کی قوم کے تعلیمی انجنیر جس درجہ کے ماہر فن ہیں اس کا اندازہ آپ اس امر واقعہ سے کر لیجیے کہ وہ ایک ایسی تعلیمی مشین بنانے بیٹھے تھے جس کو اسلامی نصب العین کی جانب حرکت دینا مقصود تھا، مگر جو مشین انہوں نے بنائی وہ بالکل جانب مخالف میں حرکت کرنے لگی، اور مسلسل پندرہ سال تک حرکت کرتی رہی، اور ایک دن بھی ان کو محسوس نہ ہوا کہ ان کے نقشہ تعمیر میں کیا غلطی ہے، بلکہ کوئی غلطی ہے بھی یا نہیں۔

بعد از خرابی بسیار اب یونیورسٹی کورٹ کو یاد آیا ہے کہ :-

"مسلم یونیورسٹی کے مقاصد اوّلیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں اسلامی روح پیدا کرے۔"

اور اس غرض کے لیے اس نے سات اشخاص کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ :-

"تمام صورت حال کا جائزہ لے اور دینیات علوم اسلامیہ کی تعلیم کے لیے ایسے جدید اور ترقی یافتہ ذرائع اختیار کرنے کی سفارش کرے جو ضروریات زمانہ سے مناسبت رکھتے ہوں اور جن سے اسلامی تعلیمات کو زیادہ اطمینان بخش طریق پر پیش کیا جا سکے"

بڑی خوشی کی بات ہے۔ نہایت مبارک بات ہے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ اگر اب بھی ہمارے تعلیمی انجینیروں نے یہ محسوس کر لیا ہو کہ ان کی تعلیمی مشین غلط نقشے پر بنی ہے اور اپنے مقصد ایجاد کے خلاف اس کے چلنے کی اصلی وجہ محض بخت و اتفاق نہیں بلکہ نقشہ تاسیس و تشکیل کی خرابی ہے تو ہم خوشی کے ساتھ یہ کہنے لیے تیار ہیں کہ مضیٰ ما مضیٰ، اٹھو، اب اپنے پچھلے نقشے کی غلطیوں کو سمجھ لو اور ایک صحیح نقشہ اس مشین کو مرتب کرو لیکن ہمیں شبہ ہے کہ اب بھی اپنی غلطیوں کا کوئی صحیح احساس ان حضرات میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ ابھی تک وہ اس امر کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کے نقشے میں کوئی بنیادی خرابی ہے۔ محض نتائج کی خوفناک ظاہری صورت ہی سے وہ متاثر ہوئے ہیں، اور بالکل سطحی نگاہ سے حالات کو دیکھ رہے ہیں۔

خدا کرے کہ ہمارا یہ شبہ غلط ہو۔ مگر پچھلے تجربات ہم کو ایسا ہی شبہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں پچھلی صدی کے وسط میں جب دو صدیوں کا بہیم انحطاط ایک خوفناک سیاسی انقلاب پر منتہی ہوا تھا اس وقت مسلمانوں کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو سنبھالنے کے لیے پردۂ غیب سے چند ناخدا پیدا ہو گئے تھے۔ وہ وقت زیادہ غور و خوض کا نہ تھا۔ یہ سوچنے کی مہلت ہی کہاں تھی کہ اس شکستہ جہاز کے بجائے ایک نیا اور پائیدار جہاز کس نقشے پر بنایا جائے۔ اس وقت تو صرف یہ سوال درپیش تھا کہ یہ قوم جو ڈوب رہی ہے اس کو ہلاکت سے کیونکر بچایا جائے۔ ناخداؤں میں سے ایک گروہ نے فوراً اپنے اسی پرانے جہاز کی مرمت شروع کر دی، انہی پرانے تختوں کو جوڑا، ان کے رخنوں کو بھرا اور پھٹے ہوئے بادبانوں کو رفو کر کے جیسے تیسے بن پڑا اسے ابھرنے کے قابل بنا لیا۔ دوسرے گروہ نے لپک کر ایک نیا دخانی جہاز کرایہ پر لے لیا اور ڈوبنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس پر سوار کرا دیا

اس طریقہ سے دونوں گروہ اس اچانک مصیبت کو ٹالنے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر یہ دونوں تدبیریں صرف اس حیثیت سے کامیاب تھیں کہ انہوں نے فوری ضرورت کے لحاظ سے چارہ سازی کردی اور ڈوبتوں کو ہلاکت سے بچا لیا۔ ان میں حکمت اور دانشمندی جو کچھ بھی تھی، صرف اسی حد تک تھی۔ اب جو لوگ اس وقت کے ٹل جانے کے بعد بھی انہی دونوں تدبیروں کو ٹھیک ٹھیک انہی دونوں شکلوں پر باقی رکھنا چاہتے ہیں ان کا طرز عمل حکمت و دانش کے خلاف ہے۔ نہ تو پرانا بادبانی جہاز اس قابل ہے کہ مسلمان صرف اسی پر بیٹھ کر ان قوموں سے مطابقت کرسکیں جن کے پاس اس سے ہزارگنی زیادہ تیز رفتار سے چلنے والے کلدار جہاز ہیں۔ نہ کرایہ پر لیا ہوا دخانی جہاز اس لائق ہے کہ مسلمان اس کے ذریعہ سے اپنی منزل مقصود کو پہنچ سکیں، کیونکہ اس کا ساز و سامان تو ضرور نیا ہے اور اس کی رفتار بھی تیز ہے اور وہ کلدار بھی ہے، مگر وہ دوسروں کا جہاز ہے، اس کا ڈزاین انہی کے مقاصد اور انہی کی ضروریات کے لیے موزوں ہے، اور اس کے رہنما اور ناخدا بھی وہی ہیں، لہذا اس جہاز سے ہم کبھی یہ امید نہیں کرسکتے کہ وہ ہمیں اپنی منزل مقصود کی طرف لے جائے گا، بلکہ اس کی تیز رفتاری سے الٹا خطرہ یہ ہے کہ وہ ہمیں زیادہ سرعت کے ساتھ مخالف سمت پر لے جائے گا، اور روز بروز ہمیں اپنی منزل مقصود سے دور کرتا چلا جائے گا۔ فوری ضرورت کے وقت تو وہ لوگ بھی حق بجانب تھے جنہوں نے پرانے جہاز کی مرمت کی، اور وہ بھی غلطی پر نہ تھے جنہوں نے کرایہ کے جہاز پر سوار ہو کر جان بچائی۔ مگر اب وہ بھی غلطی پر ہیں جو پرانے جہاز میں ڈٹے بیٹھے ہیں، اور وہ بھی غلطی پر ہیں جو اسی کرایہ کے جہاز پر جمے ہوئے ہیں۔

اصلی رہنما اور حقیقی مصلح کی تعریف یہ ہے کہ وہ اجتہادِ فکر سے کام لیتا ہے اور

وقت اور موقع کے لحاظ سے جو مناسب ترین تدبیر ہوتی ہے اسے اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں وہ اندھے مقلد ہوتے ہیں۔ جس طریقہ کو اس نے وقت کے لحاظ سے اختیار کیا تھا، اسی طریقہ پر یہ اس وقت کے گذر جانے کے بعد بھی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں، اور اتنا نہیں سوچتے کہ ماضی میں جو انسب تھا حال میں وہی غیر انسب ہے۔ پچھلی صدی کے رہنماؤں کے بعد اُن کے متبعین آج بھی اسی روش پر اصرار کر رہے ہیں جس پر ان کے رہنما انہیں چھوڑ گئے تھے، حالانکہ وہ وقت جس کے لیے انہوں نے وہ روش اختیار کی تھی، گذر چکا ہے۔ اب اجتہاد و فکر سے کام لے کر نیا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

بدقسمتی سے ہم کو دونوں گروہوں میں ایک بھی مجتہد نظر نہیں آتا۔ انتہائی جرأت کر کے پُرانے جہاز والوں میں سے کوئی اگر اجتہاد کرتا ہے تو بس اتنا کہ اپنے اسی پرانے جہاز میں چند بجلی کے بلب لگا لیتا ہے، کچھ نئے طرز کا فرنیچر مہیا کر لیتا ہے، اور ایک چھوٹی سی دخانی کل خرید لاتا ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ دور سے سیٹی بجا بجا کر لوگوں کو یہ دھوکہ دیتی رہے کہ یہ پرانا جہاز اب نیا ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں نئے جہاز والے اگرچہ دوسروں کے جہاز پر بیٹھے ہیں اور تیزی کے ساتھ سمت مخالف پر بہے چلے جا رہے ہیں، مگر دو چار پرانے بادبان بھی لیکر بیسویں صدی کے اس اپ ٹو ڈیٹ جہاز میں لگائے ہوئے ہیں، تاکہ خود اپنے نفس کو اور مسلمانوں کو یہ دھوکہ دے سکیں کہ یہ جہاز بھی "اسلامی جہاز" ہے اور لندن کے راستہ سے حج کعبہ کو چلا جا رہا ہے۔

اندھی تقلید اور اس کے ساتھ اجتہاد کی چھوٹی نمائش تابکے۔ ایک طوفان گذر گیا اب دوسرا طوفان بہت قریب ہے۔ ہندوستان میں ایک دوسرے سیاسی انقلاب کی بنا

پڑ رہی ہے۔ ممالک عالم میں ایک دوسرے انقلاب کے سامان ہو رہے ہیں جو بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں متوقع انقلاب کے بجائے ایک بالکل غیر متوقع اور ہزار درجہ زیادہ خطرناک انقلاب برپا کردیں یہ آنے والے انقلابات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی بہ نسبت اپنی نوعیت اور اپنی شدت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت مسلمانوں کی اعتقادی و ایمانی اور اخلاقی وعملی حالت جیسی کچھ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم نہیں سمجھتے کہ وہ ان آنے والے طوفانوں کی ایک ٹکر بھی خیریت کے ساتھ سہ سکیں گے۔ ان کا پرانا جہاز دورِ جدید کے کسی ہولناک طوفان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ شاید ایک ہی تھپیڑے میں اس کے تختے بکھر جائیں، اور اس کے بادبانوں کا تار تار الگ ہو جائے۔ رہا انکا کرایہ کا جہاز تو وہ پرانے جہاز سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جو لوگ اس پر سوار ہیں، ہمیں خوف ہے کہ طوفانی دور کا پہلا ہی تھپیڑا ان کو ملت اسلامیہ سے جدا کرکے شاید ہمیشہ کے لیے ضلالت کے قعر عمیق میں لے جائیگا، لاقدر اللہ۔ پس اب یہی وقت ہے کہ مسلمان پرانے جہاز سے بھی نکلیں اور کرایہ کے جہاز سے بھی اتریں، اور خود اپنا ایک جہاز بنائیں جس کے آلات اور کل پرزے جدید ترین ہوں، مشین موجودہ دور کے تیز سے تیز جہاز کے برابر ہو، مگر لفظ "اسلامی جہاز" کا ہو اور اس کے انجنیر اور کپتان اور دیدبان سب وہ ہوں جو منزلِ کعبہ کی راہ و رسم سے باخبر ہوں۔

استعارہ کی زبان چھوڑ کر اب ہم کچھ صاف صاف کہیں گے۔ سرسید احمد خاں مرحوم ومغفور کی قیادت میں علیگڈھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضروریات کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں، تعلیم جدید سے بہرہ مند ہوکر اپنی معاشی اور سیاسی حیثیت کو تباہی سے بچالیں، اور ملک کے جدید نظم و نسق سے استفادہ کرنے میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس وقت اس سے زیادہ کچھ دقت کرنے کا موقع نہ تھا۔ اگرچہ اس تحریک میں فوائد کے ساتھ نقصانات اور خطرات بھی تھے مگر اس

اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی۔ نہ اس وقت ایسے اسباب موجود تھے کہ اس نوع کی تعلیمی پالیسی کے مطابق عمل درآمد کیا جا سکتا۔ لہٰذا محض وقتی ضرورت کو پیش نظر رکھکر مسلمانوں کو اسی طرزِ تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا، اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔

یہ صرف ایک وقتی تدبیر تھی جو ایک آفت ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طریق پر اختیار کر لی گئی تھی۔ اب وہ وقت گذر چکا ہے جس میں فوری تدبیر کی ضرورت تھی، وہ فائدہ بھی حاصل ہو چکا ہے جو اس تدبیر سے حاصل کرنا مقصود تھا، اور وہ خطرات بھی واقعہ کی صورت میں نمایاں ہو چکے ہیں جو اس وقت صرف موہوم تھے۔ اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا تو ضرور بنا دی مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں "کالے فرنگی" پیدا کئے، اس نے ہم میں "اینگلو محمڈن" اور "اینگلو انڈین" پیدا کئے اور وہ بھی ایسے جن کے نفسیات میں "محمڈن" اور "انڈین" کا تناسب برائے نام ہی ہے۔ اس نے ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقۂ متوسط کو، جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا، صرف اتنے معاوضہ پر کہ چند عہدے، چند خطاب اور چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اب دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے؟ فی الواقع اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک "علیگڈھ" موجود ہے جہاں سے دھڑا دھڑ "اینگلو محمڈن" اور "اینگلو انڈین" نکل رہے ہیں۔ پھر یہ پس بھری فصل کاٹنے کے لیے ہم کو اپنا ایک مستقل مزرعہ رکھنے کی حاجت ہی کیا ہے؟ اور اگر درحقیقت اس حالت کو بدلنا مقصود ہے، تو ذرا ایک حکیم کی نظر سے دیکھیے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور اسکو

دور کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔

جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ اگر ہم اس کو بجنسہ لیکر اپنی نوخیز نسلوں میں پھیلائیں گے تو ان کو ہمیشہ کے لیے اسلام سے کھو دیں گے۔ آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لیکر فروع تک اور نظریات سے لیکر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے یکسر مختلف ہے۔ آپ ان کی تربیت تمام تر ایسی تہذیب کے زیر اثر کرتے ہیں جو اپنی روح اور اپنے مقاصد اور اپنے مناہج کے اعتبار سے کلیۃً اسلامی تہذیب کی ضد واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی؟ انکی سیرت اسلامی سیرت ہوگی؟ انکی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے۔ اس قسم کے عمل تعلیم کا کوئی خوشگوار پھل حاصل نہ ہوگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیے جائیں۔ مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی اسٹیمر نہ بنیگا۔

اگر فی الواقع علیگڈھ یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی بنانا ہے تو سب سے پہلے مغربی علوم و فنون کی تعلیم پر نظر ثانی کیجیے۔ ان علوم کو جوں کا توں لینا ہی درست نہیں ہے۔ طالب علموں کی لوح سادہ پر اس نوع کی تعلیم کا نقش اس طرح مرتسم ہوتا ہے کہ وہ ہر مغربی چیز پر ایمان لاتے چلے جاتے ہیں۔ تنقید کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر پیدا بھی ہوتی ہے تو فی ہزار ایک طالب علم میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہا سال کے گہرے مطالعہ سے جبکہ وہ زندگی کے آخری مرحلوں میں پہنچ جاتا ہے اور کسی علمی کام کے قابل نہیں رہتا۔ اس طرز تعلیم کو بدلنا چاہیے۔ تمام مغربی علوم کو طلبہ کے سامنے تنقید کے ساتھ پیش کیجیے، اور یہ تنقید خالص اسلامی نظر سے ہو تا کہ وہ ہر قدم پر ان کے ناقص اجزا کو چھوڑتے جائیں، اور صرف کار آمد حصوں کو لیتے چلے جائیں۔

اس کے ساتھ علوم اسلامیہ کو بھی قدیم کتابوں کے متون کا توں نہ لیجیے بلکہ ان میں سے بھی متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کر کے اسلام کے دائمی اصول اور حقیقی اعتقادات، اور غیر متبدل قوانین لیجیے، ان کی اصلی اسپرٹ دلوں میں اتاریئے اور ان کا صحیح تدبّر دماغوں میں پیدا کیجیے۔ اس غرض کے لیے آپ کو نیا نصاب تعلیم بنانا ہر چیز از سر نو بنانی ہوگی۔ قرآن اور سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔ انکے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہییں جو قرآن اور سنت کے مغز کو پا چکے ہیں۔ اسلامی قانون کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ مگر یہاں بھی پرانی کتابیں کام نہ دیں گی۔ آپ کو معاشیات کی تعلیم میں اسلامی نظم معیشت کے اصول، قانون کی تعلیم میں اسلامی قانون کے مبادی، فلسفہ کی تعلیم میں حکمت اسلامیہ کے نظریات تاریخ کی تعلیم میں اسلامی فلسفۂ تاریخ کے حقائق اور اسی طرح ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلامی عنصر کو ایک غالب اور حکمران عنصر کی حیثیت سے داخل کرنا ہوگا۔

آپ کے تعلیمی اسٹاف میں جو ملاحدہ اور متفرنجین بھر گئے ہیں انکو رخصت کیجیے۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو علوم جدیدہ میں بصیرت رکھنے کے ساتھ دل و دماغ اور نظر و فکر کے اعتبار سے پورے مسلمان ہیں۔ ان بکھرے ہوئے جواہر کو جمع کیجیے تاکہ وہ جدید آلات سے اسلامی نقشہ پر ایک سسٹم بنائیں۔ آپ کہیں گے انگریز ایسی تعمیر کی اجازت نہ دیگا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر آپ اس سے پوچھیے کہ تو پورے مسلمان اور پورے کمیونسٹ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتا ہے؟ ان دونوں میں سے ایک کو بہرحال تجھے قبول کرنا ہوگا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کا "اینگلو محمڈن" مسلمان اب زیادہ مدت تک نہیں پایا جا سکتا۔ اب اگر تو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو پورا کمیونسٹ دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی قدیم اسلام دشمنی پر جما رہ۔ نتیجہ خود تیرے سامنے آجائیگا اور اگر یہ منظور نہیں تو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں کمیونزم کی بڑھتی ہوئی وبا کا مقابلہ صحیح الفسباں نڈول اور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس وبا کو صرف ایک طاقت روک سکتی ہے اور وہ اسلام کی طاقت ہے۔

مقالات

بشارات الانبیاءؑ

نبوت محمدی صلعم کے متعلق انبیاء سابقین کی پیشینگوئیاں

(۵)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

دسویں بشارت

کتاب یسعیاہ باب ۶۵ میں لکھا ہے:۔

"میں نے ان کی طرف توجہ کی جنہوں نے مجھ سے نہ مانگا۔ انھوں نے مجھے پایا جنہوں نے مجھے نہ ڈھونڈا۔ میں نے ایک گروہ کو جو میرے نام کا نہ کہلاتا تھا کہا مجھے دیکھ مجھے دیکھ۔ میں اب تک[1] اپنے ہاتھ ایک ایسے سرکش گروہ کی طرف پھیلائے رہا جو خود اپنی اھوار کے اتباع[2] میں ایسے راستے پر چلتا ہے جو اچھا نہیں ہے ایسا گروہ جو ہمیشہ

[1] اردو ترجمہ میں "ہمیشہ اپنے ہاتھوں کو پھیلایا کیا" لکھا ہے مگر عربی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں بسطت یدیّ طول النہار۔ اور انگریزی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

I have spread out my hands all the day unto a rebellious people

سیاق عبارت اور ان تراجم کو دیکھنے سے یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ اب تک میں ایک ایسی نالائق قوم کی طرف ہاتھ پھیلائے رہا مگر اب میں اس سے ہاتھ کھینچ کر ایک دوسری قوم کی طرف توجہ کروںگا۔

[2] اردو ترجمہ کے الفاظ یہ تھے: "جو اپنی فکروں کی پیروی میں ایسی راہ چلتا ہے"۔ اس سے اصل مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔

میرے منہ پر مجھے غصہ دلاتا تھا[1] باغوں میں قربانیاں کرتا تھا اور اینٹوں پر بخور جلاتا تھا۔ جو قبروں میں رہتا تھا[2] پوشیدہ مقاموں میں راتیں کاٹتا اور سوروں کے گوشت کھاتا تھا اور نجس چیزوں کا شوربا ان کے برتنوں میں رہتا تھا۔ جو کہتا تھا۔ پرے ہی کھڑا رہ میرے نزدیک مت آ کیونکہ میں تجھ سے زیادہ پاک ہوں۔ یہ میرے لیے ایسے ہیں جیسے میری ناک میں دھواں اور دن بھر سلگتی ہوئی آگ۔ دیکھ یہ میرے آگے لکھا ہوا فیصلہ رکھا ہے[3]۔ میں چپ نہ رہوں گا بلکہ خود ان کی اپنی گود ہی میں بدلہ دوں گا۔" (آیت ۱-۶)

اس پیشین گوئی کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یسعیاہ نبی کی زبان سے اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرما رہا ہے کہ اب تک میری تمام عنایات بنی اسرائیل کی طرف مبذول رہیں۔ مگر انہوں نے سرکشی اختیار کی اور میرے پسند کیے ہوئے طریقہ کو چھوڑ کر اپنی خواہشات نفس اور غلط افکار کی پیروی میں ایسے راستوں پر چلنا شروع کر دیا جو مجھے پسند نہیں ہیں۔ وہ غیر اللہ کے لیے نذر و نیاز اور قربانیاں کرنے لگے۔ اینٹ پتھر کی یادگاروں پر خوشبوئیں جلانے لگے۔ اپنے بزرگوں کے آثار اور مقابر کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ میری عبادت ہی چھوڑ دی اور وہیں

---

[1] یہاں بھی ہم نے ترجمہ میں اصلاح کی ہے۔ بائبل کے اردو مترجم نے لکھا تھا: "میرے منہ پر مجھے کھجا کے غصہ دلاتی تھی" اس سے صحیح مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ مطلب دراصل یہ ہے کہ یہ قوم میرے سامنے ایسی ایسی حرکات کر کے مجھے غصہ دلا رہی تھی۔ [2] عربی ترجمہ میں "مدافن" اور انگریزی ترجمہ میں (Monuments) لکھا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی عبادت چھوڑ کر قبر پرستی شروع کر دی تھی اور اپنے بزرگوں کے آثار سے ان کا شغف اتنا بڑھ گیا تھا کہ مساجد اللہ سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

[3] اردو کے مترجم نے اس فقرہ کا ترجمہ "میرے آگے یہ قلم بند ہوا ہے" کیا ہے۔ عربی کے مترجم نے قد کتب امامی لکھا ہے۔ آسمانی کتابوں میں خدا کے لکھے سے مراد خدا کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ان کے مجمگٹے لگنے شروع ہوگئے۔ حرام وحلال کی تمیز ان سے جاتی رہی جن چیزوں کو میں نے حرام کیا تھا ان کو انہوں نے حلال کر لیا۔ اب میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اس قوم سے انتقام لونگا اور اس سے نظر پھیر کر ایک ایسی قوم کی طرف توجہ کرونگا جو مجھکو نہیں جانتی۔ ان کو بے مانگے ہدایت ملے گی وہ بے طلب مجھ کو پائیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ دوسری قوم کونسی ہے؟ کیا یہ یونانی ہیں؟ مگر ان کی صنم پرستی تو مشہور ہے ان کے حق میں یہ بات کیسے صادق آسکتی ہے کہ انہوں نے خدا کو پایا؟ پھر کیا یہ رومی ہیں؟ مگر وہ بھی صنم پرست تھے۔ صدیوں تک صنم پرست رہے۔ بعد میں حضرت عیسیٰ پر ایمان بھی لائے تو اس طرح کہ پچھلے بتوں کو چھوڑ کر مریم اور مسیح اور صلیب کی پرستش شروع کردی۔ بہرحال خدا کو انھوں نے بھی نہ پایا۔ اب سوائے اہل عرب کے اور کونسی قوم ایسی ہے جو خدا سے قطعاً جاہل تھی، جس نے خدا کو کبھی نہ ڈھونڈا تھا، اور خدا نے یکبیک اپنا رسول بھیج کر انہیں اپنے علم اور اپنی معرفت سے سرفراز کیا۔

گیارہویں بشارت

جس زمانہ میں بنی اسرائیل بابل کی قید میں تھے، بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر دینے سے بابل کے تمام حکیم اور کاہن عاجز رہے۔ اس موقع پر بنی اسرائیل میں سے دانیال نبی نے بادشاہ کے پاس جا کر کہا کہ میں خدا کی وحی سے تیرے خواب کی تفصیل بھی بتاؤنگا جسے تو بھول گیا ہے۔ اور اس کی تعبیر بھی بیان کرونگا۔ یہ خواب اور اس کی تعبیر کتاب دانیال کے دوسرے باب میں اس طرح مذکور ہے۔

”تو نے اے بادشاہ نظر کی اور ایک بڑی مورت دیکھی۔ وہ بڑی مورت جس کی

"رونق بے نہایت تھی تیرے سامنے کھڑی ہوئی اور اس کی صورت ہیبت ناک تھی۔ اس مورت کا سر خالص سونے کا تھا۔ اس کا سینہ اور اس کے بازو چاندی کے، اس کا شکم اور رانیں تانبے کی، اس کی ٹانگیں لوہے کی اور اس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے تھے۔ اور تو اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایک پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے کاٹ کے نکالے آپ سے آپ نکلا اور اس شکل کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے لگا اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تب لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور تابستانی کھلیان کی بھوسی کے مانند ہوئے اور ہوا انھیں اڑا لے گئی یہاں تک کہ ان کا پتہ نہ ملا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو مارا ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور تمام زمین کو بھر دیا۔"

"وہ خواب یہ ہے اور اس کی تعبیر بادشاہ کے حضور بیان کرتا ہوں۔ تو اے بادشاہ، بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس لیے کہ آسمان کے خدا نے تجھے ایک بہت بادشاہت اور توانائی اور قوت اور شوکت بخشی ہے۔ اور جہاں کہیں بنی آدم سکونت کرتے ہیں اس نے میدان کے چوپائے اور ہوا کے پرندے تیرے قابو میں کر دیے اور تجھے ان سبھوں کا حاکم کیا۔ تو ہی وہ سونے کا سر ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہوگی جو تجھ سے چھوٹی ہوگی۔ اور اس کے بعد ایک اور سلطنت تانبے کی جو تمام زمین پر حکومت کرے گی اور چوتھی سلطنت لوہے کی مانند مضبوط ہوگی اور جس طرح کہ لوہا توڑ ڈالتا ہے اور سب چیزوں پر غالب ہوتا ہے، اس لوہے کی طرح سے جو سب چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اس طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کرے گی اور کچل ڈالے گی۔ اور جو کہ تو نے دیکھا کہ اس کے پاؤں اور انگلیاں کچھ تو کمہار کی مٹی اور کچھ لوہے

کی تھیں تو اس میں تفرقہ ہوگا۔ مگر جیسا کہ تو نے دیکھا کہ اس میں لوہا گا۔ رے سے ملا ہوا تھا۔ سو لوہے کی توانائی اس میں ہوگی۔ اور جیسا کہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی اور کچھ مٹی کی تھیں سو وہ سلطنت کچھ قوی کچھ ضعیف ہوگی۔ اور جیسا تو نے دیکھا کہ لوہا گارے سے ملا ہوا ہے وے اپنے کو انسان کی نسل سے ملا دیں گے لیکن جیسے لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا ویسے ہی وے باہم میل نہ کھائیں گے۔ اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے گا جو تا ابد نیست نہ ہووے گی اور وہ سلطنت دوسری قوم کے قبضے میں نہ پڑے گی وہ ان سب مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کرے گی اور وہی تا ابد قائم رہے گی جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا اور اس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ خدا تعالیٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھایا جو آگے کو ہونے والا ہے اور یہ خواب یقینی ہے اور اس کی تعبیر بھی یقینی (آیت ۳۱ - ۴۵)۔

اس پیشنگوئی کا تعلق ان ممالک سے ہے جو اس وقت کلدانیوں کے زیر اثر تھے۔ اس مملکت میں پہلا انقلاب خود دانیال نبی کے سامنے ہوا جس کا ذکر کتاب دانیال کے پانچویں باب میں ہے۔ یہ مادیوں کی حکومت تھی اور بخت نصر کی سلطنت سے ضعیف تر تھی۔ اس کو چاندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کیانیوں کی حکومت ہوی جسے پیشنگوئی میں تانبے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یونانی آئے جنہوں نے لوہے کی طرح ان تمام ممالک کو کچل ڈالا۔ پھر یہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور ساسانیوں کا دور آیا۔ ان کی سلطنت میں کچھ تو لوہے کی سی مضبوطی تھی اور کچھ مٹی کی سی کمزوری ان کے دور میں طبقات اور نسلوں کے امتیازات تھے جن کی بنا پر دانیال نبی نے کہا ہے

"وے اپنے کو انسان کی نسل سے ملائیں گے لیکن جیسا لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا ویسے ہی وے باہم میل نہ کھائیں گے"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان میں حکمران طبقہ (لوہا) اہل زمین (مٹی) سے ہمیشہ جدا رہے گا، اور ان کے درمیان کوئی میل نہ ہوگا جو انہیں ایک قوم بنا دے۔ آخر میں ایک پتھر ظاہر ہوا جس کو کسی نے کاٹ کر نہ نکالا تھا بلکہ وہ آپ سے آپ نکلا، مورت کے پاؤں یعنی ساسانی سلطنت پر گرا اور سب لوہے اور مٹی اور تانبے اور چاندی اور سونے کو اس نے پاش پاش کر ڈالا۔ پھر یہی پتھر اس تمام مملکت پر چھا گیا اور ساری زمین کو اس نے بھر دیا۔ دانیال نبی اس پتھر کی تعبیر یہ دیتے ہیں کہ وہ ایک سلطنت ہوگی جس کو نہ ابد تک کرے گا اور وہ تا ابد نیست و نابود نہ ہوگی اور دوسری قوم کے قبضے میں نہ پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اسلامی سلطنت ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے ان ممالک پر قابض ہے۔ قوموں پر قومیں آئیں اور اسلامی قومیت میں جذب ہو کر اسی پتھر کا ایک ایک جز بنتی چلی گئیں جو ابتدا میں عرب کی جانب سے آیا تھا۔ اس طرح اس پتھر کی وحدت بدستور قائم رہی اور سینکڑوں انقلابات کے باوجود وہ جوں کا توں رہا۔ بلکہ اور زیادہ پھیلتا چلا گیا۔

بارہویں بشارت

کتاب ملاکی باب سوم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:-

"دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کریگا اور وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو، ہاں عہد کا رسول جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آوے گا دیکھو وہ یقیناً آوے گا رب الافواج فرماتا ہے"۔

اس پیشنگوئی میں جس کو "عہد کا رسول" کہا گیا ہے اس کے لیے بائبل کے قدیم نسخوں

میں "ختنہ کا رسول" لکھا ہوا تھا۔ بعد میں ترمیم کی گئی اور "عہد کا رسول" لکھ دیا گیا۔ لیکن اس سے بھی حقیقت نہ بدلی۔ کیونکہ عہد سے مراد وہی ختنہ کا عہد ہے[1] جو ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل سے لیا گیا تھا۔ کتاب پیدائش باب ۱۷ میں اس کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے :-

"پھر خدا نے ابرھام سے کہا کہ تو اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں۔ اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جاوے؛ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرو اور یہ اس کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے (آیت ۹ - ۱۱)۔

اس تشریح کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا پیشنگوئی میں رسول موعود کی امتیازی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ختنہ کی ابراہیمی سنت کو اپنی امت میں جاری کریگا۔ یہ علامت اہل کتاب میں مشہور تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ قیصر روم (ہرقل) کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پہنچی تو اس نے دریافت کیا کہ کیا اس قوم میں ختنہ کا رواج ہے؟ تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملا۔ تب اس نے اپنے ایک دوست کو جو رومیہ قسطنطنیہ میں تھا اس واقعہ کی خبر دی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ نبی جس کا انتظار تھا یہی ہے۔ وہاں سے بھی جواب آیا کہ قیاس درست ہے۔ اس کے بعد قیصر نے اپنے اعیان دولت کو جمع کر کے کہا کہ "اے اہل روم! اگر تم فلاح اور رشد کے طالب ہو اور چاہتے ہو

[1] لفظ عہد کے معنی یہاں دور اور زمانہ کے نہیں ہیں بلکہ میثاق کے ہیں چنانچہ انگریزی ترجمہ میں Messenger of the Covenant ہے اور یہی لفظ Covenant کتاب پیدائش باب ۱۷ میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔

کہ تمہاری حکومت برقرار رہے تو اس نبی سے بیعت کرلو" (بخاری۔ باب کیف کان بدء الوحی)۔
اس قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب ملاکی میں رسول عہد سے مراد رسول ختنہ ہی ہے۔ اور اس زمانہ کے اہل کتاب منجملہ دوسری علامات کے اس علامت سے بھی واقف تھے، اور جن لوگوں کو کتاب کا علم تھا، انہوں نے اسلام کی سنت اختتان کا حال معلوم کرکے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تھا۔

یہاں یہ امر ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ ختنہ کی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی علامت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صرف ان کی نسل کے لیے ختنہ کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں میں ختنہ کا رواج محض ایک خاندانی رواج کی حیثیت سے تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سنت کو بالحاظ نسل ونسب تمام مسلمانوں میں رائج کیا۔ اسی وجہ سے بائبل میں آپ کو "رسول ختنہ" کے الفاظ سے یاد کیا گیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہرقل نے جب شاہ غسان کے قاصد کی زبانی آپ کے مبعوث ہونے کی پہلی اطلاع پانے سے پہلے نجوم کے ذریعہ سے آپ کی بعثت کا حال معلوم کیا تو اپنے حاشیہ نشینوں سے کہا "ملک الختان" (یعنی ختنہ کا بادشاہ) پیدا ہو چکا ہے۔ بخاری میں امام زہری نے ابن الناطور[1] کی جو روایت نقل کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ملک الختان" کے ظہور کا حال جس روز ہرقل کو نجوم کے طریق سے معلوم ہوا اس روز وہ سخت پریشان اور بدحواس تھا۔ (اصبح خبیث النفس) یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ محض ختنہ کے بادشاہ کا ظہور کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے کسی کو پریشانی لاحق ہو۔ دراصل جس چیز سے وہ پریشان ہوا وہ یہ تھی کہ

[1] ابن الناطور شام کے نصاریٰ کا اسقف اور بیت المقدس کا حاکم اور ہرقل کا خاص دوست تھا بعد میں مسلمان ہوا اور یہ روایت بیان کی۔

انجیل میں وہ رسول ختنہ کا حال پڑھ چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس رسول کے مقابلہ میں کوئی قوت نہ ٹھیر سکے گی اور تمام سلطنتیں زیر وزبر ہو جائینگی۔ چنانچہ جب شاہ غسان کے قاصد سے اس کو بعثت محمدی کی خبر ملی تو سب سے پہلے اس نے یہی دریافت کیا کہ کیا اس قوم میں ختنہ کا رواج ہے، اور جب اس کی تصدیق ہوی تو اپنی قوم کو مسلمان ہو جانے کا مشورہ دیا۔ پھر مزید تحقیق کے لیے حجاز کے ان تاجروں کو اپنے پاس طلب کیا جو ابوسفیان کی امارت میں اس وقت ایلیا (بیت المقدس) گئے ہوئے تھے، اور ان کی زبان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزید حالات معلوم کرنے کے بعد صاف کہدیا کہ "اگر یہ بات سچی ہے تو یہ شخص عنقریب اس مقام پر قابض ہو جائے گا جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ پیغمبر ظاہر ہونے والا ہے، مگر یہ خبر نہ تھی کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس تک جاسکتا ہوں تو میں ضرور اس سے ملنے کی کوشش کرتا، اور اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا"۔ خود رومی تاریخیں بھی اس پر گواہ ہیں کہ ہرقل ہمیشہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بے دلی سے لڑا۔ اس کی ہمیشہ یہ عادت رہی تھی کہ جنگ میں وہ خود ہی فوجوں کی قیادت کیا کرتا تھا۔ مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک مرتبہ بھی وہ نہیں آیا۔ شکستوں پر شکستیں ہوتی رہیں اور وہ منہ چھپائے بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۴۱ء میں جب وہ مرا تو بیان کیا جاتا ہے کہ پیہم خوف اور پریشانی اور دل شکستگی نے اس کو موت کے منہ تک پہنچایا۔

لہ مولٰنا رحمۃ اللہ ہندی نے اظہار الحق میں بارہویں بشارت اُس عبارت کو قرار دیا ہے جو یہوداہ کے خط عام کی چودھویں آیت میں حنوک کی زبانی نقل کی گئی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک ملاکی نبی کی یہ بشارت اس سے بہت زیادہ واضح تھی اس لیے ہم نے اس کو چھوڑ کر اسے بیان کیا ہے۔

تیرہویں بشارت

یہاں تک جو بشارتیں نقل کی گئی ہیں وہ بائبل کے عہد عتیق سے منقول تھیں اب ہم عہد جدید کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

انجیل متی باب ۳ کی ابتدا ان آیات سے ہوتی ہے:۔

"ان دنوں میں یوحنا بپتسمہ دینے والا آیا اور یہودیہ کے بیابان میں یہ منادی کرنے لگا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے"

پھر اسی انجیل کے چوتھے باب میں ہے:۔

"جب یسوع نے سنا کہ یوحنا گرفتار ہوا تو جلیل کو چلا گیا.... اس وقت سے یسوع نے منادی کرنی اور یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی ...... اور یسوع تمام جلیل میں پھرتا رہا اور ان کے عبادت خانوں میں تعلیم دیتا اور بادشاہت کی خوشخبری کی منادی کرتا" (آیت ۱۲، ۱۷، ۲۳)

اس کے بعد متی کے باب ۶ میں مسیح علیہ السلام نے اپنے پیرووں کو جو دعا سکھائی ہے اس میں منجملہ اور باتوں کے ایک یہ بھی ہے کہ "تیری بادشاہت آئے" (آیت ۱۰)۔

پھر متی کے باب ۱۰ میں یہ ذکر ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ شاگردوں کو "اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں" کے پاس جانے کا حکم دیا اور ان کو بہت سی وصیتیں کیں جن میں پہلی وصیت یہ تھی کہ:۔

"اور چلتے ہوئے منادی کرو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ (آیت ۷)۔

ایک دوسرے تبلیغی وفد کا ذکر انجیل لوقا کے دسویں باب میں اس طرح کیا گیا ہے :-

" ان باتوں کے بعد خداوند نے ستر آدمی اور مقرر کئے اور جس جس شہر اور جگہ کو خود جانے والا تھا وہاں انہیں دو دو کر کے بھیجا۔ اور ان سے کہا کہ..... وہاں کے بیماروں کو چنگا کر دو اور ان سے کہو کہ خدا کی بادشاہت تمہارے نزدیک آگئی ہے۔ اور جس شہر میں تم داخل ہو اور وہاں کے لوگ تمہیں قبول نہ کریں تو باہر جا کر وہاں کی سڑکوں پر کہو کہ ہم اس گرد کو بھی جو تمہارے شہر سے ہمارے پاؤں میں لگی ہے تمہارے سامنے جھاڑے دیتے ہیں، اگر یہ جان لو کہ آسمان کی بادشاہت تمہارے نزدیک آپہنچی ہے"۔ (آیت ۱۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱)۔

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ (یوحنا) حضرت عیسیٰ اور حوارین اور تلامذہ مسیح سب کے سب آسمان کی بادشاہت قریب آجانے ہی کی خبر دے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ بادشاہت آچکی ہے اور اس وقت موجود ہے پس اس تعلیم اور اس شریعت کو آسمان کی بادشاہت نہیں کہا جا سکتا جسے حضرت عیسیٰ نے پیش کیا، بلکہ حضرت عیسیٰ اس بادشاہت کے قریب آنے کی خبر دینے والے تھے، اور اپنے ۱۲ حواریوں اور ستر شاگردوں کو انہوں نے یہی دعا مانگنے کی ہدایت کی تھی کہ "تیری بادشاہت آئے"۔ نیز لفظ "بادشاہت" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ سلطنت کی صورت میں ہو نہ کہ مسکنت کی صورت میں۔ اور آسمان کی بادشاہت یا خدا کی بادشاہت کے معنی صاف یہ ہیں کہ سلطنت کا قانون خدا کی ہدایت پر مبنی ہو، اور اس میں اتنی قوت ہو کہ وہ زمین میں شریعت الٰہی کو نافذ کر دے۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام نے اپنے پیروؤں کو جو دعا سکھائی تھی اس میں "تیری بادشاہت آئے" کی تفسیر بعد کے فقرے سے اس طرح کی ہے کہ "تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین

پر بھی ہو" (متی باب ۶۔ آیت ۱۰) ظاہر ہے کہ یہ بات نہ مسیح علیہ السلام کے عہد میں حاصل ہوئی نہ ان کے حواریوں اور شاگردوں کے عہد میں لہذا یہ کسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ "آسمانی بادشاہت" آنے سے مراد خود مسیح علیہ السلام اور ان کے دین کی آمد ہے۔

علماء مسیحیہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے دو تین صدی بعد ملت مسیحیہ کی جو عام اشاعت ہوئی اور رومی سلطنت کے دین مسیحی قبول کرنے کی وجہ سے اس کو جو غلبہ نصیب ہوا یہ اسی کی طرف اشارہ تھا، اور اسی کی بشارت تھی لیکن تاریخ اس بیان کو غلط ثابت کرتی ہے کیونکہ مسیحی سلطنتوں کا قانون ابتداء سے آج تک کسی زمانہ میں بھی آسمانی شریعت پر مبنی نہیں ہوا۔ سینٹ پال نے پہلے ہی شریعت اور ایمان کا رشتہ کاٹ دیا تھا۔ اور تمام قوموں کو یہی کہکر مسیحیت کی طرف دعوت دی تھی کہ تمہارے لیے شریعت نہیں، صرف ایمان ہے پس خدا کی بادشاہت کے اس معنی میں کہ اُس کی مرضی جس طرح آسمان پر پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی ہو" امت مسیحیہ کے ہاتھوں سے کبھی قائم ہی نہیں ہوئی، پھر ان کی سلطنت کو اس بشارت کا مصداق کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ علاوہ بریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو غیر قوموں کو دعوت دینے کی اجازت ہی نہ دی تھی، بلکہ بالفاظ صریح اس سے منع کیا تھا پھر جو قومیں ان کی تعلیم کے خلاف تثلیث پر ایمان لائیں، اور جنہوں نے ان کی ہدایت کے خلاف آسمانی شریعت کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ قوانین کو نافذ کیا ان کی بادشاہت کو آسمانی بادشاہت قرار دینا آنجناب کا مقصود کیونکر ہوسکتا تھا۔

یہ تو خارجی قرائن تھے۔ اب خود حضرت عیسیٰ کے دوسرے اقوال پر غور کرو کہ حق آسمانی بادشاہت کی انہوں نے بشارت دی ہے اس سے ان کی مراد کیا تھی۔ متی باب ۱۳ میں وہ فرماتے ہیں:۔

"آسمان کی بادشاہت اُس آدمی کے مانند ہے جس نے اپنے کھیت میں اچھا بیج بویا"
"آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بویا"
"آسمان کی بادشاہت اس خمیر کے مانند ہے جسے کسی عورت نے لے کر تین پیمانے آٹے میں ملا دیا اور ہوتے ہوتے سب خمیر ہو گیا"
ان فقروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس بادشاہت سے مسیح علیہ السلام کی بیج بونے والا ہے نہ کہ فصل کاٹنے والا، اور رائی کا دانہ ہے نہ کہ اس دانہ سے نکلا ہوا درخت، اور وہ تھوڑا سا خمیر ہے جو آٹے میں ملایا جاتا ہے نہ کہ وہ بہت سا آٹا جو اس خمیر کے اثر سے خمیر بن جاتا ہے۔ اس تشریح سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مسیح علیہ السلام نے جس آسمانی بادشاہت کی خوشخبری دی تھی وہ دراصل ایک پیغام حق اور قانون عدل تھا جو ان کے بعد آکر ایمان و عمل صالح کا دانہ بونے والا تھا تاکہ اس سے ایک شجر عظیم پیدا ہو اور نوع انسانی کے آٹے میں تھوڑا سا خمیر ملا دینے والا تھا تاکہ بے حد و حساب آٹا خمیر بن جائے۔ ایسا پیغام اور ایسا قانون نہ تو حضرت یحییٰ لائے، نہ حضرت عیسیٰ، نہ ان کے حواری۔ یہ سب تو اس کی آمد کی خبریں دے رہے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے۔

چودھویں بشارت

انجیل متی باب ۱۳ میں ہے:-

"اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ

سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں" (۳۱ ر ۳۲) ۔

یہ تشبیہ ٹھیک ٹھیک شریعت محمدی علی صاحبہا السلام پر راست آتی ہے۔ واقعی وہ ابتدا میں ایک رائی کا دانہ تھا۔ ایک ایسی قوم میں بویا گیا جو نہایت حقیر، بے سر و سامان، بے زور و زر، اور خصوصاً یہودیوں کی نگاہ میں ذلیل و خوار تھی۔ مگر چند ہی سال کے اندر اسی رائی کے دانے سے ایک ایسا عظیم الشان درخت پیدا ہوا جو شرق و غرب پر چھا گیا، حتیٰ کہ جن لوگوں نے اس شریعت کا اتباع قبول نہ کیا، وہ "ہوا کے پرندے" بھی اس کی کسی نہ کسی شاخ کے سایے میں آ ہی گئے۔

پندرہویں بشارت

انجیل متی کے بیسویں باب کا آغاز ان آیات سے ہوتا ہے :۔

" کیونکہ آسمان کی بادشاہت اس صاحب خانہ کے مانند ہے جو سویرے نکلا تاکہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگا دے۔ اور اس نے مزدوروں کا ایک ایک دینار روزینہ مقرر کر کے انھیں اپنے باغ میں بھیج دیا۔ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں کھڑے دیکھا اور ان سے کہا کہ تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تمہیں دوں گا، پس وہ چلے گئے۔ پھر اس نے دوپہر اور تیسرے پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا۔ اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑے پایا اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے؟ انھوں نے اس سے کہا اس لیے کہ ہم کو کسی نے مزدوری پر نہیں لگایا۔

اس نے ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلا اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک انہیں مزدوری دے دے۔ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہتے لگائے گئے تھے تو انہیں ایک ایک دینار ملا۔ جب پہلے مزدور آئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی ایک دینار ملا۔ جب ملا تو گھر کے مالک سے یہ کہکر شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت دھوپ سہی۔ اس نے جواب دے کر ان میں سے ایک سے کہا کہ میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔ کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھیرا تھا؟ جو تیرا ہے اٹھالے اور چلا جا۔ میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بری نظر سے دیکھتا ہے؟ اسی طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر کیونکہ بہت سے بلائے جاتے ہیں اور منتخب تھوڑے ہی ہوتے ہیں" (آیت ۱۔ ۱۶)۔

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے امتوں کا حال بیان کیا ہے کہ بار بار دعوت حق ان کے پاس آئی اور ان کو اجر آخرت کے عوض دنیوی زندگی کے عمل صالح میں لگاتی رہی۔ ان میں آخری امت وہ تھی جو دن بھر بیکار کھڑی رہی، اور دن ڈوبنے کے قریب یہ دعوت اس کے پاس پہنچی۔ یہی امت مسلمہ ہے۔ وقت کے اعتبار سے یہ آخری امت ہے۔ مگر اجر کے اعتبار سے یہ سب پر سبقت لے جائے گی۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ نحن الاخرون السابقون[1]

[1] ۔ صحیح بخاری ج ۱، ۲۰۱۔ عمر کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری اور اہل کتاب

سولہویں بشارت

انجیل متی باب ۲۱ میں ہے:-

"ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگوری باغ لگایا۔ اور اس کے چاروں طرف احاطہ گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور برج بنایا۔ اور اُسے باغبانوں کو ٹھیکے پر دیکر پردیس چلا گیا۔ اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں کے پاس اپنا پھل لانے کے لیے بھیجا۔ مگر باغبانوں نے اس کے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو قتل کیا اور کسی کو سنگسار کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے۔ انہوں نے ان کے ساتھ بھی ویسا ہی کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہکر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا تو لحاظ کریں گے جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے۔ آؤ اسے قتل کرکے اس کی میراث پر قبضہ کرلیں۔ اور پکڑ کر باغ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۔ کے پچھلے دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کچھ مزدور مقرر کیے اور کہا کہ جو شخص میرے لیے صبح سے دوپہر تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا چنانچہ یہودیوں نے اس اجرت پر مزدوری کی۔ پھر اس نے کہا کہ جو شخص دوپہر سے عصر کے وقت تک کام کریگا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا۔ چنانچہ نصاریٰ نے بھی اس اجرت پر کام کیا۔ پھر اس نے کہا کہ جو شخص میرے لیے عصر سے غروب آفتاب تک کام کرے گا اس کو دو دو قیراط ملیں گے۔ چنانچہ تم وہی مزدور ہو۔ یہود و نصاریٰ اس پر ناراض ہوئے اور انہوں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ ہم سے زیادہ دیر تک کام لیا گیا اور مزدوری کم دی گئی۔ مالک نے جواب دیا کیا میں نے تمہارے حق میں کچھ کم دیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں کم تو نہیں دیا۔ مالک نے کہا بس تو یہ میرا فضل ہے جس کو چاہوں دوں۔

سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا؟ انہوں نے اس سے کہا کہ ان برے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکا اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا چور چور ہو جائے گا۔ مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ اور جب سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اس کی تمثیل سنی تو سمجھ گئے کہ ہمارے حق میں کہتا ہے" (آیت ۳۳ تا ۴۵)

یہ ایسا واضح بیان ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ واضح ہو سکے۔ باغ کے مالک سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ باغ یہی دنیا ہے۔ باغبان اہل دنیا ہیں۔ مالک کے پردیس جانے سے مراد اس کا نظروں سے پوشیدہ ہونا اور دنیا کے عمل کو اہل دنیا کے اختیار میں دینا ہے۔ اہل دنیا نے ان اختیاری اعمال میں ہمیشہ سرکشی کی اور عمل صالح کے پھل پیش نہ کیے۔ مالک نے بار بار انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا۔ مگر دنیا والوں نے کسی کو قتل کیا، کسی کو سنگسار کیا، اور کسی کو اذیتیں پہنچائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو بھیجا۔ عیسائی خود حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس لیے بیٹے کو بھیجنے سے مراد انہی کی بعثت ہو سکتی ہے، اور اس کے سوا کوئی اور مراد نہیں لی جا سکتی۔ باغبانوں نے بیٹے کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ صلیب کی طرف کھلا اشارہ ہے۔ اور نصاریٰ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ہی صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔ اب اس کے بعد انجیل کی عبارت صاف کہہ رہی ہے کہ بیٹے کو قتل کرنے کی پاداش میں تم سے

خدا کی بادشاہت چھین لی جائیگی۔ جس پتھر کو معماروں نے رد کردیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگا۔ اور وہ ایسا پتھر ہوگا کہ جو قوت اس سے ٹکرائے گی پاش پاش ہو جائیگی۔ یہ نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور، اور قوم عرب (یعنے رد کیے ہوئے پتھر) کے عروج، اور اسلام کے مادی و روحانی غلبہ کی کھلی ہوئی بشارت ہے۔

مسیحی علما کہتے ہیں کہ کونے کے پتھر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں مگر یہ متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

(۱) تمثیل میں کتاب مقدس کی جس عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ زبور ۱۱۸ میں اس طرح لکھی ہوئی ہے:۔

"وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔ اور یہ ہماری نظروں میں عجیب ہے"۔ (آیت ۲۲۔ ۲۳)۔

اگر اس پتھر سے مراد حضرت عیسیٰ ہوتے تو پھر یہ کہنے کے کیا معنی ہیں کہ "یہ ہماری نظروں میں عجیب ہے"۔ حضرت عیسیٰ تو بنی اسرائیل ہی سے ہیں۔ خود حضرت داؤد کی اولاد سے ہیں مسیحیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ حضرت داؤد نے اپنے مزامیر میں ان کی تعریف کے گیت گائے ہیں اور ان کو خداوند کہا ہے۔ پھر اگر وہ کونے کا پتھر ہو جائیں تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ رد کیا ہوا پتھر تو بنی اسمٰعیل ہی سے ہونا چاہیے کیونکہ انہی کو بنی اسرائیل اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان میں نبوت اور حکمت ہو، اور انہی کی سرفرازی قابل تعجب ہوسکتی ہے

(۲) اس پتھر کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ جو اس پر گرے گا وہ چور چور ہو جائے گا اور جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ یہ وصف حضرت عیسیٰ پر صادق نہیں آتا۔ وہ تو خود کہتے ہیں کہ میں سزا دینے پر مامور نہیں ہوں (یوحنا ۱۲۔ آیت ۴۷)۔ اور تاریخ سے بھی یہی معلوم

ہوتا ہے کہ مسیحیت کو مسیحیت ہونے کی حیثیت سے کبھی اتنی قوت حاصل نہیں ہوی کہ جو اس سے ٹکرائے وہ چور چور ہو جائے۔ بخلاف اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تعریف ٹھیک ٹھیک صادق آتی ہے اس لئے کہ اول روز سے آپ کا دین ایک غیر معمولی طاقت کے ساتھ اٹھا اور بڑی بڑی قوتیں اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔

(۳) حضرت عیسی کے کلام میں خود یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ یہ پتھر بیٹے کے سوا ہے اور بیٹے کے قتل ہونے کے بعد لگایا جائیگا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری مثال انبیاء میں ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور نہایت خوبی کے ساتھ اس کو تعمیر کیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے تھے اور اس کے حسن کی تعریف کرتے تھے۔ مگر اس خالی جگہ کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ کیوں چھوٹی ہوی ہے؟ سو اب وہی جگہ بھر دی گئی ہے اور میں ہی وہ آخری اینٹ ہوں[1]۔ یہ بیان زبور اور انجیل کے مذکورہ بالا عبارتوں سے کس قدر ٹھیک ٹھیک مطابق ہوتا ہے۔

سترہویں بشارت

یوحنا عارف کے مکاشفہ میں لکھا ہے:۔

" اور وہ جو غالب آئے اور میرے کاموں کو آخر تک قائم رکھے میں اسے قوموں پر اختیار دونگا اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا۔ وہ کمہار کے برتنوں کی طرح چکنا چور ہوں گے۔ ایسا ہی میں نے اپنے باپ سے پایا ہے اور میں اسے صبح کا ستارہ دونگا۔ جس کے کان ہوں وہ سنے کہ روح کلیساؤں سے کیا کہتی ہے (باب ۲۔ آیت ۲۶۔ ۲۹)۔

اس عبارت میں لوہے کا عصا دیا جانا، اور کمہار کے برتنوں کی طرح قوموں کو چکنا چور کرنا، اور مسیح کے حقیقی مشن کو تکمیل اور دوام بخشنا، یہ ایسی علامتیں ہیں جو محمد

[1] اس مضمون کی حدیثیں بخاری اور مسلم میں حضرت جابر اور حضرت ابوہریرہ سے مروی ہیں۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر راست نہیں آتیں۔ اور صبح کے تارے سے غالباً قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ وہی کتب آسمانی میں آخری کتاب ہے اور اسی کی روشنی طلوع صبح محشر تک قائم رہے گی۔

صاحب صولۃ الضیغم[1] نے اس بشارت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جب پادری وٹ و ولیم سے میرا مناظرہ ہوا تو میں نے کہا کہ وہ لوہے کا عصا جس کا ذکر یوحنا کے مکاشفہ میں کیا گیا ہے، اس کے مالک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ یہ سن کر وہ ذرا پریشان ہوئے، پھر انہوں نے کہا کہ مسیح نے تو اس ارشاد میں تھواتیرہ کے کلیسا کو خطاب کیا ہے، لہٰذا اس شخص کا ظہور وہیں ہونا چاہیے، مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو وہاں کبھی نہیں گئے۔ میں نے پوچھا وہ تھواتیرہ کا کلیسا کہاں تھا؟ انہوں نے اپنی کتابوں کی ورق گردانی کرنے کے بعد جواب دیا کہ وہ بلاد روم میں استانبول کے قریب تھا۔ میں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کی وفات کے چند ہی برس بعد وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ابو ایوب انصاریؓ کی قبر اب تک وہاں موجود ہے پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو آخر کار اس پوری سرزمین پر قابض ہوئے اور صدیوں تک لوہے کے عصا ہی سے اقوام فرنگ کو کمہار کے برتنوں کی طرح چکنا چور کرتے رہے۔

(باقی)

---

[1] یہ کتاب ۱۲۸۰ ہجری کے قریب زمانہ میں عباس علی جاجموی نے لکھی تھی۔ اور فاضل موصوف کا مناظرہ پادری وٹ اور پادری ولیم سے کانپور میں ہوا تھا۔

فتنۂ تکفیر

مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین پر تکفیر کا فتویٰ اور اس پر ایک نظر

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنے جو احسانات گنائے ہیں، ان میں نعمت ہدایت کے بعد سب سے بڑی نعمت اس رابطۂ الفت و محبت کو قرار دیا ہے جو ایمان و اسلام کے رشتہ سے تمام مسلمانوں کے درمیان قائم کیا گیا ہے:-

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران)

اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہو اور پراگندہ نہ ہو اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر نازل کی کہ تم آپس میں دشمن تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا پھر تم بھائی بھائی بن گئے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حبل اللہ فرمایا ہے وہ یہی ایمان و اسلام کا رشتہ ہے مختلف النسل، مختلف اللون، مختلف اللسان اور مختلف الاوطان لوگوں کو، جن کے درمیان عداوت کے بیسیوں اسباب موجود تھے، اسی حبل اللہ نے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرکے ایک قوم بنایا ہے، اور اس قوم کی فلاح و بہبود ہی نہیں بلکہ اس کا عین بقا اس پر منحصر ہے کہ اس کے افراد کے درمیان محبت اور اخوت اور معاونت کا یہ رشتہ نہ صرف قائم بلکہ خوب مضبوط اور مستحکم رہے۔ دوسری قوموں کے افراد کو خون کے رشتے ایک دوسرے سے ملاتے ہیں، زبان کی وحدت، رنگ کی یکسانی، وطن کی موافقت ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک قوم بناتی ہے لیکن اسلام میں قومیت کا رابطہ بجز رابطۂ دینی کے اور کوئی نہیں ہے۔ ادھر یہ رابطہ ٹوٹا اور ادھر تمام افراد اس طرح بکھر گئے جیسے تسبیح

دورا ٹوٹتے ہی تمام دانے بکھر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رابطۂ دینی کی حفاظت کے لیے بہت تاکید کی گئی ہے اور اس پر حملہ کرنے والے کو سخت مجرم ٹھیرایا گیا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء - ۱۳)

جو شخص (اظہار اسلام کے لیے) تم کو سلام کرے اس کو نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:۔

ایما رجل قال لاخیہ یا کافر فقد باء بہا احدھما (بخاری)۔

جس نے اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہا تو ضرور ہے کہ یہ قول ان دونوں میں سے ایک پر پڑے گا۔

لا یرمی رجل رجلاً بالفسوق ولا یرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذالک (بخاری)۔

ایک شخص جب دوسرے شخص پر فاسق یا کافر ہونے کا الزام لگائے گا درانحالیکہ وہ شخص ایسا نہ ہو تو یہ قول خود کہنے والے پر پلٹ جائے گا۔

من دعا رجلاً بالکفر او قال عدو اللہ ولیس کذالک الا حار علیہ (مسلم)

جس نے کسی کو کافر کہا یا اللہ کا دشمن کہا درانحالیکہ وہ ایسا نہیں ہے تو یہ قول خود قائل پر ہی پلٹ آئے گا

من لعن مومناً فھو کقتلہ ومن قذف مومناً بکفر فھو کقتلہ (بخاری)۔

جس نے کسی مومن پر لعنت کی اس نے گویا اسے قتل کیا اور جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی اس نے گویا اسے قتل کیا۔

ان احکام کا منشا یہ ہے کہ مومن کو کافر کہنے میں اتنی ہی احتیاط کرنی چاہیے جتنی کسی شخص کے قتل کا فتویٰ صادر کرنے میں کی جاتی ہے۔ بلکہ یہ معاملہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کسی کو قتل کرنے سے کفر میں مبتلا ہونے کا خوف تو نہیں ہے، مگر مومن کو کافر کہنے میں یہ خوف بھی ہے کہ اگر فی الواقع وہ شخص کافر نہیں ہے اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان موجود ہے، تو کفر کی تہمت خود اپنے

اور پلٹ آئے گی۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہو، اور جس کو اس کا کچھ بھی احساس ہو کہ کفر میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ کتنا بڑا خطرہ ہے، وہ کبھی کسی مسلم کی تکفیر کی جرأت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اسے خوب چھان بین کرنے کے بعد اس کے مبتلائے کفر ہو جانے کا پورا علم نہ ہو جائے۔ اس باب میں احتیاط کی حد یہ ہے کہ جس شخص کے طرز عمل سے صاف طور پر نفاق ظاہر ہو رہا ہو، جس کا حال صاف بتا رہا ہو کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہے، وہ بھی اگر کلمہ اسلام اپنی زبان سے پڑھ دے تو اسے کافر کہنا اور اس کے ساتھ کافر کا سا معاملہ کرنا جائز نہیں۔ ایک مرتبہ ایک سریہ میں ایک شخص نے مسلمانوں کو دیکھ کر کہا السلام علیکم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ ایک مسلمان نے یہ گمان کر کے اسے قتل کر دیا کہ اس نے محض جان بچانے کی خاطر کلمہ پڑھا ہے۔ ظاہر حال کے لحاظ سے یہ گمان کرنے کی معقول وجہ بھی موجود تھی کیونکہ جنگ کا موقع تھا، تلواریں کھنچی ہوئی تھیں، کچھ بعید نہ تھا کہ اس مقتول کے دل میں درحقیقت ایمان نہ ہو، اور اس نے کلمہ کو محض جان بچانے کے لیے ڈھال بنانا چاہا ہو۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ غضبناک ہوئے اور سختی کے ساتھ اس مسلمان سے باز پرس کی۔ اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس نے تو محض ہماری تلوار سے بچنے کے لیے کلمہ پڑھ دیا تھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا ہلا شققت عن قلبہ "کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟" مطلب یہ ہے کہ تمہارا کام دلوں کا ٹٹولنا نہیں ہے۔ یہ حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس کے دل میں ایمان ہے اور کس کے دل میں نہیں۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى۔ تم صرف ظاہر کو دیکھ سکتے ہو۔ اور ظاہر میں جب ایک شخص اسلام کا اظہار کرے تو تمہیں کوئی حق نہیں کہ تاویلات سے اس کو کافر ٹھیراؤ اور اس کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کرو۔

رشتۂ دینی کے احترام کی اتنی سخت تاکید اور اس کو قطع کرنے پر ایسی سخت وعید اسلیے

ہے کہ جو شخص مسلمان کی تکفیر کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی اُس رسّی پر قینچی چلاتا ہے جس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو جوڑ کر ایک قوم بنایا گیا ہے۔ اگر اسی طرح سے بات بات پر یہ حبل اللہ کاٹی جانے لگے تو ساری امتِ مسلمہ منتشر ہو کر رہ جائے گی، مسلمانوں کے درمیان محبت اور تعاون اور معاشرت اور ہمدردی کے تمام تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ اور ایک مرتبہ پھر یہ قوم آتشِ عداوت کے اسی گڑھے پر کھڑی نظر آئے گی جس سے اللہ نے اس کو نکالا تھا۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔

یہی وجہ ہے کہ متقی اور محتاط اہلِ علم نے ہمیشہ تکفیرِ اہلِ قبلہ میں سخت احتیاط برتی ہے۔ انہوں نے جن لوگوں کو اپنی تحقیق میں گمراہ سمجھا ان کے خیالات اور عقائد کی تردید نہایت جراءت سے کی۔ کسی کے اقوال و افعال کو اگر اپنے نزدیک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف پایا تو اس کا سختی کے ساتھ ابطال کیا۔ جن مقالات میں ان کو کفر و الحاد کی جھلک نظر آئی ان کے متعلق برملا کہا کہ یہ کافرانہ اور ملحدانہ مقالات ہیں۔ جن افعال میں شرک و کفر کے نشانات محسوس ہوئے ان کے متعلق صاف صاف کہہ دیا کہ یہ مشرکانہ اور کافرانہ اعمال ہیں لیکن ضلالت کو ضلالت اور کفر کو کفر[1] شرک کو شرک کہنے میں خواہ کتنی ہی جرأت انہوں نے ظاہر کی ہو، مگر ان افعال و اقوال کا ارتکاب کرنے والوں کو "کافر" یا "مشرک" کہہ دینے میں انہوں نے کبھی جرأت سے کام نہیں لیا۔ وہ

---

[1] یہاں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ کسی شخص کا کافر یا ملحد یا مشرک ہونا اور چیز ہے اور اس کے اقوال یا افعال میں کفر یا الحاد یا شرک ہونا اور چیز۔ انسان کو کافر اس وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ اصول دین میں سے کسی اصل کا قطعی منکر ہو جائے۔ اسی طرح وہ ملحد اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ حق تعالیٰ کو ماننے سے صاف انکار کر دے۔ اسی طرح وہ مشرک اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ الوہیت میں دوسروں کو شریک ٹھیرانے کا صریح طور پر اظہار کرے لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے غالب اعتقادات و اعمال اسلام کے مطابق ہوں اور کسی جزئیہ میں اسکی کسی بات سے کفر یا شرک یا الحاد لازم آتا ہو یہی چیز ہے جس کو کفر دون کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسکی بنا پر کسی کو کافر کہنا جائز نہیں۔

اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ کہیں کسی ایسے شخص کو کافر یا مشرک قرار نہ دے بیٹھیں جو درحقیقت مومن اور صاحب ایمان ہو۔ اس لیے جس کلمہ گو کے خیالات میں ان کو کفر والحاد یا شرک کی جھلک نظر آتی تھی اس کے خیالات کی تردید تو کر دیتے تھے، اور نہ صرف اس کی تفہیم کرتے تھے بلکہ عام مسلمانوں کو بھی اس کے خیالات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے تھے، مگر جب خود اسے کافر یا مشرک قرار دینے کا سوال سامنے آتا تو وہ بعید سے بعید تاویل کر کے بھی اس کو دائرۂ اسلام میں رکھنے کی کوشش کرتے، اور اس وقت تک دین سے خروج اور سلب ایمان کا حکم نہ لگاتے جب تک کہ صریح کفر کا اظہار نہ ہو، ایسا صریح کفر جس میں کسی تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک ایسے شخص کا معاملہ پیش کیا گیا جو کہتا تھا کہ کوئی کافر دوزخ میں نہ جائے گا۔ امام صاحب کے تلامذہ نے بے تکلف فتویٰ دے دیا کہ یہ شخص کافر ہو گیا کیونکہ یہ قرآن کی تکذیب کر رہا ہے۔ مگر امام صاحب نے فرمایا کہ تکفیر میں جلدی نہ کرو۔ کیا اس کے قول کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی؟ شاگردوں نے عرض کیا کہ ایسے صریح قول کی کیا تاویل ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کی ایک تاویل ممکن ہے۔ شاید اس کا خیال یہ ہو کہ جب حشر میں انسان اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ لے گا تو وہ کافر نہ رہے گا بلکہ مومن ہو جائیگا۔ دوسرا امر دیگر ہے کہ اس وقت کا ایمان نافع نہیں ہے، کیونکہ وہ ایمان بالغیب نہیں، ایمان بالشہادۃ ہے۔ مگر اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ دوزخ میں جانے سے پہلے وہ خدائے واحد کی الوہیت کا مقر ہو چکا ہو گا۔ اس لحاظ سے جو شخص کہتا ہے کہ کوئی کافر دوزخ میں نہ جائے گا اس کی مراد یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں کفر کیا ہے وہ دوزخ میں نہ جائیں گے، بلکہ اس کی مراد مطلقاً کفر سے ہے۔ یعنی بحالت کفر کوئی شخص دوزخ میں داخل نہ ہو گا۔ یہ ایک حق بات ہے پھر اس کے قائل کو تم کافر کیسے کہہ سکتے ہو؟

یہ مسلک تھا سلف صالحین کا۔ اور یہ صرف تقویٰ اور خشیت الٰہی کی بنا پر ہی نہ تھا، بلکہ

عقل اور تدبر کا مقتضیٰ بھی یہی تھا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، توحید و رسالت کا قائل ہے اور قرآن کو کتاب اللہ تسلیم کرتا ہے، اس کے متعلق بادی النظر میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قصداً کفر کی نیت سے کوئی ایسی بات کہے گا جو عقیدۂ توحید کے خلاف ہو یا رسالت کی تکذیب ہو، یا قرآن سے معارض ہو۔ اس قسم کی کوئی بات اگر ایک کافر کے قلم یا زبان سے نکلے تب تو ہم اس کو نیت کفر ہی پر محمول کریں گے، کیونکہ اس سے کفر ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن ویسا ہی قول اگر ایک مسلمان کی زبان سے نکلے تو ہم بہت ہی جلد باز ہوں گے اگر اس کے قول کو بھی اسی طرح نیت کفر پر محمول کر دیں۔ کیونکہ ایک مسلمان سے نیت کفر کی توقع نہیں کی جاتی بہت ممکن ہے کہ اس کا قول قرآن کی تعلیم سے معارض ہوتا ہو مگر اس کی نیت قرآن سے معارضہ کرنے کی نہ ہو، یا اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے، یا اس نے کسی ایسے معنی میں وہ بات کہی ہو جو درحقیقت قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کو جو قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کر رہا ہے، محض ایک ظاہری تعارض کی بنا پر منکر قرآن ٹھیرا دیں؟ اگر ہم خود اس کی کوئی تاویل نہ کر سکتے ہوں تو ہمیں اس سے یا اس کے ہم خیال لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ تمہارے اس قول کا مراد حقیقی کیا ہے، اور اس کے جواب میں اگر وہ کوئی تاویل ایسی پیش کریں جو قرآن سے صریحاً معارض نہ ہوتی ہو، تو اس کو تسلیم کر لینا چاہیے نہ یہ کہ خواہ مخواہ کھینچ تان کر اسے خلاف قرآن ہی ثابت کیا جائے اور ایک ایسے شخص کو زبردستی منکر قرآن ہی قرار دیا جائے جو خود قرآن کے کتاب اللہ ہونے اور اس پر ایمان رکھنے کا اقرار کر رہا ہے۔

کفر اور ایمان کا امتیاز جن امور سے ہوتا ہے ان کی تصریح اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرما دی ہے۔ جو شخص خدا کی وحدانیت اور اس کی اُن صفات کا قائل ہے جو قرآن میں بیان ہوئی

اور جو شخص ملائکہ اور کتب آسمانی، اور انبیا علیہم السلام کی نبوت، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے، اور یوم الآخر کے برحق ہونے پر اس طریقہ سے ایمان لاتا ہے جس کا اظہار قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے، وہ بہرحال مومن ہے، خواہ کلام اور فقہ کے اعتبار سے اس کا مذہب جمہور کے مذہب سے کتنا ہی مختلف ہو۔ تفصیلات اور فروع میں اگر اس کی رائے غلط ہو کسی مسئلے یا بعض مسائل میں وہ ضلالت کی حد تک بھی پہنچ جاتا ہو تو آپ اس کی تردید کر سکتے ہیں مگر محض اس بنا پر اس کی تکفیر نہیں کر سکتے کہ اس کی تاویل آپ کی تاویل کے خلاف ہے، یا منطقی اسلوب پر اس کے مقدمات کو مرتب کرنے سے کفر یا الحاد یا زندقہ کا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص عالم کو حادث نہیں مانتا اور مادہ کو قدیم کہتا ہے تو آپ محض اس قول کی بنا پر اسے کافر کہنے کا حق نہیں رکھتے، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے حدوث اور قدم کی بحث سرے سے چھیڑی ہی نہیں ہے۔ آپ نے خود یہ اصطلاحات وضع کی ہیں، ان کا ایک خاص مفہوم مقرر کیا ہے، اور منطقی استدلال سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عالم کو قدیم کہنے سے خدا کا انکار لازم آتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص آپ کی اس اصطلاح اور اسکے اس خاص مفہوم پر ایمان لائے۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ عالم کو قدیم کہنے سے جو کچھ آپ کے نزدیک لازم آتا ہے وہی اس کے نزدیک بھی لازم آئے اور وہی اس کی مراد بھی ہو۔ جو شخص عالم کو قدیم کہتا ہے آپ اس سے پوچھیے کہ تو خدا کو عالم اور مادۂ عالم کا خالق مانتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ مانتا ہوں تو آپ کو تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ مومن ہے، اور اس کے نزدیک قدم کا وہ مفہوم نہیں ہے جو آپ نے اپنے ذہن میں قرار دیا ہے، اور اس قول سے جو کچھ آپ کے نزدیک لازم آتا ہے وہ اس کے نزدیک لازم نہیں آتا، نہ اس لزوم کا وہ قائل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی اصطلاح غلط ہو۔ ہو سکتا ہے کہ منطقی حیثیت سے اللہ کے مبدع عالم ہونے اور عالم کے قدیم ہونے میں کھلا ہوا

تعارض ہو اور منطق کی نگاہ میں ان دونوں متعارض باتوں کو جمع کرنے والا ایک ناتمام العقل انسان قرار پائے۔ مگر دین کی نگاہ میں اس کو کافر اور مسلوب الایمان ٹھیرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ خدا نے اس کو حدوث عالم پر ایمان لانے کا مکلف نہیں فرمایا بلکہ خدا کی تقیت اور مُبدعیت پر ایمان لانے کی تکلیف دی ہے۔ اس بات کو جب وہ مانتا ہے تو آپ کون ہیں کہ اس کو اپنے مسائل کلامیہ پر ایمان لانے کا مکلف ٹھیراتے ہیں؟

اسی پر دوسرے مسائل کو بھی قیاس کر لیجیے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ تفصیل کے ساتھ ایک ایک مسئلہ کو لے کر بحث کی جائے۔ ہم دراصل اس قاعدۂ کلیہ کی توضیح کرنا چاہتے ہیں کہ کسی مسلمان کو تاویل اور منطقی استنتاج سے کافر بنانا جائز نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ ایک مسلم کی زبان سے کوئی فقرہ سن کر ہم اپنے طور پر اس کا صغریٰ کبریٰ قائم کریں، پھر خود ہی ایک حد اوسط لگائیں اور اس سے ایک نتیجہ نکال کر کہیں کہ وہ شخص دراصل اس نتیجہ کا قائل ہے اور یہ نتیجہ کفر ہے، لہذا وہ کافر ہے۔ یہ وہی ظالمانہ فعل ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا تھا۔ جنگ کے موقع پر السّلام علیکم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والے کو جن صحابی نے قتل کیا تھا انہوں نے بھی یہی تو کیا تھا کہ منطقی استدلال سے اسکی نیت معلوم کرنے کی کوشش کی، اور یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اس نے جھوٹے دل سے کلمہ پڑھا ہے مگر حضور نے فرمایا کہ تو نے اس کا دل تو چیر کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کا کلمہ پڑھنا بہرحال دو معنی کا محتمل تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ درحقیقت مسلمان ہو گیا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دھوکہ دے رہا ہو۔ آگے چل کر خود اس کے فعل سے یہ متحقق ہو جاتا کہ ان دونوں احتمالات میں سے کونسا احتمال صحیح ہے۔ مگر تیرے پاس علم کا کونسا ذریعہ تھا جس سے تو نے حتماً وجزماً ایک احتمال کو ساقط کر کے فیصلہ کر دیا کہ دوسرا احتمال ہی صحیح ہے، اور اس فیصلہ پر اعتماد کر کے ایک ایسے شخص کو قرار دیا

جو ایمان کا اقرار کر رہا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کو جن لوگوں نے سمجھا تھا، اور جو اللہ کی پکڑ کا خوف اپنے دل میں رکھتے تھے، وہ کبھی مسلمانوں کو کافر بنانے کے لیے حجتیں نہیں ڈھونڈتے تھے۔ بلکہ انہیں یہ فکر رہتی تھی کہ کافروں کو کسی طرح مسلمان بنائیں۔

مگر افسوس کہ متأخرین نے اس معاملہ میں سہل انگاری کی حد کر دی ہے۔ کفر اور الحاد اور زندقے کے ٹھپے بنا کر ہر عالم کے قلمدان میں رکھ دیے گئے ہیں۔ اُدھر کسی مسلمان کے قلم یا زبان سے ان کے مشرب کے خلاف کوئی بات نکلی اور ادھر شرح مقاصد اور شرح فقہ اکبر اور النبراس اور الفرق بین الفرق، اور شرح الشفاء کی ورق گردانی کر کے جزئیات کی تلاش شروع کر دی گئی، اور جس جزئیہ کی زد میں وہ شخص آ گیا اُسی کے مطابق تین چار ٹھپوں میں سے کوئی ایک ٹھپہ اس پر لگا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ شخص کافر، اس کو کافر نہ ماننے والا کافر، اس کا خون اور اس کا مال مباح، اس کی جورو پر طلاق، اس کے بچے اولاد الحرام، اور تمام مسلمانوں سے نہ صرف اس کے بلکہ اس کو کافر نہ ماننے والوں تک کے تعلقات بھی منقطع۔ گذشتہ چند صدیوں میں یہ تکفیر کا فتنہ اس قدر عام ہوا ہے کہ شاید ہی مشاہیر امت میں سے کوئی ایسا شخص بچا ہوگا جس کو کسی نہ کسی گروہ نے کافر نہ ٹھیرایا ہو۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے۔ پہلے کفار اور منافقین کی شان یہ تھی کہ تحسبھم جمیعًا و قلوبھم شتّٰی۔ مگر اس کفر بازی کی بدولت وہی حال مسلمانوں کا ہو گیا۔ ان کی جمعیت پراگندہ ہو گئی۔ وہ الفت، وہ اتحاد، وہ ہمدردی، وہ تعاون جس سے اللہ نے نعمت ایمان کے ساتھ اس قوم کو سرفراز کیا تھا سب رخصت ہوا۔ اور ایک مرتبہ پھر یہ قوم اسی آگ کے گڑھے پر پہنچ گئی جس سے اس کو نکالا گیا تھا۔

اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علمائے دین میں کافروں کو مسلمان بنانے کا اتنا ذوق نہیں جتنا

مسلمانوں کو کافر بنانے کا ذوق ہے۔ اچھے خاصے مسلمان جو ضروریات دین کے قائل ہیں، جن کے قول اور عمل سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ نہ صرف ما جاء بہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ ذات محمدی کے عاشق ہیں دین محمدی کے پرستار ہیں مسلمانوں کے خیرخواہ اور ملت اسلامیہ کے درد مند ہیں، مگر صرف اس بات کے قصوروار ضرور ہیں کہ بعض جزئی و فروعی مسائل میں انہوں نے علماء سے اختلاف کیا ہے، ان کو سزا دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ان کی تحریروں میں سے چند فقرے سیاق و سباق سے الگ کرکے نکالے جاتے ہیں، پھر ان منتشر فقروں کو جوڑ کر تاویل القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کے طریق پر ان کو ایسے معنی پہنائے جاتے ہیں جو خود قائل کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتے، بلکہ جن کی تردید خود قائل اپنی دوسری تحریروں میں کرچکا ہوتا ہے۔ قائل بیچارہ کہتا ہے کہ حاشا و کلا میرا مقصود یہ نہیں ہے، مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تیرا دل چیر کر دیکھ چکے ہیں۔ تیرا یہی مقصود ہے، اور منطقی اسلوب پر تیرے مقدمات کو ترتیب دینے سے قطعاً وہی نتیجہ نکلتا ہے جو ہم نے نکالا ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ تو اسی نتیجہ کا قائل ہے، لہٰذا تو کافر ہے، زندیق ہے، ملحد ہے، اور جو تجھے ایسا نہ سمجھے وہ بھی کافر ہے، اور جو کسی قومی کام میں تیری اعانت کرے وہ فعل حرام کا مرتکب ہے۔

یہ طریقہ ہے ان حضرات کا جو علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کے مصداق سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تو ضرور پائی، مگر اس میراث میں تصرف کا جو طریقہ اختیار کیا وہ مورث علیہ وعلیٰ آلہ السلام کے خلاف ہے۔ مورث نے یہ میراث اس طرح جمع کی تھی کہ گالیاں اور پتھر کھا کھا کر غیروں کو اپنا بنایا تھا۔ مگر یہ اس میراث کو اس طرح لٹا رہے ہیں کہ اپنوں کو زبان و قلم کے تیر اور پتھر مار مار کر غیر بناتے ہیں۔ اُس ذات پاک کو رات دن یہ فکر تھی کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو اس کو ڈھونڈھ کر نکالیں اور

سینے سے لگالیں مگر ان کو نورِ ایمان کی نہیں ظلمتِ کفر کی تلاش ہے۔ ایک شخص کی ساری زندگی اس کے ایمان پر گواہی دیتی ہے، اس کے تمام اقوال وافعال اس کے اسلام پر شہادت دیتے ہیں۔ مگر یہ ان کو نہیں دیکھتے۔ اس کی تحریروں میں سے صرف چند منتشر فقرے نکال کر اگر کوئی ظالم ان سے استفتا کرتا ہے تو یہ کسی تحقیق و تفتیش کے بغیر نہ صرف اس کو بلکہ اس کے کثیر التعداد متبعین اور اعوان و انصار کو بھی جو سب کے سب اللہ کی مضبوط رسی میں بندھے ہوئے تھے، مقراض افتاء کے ایک ہی وار سے کاٹ کر ملتِ اسلامیہ سے نکال پھینکتے ہیں۔ گویا ہزاروں مسلمانوں کو بیک جنبشِ قلم کافر بنا دینا کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے جس میں کسی احتیاط اور تامل کی ضرورت ہو، اور جس کی تحقیق میں چند ساعتوں کی محنت بھی گوارا کرنا ضروری ہو۔ یہ معاملہ ایک دو کے ساتھ نہیں بیسیوں اکابر اسلام کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کو اسی طرح کافر بنایا گیا۔ مولانا محمد قاسم کی تحریروں میں بڑی محنت اور تکلف سے کفر کو تلاش کیا گیا اور نہ صرف انکو بلکہ پوری جماعت دیو بند کو نعمت ایمان سے محروم کر دیا گیا۔ سید احمد خاں اور محسن الملک اور حالی اور ان کی پوری جماعت کا رشتہ اسی طرح امتِ مسلمہ سے قطع کر ڈالا گیا۔ مولانا عبد الحی فرنگی محلی اور مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمود الحسن اور خدا جانے کن کن کو اسی طرح خلود فی النار کا مستحق بنایا گیا۔ مدت العمر ان لوگوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، فرائض دینی کو نہایت اہتمام سے ادا کیا، دین کی نہ صرف خود پابندی کی بلکہ اس کی تبلیغ اور اعداءِ دین کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کے لیے جانیں لڑادیں، مگر ان میں سے کوئی چیز بھی مفتیوں کی نگاہ میں قابلِ لحاظ نہ تھی۔ لحاظ کے قابل اگر کچھ تھا تو وہ چند الفاظ یا چند فقرے جن کو توڑ مروڑ کر کفر کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا تھا۔ کیونکہ دراصل انھیں کافر بنانے ہی کی ضرورت تھی۔ ان کا ایمان مطلوب ہی نہ تھا مسلمانوں کے

ہم غیروں کو دیکھتے دیکھتے مفتیوں کے دل بھر چکے تھے اب اس بھیڑ کو چھانٹنے اور کفار کے غول کے غول دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا ذوق اشاعت اسلام سے تھا، ویسا ہی ذوق اب آنحضور کے جانشینوں کو اشاعت کفر سے ہو گیا ہے۔ وہ وقت گیا جب یدخلون فی دین اللہ افواجا کا نظارہ دیکھ کر دل ٹھنڈا ہوتا تھا اب تو یخرجون من دین اللہ افواجا ہی کے منظر سے آنکھوں میں نور اور دل میں سرور آتا ہے!

ارادہ یہ تھا کہ اس تازہ فتوے پر کچھ لکھا جائے جس میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی رحمہا اللہ کی تکفیر کی گئی ہے۔ مگر دل کے درد اور روح کے الم نے اتنے صفحات اس طویل تقریر سے رنگین کرا دیے۔ دراصل وہ اذیت ناقابل بیان ہے جو ہمارے دل کو یہ دیکھ کر ہوئی کہ اسلام کے دو سچے خادموں کو ان کی وفات کے برسوں بعد کافر اور ملحد اور زندیق ٹھیرایا گیا ہے، حالانکہ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے عمر بھر تاریخ اسلام کی خدمت کی لاکھوں مسلمان اور غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کی گذشتہ عظمت کا سکہ بٹھایا جس کی تحریروں سے ہزاروں بدعقیدہ مسلمان خوش عقیدہ ہوگئے، جس نے الفاروق اور سیرۃ النبی لکھ کر تمام امت پر احسان کیا جس کے دل میں اسلام کا ایسا درد تھا کہ جنگ طرابلس و بلقان کے موقع پر وہ نہ صرف خود تڑپا بلکہ اپنی نظموں اور تقریروں سے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں بھی غیرت ایمانی کی تڑپ پیدا کر دی۔ دوسرا شخص وہ ہے جس نے مسلسل چالیس برس تک قرآن مجید کی خدمت کی جس نے معارف قرآنی کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا۔ جس کی تفسیروں سے عرب وعجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہوا جس کی تحریروں کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ وہ قرآن کا عاشق ہے اور اس کے لفظ لفظ پر جان نثار کرتا ہے۔ اگر ایسے لوگ بھی مسلمان نہیں تو اس زمین پر ہم مسلمانوں کو کہاں تلاش کریں؟

یہ دونوں بزرگ کچھ غیر معروف نہ تھے۔ ان کے حالات سب کو معلوم تھے۔ ان کی

زندگیاں سب کے سامنے تھیں۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے ہزاروں صفحات موجود تھے۔ ان سب پر نگاہ ڈال کر معلوم کیا جاسکتا تھا کہ ان کے دل میں ایمان تھا یا نہ تھا۔ زمانہ بھی ایسا نہیں کہ کوئی شخص نفاق کے ساتھ اظہار اسلام پر آمادہ ہو۔ اور اگر بالفرض اب بھی اس کا موقع ہو، تو منافق کا یہ کام تو نہیں ہے کہ تاریخ کے اوراق پارینہ میں سے اسلام اور مسلمانوں کی ایک ایک خوبی کو نکال کر چمکائیں یا قرآن مجید کے معارف وحقائق بیان کرکے ایک دنیا کو اس کا شیدائی بنانے کی کوشش کریں۔ یہ سب باتیں شبلی اور حمید الدین کے ایمان کا آفتاب سے زیادہ روشن ثبوت پیش کر رہی تھیں۔ مگر ہمارے مفتیوں کو ان میں سے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ان کے سامنے چند فقرے شبلی کے اور چند فقرے حمید الدین کے پیش کیے گئے، بالکل اسی طرح جس طرح اس سے پہلے چند فقرے مولانا محمد قاسم کے اور چند فقرے مولانا اشرف علی کے بھی پیش کیے جاچکے ہیں۔ مفتیوں نے ان فقروں کو دیکھتے ہی بے تکلف حکم لگادیا کہ نہ صرف یہ فقرے موجب کفر ہیں بلکہ ان کے قائل قطعاً کافر، ملحد، زندیق، منکر خدا ورسالت، منکر قرآن، شاتم رسول، اور کعب بن اشرف کی سی سزا کے مستحق ہیں۔ اور جو ان کو ایسا نہ سمجھیں، اور ان سے بیزاری کا اظہار نہ کریں وہ بھی کافر ہیں۔ اور جو لوگ ان کے مشن کی مالی امداد کریں یا ان کے رسائل کو خریدیں یا ان کے مدرسے میں اپنے بچوں کو بھیجیں وہ فعل حرام کے مرتکب ہیں! اب پوچھیے کہ آخر اس فتوے کا فائدہ کیا ہے؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علماء دیوبند اور جماعت ندوہ میں دشمنی پیدا ہو۔ مسلمانوں میں ندوہ اور دارالمصنفین اور مدرسۂ اصلاح کی طرف سے بدگمانی پھیلے۔ جو مفید کام مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین رحمہما اللہ کے تلامذہ کر رہے ہیں اس کو نقصان پہنچے، اور اس خستہ حالی کے دور میں چند اللہ کے بندے ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرکے اسلام کی جو خدمت کر رہے ہیں اس کی مدد سے بھی مسلمان ہاتھ کھینچ لیں۔ کیسا مفید کام

ہے، کیسے ثواب کا کام ہے جو حاملین شریعت کے مبارک ہاتھوں سے انجام پایا ہے!۔
سب سے زیادہ رنج یہ دیکھ کر ہوا کہ اس گناہ عظیم کا ارتکاب معمولی پیشہ ور مولویوں نے نہیں بلکہ ہندوستان کے ان اکابر علماء نے کیا ہے جن کے علم و فضل اور تقویٰ و خشیت سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ ایسے امر خطیر کا ارتکاب کرنے سے پہلے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گے، مثلاً مولٰنا اشرف علی صاحب تھانوی، مولٰنا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولٰنا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ان حضرات نے مولٰنا شبلی اور مولٰنا حمید الدین کی تکفیر میں جس سہل انگاری سے کام لیا ہے اس سے تو یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اب ایک مسلمان کی تکفیر ایک چیونٹی کو مار دینے سے بھی زیادہ سہل ہوگئی ہے۔ دو مرحوم مسلمانوں کو کافر ثابت کرنے کے لیے کم و بیش ۱۶ کتابوں کی تو ورق گردانی کی جاسکتی ہے، اور ان میں سے تقریباً دس صفحات کی عبارتیں بھی نقل کیجاسکتی ہیں، مگر اتنی زحمت نہیں اٹھائی جاسکتی کہ خود ان دونوں کی اصل تحریروں کو پڑھ کر ان کے سیاق و سباق اور موقع و محل سے ان کا مقصد اور ان کی نیت معلوم کرلی جاتی۔ معمولی فوجداری مقدمات میں بھی وہ لوگ جن کو خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کا یقین نہیں ہے، کسی شخص کے مجرد فعل یا قول پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ اس کے عام طرزِ عمل کو دیکھتے ہیں، اس کی سابقہ روش پر نظر ڈالتے ہیں، ان حالات کا لحاظ کرتے ہیں جن میں کوئی فعل کیا گیا ہو، اور اگر کوئی تحریر معرض بحث میں ہو تو پوری تحریر کو دیکھ کر اس کے مقصود و مدعا کی تحقیق کرتے ہیں۔ ازالۂ حیثیت عرفی، یا توہین عدالت، یا بغاوت کے معمولی مقدمات میں بھی کہیں یہ نہیں ہوتا کہ اصل تحریر سے الگ کرکے چند فقروں کو لے لیا جائے اور ان پر کوئی حکم لگا یا جائے مگر علمائے اسلام کا یہ حال ہے کہ دو مشہور مسلمانوں پر اسلامی قانون کی انتہائی سزا، دین و ایمان کی سزائے موت کا فتویٰ صادر کرنے بیٹھتے ہیں، اور مجرد چند فقروں

حکم لگا دیتے ہیں، حالانکہ وہ مسلمان غیر معروف نہیں ہیں، ان کے حالات معلوم کرنے کے کثیر ذرائع موجود ہیں جن کو دیکھ کر ان کے دین و ایمان کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے، خود وہ کتاب اور وہ رسالہ بھی بآسانی دستیاب ہو سکتا ہے جس سے وہ فقرے اخذ کیے گئے ہیں۔ کیا یہی عمل ہونا چاہیے ان لوگوں کا جو یقین رکھتے ہیں کہ ہم کو ایک روز اپنے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے ؟

مولانا شبلی کے جن فقروں پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے وہ ان کی کتاب "الکلام" سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب تمام تر ملاحدہ اور مادہ پرستوں کے رد میں لکھی گئی ہے اور اس کا مقصد وجود باری، صفات باری، نبوت، اور جزا و سزائے آخرت کا اثبات ہے۔ مصنف نے یہ دیکھا کہ جدید فلسفہ و سائنس سے جو شکوک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے قدیم علم کلام کے دلائل کافی نہیں ہیں اس لیے ایک نئے طرز پر علم کلام کو مرتب کرنا چاہیے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے "الکلام" تصنیف کی۔ اگرچہ ہم کو ان تمام باتوں سے اتفاق نہیں ہے جو انہوں نے اس کتاب میں لکھی ہیں۔ مگر پوری کتاب میں ایک بات بھی ایسی نہیں جس میں الحاد کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ بلکہ اس کو پڑھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف پکا مومن ہے، اور ایسا مومن ہے جسے دوسرے مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کی لگن لگی ہوئی ہے۔

کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہے "علوم جدیدہ اور مذہب"۔ اس کی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے :۔

"تمام دنیا میں غل مچ گیا ہے کہ علوم جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کر دی ہے، فلسفہ اور مذہب کے معرکے میں ہمیشہ اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلسفۂ قدیمہ قیاسات

اور ظنیات پر مبنی تھا اس لیے وہ مذہب کا استیصال نہ کرسکا۔ بخلاف اس کے فلسفہ جدیدہ تمام تر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے اس لیے مذہب کسی طرح اس کے مقابلہ میں جانبر نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہے لیکن ہم کو غور سے دیکھنا چاہیے کہ اس واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہوگیا ہے" (الکلام صفحہ ۷)۔

اس کے بعد مصنف نے ثابت کیا ہے کہ علوم جدیدہ میں جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں وہ کسی حیثیت سے بھی مذہب کی مخالف نہیں ہیں۔ اور جو چیزیں مذہب کی مخالف ہیں وہ قطعی نہیں ہیں بلکہ ظنیات اور فلسفیانہ قیاسات ہیں جن کو یقینی کہنے کی جرأت خود اہل یورپ میں بھی نہیں۔ سائنس کی رو سے مذہب کے خلاف زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ مذہب جن امور پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے ان کے متعلق تجربہ و مشاہدہ سے نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ وہ حس اور مشاہدہ سے ماوراء ہیں۔ لیکن کوئی سائنس داں "عدم علم" کے اعتراف سے آگے بڑھ کر یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ خدا نہیں ہے، یا فرشتے نہیں ہیں، یا نبوت اور وحی اور حشر کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس بحث کے سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں کہ

"یہ ہے ماہرین فن کی رائے، لیکن بعض کم درجہ کے اُدیب اپنی حد سے بڑھ کر نفی کا دعویٰ بھی کر بیٹھتے ہیں اور انہی کی طمع کاریاں ہیں جس نے ہمارے ملک کے نوجوانوں کی آنکھوں کو خیرہ کردیا ہے" (الکلام صفحہ ۱۰)۔

کیا یہ کسی ملحد اور زندیق کے خیالات ہوسکتے ہیں؟

بعد کے ابواب میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے، مذہب اسلام عین فطری مذہب ہے، اس مذہب میں کوئی چیز عقل کے خلاف نہیں، اور عقل کا

تقاضا ہے کہ اسلام کو قبول کیا جائے۔ اس کے بعد وجود باری کی بحث ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وجود باری کے اثبات میں جو طریقہ فلاسفہ اور متکلمین نے اختیار کیا ہے وہ محکم اور اطمینان بخش نہیں ہے۔ بہترین استدلال قرآن مجید کا ہے، اور موجودہ زمانے کے بڑے بڑے حکما بھی ذات باری کے جو قائل ہوئے ہیں، تو اسی طرز استدلال سے ہوئے ہیں نہ کہ منطقی دلائل سے۔

اس کے بعد مصنف نے ملاحدۂ قدیم و جدید کے اعتراضات نقل کیے ہیں اور ان کے جوابات دئے ہیں۔ اسی بحث کے چند فقرات نقل کر کے مولانا پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ ملحد ہیں۔ حالانکہ یہ فقرے در اصل ملاحدہ کے اعتراضات ہیں جن کو مولانا نے جواب دینے کی غرض سے نقل کیا ہے۔ باب کے عنوان ہی پر لکھا ہوا ہے کہ "ملاحدہ یعنی منکرین خدا کے اعتراضات" اس کے بعد ذیلی عنوان ہے "مادیین کس بنا پر خدا کے قائل نہیں"۔ اس عنوان کے تحت ملاحدہ کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان کو مولانا کا اپنا عقیدہ قرار دینا نہ صرف ظلم بلکہ صریح افترا ہے اس طریقہ سے تو متکلمین اسلام میں سے ہر ایک کو ملحد اور زندیق ثابت کیا جا سکتا ہے، کیونکہ سب نے دشمنوں کے اقوال نقل کیے ہیں۔ بلکہ امام رازی تو مخالفین کے دلائل اس قوت کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ شائد خود مخالفین نے بھی انہیں اتنی قوت کیساتھ پیش نہ کیا ہوگا۔ پھر ان کے متعلق علمائے اسلام کا کیا فتویٰ ہوگا؟

الکلام صفحہ ۳۲ سے ۴۹ تک کی جتنی عبارتیں استفتا میں نقل کی گئی ہیں ان سب میں یہی جعل سازی کی گئی ہے کہ یا تو ملاحدہ کے اقوال کو مصنف کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یا ان باتوں کو جنہیں مولانا نے استدلال کی غرض سے برسبیل تنزل تسلیم کر کے جواب دیا تھا، مولانا کا اصل عقیدہ قرار دے دیا گیا ہے، حالانکہ متکلمین میں یہ طریقہ شائع ہے کہ وہ بسا اوقات

معارضہ کی خاطر خصم کی کسی بات کو تسلیم کر کے اسی کے طریق پر اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس کی بکثرت مثالیں انکے کلام سے نقل کی جا سکتی ہیں۔

مصنف کا اصل مسلک یہ ہے کہ عالم کے تغیر سے اس کے حدوث پر اور اس کے حدوث سے وجود باری کے وجوب پر جو استدلال متکلمین نے کیا ہے وہ کوئی قوی استدلال نہیں ہے ملاحدین کے پرزور اعتراضات کے سامنے یہ دلائل نہیں ٹھیر سکتے۔ وجود باری پر بہترین استدلال وہی ہے جو قرآن میں اختیار کیا گیا ہے یعنی پہلے انسان کی وجدانی شہادت کو اپیل کیا جائے اور پھر کائنات کے نظم اور اس کی حکیمانہ ترتیب کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اسی سے خدا کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے اور اس کی توحید بھی۔ اسی استدلال کی پیروی میں جدید زمانہ کے خدا پرستوں نے بھی تمام منطقی اور فلسفیانہ دلائل کو چھوڑ کر آثار فطرت کی ترتیب و نظم (Design in Nature) سے وجود باری پر استدلال کیا ہے جس کا جواب دینے سے ملاحدہ و مادیین عاجز ہیں۔ زمانۂ جدید کے بڑے بڑے حکما و فلاسفہ نے بھی اسی استدلال کے آگے سر جھکایا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث الکلام میں دو مقامات پر ہے۔ ایک بحث کا عنوان ہے۔" وجود باری پر قرآن مجید کا طریقہ استدلال" (صفحہ ۲۵ تا ۳۹) دوسری بحث کا عنوان ہے" ملاحدہ کے اعتراضات کا جواب" (صفحہ ۴۵ تا ۶۲) ان دونوں بحثوں کو دیکھیے اور اپنے ضمیر سے پوچھیے کہ کیا یہ شخص مادے کی قدامت کا قائل ہے؟ کیا اس کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا خالق کائنات نہیں ہے؟ کیا وہ کہتا ہے کہ لوازم انواع خود بخود پیدا ہو گئے اور خلق عالم میں خدا کا کچھ دخل نہیں؟ کبرت کلمۃ تخرج من افواھکم۔

نبوت کے بارے میں مرحوم مظلوم پر یہ بہتان تراشا گیا ہے کہ وہ نبوت کو ایک کسبی چیز مانتے تھے۔ اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ قوائے عقلیہ میں ترقی کرتے کرتے انسان نبوت کے

درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایسا کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ شاعری کوئی بڑے سے بڑا کذاب اس کی جرأت کرسکتا ہو۔ مولانا نے نبوت کی بحث میں تمام تر جو کچھ لکھا ہے امام رازی کی مطالب عالیہ، شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ، امام غزالی کی معارج القدس، اور ابن حزم کی ملل ونحل سے منقول ہے۔ ان کی عبارتیں نقل کرکے مولانا خود اپنی رائے اسطرح ظاہر کرتے ہیں:

"خدا نے انسان کو جس طرح اور مختلف قوتیں عطا کی ہیں جو بعض افراد میں بالکل نہیں پائی جاتیں اور بعض میں بتفاوت درجات پائی جاتی ہیں، اسی طرح ایک روحانی قوت بھی عطا کی ہے جس کا نام قوت قدسیہ یا ملکۂ نبوت ہے۔ یہ قوت تزکیۂ نفس اور پاکیزگی اخلاق سے تعلق رکھتی ہے۔ جس شخص میں یہ قوت موجود ہوتی ہے وہ اخلاق میں کامل ہوتا ہے اور اپنے اثر سے اور انسانوں کو کامل بنا سکتا ہے۔ یہ شخص کسی سے تعلیم وتربیت نہیں پاتا بلکہ بغیر تعلیم وتعلم کے اس پر حقائق اشیا منکشف ہوجاتے ہیں۔

" نبوت کی اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا جب یہ بات بداہۃً نظر آتی ہے کہ ایک شخص کچھ پڑھا لکھا نہیں ہوتا (مثلاً ہومر اور امراء القیس) اور باوجود اس کے اس درجہ کا فصیح وبلیغ، شاعر یا خطیب، یا صناع یا موجد ہوتا ہے کہ تمام زمانہ میں اس کا جواب نہیں ہوتا، تو کیا یہ بعید ہے کہ خدا بعض افراد کو اس قسم کی قوت قدسیہ عطا کرے کہ ان پر بغیر تعلیم وتعلم کے اخلاق کے حقائق واسرار منکشف ہوجائیں۔ کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ اکثر انبیاء مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسٰیؑ، اور جناب رسالتؐ پناہ نے علوم وفنون کی مطلق تعلیم نہ پائی تھی اور باوجود اس کے صرف ہدایت وتلقین کی تاثیر سے دنیا کی حالت بدل دی، اور فلسفۂ اخلاق کے وہ اصول

اور مسائل تعلیم کیے کہ فلاطون اور ارسطو کا خیال بھی وہاں تک نہ پہنچ سکا تھا" (الکلام صفحہ ۱۰۲-۱۰۳)۔

پھر "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت" کا عنوان قائم کرکے اس کے نیچے لکھتے ہیں۔

"نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اجزائے ذیل سے مرکب ہے۔ خود کامل ہو۔ دوسروں کو کامل کرسکتا ہو۔ اس کے علوم و معارف اکتسابی نہ ہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں۔ یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذات مبارک میں موجود تھیں کیا ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی کوئی نظیر مل سکتی ہے؟ (الکلام صفحہ ۱۳۰)۔

پھر لکھتے ہیں۔

"اب ہم تفصیل کے ساتھ دکھاتے ہیں کہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت کے متعلق آنحضرت نے جو اصول اور مسائل وحی کے ذریعہ سے تلقین فرمائے وہ اس قدر کامل اور اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ کسی حکیم اور مقنن کے خیال میں نہیں آئے اور بغیر وحی الٰہی کے کسی کے خیال میں آ ہی نہیں سکتے۔ (الکلام صفحہ ۱۳۳)

غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ وہ شخص جس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں، کیا یہ وہی شخص ہے جو نبوت کو اکتسابی چیز مانتا ہے؟۔

معجزات کے متعلق مولانا کی ایک عبارت نقل کر کے ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ سرے سے معجزے کے صدور ہی کو غیر ممکن، اور خدا کو اعجاز سے عاجز سمجھتے ہیں۔ یہ کھلا ہوا افترا ہے۔ مولانا نے دراصل اشاعرہ کے اس اعتقاد کی تردید کی ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جتنے دلائل نقل کیے ہیں، سب کے سب امام رازی کی مطالب

عالیہ سے منقول ہیں۔ مولانا کا اصل مقصود یہ ہے کہ اگر نبوت کے لیے صرف معجزہ ہی کو دلیل اور ذریعۂ شناخت قرار دیا جائے تو اس سے کسی نبی کی نبوت ثابت کرنا مشکل ہے۔ رہی یہ بات کہ مولانا خود معجزات کے قائل ہیں یا نہیں، تو اس کے لیے الکلام کے پورے پندرہ صفحات بہترین شہادت دے سکتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں خارق عادت واقعات مذکور ہیں۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ قرآن کے ان بیانات کی ایسی تاویل کرنا درست نہیں ہے جن سے یہ واقعات خارق عادت نہیں بلکہ مطابق عادت قرار پائیں۔ ان کے نزدیک معجزات کا انکار "ہٹ دھرمی" ہے (الکلام صفحہ ۱۱۵) وہ تفصیل کے ساتھ منکرین کے دلائل نقل کرکے ان کی تردید کرتے ہیں، اور جدید زمانہ کے تجربات سے خرق عادت کا نہ صرف امکان بلکہ وقوع ثابت کرتے ہیں (الکلام صفحہ ۱۱۶ تا ۱۲۶) ان سب باتوں کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید چونکہ قطعی الثبوت ہے اس لیے اس میں جہاں خرق عادت کا ذکر ہوگا واجب التسلیم ہوگا لیکن پہلے یہ امر نہایت غور اور دقتِ نظر سے طے کرنا پڑے گا کہ فی الواقع قرآن مجید کے الفاظ اس کے ثبوت میں قطعی الدلالۃ ہیں یا نہیں؟ مفسرین میں جو محقق گذرے ہیں مثلاً قفال، ابو مسلم اصفہانی، ابوبکر اصم وغیرہ ان کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید میں بہت کم خرق عادات مذکور ہیں اور جو واقعی مذکور ہیں اُن کی صحت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے" (صفحہ ۱۲۹۔ ۱۳۰)۔

کیا یہ وہی شخص ہے جس کو معجزات کا منکر کہا جاتا ہے؟

عذاب وثواب آخرت کے متعلق مولانا کی ایک نامکمل عبارت نقل کرکے ان پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ حقیقت جنت و دوزخ کے منکر ہیں۔ یہ عبارت الکلام کے صفحہ ۱۳۹ سے

نقل کی گئی ہے مگر اسی سے متصل امام غزالی کی کتاب المضنون بہ علیٰ غیر اہلہ سے جو عبارت مولانا نے نقل کی تھی اس کو بے تکلف چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ مقصود بالذات تو شبلی کی تکفیر ہے۔ اگر بالتبع غزالی کی تکفیر بھی آپ سے آپ ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں! یہ حال ہے ان لوگوں کی جرأت کا اور یہ حال ہے ان کی دیانت کا۔

الکلام میں جزا و سزا کی بحث تمام تر ملاحدہ کے ان اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے کی گئی ہے جو ان کی طرف سے عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ پر کیے جاتے ہیں۔ ملاحدہ کہتے ہیں کہ خدا کو تم نے انسان کے سے جذبات رکھنے والا وجود فرض کیا ہے جو نافرمانی پر غصہ میں آجاتا ہے اور انتقام لیتا ہے، اور فرمانبرداری پر خوش ہو جاتا ہے اور انعام دینے لگتا ہے۔ مولانا اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ عذاب و ثواب کی حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ طاعت کا فطری نتیجہ ثواب ہے اور عصیان کا فطری نتیجہ عقاب ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ قرآن مجید کی آیات پیش کرتے ہیں اور ان کی وہ تفسیر نقل کرتے ہیں جو امام غزالی نے جواہر القرآن میں لکھی ہے۔ یہ پوری بحث الکلام میں صفحہ ۱۳۹ سے ۱۴۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو غور سے پڑھیے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ خیالات کسی کافر و زندیق کے ہیں یا کسی مسلم مومن بالقرآن کے؟

ایک "زندیق" کے اصل عقاید آپ کو معلوم ہو چکے۔ اب دوسرے "زندیق" کی فرد قرار داد جرم دیکھیے۔

مولانا حمید الدین مرحوم کی جن عبارتوں پر فتویٰ دیا گیا ہے وہ دراصل ان کی ایک ناتمام یادداشت سے منقول ہیں۔ مولانا نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ اس کام کے دوران میں جو خیالات ان کے ذہن میں آئے ان کو منتشر طور پر انھوں نے قلم بند کر لیا تھا۔ انتقال کے بعد یہ مسودہ ان کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی کے ہاتھ آیا اور انھوں نے الاصلاح میں اسے شائع کر دیا

ابتدا میں خود امین احسن صاحب نے یہ تنبیہی نوٹ بھی لکھدیا ہے کہ

"یہ ناتمام حالت میں ہے اسلیے کہیں کہیں عبارت چھوٹی ہوئی ہے بعض جگہ سخت ابہام ہے۔ ناظرین غور سے ملاحظہ فرمائیں"

اب یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ یہ ایک شخص کا مرتب مضمون نہیں ہے، بلکہ غیر مرتب اشارات کا مجموعہ ہے، جس میں عبارتیں چھوٹی ہوئی ہیں اور بعض جگہ سخت ابہام بھی ہے، اس کی عبارتوں کو نقل کرنا اور ان سے اس شخص کے عقائد پر استدلال کرنا کھلا ہوا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ قرآن کے متعلق مولانا حمید الدین کے اصلی خیالات انکے بکثرت مضامین اور رسائل میں موجود ہیں ان سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن اور اس کے نظم اور اس کی ترتیب، اور اس کے اعجاز کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے۔ مگر ان چیزوں میں سے کسی چیز کو نہیں دیکھا جاتا۔ استناد کیا جاتا ہے چند منتشر جملوں سے اور ان کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور خود حق تعالیٰ پر طعن کرتے ہیں اس لیے کافر و زندیق ہیں، شاتم رسول ہیں، اور اُسی سزا کے مستحق ہیں جو کعب بن اشرف کو دی گئی تھی! کیا اسی کا نام تقویٰ ہے؟ یہی اللہ سے ڈرنے والوں کی شان ہے؟

تمام اکابر اسلام کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اگر کسی مسلم کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل جائے جس میں کفر کا شبہہ ہوتا ہو تو دیکھنا چاہیے کہ اس کلام کا کوئی صحیح محمل بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور اگر معلوم ہو کہ اس کا ایک صحیح محمل بھی ممکن ہے تو حسن ظن سے کام لے کر یہی سمجھنا چاہیے کہ قائل کا مقصود دراصل وہی ہوگا نہ کہ کفر۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا حمید الدین نے جو باتیں لکھی ہیں ان سب کے صحیح محمل بھی موجود ہیں، ان کے تلامذہ ان کے کلام کی تشریح کر رہے ہیں، خود ان کی

سابق تحریروں سے بھی انکے اصل مدعا پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن پر نہ صرف ایمان رکھتے تھے بلکہ اسکے لفظ لفظ سے انکو عشق تھا پھر کیا وجہ ہے کہ انکے چند مبہم فقروں کو دیکھ کر ہم یہ رائے قائم کرلیں کہ ان کی نیت قرآن پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور خود اللہ تعالیٰ پر طعن کرنے کی تھی کیا شرح مقاصد اور شرح فقہ اکبر اور شرح الشفاء میں کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان کو کافر ہی بنانے پر اصرار کرو، اور اگر اسکی کوئی بات دو معنوں پر محمل ہو تو صرف اسی احتمال پر زور دو جس سے اس کا کفر ثابت کیا جاسکے۔

اس تمام بحث سے ہمارا مقصد علمائے کرام پر طعن کرنا نہیں ہے۔ ہم ان سب بزرگوں کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ مگر تحقیق سے ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ انہوں نے تکفیر کے اس فتوے میں سخت غلطی کی ہے۔ ایک گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ نہایت بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس بارگراں کو لیے ہوے وہ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور اس عدالت میں ان کی رسوائی ہو۔ اس لیے ہم ان پر انکی غلطی واضح کر دینا چاہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کو توبہ اور تلافی مافات کی توفیق عطا فرمائے، اور ایسا نہ ہو کہ دنیا کی جھوٹی عزت کا خیال انھیں اعتراف گناہ سے باز رکھے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ اُن ظالموں کو بھی توبہ کی توفیق بخشے جنہوں نے محض اپنی ذاتی اغراض کے لیے دو مرحوم مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگوانے کی کوشش کی اور ان کی عبارتوں کو غلط طریقہ سے پیش کر کے علمائے کرام کو دھوکہ دیا۔ خدا ان کی نیتوں کو پاک فرمائے اور انہیں صداقت اور دیانت کے ساتھ کسب حلال کی توفیق دے۔

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۸)

خاندان کی تنظیم صنفی میلان کو تمدن کے سنگ بنیاد یعنی خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام کا ذریعہ بنانے کے بعد، اسلام خاندان کی تنظیم کرتا ہے، اور یہاں بھی وہ پورے توازن کے ساتھ قانون فطرت کے تمام پہلوؤں کی وہی رعایت ملحوظ رکھتا ہے جو آپ نے اوپر دیکھی ہے۔ عورت اور مرد کے حقوق متعین کرنے میں جس درجہ عدل و انصاف اس نے ملحوظ رکھا ہے، اس کی تفصیل ہم اس سے پہلے اپنے مضمون "حقوق الزوجین" میں بیان کر چکے ہیں اسکی طرف مراجعت کرنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں صنفوں میں جس حد تک مساوات قائم کی جا سکتی تھی، وہ اسلام نے قائم کر دی لیکن وہ اس مساوات کا قائل نہیں ہے جو قانون فطرت کے خلاف ہو۔ انسان ہونے کی حیثیت سے جیسے حقوق مرد کے ہیں ویسے ہی عورت کے ہیں۔ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ۔ لیکن زوج فاعل ہونے کی حیثیت سے جو ذاتی فضیلت (یعنی عزت نہیں بلکہ معنی غلبہ و تقدم) مرد کو حاصل ہے، وہ اس نے پورے انصاف کے ساتھ مرد کو عطا کی ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ: ۲۰) اس طرح عورت اور مرد میں فاضل اور مفضول کا فطری تعلق تسلیم کر کے اسلام نے خاندان کی تنظیم حسب ذیل قواعد پر کی ہے:۔

(۱) خاندان میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہے، یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے، محافظ ہے،

اخلاق اور معاملات کا نگران ہے، اس کی بیوی اور بچوں پر اس کی اطاعت فرض ہے (بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دے)، اور اس پر خاندان کے لیے روزی کمانے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۤءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء: ۶)۔

مرد عورتوں پر قوام ہیں اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے، اور اس بنا پر کہ وہ ان پر (مہر و نفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

الرجل راع علی اهله وهو مسئول (بخاری، باب قوا انفسكم و اهليكم نارا، كتاب النكاح)

مرد اپنے بیوی بچوں پر حکمران ہے اور اپنی رعیت میں اپنے عمل پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء: ۶)۔

صالح بیویاں شوہروں کی اطاعت گذار اور اللہ کی توفیق سے شوہروں کی غیبت میں ان کے ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔

قال النبی صلعم اذا خرجت المرأة من بيتها و زوجها كاره لعنها كل ملك فی السماء وكل شیء مرت عليه غير الجن والانس حتى ترجع (كشف الغمه)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورت اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف گھر سے نکلتی ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت بھیجتا ہے اور جن و انس کے سوا ہر وہ چیز جس پر وہ گزرتی ہے، اس پر پھٹکار بھیجتی ہے تاوقتیکہ وہ واپس نہ ہو۔

وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (النساء)

اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی و نافرمانی کا خوف ہو ان کو نصیحت کرو (نہ مانیں تو) خوابگاہوں میں ان سے ترک تعلق کرو (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کرنے کیلئے کوئی بہانہ نہ نکالو۔

وقال النبی صلعم لا طاعۃ لمن لم یطع اللہ (رواہ احمد من حدیث معاذ) ولا طاعۃ فی معصیۃ اللہ (رواہ احمد من حدیث عمران بن حصین) انما الطاعۃ فی المعروف (بخاری کتاب الاحکام)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا کی اطاعت نہ کرے اس کی اطاعت نہ کی جائے۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی شخص کی فرمانبرداری نہیں کی جا سکتی۔ فرمانبرداری صرف امر معروف میں ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا فَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (العنکبوت: ۲۹)

اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ ادب سے پیش آئے لیکن اگر وہ تجھکو حکم دیں کہ میرے ساتھ کوئی شریک ٹھیرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی دلیل ہی نہیں ہے تو اس باب میں ان کی اطاعت نہ کر۔

اس طرح خاندان کی تنظیم اس طور پر کی گئی ہے کہ اس کا ایک سردھرا اور صاحب امر ہو۔ جو شخص اس نظم میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے اس کے حق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وعید ہے کہ

من افسد امرأۃ علی زوجھا فلیس منا (کشف الغمہ)

جو کوئی کسی عورت کو اس کے شوہر کے خلاف نافرمانی پر آمادہ کرے اس کا ہم سے کچھ تعلق نہیں۔

(۲) اس تنظیم میں عورت کو گھر کی ملکہ بنایا گیا ہے۔ کسب مال کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے، اور اس مال سے گھر کا انتظام کرنا اس کا کام ہے۔

المرأۃ راعیۃ علی بیت زوجھا وھی مسئولۃ۔ (بخاری باب قوا انفسکم واھلیکم نارا)۔

عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمران ہے اور وہ اسکی جوابدہ ہے۔

(۳) اولاد پر باپ کے بعد ماں کا ادب اور اس کی اطاعت فرض ہے:-

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (لقمٰن:۲)	اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے حق میں ادب و اطاعت کی تاکید کر دی ہے۔ اس کی ماں نے اس کو جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر پیٹ میں رکھا پھر دو سال کے بعد وہ ماں کی چھاتی سے جدا ہوا۔

(۲) عورت کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کیا گیا ہے جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً۔

اس پر نماز جمعہ واجب نہیں (ابو داؤد۔ باب الجمعۃ للمملوک والمرأۃ)۔

اس پر جہاد بھی فرض نہیں اگرچہ بوقت ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لیے جا سکتی ہے جیسا کہ آگے چل کر تحقیق بیان ہوگا۔

اس کے لیے جنازوں کی شرکت بھی ضروری نہیں بلکہ اس سے روکا گیا ہے (بخاری باب اتباع النساء الجنازۃ)۔

اس پر نماز باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی۔ اگرچہ چند پابندیوں کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت ضرور دی گئی ہے لیکن اس کو پسند نہیں کیا گیا (ابو داؤد۔ باب ما جاء فی خروج النساء الی المساجد)۔

اس کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ (ترمذی۔ باب ما جاء فی کراھیۃ ان تسافر المرأۃ وحدھا۔ ابو داؤد باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم)۔

غرض ہر طریقہ سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لیے قانون اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ[1] (تم اپنے گھر میں

[1] بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لیے خاص ہے۔ بقیہ حاشیہ برصفحہ ۴۴۶

بھی بیٹھی رہو۔ الاحزاب رکوع ۴) لیکن اس باب میں زیادہ سختی اس لیے نہیں کی گئی کہ بعض حالات میں عورتوں کے لیے گھر سے نکلنا ضروری ہوجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک عورت کا کوئی سردھرانہ ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ محافظ خاندان کی مفلسی، قلت معاش، بیماری، معذوری یا اور ایسے ہی وجوہ سے عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہوجائے۔ ایسی تمام صورتوں کے لیے

بقیہ حاشیہ صد ۶۱۔ کیونکہ آیت کی ابتدا یا نساء النبی سے کی گئی ہے لیکن اس پوری آیت میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے کونسی ہدایت ایسی ہے جو امہات مومنین کے ساتھ خاص ہو؟ فرمایا گیا ہے "اگر تم پرہیزگار ہو تو دبی زبان سے لگاوٹ کے انداز میں کسی سے بات نہ کرو تاکہ جس شخص کے دل میں کھوٹ ہو وہ تمہارے متعلق کچھ امیدیں اپنے دل میں نہ پال لے جو بات کرو سیدھے سادھے انداز میں کرو۔ اپنے گھروں میں ٹکی بیٹھی رہو۔ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ کرتی پھرو۔ نماز پڑھو۔ زکوٰۃ دو۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اللہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کر دے"۔ ان ہدایات پر غور کیجیے! ان میں کونسی چیز ہے جو عام مسلمان عورتوں کے لیے نہیں ہے؟ کیا مسلمان عورتیں پرہیزگار نہ رہیں؟ کیا وہ غیر مردوں سے لگاوٹ کی باتیں کیا کریں؟ کیا وہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار کرتی پھریں؟ کیا وہ نماز و زکوٰۃ اور اطاعت خدا و رسول سے انحراف کریں؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کو گندگی ہی میں کھلا چھوڑ دینا چاہتا ہے؟ اگر یہ ہدایات مسلمان عورتوں کے لیے عام ہیں تو صرف وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کو ازواج نبی کے لیے مخصوص کرنے کی کیا وجہ ہے؟ دراصل غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ آیت کی ابتدا میں لوگ یہ الفاظ دیکھتے ہیں کہ "اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو"۔ لیکن انداز بیان اس طرح کا ہے جیسے کسی شریف بچے سے کہا جاتا ہے کہ "تم کوئی عام بچوں کی طرح تو نہیں ہو کہ بازاروں میں گھومو اور بیہودہ حرکات کرو، تمہیں تمیز سے رہنا چاہیے"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے بچوں کے لیے بازاری پن اور بے ہودگی پسندیدہ ہیں اور خوش تمیزی ان کے حق میں مطلوب نہیں، بلکہ اس سے حسن اخلاق کا ایک معیار قائم کرنا مقصود ہے تاکہ ہر وہ بچہ جو شریف بچوں کی طرح رہنا چاہتا ہو اس معیار پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا کہ عرب جاہلیت کی عورتوں میں ایسی ہی آزادی تھی جیسی اس وقت یورپ میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے بتدریج ان کو اسلامی تہذیب کا خوگر بنایا جارہا تھا اور ان کے لیے اخلاقی حدود اور ضوابط معاشرت کی قیود مقرر کی جارہی تھیں۔ اس حالت میں امہات المومنین کی زندگی کو خاص طور پر منضبط کیا گیا تاکہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ بن جائیں اور عام مسلمانوں کے گھروں میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جائے۔

ضرورتوں میں کافی گنجایش رکھی گئی ہے :۔

قد اذن اللہ لکن ان تخرجن لحوائجکن (بخاری باب خروج النساء لحوائجھن یعنی ھذا الحدیث فی الصحیح باب اباحۃ الخروج للنساء لقضاء حاجۃ الانسان)	اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لیے گھر سے نکل سکتی ہو۔

مگر اس قسم کی اجازت جو محض حالات اور ضروریات کی رعایت سے دی گئی ہے، اسلامی نظام معاشرت کے اس قاعدہ میں ترمیم نہیں کرتی کہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے۔ یہ محض ایک وسعت اور رخصت ہے اور اس کو اسی حیثیت میں رہنا چاہیے۔

(۵) بالغ عورت کو اپنے ذاتی معاملات میں کافی آزادی بخشی گئی ہے، مگر اس کو اس حد تک خود اختیاری عطا نہیں کی گئی جس حد تک بالغ مرد کو عطا کی گئی ہے۔ مثلاً مرد اپنے اختیار سے جہاں چاہے جا سکتا ہے لیکن عورت خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ یا بیوہ، ہر حال میں ضرورت ہے کہ سفر میں اس کے ساتھ ایک محرم ہو۔

لا یحل لامرأۃ تومن باللہ والیوم الاخر ان تسافر سفرا یکون ثلثۃ ایام فصاعدا الا ومعھا ابوھا او اخوھا او زوجھا او ابنھا او ذو محرم منھا۔	کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں کہ وہ تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کوئی اور محرم مرد ہو۔
وعن ابی ھریرۃ عن النبی صلعم انہ قال لا تسافر المرأۃ مسیرۃ یوم ولیلۃ الا ومعھا محرم والعمل علی ھذا عند اھل العلم (ترمذی، ابواب الرضاع، باب فی کراھیۃ ان تسافر المرأۃ وحدھا)	اور حضرت ابوہریرہ کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ہے کہ حضور نے فرمایا عورت ایک دن رات کا سفر نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی محرم مرد نہ ہو۔

وعن ابی ھریرۃ ایضًا انہ صلعم قال	اور حضرت ابو ہریرہ سے یہ بھی روایت ہے کہ
لا یحل لامرأۃ مسلمۃ تسافر مسیرۃ	حضورؐ نے فرمایا کسی مسلمان عورت کے لیے حلال
لیلۃ الا ومعہا رجل ذو حرمۃ منھا	نہیں کہ ایک رات کا سفر کرے تا وقتیکہ اس کے
(ابوداؤد۔ باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم)	ساتھ ایک محرم مرد نہ ہو۔

ان روایات میں جو اختلاف مقدار سفر کی تعیین میں ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ در اصل ایک دن یا دو دن کا سوال اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ عورت کو تنہا نقل و حرکت کرنے کی ایسی آزادی نہ دی جائے جو موجب فتنہ ہو۔ اسی لیے حضورؐ نے مقدار سفر معین کرنے میں زیادہ اہتمام نہ فرمایا، اور مختلف حالات میں وقت اور موقع کی رعایت سے مختلف مقداریں ارشاد فرمائیں۔

مرد کو اپنے نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔ مسلمان یا کتابیہ عورتوں میں سے جس کے ساتھ چاہے وہ نکاح کرسکتا ہے، اور لونڈی بھی رکھ سکتا ہے لیکن عورت اس معاملہ میں کلیتہً خود مختار نہیں ہے۔ وہ کسی غیر مسلم سے نکاح نہیں کرسکتی:۔

لا ھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن (الممتحنۃ۔۲) نہ یہ ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال

وہ اپنے غلام سے بھی تمتع نہیں کرسکتی۔ قرآن میں جس طرح مرد کو لونڈی سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے اس طرح عورت کو نہیں دی گئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک عورت نے ما ملکت ایمانکم کی غلط تاویل کرکے اپنے غلام سے تمتع کیا تھا۔ آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے یہ معاملہ صحابہ کی مجلس شوریٰ میں پیش کیا اور سب نے بالاتفاق فتویٰ دیا کہ قبحھا اللہ تأولت کتاب اللہ غیر تاویلہ (اس نے کتاب اللہ کو غلط معنی پہنائے) ایک عورت نے حضرت عمرؓ سے ایسے ہی فعل کی اجازت مانگی تو آپ نے اس کو سخت سزا دی اور فرمایا لن تزال العرب

بغیر ما منعت لنسا ؤھا یُعرب کی بھلائی اسی وقت تک ہے جب تک اس کی عورتیں محفوظ ہیں" (کشف الغمہ للشعرانی)۔

غلام اور کافر کو چھوڑ کر احرار اسلام میں سے عورت اپنے لیے شوہر کا انتخاب کر سکتی ہے، لیکن اس معاملہ میں بھی اس کے لیے اپنے باپ دادا بھائی اور دوسرے اولیاء کی رائے کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اولیاء کو یہ حق نہیں کہ عورت کی مرضی کے خلاف کسی سے اس کا نکاح کریں، کیونکہ ارشاد نبوی ہے کہ الایم احق بنفسھا من ولیھا اور لا تنکح البکر حتی تستاذن، مگر عورت کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی رائے کے خلاف جس کے ساتھ چاہے نکاح کرلے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں مرد کے نکاح کا ذکر ہے وہاں نکح ینکح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نکاح کر لینے کے ہیں، مثلاً وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ اور فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ۔ مگر جہاں عورت کے نکاح کا ذکر آیا ہے وہاں باب افعال سے انکاح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نکاح کر دینے کے ہیں مثلاً وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ (النور: ۴) اور وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا (بقرہ: ۲۷)

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی تابع ہے اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی تابع ہے، اور یہ تابعیت اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کے لیے ارادہ وعمل کی کوئی آزادی نہیں، یا اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ نظام معاشرت کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے اور خاندان کے اخلاق و معاملات کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچانے کی ذمہ داری مرد پر ہے، اور اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہو اس کی اطاعت کرے، خواہ وہ اس کا شوہر ہو، یا باپ یا بھائی۔

عورت کے حقوق | اس طرح اسلام نے بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کو ایک فطری حقیقت تسلیم کرنے کے بعد لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کی ٹھیک ٹھیک تعیین کر دی ہے۔ عورت اور مرد میں حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے جو فرق ہے اس کو وہ بعینہٖ قبول کرتا ہے۔ جتنا فرق ہے اسے جوں کا توں برقرار رکھتا ہے۔ جیسا فرق ہے اسی کے لحاظ سے ان کے مراتب اور وظائف مقرر کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال عورت کے حقوق کا ہے۔ ان حقوق کی تعیین میں اسلام نے تین باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

ایک یہ کہ مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض نظم عائلی کی خاطر دیے گئے ہیں اُن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے، اور ایسا نہ ہو کہ تابع و متبوع کا تعلق عملاً لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔

دوسرے یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع بہم پہونچائے جائیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ نظام معاشرت کے حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے اور تعمیر تمدن میں اپنے حصے کا کام بہتر سے بہتر انجام دے سکے۔

تیسرے یہ کہ عورت کے لیے ترقی اور کامیابی کے بلند سے بلند درجوں تک پہنچنا ممکن ہو، مگر اس کی ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو۔ مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے نہ مردانہ زندگی کے لیے اس کو تیار کرنا اس کے اور نظام تمدن کے لیے مفید ہے، اور نہ مردانہ زندگی میں وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔

مذکورۂ بالا تینوں امور کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھ کر اسلام نے عورتوں کو جیسے وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیے ہیں اور عزت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں ان

ان حقوق اور مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائدار ضمانتیں مہیا کی ہیں ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظام معاشرت میں نہیں ملتی۔

(۱) سب سے اہم اور ضروری چیز جس کی بدولت تمدن میں انسان کی منزلت قائم ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ اپنی منزلت کو برقرار رکھتا ہے، وہ اس کی معاشی حیثیت کی مضبوطی ہے۔ اسلام کے سوا تمام قوانین نے عورت کو معاشی حقوق سے قطعاً محروم کر دیا ہے اور یہی معاشی بےبسی معاشرت میں عورت کی غلامی کا سب سے بڑا سبب بن گئی ہے۔ یورپ نے اس حالت کو بدلنا چاہا، مگر اس طرح کہ عورت کو ایک کمانے والا فرد بنا دیا۔ یہ ایک دوسری اور عظیم تر خرابی کا سبب بن گیا۔ اسلام بیچ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ عورت کو وراثت کے نہایت وسیع حقوق دیتا ہے۔ باپ سے، شوہر سے، اولاد سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے اسکو وراثت ملتی ہے نیز شوہر سے اسکو مہر بھی ملتا ہے، اور ان تمام ذرائع سے جو کچھ مال اس کو پہنچتا ہے اسمیں ملکیت اور قبض و تصرف کے پورے حقوق اسے دیے گئے ہیں جن میں مداخلت کرنے کا اختیار نہ اس کے باپ کو حاصل ہے، نہ شوہر کو نہ کسی اور کو۔ ان کے علاوہ اگر وہ کسی تجارت میں روپیہ لگا کر یا خود محنت کر کے کچھ کمائے تو اسکی مالک بھی کلیتہً وہی ہے۔ اور ان سب کے باوجود اس کا نفقہ ہر حال میں اسکے شوہر پر واجب ہے۔ بیوی خواہ کتنی ہی مالدار ہو، اس شوہر کے نفقہ سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اسلام میں عورت کی معاشی حیثیت اتنی مستحکم ہو گئی ہے کہ بسا اوقات وہ مرد سے زیادہ بہتر حال میں ہوتی ہے۔

(۲) عورت کو شوہر کے انتخاب کا پورا حق دیا گیا ہے اسکی مرضی کے خلاف یا اسکی رضامندی کے بغیر کوئی شخص اسکا نکاح نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ خود اپنی مرضی سے کسی مسلم کیساتھ نکاح کرے تو کوئی اسکو روک نہیں سکتا۔ البتہ اگر اسکی نظر انتخاب کسی ایسے شخص پر پڑے جو اس کے خاندان کے مرتبہ (Social status) سے گرا ہوا ہو تو صرف اس صورت

ا وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ میں نصف رکھا گیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عورت کو نفقہ اور مہر کے حقوق حاصل ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ عورت کا نفقہ صرف اسکے شوہر ہی پر لازم نہیں ہے، بلکہ شوہر نہ ہونے کی صورت میں باپ یا بھائی بیٹے یا دوسرا اولیا پر بھی اسکی کفالت واجب ہوتی ہے۔ پس جبکہ تمام وہ ذمہ داریاں نہیں ہیں جو مرد پر ہیں، تو وراثت میں اس کا حصہ بھی وہ نہ ہونا چاہیے جو مرد کا ہے۔

میں اس کے اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔

(۳) ایک ناپسندیدہ یا ظالم یا ناکارہ شوہر کے مقابلہ میں عورت کو خلع اور فسخ و تفریق کے وسیع حقوق دئے گئے ہیں۔

(۴) شوہر کو بیوی پر جو اختیارات اسلام نے عطا کیے ہیں ان کے استعمال میں حسن سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو)۔ اور وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ۔ (اور آپس کے تعلقات میں فیاضی کو نہ بھول جاؤ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے خیارکم خیارکم لنسائہ و الطفھم باھلہ (تم میں اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے ہیں اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ لطف اور مہربانی کا سلوک کرنے والے ہیں) یہ محض اخلاقی ہدایات ہی نہیں ہیں اگر شوہر اپنے اختیارات کے استعمال میں ظلم سے کام لے تو عورت کو قانون سے مدد لینے کا حق بھی حاصل ہے۔

(۵) بیوہ اور مطلقہ عورتوں اور ایسی تمام عورتوں کو جن کے نکاح از روئے قانون فسخ کیے گئے ہوں یا جن کو حکم تفریق کے ذریعہ سے شوہر سے جدا کیا گیا ہو نکاح ثانی کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے اور اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ ان پر شوہر سابق یا اس کے کسی رشتہ دار کا کوئی حق باقی نہیں یہ وہ حق ہے جو آج یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک میں بھی عورت کو نہیں ملا ہے۔

(۶) دیوانی اور فوجداری کے قوانین میں عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات قائم کی گئی ہے۔ جان و مال اور عزت کے تحفظ میں اسلامی قانون عورت اور مرد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں کرتا۔

(۷) عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ نبی

صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی کرتی تھیں۔ آپ نے ان کے لیے اوقات معین فرما دیے تھے جن میں وہ آپ سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپ کی ازواج مطہرات، اور خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نہ صرف عورتوں کی بلکہ مردوں کی بھی معلمہ تھیں اور بڑے بڑے صحابہ و تابعین ان سے حدیث تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اشراف تو در کنار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں تک کو علم اور ادب سکھانے کا حکم دیا تھا، چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ

ایما رجل کانت عندہ ولیدۃ فعلمھا	جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اس کو خوب
فاحسن تعلیمھا وادبھا فاحسن تادیبھا	تعلیم دے اور عمدہ تہذیب و شائستگی سکھائے، پھر اس کو
ثم اعتقھا وتزوجھا فلہ اجران (بخاری کتاب النکاح)	آزاد کر کے اس سے شادی کر لے اس کے لیے دوہرا اجر ہے

پس جہاں تک نفس تعلیم و تربیت کا تعلق ہے، اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اس کو ایک بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھر والی بنائے۔ اس کا دائرۂ عمل گھر ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کو ان علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اس دائرے میں اُسے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکتے ہوں۔ مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لئے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اس کے اخلاق کو سنوارنے والے اور اس کی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں۔ ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا تو ہر مسلمان عورت کے لیے لازم ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی عورت غیر معمولی عقلی و ذہنی استعداد رکھتی ہو، اور ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہے تو اسلام اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اُن حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے

مقرر کیے ہیں۔

یہ تو صرف معاشی اور تمدنی حقوق ہیں۔ ان سے اُس احسانِ عظیم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اسلام نے عورت پر کیا ہے۔ انسانی تمدن کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ عورت کا وجود دنیا میں ذلت، شرم اور گناہ کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت عیب اور موجب ننگ و عار تھی۔ مصاہرت کے رشتے ذلیل رشتے سمجھے جاتے تھے، حتٰی کہ سسرے اور سالے کے الفاظ اسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کر دینے کا رواج ہو گیا تھا۔ جہلا تو درکنار علما اور پیشوایانِ مذہب تک میں مدتوں یہ سوال زیر بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ اور خدا نے اسکو روح بخشی ہے یا نہیں؟ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بودھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسانی گناہ کی بانی مبانی اور ذمہ دار تھی۔ یونان میں گھر والیوں کے لیے نہ علم تھا نہ تہذیب و ثقافت تھی اور نہ حقوق مدنیت۔ یہ چیزیں جس عورت کو ملتی تھیں وہ رنڈی ہوتی تھی۔ روم اور ایران اور چین اور مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال

لہ قرآن اس جاہلی ذہنیت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے :-

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (النحل: ۷)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرہ پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خبر سے جو شرم کا داغ اس کو لگ گیا ہے اس کے باعث لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہوں یا مٹی میں دبا دوں۔

بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی ومحکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزت نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لیے بھی عزت کا کوئی مقام ہے۔ مرد اس پر ظلم وستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا، اور وہ اس ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک اس میں پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو شوہر کی "داسی" کہتی تھی، "پتی ورتا" اس کا دھرم تھا، اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک انقلاب عظیم برپا کیا وہ اسلام ہے۔ اسلام ہی نے عورت اور مرد دونوں کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ عورت کی عزت اور اس کے حق کا تخیل ہی انسان کے دماغ میں اسلام کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج حقوق نسواں اور تعلیم نسواں اور بیداری اناث کے جو الفاظ آپ سن رہے ہیں، یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو سب سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بلند ہوئی تھی، اور جس نے افکار انسانی کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے دنیا کو بتایا کہ عورت بھی ویسی ہی انسان ہے جیسا مرد ہے۔

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ (النساء۔ ۱)۔ اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔

خدا کی نگاہ میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں:۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء۔ ۵)۔ مرد جیسے عمل کریں ان کے لیے ان کا حصہ ہے اور عورتیں جیسے عمل کریں ان کے لیے ان کا حصہ۔

ایمان اور عمل صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں وہی

عورت کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ مرد اگر ابراہیم ادہم بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی شئے نہیں روک سکتی۔

انی لا اُضِیعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنکُم مِن ذَکَرٍ اَوْ اُنثٰی بَعضُکُم مِن بَعضٍ (آل عمران ۲) — میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو۔

وَمَن یَّعمَل مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِن ذَکَرٍ اَوْ اُنثٰی وَھُوَ مُؤمِنٌ فَاُولٰئِکَ یَدخُلُونَ الجَنَّۃَ وَلَا یُظلَمُونَ نَقِیرًا (النساء ۔۱۸۰)۔ — اور جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اگر ہو ایمان دار، تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، جنہوں نے مرد کو بھی خبردار کیا، اور عورت میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ جیسے حقوق عورت پر مرد کے ہیں ویسے ہی مرد پر عورت کے ہیں۔

لَھُنَّ مِثلُ الَّذِی عَلَیھِنَّ (البقرہ ۔ ۲۲۸) — عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اسکے حقوق بھی ہیں۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جس نے ذلت اور عار کے مقام سے اٹھا کر عورت کو عزت کے مقام پر پہنچایا۔ وہ حضور ہی ہیں جنہوں نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تیرے لیے ننگ نہیں ہے بلکہ اس کی پرورش اور اس کی حق رسانی تجھے جنت کا مستحق بناتی ہے

من عال جاریتین حتّٰی تبلغا جاء یوم القیٰمۃ انا وھو وضمّ اصابعہ (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب) — جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں، تو قیامت کے روز میں اور وہ اسطرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں۔

من ابتلی من البنات بشیءٍ فاحسن — جس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ اچھی طرح

إِلَّيهِنَّ كُنَّ لَهُ ستراً مِنَ النَّارِ (مسلم کتاب البر) — ان کی پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

حضورؐ ہی نے شوہر کو بتایا کہ نیک بیوی تیرے لیے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة (نسائی کتاب النکاح)۔ — دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک عورت ہے۔

حبب الیّ من الدنیا النساء والطیب وجعل قرة عینی فی الصلوٰة (نسائی۔ کتاب عشرة النساء)۔ — دنیا کی چیزوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب عورت اور خوشبو ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

لیس من متاع الدنیا شیٔ افضل من المرأة الصالحة (ابن ماجہ۔ کتاب النکاح) — دنیا کی نعمتوں میں کوئی چیز صالح عورت سے بہتر نہیں ہے۔

حضورؐ ہی نے بیٹے کو بتایا کہ خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ عزت اور قدر و منزلت اور حسن سلوک کی مستحق تیری ماں ہے۔

سأل رجلٌ یا رسول اللہ من احق بحسن صحابتی قال امك قال ثمّ من قال امك قال ثم من قال امك قال ثم من قال ابوك (بخاری کتاب الادب) — ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ مجھ پر حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ فرمایا تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ۔

انّ اللہ حرّم علیکم عقوق الامھات (بخاری کتاب الادب)۔ — اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کر دی ہے۔

حضورہی نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ جذبات کی فراوانی، اور حسیات کی نزاکت، اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے۔ اسی فطرت پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور یہ انوثت کے لیے عیب نہیں اس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اس فطرۃ پر قائم رکھ کر اٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو اپنی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کروگے تو اسے توڑ دوگے المرأۃ کالضلع ان اقمتھا کسرتھا وان استمتعت بھا استمتعت بھا وفیھا عوج (بخاری۔ باب مدارات النساء)

اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلے اور درحقیقت آخری شخص ہیں جنھوں نے عورت کی نسبت نہ صرف مرد کی، بلکہ خود عورت کی اپنی ذہنیت کو بھی بدل دیا اور جاہلی ذہنیت کی جگہ ایک نہایت صحیح ذہنیت پیدا کی جس کی بنیاد جذبات پر نہیں بلکہ خالص عقل اور علم پر تھی۔ پھر آپ نے باطنی اصلاح ہی پر اکتفا نہ فرمائی بلکہ قانون کے ذریعہ سے عورتوں کے حقوق کی حفاظت، اور مردوں کے ظلم کی روک تھام کا بھی انتظام کیا اور عورتوں میں اتنی بیداری پیدا کی کہ وہ اپنے جائز حقوق کو سمجھیں اور ان کی حفاظت کے لیے قانون سے مدد لیں۔ سرکار رسالت مآب کی ذات میں عورتوں کو ایک ایسا رحیم و شفیق حامی اور ایسا زبردست محافظ مل گیا تھا کہ اگر ان پر ذراسی بھی زیادتی ہوتی تو وہ شکایت لے کر بے تکلف حضور کے پاس دوڑ جاتی تھیں، اور مرد اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کو شکایت کا موقع نہ مل جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر کا بیان ہے کہ جب تک حضور زندہ رہے ہم اپنی عورتوں سے بات کرنے میں احتیاط کرتے تھے کہ مبادا ہمارے حق میں کوئی حکم نازل نہ ہو جائے۔ جب حضور نے وفات پائی تب ہم نے کھل کر بات کرنی شروع کی (بخاری باب الوصاۃ بالنساء)۔ ابن ماجہ میں ہے کہ حضور نے بیویوں پر دست درازی کرنے کی عام ممانعت فرمادی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر نے شکایت کی کہ

عورتیں بہت شوخ ہوگئی ہیں۔ ان کو مطیع کرنے کے لئے مارنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ آپ نے اجازت دیدی۔ لوگ نہ معلوم کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ جس روز اجازت ملی اسی روز ستر عورتیں اپنے گھروں میں پٹی گئیں۔ دوسرے دن کا شانۂ نبوی پر فریادی عورتوں کا ہجوم ہوگیا۔ سرکار نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا۔

لقد طاف اللیلۃ بآل محمد سبعون امرأۃ کل امرأۃ تشتکی زوجھا فلا تجدون اولئک خیارکم۔

آج محمدؐ کے گھر والوں کے پاس ستر عورتوں نے چکر لگایا ہے۔ ہر عورت اپنے شوہر کی شکایت کررہی تھی جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے وہ تم میں ہرگز اچھے لوگ نہیں ہیں۔

اسی اخلاقی اور قانونی اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اسلامی سوسائیٹی میں عورت کو وہ بلند حیثیت حاصل ہوئی جس کی نظیر دنیا کی کسی سوسائیٹی میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان عورت دنیا اور دین میں مادی، عقلی اور روحانی حیثیات سے عزت اور ترقی کے اُن بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے جن تک مرد پہنچ سکتا ہے، اور اس کا عورت ہونا کسی مرتبہ میں بھی اس کی راہ میں حارج نہیں ہے۔ آج اس بیسویں صدی میں بھی دنیا اسلام سے بہت پیچھے ہے اور افکار انسانی کا ارتقاء اب بھی اس مقام تک نہیں پہنچا ہے جس پر اسلام پہنچا ہے۔ مغرب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے عورت رہتے ہوئے نہیں دیا بلکہ مرد بنا کر دیا ہے۔ عورت درحقیقت اب بھی اس کی نگاہ میں ویسی ہی ذلیل ہے جیسی پرانے دور جاہلیت میں تھی۔ گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی، بچوں کی ماں، ایک اصلی اور حقیقی عورت کے لیے اب بھی کوئی عزت نہیں۔ عزت اگر ہے تو اس مرد مؤنث کے لیے ہے۔ جو جسمانی حیثیت سے تو عورت، مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو اور تمدن و معاشرت میں مرد ہی کا کام کرے۔ یہ انوثت کی عزت نہیں، رجولیت کی

عزت بے پستی اور دنائت کے احساس (Inferiority Complex) کا کھلا ہوا مظاہرہ یہ ہے کہ مغربی عورت مردانہ لباس فخر کے ساتھ پہنتی ہے، حالانکہ کوئی مرد زنانہ لباس پہن کر برسر عام آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ بیوی بننا لاکھوں مغربی عورتوں کے نزدیک موجب ذلت ہے، حالانکہ شوہر بننا کسی مرد کے نزدیک ذلت کا موجب نہیں۔ مردانہ کام کرنے میں عورتیں عزت محسوس کرتی ہیں، حالانکہ خانہ داری اور پرورش اطفال جیسے خالص زنانہ کاموں میں کوئی مرد عزت محسوس نہیں کرتا۔ پس بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغرب نے عورت کو بحیثیت عورت ہونے کے کوئی عزت نہیں دی ہے۔ یہ کام اسلام اور صرف اسلام نے کیا ہے کہ عورت کو تمدن و معاشرت میں اس کے فطری مقام ہی پر رکھ کر عزت و شرف کا مرتبہ عطا کیا، اور صحیح معنوں میں انوثت کے درجہ کو بلند کر دیا۔ اسلامی تمدن عورت کو عورت اور مرد کو مرد رکھ کر دونوں سے الگ الگ وہی کام لیتا ہے جس کے لیے فطرت نے اس کو بنایا ہے، اور پھر ہر ایک کو اس کی جگہ کی مناسبت سے عزت اور ترقی اور کامیابی کے یکساں مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں انوثت اور رجولیت دونوں انسانیت کے ضروری اجزاء ہیں۔ تعمیر تمدن کے لیے دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں جو خدمات انجام دیتے ہیں وہ یکساں مفید اور یکساں قدر کے مستحق ہیں۔ نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ انوثت میں کوئی ذلت۔ جس طرح مرد کے لیے عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ مرد رہے اور مردانہ خدمات انجام دے، اسی طرح عورت کے لیے بھی عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ عورت رہے اور زنانہ خدمات انجام دے۔ ایک صالح نظام تمدن کا کام یہی ہے کہ وہ عورت کو اس کے فطری دائرۂ عمل میں رکھ کر پورے انسانی حقوق دے، عزت اور شرف عطا کرے، تعلیم و تربیت سے اس کی

،،اور اسی دائرہ میں اس کے لیے ترقیوں اور کامیابیوں کی

ام معاشرت کا پورا خاکہ ہے۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے اس خاکے
یک نظر دیکھ لیجیے۔
نشا یہ کہ اجتماعی ماحول کو حتی الامکان شہوانی ہیجانات اور تحریکات
کہ انسان کی ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک پاکیزہ اور پرسکون فضا
ے ملے اور وہ اپنی محفوظ اور مجتمع قوت کے ساتھ تعمیر تمدن میں اپنے حصہ کا

تمام تر دائرۂ ازدواج میں محدود ہوں اور اس دائرے کے باہر
وکا جائے، بلکہ انتشار خیال کا بھی امکانی حد تک سدباب کر دیا جائے۔
ائرۂ عمل مرد کے دائرہ سے الگ ہو۔ دونوں کی فطرت اور ذہنی
ظ سے تمدن کی الگ الگ خدمات ان کے سپرد کی جائیں اور ان کے
ور پر کی جائے کہ وہ جائز حدود کے اندر ایک دوسرے کے مددگار ہوں
کے کوئی کسی کے کام میں خلل انداز نہ ہو سکے۔
ے نظم میں مرد کی حیثیت قوام کی ہو اور گھر کے تمام افراد صاحب خانہ

ر مرد دونوں کو پورے انسانی حقوق حاصل ہوں، اور دونوں کو ترقی
ہم پہنچائے جائیں، مگر دونوں میں سے کوئی بھی ان حدود سے تجاوز نہ کر سکے
کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔

اس نقشے پر جس نظام معاشرت کی تاسیس کی گئی ہے، اس کو چند ایسے تحفظات کی ضرورت ہے جن سے اس کا نظم اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ برقرار رہے۔ اسلام میں یہ تحفظات تین قسم کے ہیں۔

اصلاح باطن

تعزیری قوانین

انسدادی تدابیر

یہ تینوں تحفظات نظام معاشرت کے مزاج اور اس کے مقاصد کی ٹھیک ٹھیک مناسبت ملحوظ رکھ کر تجویز کیے گئے ہیں، اور مل جل کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اصلاح باطن کے ذریعہ سے انسان کی تربیت اس طور پر کی جاتی ہے کہ وہ خود بخود اس نظام معاشرت کی اطاعت پر آمادہ ہو، عام اس سے کہ خارج میں کوئی طاقت اس کو اطاعت پر مجبور کرنے والی ہو یا نہ ہو۔ تعزیری قوانین کے ذریعہ سے ایسے جرائم کا سدباب کیا جاتا ہے جو اس نظام کو توڑنے اور اس کے ارکان کو منہدم کرنے والے ہیں۔ انسدادی تدابیر کے ذریعہ سے اجتماعی زندگی میں ایسے طریقے رائج کیے گئے ہیں۔ جو سوسائٹی کے احول کو غیر طبعی ہیجانات اور مصنوعی تحریکات سے پاک کر دیتے ہیں۔ صنفی انتشار کے امکانات کو کم سے کم حد تک گھٹا دیتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم سے جن لوگوں کی اصلاح باطن مکمل نہ ہوئی ہو اور جن کو تعزیری قوانین کا خوف بھی نہ ہو ان کی راہ میں یہ طریقے ایسی رکاوٹیں ڈال دیتے ہیں کہ صنفی انتشار کی جانب میلان رکھنے کے باوجود ان کے لیے عملی اقدام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہی وہ طریقے ہیں جو عورت اور مرد کے دائروں کو عملاً الگ کرتے ہیں۔ خاندان کے نظم کو اس کی صحیح اسلامی صورت پر قائم کرتے ہیں اور ان حدود کی حفاظت کرتے ہیں جو عورتوں اور مردوں کی

زندگی میں امتیاز قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے اسلام نے مقرر کی ہیں۔

یہاں ہمارا مقصد صرف انسدادی تدابیر ہی سے بحث کرنا ہے لیکن تحفظات گزشتہ میں سے یہ آخری تحفظ پہلے دونوں تحفظات کے ساتھ ایک گہرا ربط رکھتا ہے، جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ہم اسی ترتیب کے ساتھ ان تینوں تحفظات کو بیان کریں گے۔

اصلاح باطن اس سے پہلے ہم اس حقیقت کی طرف بارہا اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلام میں اطاعتِ امر کی بنیاد کلیۃً ایمان پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص خدا اور اس کی کتاب اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو وہی شریعت کے اوامر و نواہی کا مخاطب ہے، اور اس کو اوامر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب پر آمادہ کرنے کے لیے صرف اتنا معلوم ہو جانا کافی ہے کہ فلاں امر خدا کا امر ہے اور فلاں نہی خدا کی نہی ہے۔ پس جب ایک مومن کو خدا کی کتاب سے یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ فحش اور بدکاری سے منع کرتا ہے تو اس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اس سے پرہیز کرے اور اپنے دل کو بھی اس کی طرف مائل ہونے سے پاک رکھے۔ اسی طرح جب ایک مومن عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسول نے معاشرت میں اس کے لیے کیا حیثیت مقرر کی ہے تو اس کے بھی ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ برضا و رغبت اس حیثیت کو قبول کرے، اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس لحاظ سے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اخلاق اور معاشرت کے دائرے میں بھی اسلام کے صحیح اور قابل اتباع کا مدار ایمان پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اخلاق اور معاشرت کے متعلق ہدایات دینے سے پہلے ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور دلوں میں اس کو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تو اصلاح باطن کا وہ اساسی ذریعہ ہے جس کا تعلق صرف اخلاقیات ہی سے نہیں بلکہ پورے نظام اسلامی سے ہے۔ اس کے بعد خاص کر اخلاق کے دائرے میں اسلام نے تعلیم و تربیت کا

ایک نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس کو مختصراً ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

پہلے اشارۃً یہ کہا جا چکا ہے کہ زنا اور چوری اور جھوٹ اور تمام دوسرے معاصی جن کا ارتکاب فطرت حیوانی کے غلبہ سے انسان کرتا ہے، سب کے سب فطرت انسانی کے خلاف ہیں قرآن ایسے تمام افعال کو "منکر" سے تعبیر کرتا ہے جس کا لفظی ترجمہ مجہول" یا "غیر معروف" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے افعال ہیں جن سے فطرت انسانی آشنا نہیں ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جب انسان کی فطرت ان سے ناآشنا ہے، اور حیوانی طبیعت اس پر زبردستی ہجوم کرکے اس کو ان افعال کے ارتکاب پر مجبور کرتی ہے، تو خود انسان ہی کی فطرت میں کوئی ایسی چیز بھی ہونی چاہیے جو تمام منکرات سے نفرت کرنے والی ہو۔ شارع حکیم نے اس چیز کا پتہ چلا لیا ہے وہ اس کو "حیاء" سے تعبیر کرتا ہے۔ حیاء کے معنی شرم کے ہیں۔ اسلام کی مخصوص اصطلاح میں حیاء سے مراد وہ "شرم" ہے جو کسی امر منکر کی جانب مائل ہونے والا انسان خود اپنی فطرت کے سامنے اور اپنے خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہی حیاء وہ قوت ہے جو انسان کو فحشاء اور منکر کا اقدام کرنے سے روکتی ہے اور اگر وہ جبلت حیوانی کے غلبہ سے کوئی برا فعل کر گذرتا ہے تو یہی چیز اس کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ حیاء کے اسی چھپے ہوئے مادے کو فطرت انسانی کی گہرائیوں سے نکال کر علم و معرفت کی غذا سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ اور ایک مضبوط حاسۂ اخلاقی بنا کر اس کو نفس انسانی میں ایک کوتوال کی حیثیت سے تعین کر دیتی ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک اس حدیث نبوی کی تفسیر ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ۔ لکل دین خُلُق وخلق الاسلام الحیاء۔ "ہر دین کا ایک خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خلق حیاء ہے"۔ اور وہ حدیث بھی اسی مضمون پر روشنی ڈالتی ہے جس میں سرکار رسالتماب نے فرمایا ہے کہ اذا لم تستحی فاصنع ما شئت۔ "اگر تجھ میں حیا نہیں ہے تو

جو تیرا جی چاہے کر۔ کیونکہ جب حیا، نہ ہو گی تو خواہش جس کا مبدأ جبلت حیوانی ہے، تجھ پر غالب آجائے گی، اور کوئی منکر تیرے لیے منکر ہی نہ رہے گا۔

انسان کی فطری حیا، ایک ایسے اَن گھڑ تا دے کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ابھی کوئی صورت اختیار نہ کی ہو۔ وہ تمام منکرات سے بالطبع نفرت تو کرتی ہے، مگر اس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے، اس وجہ سے وہ نہیں جانتی کہ کسی خاص فعل منکر سے اس کو کس لیے نفرت ہے۔ یہی نادانستگی رفتہ رفتہ اس کے احساس نفرت کو کمزور کر دیتی ہے حتیٰ کہ حیوانیت کے غلبہ سے انسان منکرات کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اس ارتکاب کی ممارست آخر کار حیا کے احساس کو بالکل باطل کر دیتی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا مقصد اسی نادانی کو دور کرنا ہے۔ وہ اس کو نہ صرف کھلے ہوئے منکرات سے روشناس کراتی ہے بلکہ نفس کے چور خانوں تک میں نیتوں اور ارادوں اور خواہشوں کی جو برائیاں چھپی ہوئی ہیں، ان کو بھی اس کے سامنے نمایاں کر دیتی ہے، اور ایک ایک چیز کے مفسدوں سے اس کو خبردار کرتی ہے تاکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس سے نفرت کرے۔ پھر اخلاقی تربیت اس تعلیم یافتہ شرم وحیا کو اس قدر حساس بنا دیتی ہے کہ منکر کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اس سے مخفی نہیں رہتا، اور نیت وخیال کی ذرا سی لغزش کو بھی وہ تنبیہ کیے بغیر نہیں چھوڑتی۔

اسلامی اخلاقیات میں حیا کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ تمدن و معاشرت کا جو شعبہ انسان کی صنفی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اس میں بھی اسلام نے اصلاح اخلاق کے لیے اسی چیز سے کام لیا ہے۔ وہ صنفی معاملات میں نفس انسانی کی نازک سے نازک چوریوں کو پکڑ کر حیا کو ان سے خبردار کرتا ہے، اور ان کی نگرانی پر مامور کر دیتا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں اس لیے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے

قانون کی نظر میں زنا کا اطلاق صرف جسمانی اتصال پر ہوتا ہے۔ مگر اخلاق کی نظر میں دائرہ ازدواج کے باہر صنف مقابل کی جانب ہر میلان، ارادے اور نیت کے اعتبار سے زنا ہے۔ اجنبی کے حسن سے آنکھ کا لطف لینا، اس کی آواز سے کانوں کا لذت یاب ہونا، اس سے گفتگو کرنے میں زبان کا لوچ کھانا، اس کے کوچے کی خاک چھاننے کے لیے قدموں کا بار بار اٹھنا، یہ سب زنا کے مقدمات اور خود معنیً زنا ہیں۔ قانون اس زنا کو نہیں پکڑ سکتا۔ یہ دل کا چور ہے اور صرف دل ہی کا کوتوال اس کو گرفتار کر سکتا ہے۔ حدیث نبوی اس چور کی مخبری اس طرح کرتی ہے۔

العینان تزنیان وزناھما النظر (فتح الباری) آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کی زنا نظر ہے۔

والیدان تزنیان وزناھما البطش اور ہاتھ زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا دست درازی

والرجلان تزنیان وزناھما المشی (ابوداؤد ہے اور پاؤں زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا

باب ما یومر بہ من غض البصر)۔ اس راہ میں چلنا ہے۔

وزنا اللسان النطق والنفس اور زبان کی زنا گفتگو ہے اور نفس تمنا اور خواہش

تمنی وتشتھی والفرج یصدق ذلک کلہ کرتا ہے۔ آخر میں شرمگاہ یا تو ان سب کی تصدیق

ویکذبہ۔ (بخاری۔ باب زنا الجوارح)۔ کر دیتی ہے یا تکذیب۔

نفس کا سب سے بڑا چور نگاہ ہے، اس لیے قرآن اور حدیث دونوں سب سے پہلے اسی کی گرفت کرتے ہیں قرآن کہتا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ اے نبی مومن مردوں سے کہدو کہ اپنی نگاہوں کو

يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (غیر عورتوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ

يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ ۔ (النور : ۳۱)۔

ہے ۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے ۔ اور اے نبی مومن عورتوں سے بھی کہدو کہ اپنی نگاہوں کو (غیر مردوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ۔

حدیث میں ہے :-

ابن آدم لك اول نظرة وایاك والثانیہ (الجصاص)

اے ابن آدم تیرے لیے پہلی نظر کی اجازت ہے مگر خبردار دوسری نظر نہ ڈالنا ۔

حضرت علی سے فرمایا :-

یا علی لا تتبع النظرة النظرة فان لك الاولیٰ ولیس لك الاخرة ۔ (ابوداؤد ۔ باب ما یومر بہ عن غض البصر)

اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈال پہلی نظر تو معاف ہے، مگر دوسری نظر نہیں ۔

حضرت جابر نے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں ۔ فرمایا فوراً نظر پھیر لو (ابوداؤد باب مذکور)۔

اسی فتنہ نظر کا ایک شاخسانہ وہ بھی ہے جو عورت کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ اس کا حسن دیکھا جائے ۔ یہ خواہش ہمیشہ جلی اور نمایاں ہی نہیں ہوتی ۔ دل کے پردوں میں کہیں نہ کہیں نمائش حسن کا جذبہ چھپا ہوا ہوتا ہے، اور وہی لباس کی زینت میں، بالوں کی آرائش میں، باریک اور شوخ کپڑوں کے انتخاب میں اور ایسے ایسے خفیف جزئیات تک میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے جن کا احاطہ ممکن نہیں ۔ قرآن نے ان سب کے لیے ایک جامع لفظ استعمال کیا ہے ۔ تبرج جاھلیہ ۔ ہر وہ زینت اور ہر وہ آرائش جس کا مقصد شوہر کے سوا دوسروں کے لیے لذت نظر بنا ہو، تبرج جاہلیت کی تعریف میں آجاتا ہے ۔ اگر برقع

بھی اس غرض کے لیے خوبصورت اور خوش رنگ اختیار کیا جائے کہ نگاہیں اس سے
یاب ہوں تو یہ بھی تبرج جاہلیت ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ اس
تعلق عورت کے اپنے ضمیر سے ہے۔ اُس کو خود ہی اپنے دل کا حساب لینا چاہیے کہ اس
نہیں یہ ناپاک جذبہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ اس حکم خداوندی کی مخاطب
وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (الاحزاب : ۴) جو آرائش ہر بری نیت سے
پاک ہو، وہ اسلام کی آرائش ہے۔ اور جس میں ذرہ برابر بھی بری نیت شامل ہو
جاہلیت کی آرائش ہے۔

شیطان نفس کا ایک دوسرا خطرناک ایجنٹ زبان ہے۔ کتنے ہی فتنے ہیں جو
کے ذریعہ سے پیدا ہوتے اور پھیلتے ہیں۔ مرد اور عورت بات کر رہے ہیں۔ کوئی بُرا جذبہ
نہیں ہے۔ مگر دل کا چھپا ہوا چور آواز میں حلاوت، لہجے میں لگاوٹ، باتوں میں گھلا
پید لیے جا رہا ہے۔ قرآن اس چور کو پکڑ لیتا ہے۔

اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ (الاحزاب : ۴)۔

اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں (بدنیتی کی) بیماری ہوگی وہ تم سے کچھ امیدیں وابستہ کرے گا۔ بات تو سیدھے سادھے طریقہ سے کرو، (جس طرح انسان انسان سے بات کیا کرتا ہے)۔

یہی دل کا چور ہے جو دوسروں کے جائز یا ناجائز صنفی تعلقات کا حال بیان کرنے
میں بھی مزے لیتا ہے اور سننے میں بھی۔ اسی لطف کی خاطر عشق و محبت کے افسانے جھوٹ
ملا کر جگہ جگہ بیان کیے جاتے ہیں اور سوسائٹی میں ان کی اشاعت اس طرح ہوتی ہے جیسے
پُوے پُوے آنچ لگتی چلی جاتی ہے۔ قرآن اِس پر بھی تنبیہ کرتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (النور : ۲)۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گروہ میں بے حیائی کی اشاعت ہو ان کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔

فتنۂ زبان کے اور بھی بہت سے شعبے ہیں۔ اور ہر شعبہ میں دل کا ایک نہ ایک چور اپنا کام کرتا ہے۔ اسلام نے ان سب کا سراغ لگایا ہے اور ان سے خبردار کیا ہے۔

عورت کو اجازت نہیں کہ اپنے شوہر سے دوسری عورتوں کی کیفیت بیان کرے۔

لا تباشر المرأة المرأة حتى تصفها لزوجها كأنه ينظر إليها۔ (ترمذی باب ماجاء في كراهية مباشرة المرأة بالمرأة) عورت عورت سے خلا ملا نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی کیفیت اپنے شوہر سے اس طرح بیان کرے کہ گویا وہ خود اس کو دیکھ رہا ہے۔

عورت اور مرد دونوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ اپنے پوشیدہ ازدواجی معاملات کا حال دوسرے مردوں کے سامنے بیان کریں، کیونکہ اس سے بھی فحش کی اشاعت ہوتی ہے اور دلوں میں شوق پیدا ہوتا ہے۔ (ابوداؤد۔ باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اھلہٗ)۔

نماز با جماعت میں اگر امام غلطی کرے، یا اس کو کسی حادثہ پر متنبہ کرنا ہو تو مردوں کو سبحان اللہ کہنے کا حکم ہے۔ مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ صرف دستک دیں زبان سے کچھ نہ بولیں۔ (ابو داؤد باب التصفیق فی الصلوٰۃ۔ و بخاری باب التصفیق للنساء)

بسا اوقات زبان خاموش رہتی ہے، مگر دوسری حرکات سے سامعہ کو متاثر کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق بھی نیت کی خرابی سے ہے، اور اسلام اس کی بھی ممانعت کرتا ہے۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ اور وہ اپنے پاؤں زمین پر نہ ماریں کہ جو زینت

مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (۲۴:۳۱)۔ انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا حال معلوم ہو۔

خوشبو بھی ان قاصدوں میں سے ایک ہے جو ایک نفسِ شریر کا پیغام دوسرے نفسِ شریر تک پہنچاتے ہیں یہ خبر رسانی کا سب سے زیادہ لطیف ذریعہ ہے جس کو دوسرے خفیف سمجھتے ہیں، مگر اسلامی حیا اتنی حسّاس ہے کہ اس کی طبعِ نازک پر یہ لطیف تحریک بھی گراں ہے وہ ایک مسلمان عورت کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ خوشبو میں بسے ہوئے کپڑے پہن کر راستوں سے گذرے یا محفلوں میں شریک ہو، کیونکہ اس کا حسن اور اس کی زینت پوشیدہ بھی ہو تو کیا فائدہ۔ اس کی عطریت تو فضا میں پھیل کر جذبات کو متحرک کر رہی ہے۔

قَالَ النَّبِیُّ صلعم المرأۃ اذا استعطرت فمرت بالمجلس فھی کذا وکذا یعنی زانیۃ (ترمذی باب ماجاء فی کراھیۃ خروج المتعطرۃ) — نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت جب عطر لگائے اور کسی مجلس سے گذرے تو وہ ایسی اور ایسی ہے، یعنی زانیہ۔

اذا شَهِدَتْ اِحْدَاكُنَّ الْمَسْجِدَ فَلَا تَمَسَّ طيباً۔ (مؤطاء ومسلم) — جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں جائے تو خوشبو نہ لگائے۔

طيب الرِّجَال مَا ظهرَ ريحه وخفي لونهٗ وطيب النساء ما ظهر لونهٗ وخفي ريحه (ترمذی باب ماجاء فی طیب الرجال والنساء۔ وابوداؤد۔ باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اھلہٗ)۔ — مردوں کے لیے وہ عطر بہتر ہے جس کی خوشبو نمایاں اور رنگ مخفی ہو۔ اور عورتوں کے لیے وہ عطر بہتر ہے جس کا رنگ نمایاں اور خوشبو مخفی ہو۔

سترِ عورت کے باب میں، اسلام نے انسانی شرم و حیاء کی جس قدر صحیح اور مکمل نفسیاتی تعبیر کی ہے اس کا جواب دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں پایا جاتا۔ آج دنیا کی مہذب ترین قوموں

بھی یہ حال ہے کہ ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کو اپنے جسم کا کوئی حصہ کھول دینے میں باک نہیں۔ ان کے اس لباس محض زینت کے لیے ہے۔ ستر کے لیے نہیں ہے۔ مگر اسلام کی نگاہ میں زینت سے زیادہ ستر کی اہمیت ہے۔ وہ عورت اور مرد دونوں کو جسم کے وہ تمام حصے چھپانے کا حکم دیتا ہے جن میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پائی جاتی ہے۔ عریانی ایک ایسی ناشائستگی ہے جس کو اسلامی حیا، کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ غیر تو غیر اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہوں۔

اذا اتی احدکم اھلہ فلیستتر ولا یتجرد تجرد العیرین (ابن ماجہ۔ باب التستر عند الجماع)	جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس کو چاہیے کہ ستر کا لحاظ رکھے۔ بالکل گدھوں کی طرح ننگا نہ ہو جائے۔
قالت عایشہ ما نظرت الی فرج رسول اللّٰہ صلعم قط۔ (شمائل الترمذی۔ باب ما جاء فی حیاء رسول اللہ صلعم)۔	حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا۔

اس سے بڑھ کر شرم وحیا یہ ہے کہ تنہائی میں بھی عریاں رہنا اسلام کو گوارا نہیں۔ اس لیے کہ اللہ احق ان یستحیی منہ "اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے"۔ (ترمذی باب حفظ العورۃ)۔ حدیث میں آتا ہے کہ:۔

ایاکم والتعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الی اھلہ۔ فاستحیوھم واکرموھم (ترمذی۔ باب ما جاء فی الاستتار عند الجماع)	خبردار کبھی برہنہ نہ رہو کیونکہ تمہارے ساتھ خدا کے فرشتے لگے ہوئے ہیں جو تم سے جدا نہیں ہوتے بجز ان اوقات کے جن میں تم رفع حاجت کرتے ہو یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو۔ لہٰذا تم ان سے شرم کرو اور ان کی عزت کا لحاظ رکھو۔

اسلام کی نگاہ میں وہ لباس درحقیقت لباس ہی نہیں جس میں سے بدن جھلکے اور ستر نمایاں ہو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نساءٌ کاسیات عاریات ممیلات مایلات رؤسھن کاسنمۃ البخت المائلۃ لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحھا (مسلم۔ باب النساء الکاسیات العاریات)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہوں اور دوسروں کو رجھائیں اور بختی اونٹ کی طرح نازسے گردن ٹیڑھی کرکے چلیں وہ جنت میں ہرگز داخل ہونگی بلکہ اس کی خوشبو بھی نہ پائیں گی۔

یہاں استیعاب مقصود نہیں۔ ہم نے صرف چند مثالیں اس غرض سے پیش کی ہیں کہ ان سے اسلام کے معیار اخلاق اور اس کی اخلاقی اسپرٹ کا اندازہ ہوجائے۔ اسلام سوسائٹی کے ماحول اور اس کی فضا کو فحشاء و منکر کی تمام تحریکات سے پاک کردینا چاہتا ہے۔ ان تحریکات کا سرچشمہ انسان کے باطن میں ہے۔ فحشاء و منکر کے جراثیم وہیں پرورش پاتے ہیں، اور وہیں سے اُن چھوٹی چھوٹی تحریکات کی ابتدا ہوتی ہے جن کو جاہل انسان خفیف سمجھکر نظر انداز کردیتا ہے، مگر حکیم کی نگاہ میں دراصل وہی اخلاق اور تمدن و معاشرت کو تباہ کردینے والی خطرناک بیماریوں کی جڑ ہیں۔ لہٰذا اسلام کی تعلیم اخلاق باطن ہی میں حیاء کا اتنا زبردست احساس پیدا کردینا چاہتی ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا احتساب کرتا رہے، اور برائی کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اگر پایا جائے تو وہ اس کو محسوس کرکے آپ ہی اپنی قوت ارادی سے اس کا استیصال کردے۔ (باقی)۔

مطبوعات

التعوذ فی الاسلام ۔ تالیف مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی۔ قیمت غیر مجلد ۸؍ ۔ مجلد ۱۰؍ ۔ کتبخانہ مطبع قاسمی ۔ دیوبند ۔

یہ سورۂ فلق اور سورۂ ناس کے مضامین کی ایک عجیب و نادر تشریح ہے۔ ان دونوں سورتوں میں حق تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو اور ان کے واسطہ سے تمام اہل ایمان کو بتایا ہے کہ جس قدر شرور و آفات اس دنیا میں پائے جاتے ہیں ان کا پیدا کرنے والا کوئی غیر نہیں ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا ان سے بچنے کے لیے تم کو کسی دوسری طاقت سے پناہ مانگنے کی ضرورت نہیں اسی کی پناہ مانگو اور اسی کی پناہ تمہارے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ پھر جملہ شرور مخلوقات (شَرِّ مَا خَلَقَ) کو چار اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ، شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ، شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ اور شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ۔ ان چاروں شرور سے پناہ دینے والا وہی ہے جو رب الفلق ہے، رب الناس ہے، ملک الناس ہے اور اِلٰہ الناس ہے۔ مؤلف نے بڑی خوبی کے ساتھ ان شرور میں سے ایک ایک شر کی حقیقت بیان کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر ایک شر سے بچنے کا ذریعہ تعوّذ ہے۔ پھر تعوّذ کے لیے خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت اور صفتِ ملکیت اور صفتِ الوہیت کا ذکر جو کیا گیا ہے، اس کی حکمت کے بیان میں انہوں نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کی ہیں جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوران بحث میں بہت سے ضمنی مباحث بھی آگئے ہیں جن میں علم اور حکمت اور تدبر اور تحقیق کی شان ہر جگہ نمایاں ہے لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں مزید تحقیق کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے شلاً شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ کے معنی کو صرف سحر کے معنی میں محصور کر دیا گیا ہے حالانکہ اس کے دوسرے معنی بھی ہیں اور ان کی طرف بھی اشارہ ضروری تھا۔ پھر سحر کی حقیقت اور اس کی تاریخ اور اس کے اثرات کے متعلق مولف نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی نہ تو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ہے اور نہ علمی تحقیق کے لحاظ سے کوئی بلند پایہ چیز ہے کوائب یورات میں مولف نے طبیعی تاثیرات کے علاوہ روحانی و باطنی تاثیرات بھی ثابت کی ہیں جو محل نظر ہیں۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ اوہام باطلہ کو نظر انداز کر کے ان امور کی حقیقت پر خاص اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی یہ سب سے زیادہ جو چیز ہم کو کھٹکی وہ یہ ہے کہ حقیقت تعوذ اور طریق تعوذ کے باب میں فاضل مولف، بھی عام غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں جو دراصل یہ متاخرین کی پست خیالی اور حقائق سے منحرف ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ آیات قرآنی اور اسمار الٰہی کی روح کو چھوڑ کر صرف الفاظ کی تاثیرات میں غلو کیا گیا اور ان کے نقوش اور عملیات اور زبانی ورد کو ظہور عجائب اور حصول مقاصد کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ مسلمانوں کی عملی اور اخلاقی قوتوں کے لیے یہ ذہنیت ایک طرح کی افیون ثابت ہوئی ہے۔ اسی چیز نے ان کو ایک بے عمل اور اوہام پرست قوم بنایا ہے۔ اسی نے قرآن کی انقلاب انگیز تعلیم سے ان کا رشتہ توڑا ہے اسی نے تدبر فی القرآن اور عمل بالقرآن کے ذوق کو فنا کر کے مسلمانوں میں یہ جو گیانہ ذوق پیدا کیا ہے کہ وہ اسباب طبیعی سے کام لینے اور قانون فطرت کے مطابق جد و جہد کرنے کے بجائے صرف نقوش و اوراد سے کام لیتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کے تمام مقاصد فوق الطبیعی صورتوں سے پورے ہوا کریں۔ اب ان کی زبان میں عمل کے معنی اس عمل کے نہیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے کیا تھا بلکہ عمل صرف یہ رہ گیا ہے کہ چند مقرر اوقات میں چند مقرر شرائط کے ساتھ ایک خاص وظیفہ جپ لیا جائے اور یہ امید رکھی جائے کہ اس وظیفہ

کی طاقت سے پہاڑ ٹل جائیں گے، خزانے ابلیں گے، خوارق عادت ظاہر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ ان کی خاطر سے اپنی سنت کو بدل دے گا۔ ذکر اور تعوذ اور عزیمت اور دوسری اسلامی اصطلاحات کے مفہوم بھی اسی طرح الٹ دیے گئے ہیں، اور انکی جان نکال کر یہی "افیونیت" اُن میں بھر دی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ فاضل مؤلف بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جملہ شرور و آفات سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فلق اور سورۂ ناس کو ایک "نسخہ" کے طور پر نازل فرمایا ہے اور اس کا مقصد بس اتنا ہے کہ جب کوئی آفت آئے تو معوذتین کو پڑھ کر دم کیا جائے، پانی پر پھونک کر پلایا جائے اور تعویذ میں باندھ کر لٹکا دیا جائے۔ ہم الفاظ قرآنی کی برکت اور اسماء الٰہی کی تاثیرات کے منکر نہیں ہیں۔ بلاشبہ ان میں بے شمار فوائد ہیں، مگر یہ ہماری بدقسمتی ہوگی اگر ہم مغز کے اصلی اور عظیم ترین فوائد کو چھوڑ کر صرف قشر کے ضمنی فوائد کو اصل سمجھ لیں۔ اصل چیز تو وہ علم ہے جو معوذتین سے ہم کو عطا کیا گیا ہے، اور اصلی تعوذ یہ ہے کہ یہ علم کمال درجہ تصدیق و یقین کے ساتھ ہمارے دل میں بیٹھ جائے اور جملہ شرور و آفات کے مقابلے میں ہم حق تعالیٰ کی طرف اس طرح رجوع کریں کہ کسی طاقت کا خوف ہمارے پاس نہ پھٹکے اور غیر اللہ سے پناہ مانگنے کا ادنیٰ سے ادنیٰ خیال بھی نہ آنے پائے۔ معوذتین کا ورد اگر اس علم و یقین کے ساتھ ہو اور ہر بار پڑھنے کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی چلی جائے تو مسلمان کے قلب و روح میں وہ طاقت پیدا ہوگی کہ کسی شرِّ ما خلق کا اثر اس پر کارگر نہ ہو گا۔ یہ ان دونوں سورتوں کی روح ہے اور اسی روح کو نمایاں کرنے کی ضرورت تھی۔ عملیات اور نقوش و اَوراد کی غذا تو مسلمانوں کو بہت مل چکی ہے۔ اس جنس کی اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی (ا-م)۔

النحو فی الاسلام تالیف مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی۔ قیمت ۸ ر۔ کتب خانہ مطبع قاسمی دیوبند (ضلع سہارنپور)۔

فاضل مؤلف نے اس رسالہ میں آیۂ کریمہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کی تفسیر ایک نئے انداز میں کی ہے۔ بحث کا مرکز صرف لفظ وَانْحَرْ ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے فاضل موصوف نے قربانی کی حکمت و ضرورت اور اسکے نفسی و روحانی فوائد پر بڑی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ انداز بیان خطیبانہ اور صوفیانہ ہے۔ دلائل زیادہ تر خطابیات کے قبیل سے ہیں اور نکتہ آفرینی میں اہل تصوف کے طریقہ کا اتباع کیا گیا ہے۔ اہل ایمان کو اطمینان بخشنے کے لیے تو بلاشبہہ یہ طرز بحث بہت مفید ہے، لیکن منکرین اور مشککین کے شبہات و اعتراضات کو رفع کرنے میں یہ کچھ بھی کارگر نہیں۔ ان کے لیے اسلوب بیان منطقی ہونا چاہیے اور دلائل کا انتخاب ایسے مواد سے کرنا چاہیے جو یقینیات یا مسلمات کے قبیل سے ہو۔ قربانی پر اعتراض کرنے والے تین قسم کے ہیں:۔

ایک وہ جنہیں نفس گوشت خوری ہی پر اعتراض ہے۔

دوسرے وہ جو گوشت خوری کو تو جائز رکھتے ہیں؟ مگر "قربانی" کو عبادت اور ذریعۂ تقرب الی اللہ تسلیم کرنے میں انھیں تامل ہے۔

تیسرے وہ جن کو قربانی پر اقتصادی حیثیت سے اعتراض ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عیدالاضحیٰ میں مسلمانوں کا لاکھوں روپیہ جو قربانی پر "ضائع" ہوتا ہے اس کو خیرات و صدقات کے زیادہ مفید کاموں میں کیوں نہ صرف کیا جائے۔

ان معترضین کے شبہات کو رفع کرنے کے لیے وہ طرز استدلال کسی طرح مفید نہیں جس کو فاضل مؤلف نے اختیار کیا ہے، اور آج کل ضرورت انہی شبہات کو رفع کرنے کی ہے۔ کیا ہی بہتر ہو کہ ایک رسالہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھی لکھ دیا جائے۔ (ا-م)۔

النحو الصراح تالیف جناب مولوی عبدالحق صاحب مدرس عربی ہائی اسکول بہاول نگر (ریاست بہاولپور) قیمت درج نہیں۔ مولف سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

یہ ۴۴ صفحات کا مختصر رسالہ اس غرض کے لیے لکھا گیا ہے کہ نکاح خوانوں کو مسائل نکاح وطلاق کے ضروری جزئیات سے واقف کر دیا جائے۔ عام طور پر نکاح خواں حضرات (جو اب "قاضی" کہلانے لگے ہیں) نکاح وطلاق کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہوتے ہیں اور اس ناواقفیت کی وجہ سے نکاح پڑھانے میں اکثر ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے بہت سی شرعی وقانونی پیچیدگیاں پڑ جاتی ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے مؤلف نے فقہ حنفی کے مطابق جملہ ضروری مسائل کو نہایت سہل انداز بیان میں مرتب کر دیا ہے۔ نکاح خوانوں کے علاوہ عامۃ المسلمین کے لیے بھی یہ رسالہ مفید ہے۔

بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ مؤلف نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر متعدد ایسے احکام شریعت کو معطل کر دیا ہے جن کے اجراء کے مواقع، موجودہ حکومت کے تحت ہمیں حاصل ہیں۔ دارالحرب کا یہ تصور اصلاً غلط ہے۔ شریعت کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ آپ دارالحرب میں قیام بھی کریں اور پھر جو احکام اسلامی نافذ ہو سکتے ہیں ان کو بھی محض اس لیے معطل کر دیں کہ کتب فقہ میں دارالحرب کی جو تعریف لکھی ہے وہ اس پر صادق آ گئی ہے۔ دراصل شارع کا منشا یہ ہے کہ آپ یا تو وہاں سے ہجرت کریں، یا نہیں تو حسب امکان احکام کی کوشش کریں کے اعلائے دارالاسلام بنا دیں۔

کافرہ اگر شوہر والی ہو اور مسلمان ہو جائے تو مؤلف نے اس کے لیے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ وہ تین حیض یا تین ماہ تفریق کے لیے گذارے، پھر مزید تین حیض یا تین ماہ عدت میں صرف کرے پھر اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ تفریق کے لیے تین حیض یا تین ماہ گذارنے کا حکم تو اس جگہ کے لیے ہے جہاں کوئی حاکم اسلامی قانون کے مطابق تفریق کا حکم دینے والا موجود نہ ہو۔ ہندوستان کی یہ حالت نہیں ہے۔ یہاں ایک نومسلم عورت عدالت میں دعویٰ کر کے حکم تفریق

حاصل کر سکتی ہے ۔ اگر با قاعدہ قانونی تفریق کے بغیر وہ تین طہر گذار کر نکاح کرلے تو قانون کے مطابق اُس پر ازدواج کرر کا مقدمہ قائم ہوجائیگا۔ لہٰذا قانون اسلامی اور قانون دونوں ہی کی رو سے یہ ضروری ہے کہ عدالت سے تفریق کا حکم حاصل کیا جائے ۔ پھر تفریق کے عدت گذارنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہٗ کی رائے میں ضروری نہیں الّا یہ کہ عورت حاملہ ہو حالات زمانہ کو دیکھتے ہوئے اسی رائے پر فتویٰ ہونا چاہیے ۔ صاحبین کے فتوی پر عمل کرنا زمانے میں موجب فتنہ ہے ۔ کیونکہ ایک عورت جو اپنے اولیاء اور اپنے شوہر سے الگ ہو کر مسلما کی جماعت میں شامل ہوئی ہے اس کو تفریق کے بعد تین مہینہ تک بے شوہر رہنے پر مجبور کرنا سے خالی نہیں ۔

لعان کے مسئلہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں لعان نہیں ہے ، کیونکہ لعان کے لیے تہمت زنا کا دار الاسلام میں ہونا شرط ہے ، اور ہندوستان دار الاسلام نہیں یہ مسئلہ لکھتے وقت مولف کو غور کرنا چاہیے تھا کہ اس سے کروروں مسلمانوں کی عظیم الشان آبا میں کتنے فتنوں کا دروازہ کھلتا ہے ۔ یہاں تو ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ محمڈن لا میں کی دفعات کا اضافہ کیا جائے ، کیونکہ تہمت زنا یا نفی ولد کے بعد زوجین کا ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رہنا سخت مفاسد کا موجب ہوجاتا ہے ۔ مگر فاضل مؤلف دار الحرب کی اصطلاحی دشواری پیدا کر کے اس دروازے کو ہمیشہ کے لیے کھلا رکھنے کا سامان کر رہے ہیں

مسائل لعان میں مؤلف نے صرف یہ لکھدیا ہے کہ ملاعنت کے بعد حاکم تفریق کر اس کے ساتھ یہ بھی بیان کرنا ضروری تھا کہ ملاعنت سے مہر ساقط نہیں ہوتا (ا ۔ م) ۔

The Great Prophet تالیف فضل کریم خاں صاحب درانی بی ۔ اے ایڈیٹر اخبا قیمت ۱۲ار مفت تقسیم کرنے کے لیے پانچ نسخوں کی قیمت (ع) روپیہ ۔ پچاس نسخوں کی قیمت

انسٹھوں کی قیمت ۵ روپیہ تبلیغ لٹریچر کمپنی نمبر ۶۶ ریلوے روڈ۔ لاہور۔

انگریزی زبان میں سیرت پاک پر ایک مختصر کتاب ہے جس کو نہایت سادہ اور موثر زبان میں لکھا گیا ہے۔ انگریزی خواں غیر مسلموں کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے ابتدائی طور پر روشناس کرانے کے لیے ایک مفید چیز ہے اور اس قابل ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم دوستوں کو ہدیۃً نذر کریں اسی لیے ناشرین نے زیادہ تعداد میں خریدنے والوں کے لیے خاص رعایت رکھی ہے۔ (ا - م)۔

کلام جوہر | صفحات ۱۴۱ - قیمت ۸ر۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔

یہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جس کو نئی ترتیب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ ابتدا میں جناب مولٰنا عبد الماجد دریا بادی مدیر "صدق" کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس میں عقیدت و محبت کے ساتھ شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کی اصلی خوبیاں نمایاں کی گئی ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم کے دل و دماغ کو قدرت نے شعر و ادب کا نہایت پاکیزہ ذوق عطا کیا تھا جس سے انہوں نے زیادہ تر اپنے مضامین اور تقریروں میں کام لیا۔ ان اصلاحی اور مفید کاموں سے جو شعریت بچی وہ کبھی کبھی شعر گوئی میں بھی صرف ہوتی رہی۔ مرحوم کی تمام شاعری سوز و گداز سے لبریز ہے اس ہوسناکی کے چٹخارے اور شہوانی جذبات کو بھڑکانے والے حرکات قطعاً ناپید ہیں۔ کمر کی لچک اور باہوں کے لوچ کے بجائے تلوار کی لچک اور پھانسی کے پھندے کا لوچ پایا جاتا ہے۔ شاعرانہ تخیل پر اسلامی تخیل غالب ہے۔ آغاز عمر کے کلام میں رنگ ہلکا تھا۔ جوں جوں امتداد عمر کے ساتھ جذبۂ اسلامی بڑھتا گیا جوہر کا راستہ دوسرے شعرا سے الگ ہوتا چلا گیا ۔۔۔ وہ نہ تو زمانہ کی ناسازگاری پر ماتم کرتے ہیں نہ فلک کج رفتار کو کوستے ہیں۔ ان کا نظریہ "تسلیم و رضا" ہے۔ قید خانہ کی چار دیواری میں بیٹھ کر کس اطمینان سے کہتے ہیں

ہوں بے ہراس یہ مجھے رکھیں کہیں بھی ڈر ہو وہاں کہ تیری حکومت جہاں نہ ہو

ان کا جذبۂ عشق رسول ہر مسلمان کے لیے قابل رشک ہے۔ اشعار میں جا بجا اس گراں قدر جذبہ کا اظہار کیا ہے۔ ایک غزل کا مقطع ہے۔

نہیں معلوم کیا ہو حشر جو ہر کا پر اتنا ہے کہ ہاں نام محمد مرتے دم ورد زباں ہو گا

کلام میں تغزل کی خوش گوار چاشنی اور زبان کی شیرینی بمقدار وافر پائی جاتی ہے جن کو شعر کا چسکا ہو وہ عریاں نظموں اور فحش غزلوں کے بجائے اس آب کوثر سے اپنی پیاس کیوں نہ بجھائیں۔ (م - ق)

سید البشر | تالیف مولوی ابو سعید عبد الرحمن صاحب فرید کوٹی۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۲ر ملنے کا پتہ: میاں سعید احمد خان۔ دروازہ نندیانی، ریاست فرید کوٹ (پنجاب)۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت بائبل کے عہد عتیق اور عہد جدید میں جو بشارتیں مذکور ہیں عربی فارسی اور اردو میں ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ سید البشر کے مصنف نے ایک نئے اسلوب پر پچاس بشارتیں انتخاب کر کے ان کو سیرت پاک سے توفیق و تطبیق دی ہے۔ شروع میں مسیح علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ طیبہ نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے نسب کے بارے میں انجیل متی اور انجیل لوقا میں کس قدر اختلاف ہے۔ لوقا نے مسیح کے فرضی باپ یوسف نجار سے زرو بابل تک ۲۰ واسطے بتائے ہیں اور متی صرف ۱۱ واسطے بیان کرتا ہے۔ بخلاف اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام تک متفق علیہ ہے۔ طبری اور ابن سعد وغیرہم نے جو شجرے نقل کیے ہیں ان میں ایک نام کا بھی اختلاف نہیں۔ (ا - خ)۔

من کہ در تدبیرِ غم بیچارہ ام
چارۂ آں غمگساراں یاد باد

گرچہ یاراں فارغند از یادِ من
از من ایشاں را ہزاراں یاد باد

رازِ حافظ بعد ازیں ناگفتہ بہ
اے دریغ از رازداراں یاد باد

عشق عصیان است اگر مستور نیست
کشتۂ جرمِ زباں مغفور نیست

برتر از عشق است عالم پایۂ
راہ از من تا جنوں پُر دور نیست

دلفریبہائے دشمن دیدۂ
جاں سپاریہائے ما منظور نیست

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بد مزہ نہ ہوا

سادگیہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

نیند اُسکی دماغ اُس کا راتیں اُس کی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُس کی بزم میں آتا تھا جام مے — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے — ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

شیشہ کو بھی توڑو تو نکلتی ہے اک آواز — عاشق کا یہ دل ہے کہ جو ٹوٹے تو صدا ہیچ
ہم شیخ کی سنتے تھے مریدوں سے بڑائی — دیکھا جو انہیں جا کے تو عمامہ سوا ہیچ

اُستاد نے اچھا سبق عشق پڑھایا — جب اسکو بہلاتا ہوں تو ہوتا ہے سوا یاد
چبھتا تھا لڑکپن ہی سے کچھ بانکپن اُس کا — ترچھی سی نگہ یاد ہے برچھی سی ادا یاد

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں — بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

بیٹھا تو گرا ، گرا تو بیہوش

گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

تھوڑا لکھا ، بہت سمجھنا

آپ اپنی قضا کا نوحہ خواں تھا

کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

(اشعار)

پل مارنے کی ہوئی جو دیری — سبحان اللہ شان تیری!

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں — غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

گھربار سے کیا فقیر کو کام — کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے — جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

ہر ذرہ کا چمکے گا ستارہ — قائم جو زمین و آسماں ہے

درویش رواں رہے تو بہتر — آب دریا بہے تو بہتر

قسمت سے مفر ہے اب نہ مامن — پتھر کے تلے دبا ہے دامن

طالع سے کسے تھی ایسی امید — نکلا ہے کدھر سے آج خورشید

اب دیوان سے اسی قبیل کے اشعار میں سے تھوڑے سے نمونے منتخب کرکے پیش کرتا ہوں۔

جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی — کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا — شاخ گل اک روز جھونکا کھائیگی

صندلی رنگوں سے مانا دل ملا — دردِ سر کی کس کے ملتے جائیگی

یا ہاتھ توڑے جائیں گے یا کھولیں گے نقاب — سلطانِ عشق کی یہی فتح و شکست ہے

لائے اس بت کو التجا کرکے — کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

اربابِ ذوقِ سلیم کے لئے اتنے ہی نمونے بس ہیں۔

شرر اور چکبست کی معرکہ آرائی میں منشی سجاد حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ نے ۲۱

کے ثبوت میں کہ گلزارِ نسیم ایک ہندو شاعر کی تصنیف ہے محض ایک ہی مصرعہ ساری مثنوی میں

منتخب کرکے پیش کیا تھا: "شب کی پوشاک بدلی ساری" اس طویل مباحثہ میں اس سے زیادہ کوئی

پیش نہیں کیا گیا۔ حالانکہ درحقیقت نہ اس بحث کی گنجائش ہے کہ یہ مثنوی سوا حضرت نسیم مرحوم کے کسی اور کی تصنیف ہے اور نہ ثبوت کی ضرورت۔ اگر ثبوت ہی پیش کرنا ضروری سمجھا جائے تو ایسے ثبوت کی مثنوی میں کمی نہیں ہے۔ قارئین کرام اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیں:-

بے وقت وہ راگ خوش نہ آیا — بے فصل وہ پھاگ خوش نہ آیا

دہقان کی زوجہ کے کھلے بھاگ — کھاتے لگی نوچ نوچ کر ساگ

کنیا تھی غرضکہ راس اُس کی — پوری نہ ہوئی وہ آس اُس کی

اشعار متذکرۂ بالا میں "پھاگ" "بھاگ" اور "کنیا راس" ہندو شاعر کے نوک قلم کا نقش اپنے ساتھ لائے ہیں

اندر نے اس کے سب کے مالا — کانٹوں پہ پکھاوجی کے ڈالا

مسلمان شرفاء لکھنؤ کی زبان میں "مالا" کی جگہ "ہار" کا لفظ مستعمل ہے۔ ہندو شرفا مالا بولتے ہیں۔ دہلی کی زبان میں البتہ ہندو مسلمان سب "مالا" ہی بولتے ہیں۔ اور "مالا" کو مونث بولتے ہیں۔ لکھنؤ میں "مالا" مذکر ہے۔

باران گلاب و بارش گل — ہو کر بڑھے آگے باتجمل

"باران گلاب و بارش گل" کا بھی ہندو شرفاء کی باراتوں میں عام رواج ہے۔ اور یہاں بھی بارات ہی کا حال بیان ہو رہا ہے۔

وہ معتقد اُس کے پاؤں چھوکر — اُٹھا چھاتی پہ رکھ کے پتھر

پاؤں چھونے کی رسم خاص ہندو شرفا کی ہے۔

چوٹی ہے مری تو ہاتھ ان کے — چل آ کہ چلا میں ساتھ ان کے

یہ شعر تاج الملوک کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں اور اس کی مخاطب شاہزادی چترا وت ہیں۔ مسلمان شاعر کہ چوٹی رکھتا ہی نہیں بھلا ایسا شعر کہاں سے کہیگا اور کیونکر کہے گا۔ ایسا شعر تو مسلمان شاعر کہہ ہی نہیں سکتا۔

میں نے مانا کہ امانت نے اپنی اندر سبھا میں بھی راجہ اندر کا دربار سجایا ہے لیکن اندر اسن کا ایسا مکمل نقشہ امانت یا کسی مسلمان شاعر کے فرشتے بھی نہیں کھینچ سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:-

اندر اسن امر نگر ہے شہر ایک — خلقت ہے وہاں کی زندہ دل نیک

اندر ہے بادشاہ اُس کا — آسن ہے تخت گاہ اُس کا

مضموں وہ قضا سے اس قدر ہو — اُس بستی کا نام امر نگر ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ کی اشاعت میری بیماری کی وجہ سے ملتوی کرنی پڑی تھی۔ اس طرح جلد ہفتم میں ۸۰ صفحات کی جو کمی ہو گئی تھی اسکو جلد ہشتم کے پانچ پرچوں میں سولہ سولہ صفحات کا اضافہ کرکے پورا کر دیا گیا۔ اب اس مہینے سے ترجمان القرآن حسب معمول ۸۰ صفحات پر شائع ہوگا

یہ رسالہ ابتدائی دو ڈھائی سال تک نہایت باقاعدگی کے ساتھ وقت پر شائع ہوتا رہا۔ مگر اب تقریباً ایک سال سے وہ باقاعدگی اور پابندیٔ وقت باقی نہیں رہی بعض مہینوں میں تو اس قدر تاخیر ہو جاتی ہے کہ ناظرین کو شکایت کا موقع مل جاتا ہے۔ مجھے اس صورت حال پر افسوس ہے کوشش کر رہا ہوں کہ حالات کی اصلاح ہو جائے۔ مگر شاید ابھی چند مہینوں تک اور یہی کیفیت رہے گی، اس لیے ناظرین سے درخواست ہے کہ ہر مہینے کی اشاعت کا انتظار دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک فرمائیں۔ اسی لحاظ سے قواعد میں بھی ترمیم کر دی گئی ہے۔

پچھلے دنوں جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ایک پرائیویٹ خط سے ترجمان القرآن کے مالی حالات معلوم کرکے از راہ ہمدردی اپنے اخبار "صدق" میں اس کا تذکرہ فرما دیا تھا۔ اسکو دیکھ کر لاہور کے اخبار "ثروتھ" اور دہلی کے جریدۂ "الجمعیۃ" نے بھی چند کلمات خیر اس رسالہ اور اس کے مدیر کے حق میں لکھ دیے ہیں اس ہمدردی اور خلوص و محبت کا دلی شکریہ ان سب حضرات کی خدمت میں عرض

کرتا ہوں۔ انہوں نے جو ہمدردی حسبۃً للہ کی، اور اللہ ہی اس کا اجر دینے والا ہے۔

"ترجمان القرآن" دراصل میری زندگی کا مشن ہے۔ میں نے جس کام کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا ہے اُسی کو انجام دینے کے لیے اس پرچہ کو چلا رہا ہوں۔ اب تک اس کام میں جو کچھ بھی مشکلات پیش آئیں ان کا حال بجز میرے مخصوص دوستوں کے کسی اور کو معلوم نہ تھا، کیونکہ رسالہ کا حال گویا میرا ذاتی حال ہے اور پبلک میں اس کا اظہار میں نے کبھی مناسب نہیں سمجھا، لیکن اب "صدق" اور "ٹروتھ" "الجمعیۃ" میں اتفاقاً ان کے شائع ہو جانے کی وجہ سے بہت سے حضرات تک یہ حالات پہنچ گئے ہیں جو "ترجمان القرآن" کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور متعدد اصحاب نے اپنے خطوط میں تشویش کا اظہار فرمایا ہے، اس لیے آج مجبوراً احوالِ واقعی کا اظہار کرتا ہوں۔

"ترجمان القرآن" کی اشاعت اس وقت صرف چھ سو ہے۔ دوسری قوموں کے علمی ذوق اور جرائد کی اشاعت کو دیکھتے ہوئے تو یہ تعداد بہت کم ہے، مگر مسلمانوں کی ذہنی حالت کے لحاظ سے اس کو بہت زیادہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ ان کی دلچسپی کا دائرہ دوسرا ہے۔ اس چھ سو کی تعداد میں سے پورے نصف کی خریدار سرکارِ آصفیہ ہے۔ اگر ان تین سو پرچوں کو الگ کر دیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی اس آبادی میں صرف تین سو اصحاب ایسے ہیں جو "ترجمان القرآن" جیسے ایک رسالہ پڑھنے کے لیے کچھ خرچ کر سکتے ہیں۔ پھر ان تین سو میں سے بھی دس فی صدی حضرات اپنے بجٹ میں اس رسالہ کی پوری قیمت کے لیے گنجائش نہیں نکال سکتے، مگر چونکہ ہم خود ان تک اپنی آواز پہنچانے کے خواہش مند ہیں، اس لیے ہم کو مجبوراً رعایتی قیمت بلکہ بسا اوقات بلا قیمت پر ان کے نام پرچہ جاری کرنا پڑا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس معیار کا کوئی پرچہ اتنی کم اشاعت پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حیدرآباد میں کتابت، طباعت اور کاغذ تینوں چیزیں ہندوستان کے دوسرے مراکزِ اشاعت کی بہ نسبت سوائی اور ڈیوڑھی گراں ہیں۔ اس وجہ سے پرچہ کی آمدنی اس کی ضروریات کے لیے اور بھی زیادہ غیر مکتفی ہو گئی ہے۔ پھر اس آمدنی میں اتنی گنجائش کہاں کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے علمی رسالہ کی وہ ضروریات فراہم کر سکے جو طباعت کے مصارف سے بالاتر ہیں۔ نہ اس میں کتابیں خریدی جا سکتی ہیں جو علمی تحقیق کے لیے ناگزیر ہیں۔ نہ اس میں علمی رسالے خریدے جا سکتے ہیں جو نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ نہ اس میں بلند پایہ مضامین

لکھنے والوں کو انکے وقت اور ان کی محنت کا کم سے کم معاوضہ دیا جا سکتا ہے نہ اس میں اتنی گنجائش ہے کہ کسی ایک لائق آدمی کی بھی خدمات مستقل طور پر حاصل کی جا سکیں تاکہ وہ ادارت کے کاموں میں ایڈیٹر کا ہاتھ بٹا سکے۔ ایسی حالت میں پرچے کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ اس کا معیار بھی قائم رکھنے کا تمام تر بار ایک تنہا شخص پر ہے۔ وہ اس دوگونہ مشکل میں مبتلا ہو گیا ہے کہ ایک طرف تو اپنا تمام وقت اور اپنی پوری دماغی قوت اس پرچے کی ترتیب میں صرف کر دے اور دوسری طرف نہ صرف اپنی ذاتی ضروریات بلکہ خود پرچے کی ضروریات کا بھی ایک معتدبہ حصہ کہیں اور سے فراہم کرے جس کے لیے نہ اس کے پاس کافی وقت بچتا ہے، اور نہ اس کے دل و دماغ میں اتنی طاقت باقی رہتی ہے کہ کوئی دوسرا کام کر سکے۔

اس حالت پر شکایت کا کوئی محل نہیں، اس لیے کہ ترجمان القرآن سے مسلمانوں کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے جس میں مدد نہ دینے کی کوئی شکایت ان سے کی جا سکے۔ یہ تو میری اپنی غرض ہے کہ میں اپنی آواز اُن تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جو شخص کوئی ایک بھی دل خوش کن بات نہ سنا سکتا ہو بلکہ جس سے قریب قریب ہر گروہ کو کچھ نہ کچھ تلخ اور ناگوار طبع باتیں سننی پڑتی ہوں وہ نہ تو کسی سے مدد طلب کرنے کا حق رکھتا ہے اور نہ اس کو ایسی کوئی امید رکھنی چاہیے۔ درحقیقت مجھ پر ان لوگوں کا احسان ہے جو اس رسالہ کو پڑھ لیتے ہیں، اور اس سے زیادہ احسان ان کا ہے جو اسے پڑھنے کے ساتھ اس کی پوری یا ادھوری قیمت بھی ادا کرتے ہیں۔ اب اس کے بعد کسی مزید احسان کی درخواست نہ میں کر سکتا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں۔ رہی پرچے کی زندگی، تو جو حضرات اسکے خریدار ہیں ان کو میں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ پرچہ انشاء اللہ اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک میں زندہ ہوں میں بے مقصد زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا، اس لیے توفیق الٰہی سے جس قدر کوشش خود اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کرتا ہوں اسی قدر کوشش اپنے مقصد وجود کو بھی برقرار رکھنے کے لیے کروں گا۔ لہٰذا کسی صاحب کو یہ خوف نہ ہو کہ پرچہ بند ہو جائے گا، اور بالفرض اگر بند بھی ہو گیا، تو خدا کے فضل سے میں امید رکھتا ہوں کہ کسی شخص کا ایک پیسہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا۔ جن لوگوں کے چندے باقی رہ جائیں گے ان کی پائی پائی واپس کر دی جائے گی۔

بسلسلۂ فتنۂ تکفیر

مولٰنا شبیر احمد عثمانی کا ایک خط اور اس پر تبصرہ

اشاعت گذشتہ میں تکفیر کے جس فتوے پر اظہار خیال کیا گیا تھا، اس کے متعلق جناب مولٰنا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ایک شاگرد نے ہم کو مولٰنا کی ایک تحریر لاکر دی ہے جس میں مولٰنا نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ یہ تحریر دراصل ایک خط ہے جو مولٰنا نے اپنے ایک نیاز مند خاص کو لکھا تھا، مگر جن صاحب کے ذریعہ سے یہ خط ہم کو ملا ہے ان کا بیان ہے کہ وہ مولٰنا سے اس کو شائع کرنے کی اجازت حاصل کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہم پہلے اس کو درج کرنے کے بعد اس پر ایک مختصر تبصرہ کریں گے۔

جناب مولٰنا تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھے اوروں سے بحث نہیں، اپنی عبارت سے سروکار ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ الاصلاح والوں نے سہام ملام کا ہدف مجھے ہی سب سے زیادہ کیوں بنایا۔ لکھا ہے میری عبارت پڑھ جائیے، نہ کسی خاص شخص کا نام ہے نہ مستفتی نے ہم کو جو استفتا دکھلایا تھا اس میں مولٰنا حمید الدین اور علامہ شبلی کا نام تھا، میں نے یہی لکھا ہے کہ اگر یہ خیالات و مقالات کسی شخص کے متعین ہو جائیں تو بیشک یہ الحاد و زندقہ ہے، ان سے احتراز واجب ہے۔ آسان بات تھی کہ یہ ثابت کر دیا جاتا کہ فلاں فلاں حضرات کے یہ عقائد نہیں، چلئے چھٹی ہوئی۔ کم از کم مجھکو اس سے کچھ تعرض نہ رہتا

بلکہ خوشی ہوتی، کیونکہ مستفتی صاحب کو معلوم ہے کہ میں نے اتنی عبارت ہی بحد کراہیت سے لکھی تھی۔ اپنا اصول یہ ہے کہ اس طرح کی بحثوں سے تا بحد امکان علٰحدہ رہے۔

مولنا حمید الدین صاحب کی کتابیں میں نے نہیں دیکھیں۔ ایک مرتبہ سرسری ملاقات ہوئی ہے، زیادہ احوال معلوم نہیں ہو سکے آپ نے جو کچھ ان کی عبادت و زہد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں، نہ مزید شہادت کی ضرورت ہے، میں کم از کم اپنے سے زیادہ آپ کو ثقہ سمجھتا ہوں۔

البتہ اہل علم جانتے ہیں کہ ان احوال کو نفس کفر و ایمان کی اساسی بحث میں دخل نہیں۔ یہ احوال بعض اوقات ایمان شرعی سے مفارق بھی ہو سکتے ہیں! دیکھیے یہ ان پر تعریض نہ سمجھیے۔ میں عام مسئلہ کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔ اب گذارش یہ ہے کہ الاصلاح والوں نے اپنے بعض رسائل اور اصل عبارات کی نقول میرے پاس بھیجی ہیں۔ مولنا حمید الدین فراہی کی جن دو عبارتوں پر مفتیان عظام نے تکفیر کی بنا رکھی تھی، میں غور و تامل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ سوء تعبیر اور سماجت عنوان سے یہ عبارات خالی نہیں لیکن موجب تکفیر نہیں ہو سکتیں۔ (واللہ تعالیٰ اعلم) رہا مصنف الکلام کا معاملہ تو میں نے انکی تصانیف خود پڑھی ہیں۔ بلا شبہ مستفتی نے بعض عبارات ایسی نقل کی ہیں جن میں ان کا عقیدہ مذکور نہ تھا بلکہ ملاحدہ کے اقوال تھے۔ مگر یہ دعویٰ کرنا درست نہیں کہ سب عبارات کا یہی حال ہے۔ میں خواہ مخواہ اس بحث کو طول دینا پسند نہیں کرتا۔ صرف الکلام صفحہ ۳۰ کی عبارت ذیل کی طرف توجہ دلاتا ہوں!

"وجود باری"

"خدا کے اثبات پر قدما اس طرح استدلال کرتے تھے کہ عالم حادث ہے اور جو چیز حادث ہے یعنی ازلی نہیں ہے وہ کسی علت کی محتاج ہے اور یہی علت خدا ہے اس استدلال

کا دوسرا مقدمہ بدیہی ہے۔ پہلے مقدمہ پر یہ استدلال کیا جاتا تھا کہ عالم میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور جو چیز تغیر پذیر ہے وہ حادث ہے۔ یہ استدلال بظاہر نہایت صاف اور واضح تھا اور اس لیے اس کی زیادہ چھان بین نہیں کی گئی لیکن وہ فی الواقع صحیح نہ تھا تمام چیزیں جو عالم میں موجود ہیں، دو چیزوں کا مجموعہ ہیں، مادہ اور ایک خاص صورت۔ جو چیز بدلتی رہتی اور تغیر پذیر ہے وہ صرف صورت ہے، اصل مادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ کوئی چیز جب فنا ہوتی ہے تو صرف اس کی صورت فنا ہوتی ہے اصل مادہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ایک کاغذ کو جلا دو گا غذ جل کر راکھ ہو جائیگا۔ ایک کاغذ فنا ہو گیا لیکن راکھ موجود ہے جو اصل مادہ کی ایک دوسری صورت ہے۔ راکھ کو برباد کرو کسی نہ کسی صورت میں وہ قائم رہے گی۔ غرض جو چیز حادث ہے وہ صرف صورت ہے۔ اصل مادہ کے حادث ہونے پر نہ کوئی تجربہ پیش کیا جا سکتا ہے نہ کوئی استدلال قائم کیا جا سکتا ہے اس بنا پر عالم کو حادث کہنا صورت کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن مادہ کے لحاظ سے صحیح نہیں اور جب عالم کا حدوث ثابت نہیں تو استدلال بھی صحیح نہیں ارسطو نے اسی اعتبار کے لحاظ سے استدلال کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔"

یہ عبارت کسی دوسرے کی نقل و حکایت نہیں نہ مجارات خصم کے لیے علی سبیل التنزل کسی چیز کو فرض کیا گیا ہے، بلکہ خود مصنف اپنی طرف سے تحقیق و تنقیح کر رہا ہے۔ اور دوسروں کے استدلال کو جو ایک صحیح مدعا کے ساتھ کیا جا رہا تھا اپنے مزعومات کی بنا پر رد کرنا چاہتا ہے یہی عبارت اس کی دلیل ہے کہ صفحہ ۴۲ کی عبارت ذیل میں جو چیز تسلیم کی ہے وہ محض بطور فرض محال نہیں لکھتے ہیں۔

"ہمکو اس سے انکار نہیں کہ عالم اجزائے دیمقراطیسی سے بنا ہے، ہمکو یہ بھی تسلیم ہے کہ عالم قدیم ہے، جیسا کہ خود مسلمانوں کے ایک بڑے فرقہ معتزلہ اور حکمائے اسلام فارابی، ابن سینا

اور ابن رشد کی رائے ہے۔ بلکہ جیسا کہ ابن رشد نے تلخیص المقال میں لکھا ہے خود قرآن مجید کی ان آیتوں سے (ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقا۔ وکان عرشہ علی الماء۔ ثم استویٰ الی السماء وھی دخان) ایسا ہی مادہ ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ کے اجزا متحرک ہیں حرکت مادہ کی ذاتیات میں سے ہے مختلف قوانین قدرت ہیں جن کے موافق اجزا باہم ملتے ہیں۔ ترکیب پاتے ہیں اور پھر ان میں خاص خاص قوٰی اور خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کائنات کا عقدہ ان باتوں سے بھی حل نہیں ہوتا۔"

کیا عبارات بالا کے خلاف کسی جگہ اپنی کسی پچھلی تصنیف میں مادہ اور حرکت وغیرہ کے حدوث کی تصریح کی ہے اور اس خیال سے رجوع کر لیا ہے کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر ایسا ہوا ہو تو انتہائی مسرت وطمانیت کا موجب ہے۔ غرض آنی ہے کہ تکفیر مسلم میں (معاذ اللہ) بندہ کو کوئی دلچسپی نہیں نہ میں اشخاص خصوصاً مشاہیر کی بحث میں الجھنا چاہتا ہوں الا یہ کہ ملجا و مکرہ کی حد تک پہنچا دیا جاؤں۔ اگر یہ شغل محبوب ہوتا اور بریلویوں کا رنگ (خدا نکردہ) قبول کر لیا جاتا تو اس داستان کو طویل بنا لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ جو دلخراش جملے اور تفرعن آمیز تلمیحات جرائد میں الاصلاح والوں کی طرف سے استعمال ہو رہی ہیں وہ اللہ کے سپرد ہیں وہی ہماری سب کی نیات پر مطلع ہے اور بندہ بھی باوجود خاطی و عاصی ہونے کے کچھ نہ کچھ خوف خدا دل میں رکھتا ہے۔ ساتھ ہی کسی کی مدح سرائی کی تمنا یا تجہیل و تحمیق کا اندیشہ الحمد للہ اظہار حق میں کبھی مانع نہیں ہوا۔ اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آئندہ بھی مانع نہ ہو۔

اس تحریر میں صرف ایک چیز ہے جس کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوی، اور وہ یہ ہے کہ جناب مولانا نے کم از کم مولانا حمید الدین فراہی کے متعلق یہ تسلیم فرما لیا کہ انکی جن عبارات پر تکفیر کا فتویٰ دیا گیا تھا وہ بجائے خود موجب تکفیر نہ تھیں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مولانا نے اب بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ درحقیقت ان سے کس گناہ کا ارتکاب ہوا ہے؟ ایک خدا ترس مسلمان اور ایک ذمہ دار عالم دین کی حیثیت سے ان کا فرض کیا تھا اور انہوں نے واقع میں کیا کیا؟ وہ جس قسم کی توجیہیں پیش فرما رہے ہیں ممکن ہے کہ وہ بندوں کو خاموش کرنے کے لیے اچھی تاویل و حجت ہوں مگر ہمیں خوف ہے کہ خدا کی عدالت میں یہ توجیہیں کام نہیں آسکیں گی۔ اس لیے ہم ایک مرتبہ پھر احقاق حق کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ مولانا اپنے اصلی گناہ کو سمجھ کر تاویل و حجت کے بجائے توبہ و استغفار فرمائیں اور آیندہ اس کے اعادہ سے مجتنب رہیں۔

یہ بالکل بجا ارشاد ہے کہ مستفتی نے استفتا میں مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے نام نہیں لکھے تھے بلکہ اس نے صرف عبارتیں پیش کر کے فتویٰ لیا اور بعد میں ان دونوں حضرات کے نام لکھ کر اس فتوے کو شائع کر دیا۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا جناب والا کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہندوستان میں بالعموم تکفیر کے فتوے کس غرض کے لیے اور کن کن ترکیبوں سے لیے جاتے ہیں آپ حضرات تو خود ایسے فتووں کے زخم خوردہ ہیں۔ بڑے بڑے زندہ اور مردہ علماء و مشائخ پر اس سے پہلے جو فتوے لکھوائے جا چکے ہیں، اور خود دیو بند کے اکابر کے خلاف جو فتوے صادر ہو چکے ہیں، کیا وہ سب خالص نیک نیتی کے ساتھ اصلاح خیال کی غرض سے لیے گئے تھے؟ یا ان کی اصل غرض یہ تھی کہ ایک جماعت کے خلاف بدگمانیاں پھیلا کر مسلمانوں میں اس کو ساقط الاعتبار کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں خود اپنا اعتبار قائم کیا جائے؟ سابق کے تمام تجربات گواہ ہیں کہ اس قسم کے فتوے اسی دوسری غرض کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں اور ان میں اکثر ناموں کو چھپا کر اور اصل عبارتوں کو کاٹ چھانٹ کر استفتاء کیا جاتا ہے جب یہ حالات آپ کو معلوم تھے تو کیا احتیاط کا مقتضیٰ یہ نہ تھا کہ آپ مستفتی سے مطالبہ کرتے کہ وہ ان لوگوں کے نام ظاہر کرے

جن کی عبارتیں وہ پیش کر رہا ہے؟ آخر یہ فرض آپ پر کس نے عائد کیا تھا کہ مستفتی جو صورت مسئلہ جس طور پر آپ کے سامنے پیش کرے اُس پر آپ مجبوراً اسی طرح فتویٰ تحریر فرمادیں؟ دوسرے مسائل میں آپ کا جو طریقہ بھی ہو اس سے ہم کو بحث نہیں۔ مگر تکفیر کے معاملہ میں تو آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس سے امت میں سخت فتنے پھیل سکتے ہیں اور پھیلائے جا چکے ہیں۔ اس معاملہ میں گم نام عبارتوں پر فتویٰ لکھ کر مستفتی کے حوالہ کر دینا بالکل ایسا ہے جیسے آپ کسی کو اپنا خنجر دے کر اسے مجاز کر دیں کہ آپ کی طرف سے جس کو چاہے ذبح کر دے

آپ فرما سکتے ہیں کہ ہم مفتی ہیں، قاضی نہیں ہیں۔ بالکل درست۔ مگر کیا مفتی اسلام پر تحقیق و تفتیش اور احوال زمانہ کے ملاحظہ، اور مصالح امت کی رعایت کا قطعاً کوئی فرض عائد نہیں ہوتا؟ اور کیا شریعت میں مفتی کو بالکل مستفتی کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ مستفتی کے ہر سوال کا جواب ضرور ہی دے اور انہی قیود کے اندر دے جن میں استفتا کیا گیا ہو؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جناب والا نے "اگر" اور "تو" کی بہت ہی قانونی قیود کے ساتھ فتویٰ تحریر فرمایا ہے۔ یہ احتیاط بھی شکریہ کے قابل ہے لیکن شائد جناب نے غور نہ فرمایا کہ اس شرط و جزاء کے ساتھ فتویٰ لکھ کر مستفتی کے حوالہ کر دینے کے معنی کیا ہیں؟ جناب نے اس کو لکھ دیا کہ "اگر یہ مقالات کسی شخص کے متعین ہو جائیں تو اس کے الحاد و زندقہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ایسے زنادقہ کی اعانت بالکل حرام ہے"۔ وہ اس تحریر کو لے گیا اور معاً مستفتی کے بجائے قاضی کی حیثیت اختیار کر کے اس نے فیصلہ صادر کر دیا کہ یہ خیالات و مقالات مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے متعین ہو گئے، لہٰذا وہ اور ان کے تلامذہ و متبعین زنادقہ ہیں۔ اور ان کی اعانت حرام ہے۔ غور فرمائیے۔ یہ خنجر جو اس نے دو مرحوم مسلمانوں کی قبروں میں اور بہت سے زندہ مسلمانوں کے سینوں میں بھونک دیا کیا یہ جناب ہی کا عطا کردہ نہ تھا؟ اور کیا آپ ہی

نے اس کو اجازت عامہ عطا فرمائی تھی کہ جہاں چاہے آپ کی بتائی ہوئی شرط تعین کر کے
جزا کا خنجر استعمال کر ڈالے؟ اپنی مفتیانہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں اتنی عظیم اور خطرناک
بے احتیاطی برتنے کے بعد بھی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا دامن خون ناحق سے بالکل پاک ہے
پھر عملاً اس احتیاطی کا نتیجہ کیا ہوا؟ آپ کا اور دوسرے علمائے کرام کا فتویٰ ایک
رسالہ ایک کثیر تعداد میں شائع کیا گیا۔ اس فتوے کی بنیاد پر اشتہارات طبع کرائے
گئے جن میں مولانا شبلی اور مولٰنا حمید الدین کی جماعت کے لوگوں کو راجپال (مشہور شاتم
رسول) سے بھی بدتر قرار دیا گیا اور مدرسۃ الاصلاح جیسی خالص دینی درسگاہ کے متعلق لکھا گیا
کہ وہاں سے کفر والحاد کا دھواں اٹھ رہا ہے اور وہاں کے معلمین نے اسلام کو بیخ و بن
سے اکھاڑنے کے لیے ایک زہریلی اسکیم تیار کی ہے۔ یہ اشتہارات دیہات و قصبات کے
سیدھے سادے مسلمانوں میں تقسیم کیے گئے، ان کے دلوں میں چند مخلص مسلمانوں کے خلاف
نفرت و عداوت کے جذبات بھڑکائے گئے اور ان سے کہا گیا کہ یہی وہ زنادقہ ہیں جن
کی اعانت کو مفتیان عظام نے حرام قرار دیا ہے۔ فرمائیے کہ اس فتنہ اور اس ظلم عظیم میں
جو ہتھیار استعمال کیا گیا وہ آپ کا نہیں تو اور کس کا دیا ہوا تھا؟ جائے حیرت ہے کہ اپنے فعل
کے یہ نتائج ظاہر ہو جانے پر بھی آپ شرمسار نہیں ہوتے، توبہ و استغفار نہیں کرتے، بلکہ الٹی شکایت
فرماتے ہیں کہ ہم کو سہام ملام کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے، ہمارے خلاف دلخراش جملے اور
تنفر آمیز تلمیحات کیوں استعمال کیے جاتے ہیں، ہماری تجہیل و تحمیق کیوں کی جاتی ہے؟ یا سبحان
اللہ آپ نے تو تکفیر و تفسیق فرمائی ہے جس سے بڑھ کر کوئی زیادتی ایک مسلمان دوسرے
مسلمان پر کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد اگر کسی نے تجہیل و تحمیق کی توہین کی کی بجزاء سیئۃ
سیئۃ مثلہا کے قاعدے سے تو وہ اس سے زیادہ کا حق رکھتا تھا۔

آپ فرماتے ہیں "آسان بات تھی کہ یہ ثابت کر دیا جاتا کہ فلاں فلاں حضرات کے یہ عقائد نہیں، چلیے چھٹی ہوئی"۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اس سے بہت زیادہ آسان بات یہ تھی کہ جناب تحقیق کیے بغیر فتویٰ لکھنے سے انکار فرما دیتے۔ مگر اب کہ آپ فتویٰ دے چکے، اور وہ فتویٰ تعیین اشخاص کے ساتھ شائع بھی کر دیا گیا، اور اس فتوے کی بنا پر گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ اشتہار بازی بھی ہو چکی، صرف اتنی سی بات سے چھٹی کیوں کر ہو سکتی ہے کہ محض فلاں فلاں حضرات کی صفائی آپ کے سامنے پیش کر دی جائے اور آپ خاموشی کے ساتھ ان کے اسلام کا سرٹیفکیٹ دے دیں۔ یہ فتنہ جو آپ کی بے احتیاطی سے مسلمانوں میں پھیل گیا ہے اس کا علاج کون کرے گا؟ یہ نقصان جو آپ کے ہاتھوں سے ایک دینی درسگاہ کو پہنچ گیا ہے اس کی تلافی کون کریگا؟ الاصلاح والے آخر کس جرم کے مجرم ہیں کہ وہ اس کی پاداش میں بدنامی اور اپنے مشن کا نقصان اٹھائیں؟

جناب مولٰنا کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مولانا حمید الدین کو تو مسلمان تسلیم فرما لیا۔ مگر مولٰنا شبلی مرحوم ابھی تک ان کی نظر میں زندیق ہیں۔ اس کے ثبوت میں جو عبارات انہوں نے پیش فرمائی ہیں ان کو ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا اور اب پھر دیکھا۔ ان میں غلطی ضرور ہے اور الکلام میں ایسی بہت سی غلطیاں موجود ہیں جن کی اصل وجہ یہ ہے کہ مصنف مرحوم زیادہ تر انیسویں صدی کے سائنس سے متاثر تھے اور اس کا بھی انہوں نے کوئی گہرا تنقیدی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ان غلطیوں کے باوجود الکلام میں قطعاً کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر اس کے مصنف کو مُلحد و زندیق قرار دیا جا سکتا ہو۔ جو شخص مادے کو مخلوق اور خدا کو اس کا خالق مانتا ہو، اس کو ملحد و زندیق کہنا کم از کم اس شریعت کی رو سے تو ممکن نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ البتہ اگر کوئی شریعت اس کے بعد نازل

ہوئی ہو جس میں حدوث وقدم کی بنا پر کفر و ایمان کے درمیان از سر نو تمیز قائم کی گئی ہو تو نہ ہم کو اس کا علم ہے اور نہ خداوند علیم وخبیر کو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ علمائے اسلام پر یہ مدرسیت کا استیلا رکب تک رہے گا۔ یونانی فلسفہ کے اثر سے جو علم کلام صدیوں پہلے پیدا ہوا تھا اور اُس علم کی اصطلاحوں میں متکلمین کے ایک خاص گروہ نے اسلامی عقائد کا جو ایک سرکاری بیان مرتب کردیا تھا، اس کے خلاف جہاں کسی کی زبان سے کوئی لفظ نکلا اور بے تکلف اس کو ملحد، زندیق، کافر کہدیا گیا۔ پھر اس سے کوئی بحث نہیں کی جاتی کہ اس کی نیت کیا ہے، اور اس نیت کے لیے قرآن کے بتائے ہوئے دائرہ ایمان میں بھی کوئی گنجائش ہے یا نہیں۔ مولانا شبلی نے اگرچہ بعد میں تصریح کے ساتھ یہ اعلان فرمادیا تھا کہ وہ مادے کو حادث مانتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو الاصلاح بابت ماہ اگست ۱۹۳۶ء ص ۲۵) لیکن یہاں ایک اصولی بحث ہے جس کو طے کرنا ضروری ہے۔ بالفرض اگر وہ مادے کو قدیم کہتے ہیں، اور اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے (جیسا کہ الکلام میں تصریح لکھا ہے)۔ تو فرمائیے کہ قرآن کی کونسی آیت ہے جس کی رو سے آپ ان کو زندیق قرار دے سکتے ہیں؟

جیسا کہ ہم اپنے پچھلے مضمون میں الکلام کی عبارتوں سے ثابت کرچکے ہیں، مولانا شبلی مرحوم نے دراصل حدوث عالم کا انکار نہیں کیا ہے، بلکہ متکلمین اسلام اور جدید مادہ پرستوں کے دلائل کا موازنہ کرکے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وجود باری کے اثبات میں حدوث عالم سے جو استدلال کیا گیا تھا، اور جو اب تک ہمارے علم کلام میں سب سے زیادہ مقبول استدلال تھا، وہ زمانہ حال کے مادیین کے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکتا، اور اب اس کو پیش کرنا اثبات مدعا کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کی توضیح کے بعد انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ وجود باری اور توحید باری پر بہترین طرز استدلال وہ ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے۔

مولانا شبیر احمد صاحب براہ کرم پھر ایک مرتبہ الکلام ملاحظہ فرمائیں اور خاص طور پر صفحہ ۲۵ تا ۴۹ اور صفحہ ۴۴ تا ۴۶ کو بغور پڑھیں۔ ان کو خود معلوم ہو جائے گا کہ غریب مصنف محض اس جرم کا مرتکب ہے کہ وہ متکلمین کے طرز استدلال پر قرآن کے طرز استدلال کو ترجیح دے رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ تحقیق ہو جانے کے بعد بھی مولانا ایسے شخص کو زندیق قرار دینے کی جرأت فرمائیں۔

اس تکفیر کے قضیہ سے ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہے وہ کسی شخصیت کی خاطر نہیں ہے۔ بلکہ در اصل ہم اس کفر بازی کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے پچھلے مضمون میں صاف طور پر لکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی جمعیت کے لیے تکفیر بیجا سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہے۔ اور خصوصاً موجودہ ضعف و انتشار کی حالت میں تو اسلام کے ساتھ بدترین دشمنی اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر کو کھیل بنا لیں۔ پس جس قدر بھی قوت اللہ نے ہم کو دی ہے اسے ہم اس فتنے کے سد باب میں صرف کر دیں گے۔ یہی غرض ہے جس کے لیے ہم نے اُن اکابرِ علماء کے خلاف اظہار خیال کیا جن کی پوری عزت و حرمت ہمارے دل میں تھی اور ہے۔ خود ہمارے اُستاد مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب ان حضرات میں شریک ہیں جنہوں نے اس فتوے پر دستخط کیے ہیں مگر استاد کے ادب نے بھی ہم کو اس ظلم کی مخالفت سے باز نہ رکھا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص ہم سے شکایت کرے تو ہم مجبور ہیں کہ اس کی شکایت سے بے پروا ہو کر اپنا فرض انجام دیں۔ اسلام کی محبت ہر محبت پر مقدم اور اسلام کی مصلحت ہر مصلحت سے زیادہ اہم ہے۔

مقالات

بشارات الانبیاء

نبوت محمدی صلعم کے متعلق انبیائے سابقین کی پیشنگوئیاں

(۶)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

اٹھارویں بشارت

یہ بشارت انجیل یوحنا کے آخری ابواب میں ہے۔ باب ۱۴ میں لکھا ہے:-

"اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو۔ اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا فارقلیط[1] بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے یعنی روح حق جسے دنیا نہیں پا سکتی کیونکہ اسے نہ دیکھتی ہے نہ جانتی ہے لیکن تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم میں ہو گی"۔ (آیت ۱۵-۱۶-۱۷)

"لیکن وہ فارقلیط یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں

[1] ۱۶۷۱ء، ۱۸۳۱ء اور ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمہ میں لفظ فارقلیط ہی لکھا تھا۔ جدید عربی ترجمہ جو برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے شائع کیا ہے اس میں اس لفظ کو بدل کر المعزی لکھ دیا گیا ہے۔ ۱۸۶۴ء کے اردو ترجمہ میں اس کا ترجمہ "تسلی دینے والا" لکھا تھا۔ بعد میں اس کو بدل کر "مددگار" لکھا گیا۔ انگریزی ترجمہ میں لفظ Conforter استعمال کیا گیا ہے

سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔ (آیت ۲۶)

اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب وہ وقوع میں آئے تو تم ایمان لاؤ۔ اس کے بعد میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا کیونکہ اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں" (آیت ۲۹ - ۳۰)۔

اس کے بعد باب پندرہ میں پھر لکھا ہے :۔

لیکن جب وہ فارقلیط آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی روح حق جو باپ سے نکلتی ہے، تو وہ میری گواہی دے گا، اور تم بھی گواہی دو گے کیونکہ تم شروع سے میرے ساتھ ہو" (آیت ۲۶ - ۲۷)۔

پھر باب ۱۶ میں اس طرح لکھا ہے :۔

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا ہی تمہارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا، اور جب وہ آئے گا تو دنیا کو گناہ اور راستی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے راستی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کے سردار پر حکم کیا گیا ہے۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر ابھی تم ان کی تحمل کی قوت نہیں رکھتے۔ جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو سچائی کا پورا راستہ بتائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا، اور تمہیں آیندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میری بزرگی ظاہر کرے گا۔ اس لیے کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اُسی سے لے گا اور

تمہیں بتائے گا، سب چیزیں جو باپ کی ہیں وہ میری ہیں اس لیے میں نے کہا کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اُسی سے لے گا اور تمہیں بتائے گا۔ (آیت ۷ تا ۱۵)۔

ان عبارات پر کلام شروع کرنے سے پہلے دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

(۱) ہم اس سے پہلے اپنے مقدمات میں اس حقیقت کو ظاہر کر چکے ہیں کہ قدیم زمانے سے جدید زمانے تک اہل کتاب کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اکثر و بیشتر اسماء و اعلام کے ترجمے کر دیا کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی ہم لکھ چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مادری زبان جس میں انہوں نے اپنے دین کی تبلیغ کی، عبرانی تھی نہ کہ یونانی۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان عبارات میں جس آنے والے کی بشارت دی گئی ہے اس کے لیے حضرت عیسیٰ نے عبرانی میں کوئی خاص لفظ استعمال کیا ہوگا۔ انجیل یوحنا کے مصنف نے اس لفظ کا ترجمہ یونانی میں کیا۔ پھر اس یونانی لفظ کے بھی مختلف ترجمے عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں کر دے گئے۔ عربی کے تمام قدیم ترجموں میں اس لفظ کا ترجمہ "فارقلیط" کیا گیا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے ایک پادری اپنے ایک رسالہ میں (جو ۱۲۶۸ھ میں کلکتہ سے بزبان اردو شائع ہوا تھا) لکھتا ہے:

"یہ لفظ یونانی الاصل ہے جس کو معرب کر لیا گیا ہے۔ اگر اس کی اصل پارکلیتوس قرار دی جائے تو اس کے معنی "تسلی دینے والے"، "مددگار" اور "وکیل" کے ہوں گے اور اگر اس کی اصل پیرکلیتوس قرار دی جائے تو وہ محمد اور احمد کے معنی سے بہت

ف اردو ترجمے میں یہ فقرہ اس طرح لکھا ہے: "مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا" لیکن عربی ترجمے کے الفاظ ہیں: لانه یاخذ مما هولی ویخبرکم۔ اور انگریزی ترجمے میں یوں لکھا ہے۔

He shall receive of mine and shall shew it unto you.

قریب ہوگا۔"

مصری فاضل ڈاکٹر محمد توفیق صدقی نے اس لفظ کی جو تحقیق کی ہے وہ بھی قابل دید ہے:

"یہ لفظ فارقلیط یونانی ہے اور انگریزی میں اس کو Paraclete لکھا جاتا ہے جس کے معنی "تسلی دینے والے" کے ہیں، اور ضمناً "محبت کرنے والے" کا مفہوم بھی اس سے نکلتا ہے، جیسا کہ پوسٹ نے اپنی قاموس میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا لفظ بھی ہے جو انگریزی حروف میں Periclite لکھا جاتا ہے اور اس کے معنی "بلند پایہ" "جلیل القدر" "عالی مقام" "بزرگ" اور "نام ور" کے ہیں۔ یہ سب معنی محمد اور احمد اور محمود سے اقرب ہیں۔ اب یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مسیح علیہ السلام جس زبان میں کلام کرتے تھے وہ عبرانی تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اصل لفظ جو انہوں نے استعمال کیا تھا، وہ کیا تھا؟ اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس انجیل کے مولف نے اس کا ترجمہ لفظ "فارقلیط" سے جو کیا ہے وہ اس کا پورا مفہوم ادا کرتا ہے یا نہیں؟ ہم کو یہ بھی خبر نہیں کہ اس لفظ کا یہی ترجمہ پہلے بھی کیا گیا تھا یا نہیں؟ خود عیسائی مصنفین اس کا اقرار کر چکے ہیں کہ عہد قدیم اور عہد جدید دونوں کے ترجموں میں الفاظ اور عبارات بدلتی رہی ہیں اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ابتدا سے لفظ (Paraclete) ہی اصل عبرانی لفظ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اصل میں (Periclite) استعمال کیا گیا ہو اور بعد میں سہواً یا عمداً اس کو Paraclete کر دیا گیا ہو۔ یونانی زبان میں یہ دونوں لفظ اس قدر مشابہ ہیں کہ ایک کا دوسرے سے بدل جانا کچھ بعید نہیں۔"

ان تصریحات سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دونوں لفظوں میں بہت کم فرق ہے اور یونانی حروف اس قدر متشابہ ہیں کہ پیرکلیتوس کا پارکلیتوس سے مبدل ہو جانا بالکل قرین قیاس ہے۔

بعد میں اہل تثلیث نے یہ دیکھ کر کہ مقدم الذکر لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک سے بہت قریب المعنی ہے، اس امر پر اصرار کیا کہ دراصل موخر الذکر لفظ ہی صحیح ہے۔ جن لوگوں نے مسیحی علماء کی روش کا بنظر انصاف مطالعہ کیا ہے وہ تسلیم کریں گے کہ ان حضرات کی دیانت سے یہ امر بعید نہیں، بلکہ وہ ایسی تحریف کو نہایت مستحسن اور کار ثواب سمجھتے ہیں۔

(۲) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بعض لوگوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم "فارقلیط" کے مصداق ہیں۔ مثلاً منتس مسیحی جو دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ یہ ایک نہایت مرتاض شخص تھا اور اپنے عہد میں بڑا پرہیزگار سمجھا جاتا تھا۔ اس نے بلاد روم (ایشیار کوچک) میں ۱۸۷ء کے قریب زمانہ میں رسالت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میں ہی وہ فارقلیط ہوں جس کی آمد کا عیسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کے دعوے کو قبول کر لیا اور اس پر ایمان لے آئے۔ سر ولیم میور نے اس کا حال لکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے بعد ابتدائی صدیوں میں لوگ فارقلیط کے منتظر تھے، مدعیوں نے فارقلیط ہونے کا دعویٰ بھی کیا، اور بہت سے مسیحیوں نے ان کے دعووں کو قبول بھی کیا۔ لب التواریخ کا عیسائی مصنف لکھتا ہے:

"محمد کے ہم عصر یہودی اور مسیحی ایک نبی کے منتظر تھے اس سے محمد کو بہت فائدہ پہنچا کیونکہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ میں ہی وہ نبی منتظر ہوں۔"

اس کلام سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ ایک نبی کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی بنا پر جب نجاشی شاہ حبش کے پاس آنحضرت کا نامۂ مبارک پہنچا تو وہ پڑھتے ہی بول اٹھا کہ "میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ یہی وہ نبی ہے جس کا انتظار اہل کتاب کر رہے تھے" پھر جواب میں آپ کو لکھا کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے

صادق اور مصدق رسول ہیں میں نے آپ سے بیعت کی اور آپ کی طرف سے آپ کے چچازاد بھائی (جعفر بن ابی طالب) کے ہاتھ پر ایمان لایا"۔ یہ بادشاہ اسلام سے پہلے نصرانی تھا۔

مُقَوْقِس شاہ مصر کو جب آنحضرت کا دعوت نامۂ اسلام پہنچا تو اس نے جواب میں لکھا

"میں نے آپ کا خط پڑھا اور جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے سمجھا اور جس چیز کی طرف آپ دعوت دے رہے ہیں اس کو دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی ایک نبی آنے والا رہ گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظاہر ہوگا۔ میں نے آپ کے قاصد کے ساتھ عزت کا برتاؤ کیا ہے"۔

یہ بادشاہ اسلام نہیں لایا، مگر اس نے اپنے خط میں اقرار کیا کہ ایک نبی اور آنے والا رہ گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ایسی زبردست دنیوی طاقت نہ تھی کہ یہ بادشاہ ڈر کر اس بات کا اقرار کرتے۔ لامحالہ ان باتوں سے یہی نتیجہ نکالا جائے گا کہ فی الواقع اس وقت عیسائیوں میں عام طور پر فارقلیط کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

ایک نصرانی عالم جارود بن علار اپنی قوم کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ:-

"خدا کی قسم، حق کے ساتھ آئے ہیں، اور آپ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، میں نے انجیل میں آپ کی تعریف پائی ہے، اور مریم عذرا کا بیٹا آپ کی بشارت دے چکا ہے پس تحیۃ و سلام ہو آپ پر اور شکور ہے وہ جو آپ کی عزت کرے۔ آنکھ سے دیکھ لینے کے بعد کسی اور نشان کی ضرورت نہیں اور یقین کے بعد شک کی گنجائش نہیں ہاتھ بڑھائیے اور میں

گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور آپ خدا کے رسول ہیں"۔
اس قسم کی متعدد مثالیں تاریخ میں اور بھی ملتی ہیں جن سے ہمارے مذکورہ بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔

ان دو امور کی توضیح کے بعد ہم کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان میں جو لفظ استعمال کیا تھا اس کا تو اب کہیں پتا نہیں۔ صرف اس کا یونانی ترجمہ باقی رہ گیا ہے اب یہ بحث بے نتیجہ ہے کہ اصل عبرانی لفظ کیا ہوگا۔ ہم جو کچھ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں، یونانی ترجمہ ہی سے نکال سکتے ہیں۔ اس ترجمہ میں بھی دو احتمال ہیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اصل ترجمہ "پیرکلیتوس" تھا تب تو یہ بات بالکل ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کیوں کہ وہ آپ کے اسم مبارک کے قریب قریب لفظی ترجمہ ہے لیکن عیسائی اس احتمال کو نہیں مانتے اس لیے ان کی خاطر سے ہم اس احتمال کو بھی چھوڑے دیتے ہیں۔ اب صرف پارکلیتوس (فارقلیط) باقی رہ جاتا ہے جس کے معنی "تسلی دہندہ" "مددگار" اور "حجت کرنے والے" (وکیل) کے کیے گئے ہیں سنہ ۱۸۱۶ء کے عربی ترجمہ میں "شافع" کیا گیا ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ یہی صحیح ہے، اور حضرت عیسیٰ نے جو کچھ فرمایا تھا اس کا صحیح مفہوم یہی ہے، تب بھی ہمارا یہ دعویٰ بجائے خود قائم رہتا ہے کہ اس سے مراد وہ روح نہیں ہے جو عید پنتکست کے دن حضرت عیسیٰ کے شاگردوں پر نازل ہوئی تھی (جیسا کہ کتاب الاعمال باب ۲ میں بیان ہوا ہے)، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں۔ ہمارے اس دعوے کے لیے خود اس بشارت ہی میں حسب ذیل دلائل موجود ہیں:-

(۱) حضرت عیسیٰ نے فارقلیط کی خبر دینے سے پہلے تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ "اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جو کچھ بعد میں کہا جانے والا ہے، اس کو معین سمجھ لیں کہ وہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کی رعایت ضروری ہے۔ اگر فارقلیط سے مراد

وہی روح ہوتی جو شاگردوں پر نازل ہونے والی تھی تو اس فقرہ کی کوئی حاجت نہ تھی؛ کیونکہ یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ حواریین جو اس سے پہلے بھی اس روح کے نزول سے مستفیض ہو چکے تھے، ایک بار پھر اس کے نازل ہونے کو مستبعد سمجھیں گے۔ بلکہ اگر وہ پہلے نازل نہ بھی ہو چکی ہوتی تب بھی استبعاد کی کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ جب روح کسی کے قلب پر نازل ہوگی اور اس میں حلول کر جائے گی تو لامحالہ اس کا نمایاں اثر ظاہر ہوگا، ایسے گمان کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ متاثر شخص اس سے انکار کر دے گا۔ انکار و استبعاد کا اندیشہ اور اس کا سدباب کرنے کے لیے پہلے سے تنبیہ کر دینا تو اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جبکہ بشارت کا ظہور کسی ایسی صورت میں ہونے والا ہو جو انسانی فطرت اور انسان کے سابق طرز عمل کو دیکھتے ہوئے انکار و استبعاد کی محل سمجھی جا سکتی ہو اور رہ چکی ہو، اور یہ صورت ایک بشر رسول کی صورت ہی ہو سکتی ہے۔ مسیح علیہ السلام دیکھ چکے تھے کہ پچھلی امتوں نے ہمیشہ نبیوں کو جھٹلایا۔ اس لیے انہوں نے اپنے متبعین کو آنے والے نبی کی خبر دینے سے پہلے تنبیہ کر دی کہ وہ اس کی تکذیب نہ کریں۔

(۲) یہ روح جو شاگردوں پر نازل ہوئی تھی، مسیحی اعتقاد کے موجب باپ سے تو مطلقاً متحد ہے، اور بیٹے سے باعتبار اس کی لاہوتیت کے حقیقتہً متحد ہے۔ پھر اس کو "دوسرا فارقلیط" کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا تھا۔ البتہ اگر مخبر عنہ کوئی نبی ہو تو کسی تکلف کے بغیر یہ الفاظ اس پر صادق آ سکتے ہیں۔

(۳) وکالت اور شفاعت، خواص نبوت میں سے ہیں نہ کہ اس روح کے خواص میں سے جو اللہ کے ساتھ متحد بتائی جاتی ہے۔ پس اگر فارقلیط کے معنی وکیل اور شفیع کے ہیں تو یہ لفظ روح پر صادق نہ آئے گا بلکہ ایک نبی ہی پر صادق آئے گا۔

(۴) عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا" عہد جدید کے رسائل میں سے کسی رسالہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ عید پنتکُست کے دن جو حواری جمع تھے وہ مسیح کی باتوں کو بھول گئے تھے اور اس روح نے جو ان پر نازل ہوئی انہیں وہ سب باتیں یاد دلائیں۔

(۵) عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب وہ وقوع میں آئے تو تم ایمان لاؤ۔" اس فقرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارقلیط سے مراد یہ روح نہیں ہے۔ اگر نزول روح کی خبر دینا مقصود ہوتا تو مکرر اس تاکید کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ روح کا نازل ہونا کوئی ایسا امر نہ تھا جس کو حواریین مستبعد سمجھتے، یا ان سے یہ اندیشہ ہوتا کہ نزول روح کے وقت وہ اس سے انکار کر دیں گے۔ پس یہ تاکید کی تکرار صاف بتا رہی ہے کہ فارقلیط سے مراد ایک آنے والا نبی ہے۔

(۶) عیسیٰ علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ "وہ میری گواہی دے گا۔" مگر اس روح نے مسیح کے تلامذہ میں سے کسی کے سامنے مسیح کی گواہی نہ دی، نہ اس گواہی کی کوئی ضرورت تھی، کیونکہ جن حواریوں پر وہ نازل ہوئی تھی وہ اس کے نزول سے پہلے ہی مسیح کو جانتے تھے اور کسی شہادت کے محتاج نہ تھے۔ رہے کفار جنہوں نے مسیح کا انکار کیا تھا، تو وہ شہادت کے تو محتاج ضرور تھے، مگر یہ روح نہ ان پر نازل ہوئی نہ اس نے ان کے سامنے کوئی شہادت دی بخلاف اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح علیہ السلام کی صداقت پر گواہی دی، ان کی والدۂ ماجدہ پر کفار نے زنا کی جو تہمت لگائی تھی اس کو نہایت پرزور طریقہ سے رد کیا، اور تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مسیح علیہ السلام پر بھی ایمان لانے کو لازم گردانا۔

(۷) عیسیٰ علیہ السلام اس کے بعد فرماتے ہیں۔ "اور تم بھی گواہی دو گے کیونکہ تم شروع

؎ بعض اردو ترجموں میں "تم بھی گواہ ہو" لکھا ہے۔ مگر انگریزی ترجمہ جو زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے، یوں ہے (And ye also shall bear witness) عربی کے جدید ترین ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں۔ وتشھدون انتم ایضاً۔

سے میرے ساتھ ہو" اس قول سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب آنے والا فارقلیط مسیح پر گواہی دیگا تو مسیح کے پیچھے پیرو بھی اس کے ساتھ گواہی دیں گے لیکن اگر فارقلیط سے مراد وہ روح لی جائے جو حواریوں پر نازل ہوئی تھی تو یہ قول بے معنی ہوجاتا ہے۔ اس روح کے نزول کی کیفیت جو کتاب الاعمال میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک آندھی کے سے سناٹے کے ساتھ آئی اور زبان ہائے آتش کی شکل میں ظاہر ہوئی اور ہر ایک حواری پر آٹھیری اور وہ سب اس روح سے بھر گئے۔ اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روح ان میں اس طرح حلول کر گئی تھی جس طرح جن کسی کے اندر اتر جاتا ہے۔ اب اگر وہ مسیح پر گواہی دیتی بھی تو اس کی گواہی اور حواریوں کی گواہی جدا جدا نہ ہوتی بلکہ وہ صرف روح ہی کی گواہی ہوتی۔

(۸) عیسیٰ علیہ السلام پھر فرماتے ہیں "اگر میں نہ جاؤں تو وہ فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیجدوں گا"۔ یہاں آنجناب نے فارقلیط کی آمد کے لیے اپنے جانے کو شرط، اور موجودگی کو اس کی آمد کے لیے مانع قرار دیا ہے۔ مگر نزول روح کے لیے تو نہ مسیح کی موجودگی مانع تھی اور نہ مسیح کے جانے پر اس کی آمد موقوف تھی، کیونکہ وہ مسیح کے عہد میں بھی حواریوں پر نازل ہوچکی تھی (جبکہ مسیح نے انہیں بلاد اسرائیلیہ کی طرف بھیجا تھا) لہذا فارقلیط سے روح مراد نہیں ہوسکتی، بلکہ وہ کوئی ایسا ہی شخص ہوسکتا ہے جس سے مسیح کی زندگی میں ان کے پیرو فیضیاب نہ ہوئے ہوں اور جن کا آنا مسیح کے جانے پر موقوف ہو۔ چونکہ دو مستقل صاحب شریعت نبیوں کا بیک وقت موجود ہونا جائز نہیں ہے، اور اسی بناء پر حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ نہ آئے گا، اس لیے وہ لامحالہ کوئی نبی ہی ہونا چاہیے۔

(۹) عیسیٰ علیہ السلام آگے چل کر فرماتے ہیں "وہ دنیا کو قصوروار ٹھیرائیگا"۔ اس مفہوم کے لیے عربی ترجمہ میں "یُوبخ العالم" اور "یبکت العالم" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس کے معنی زجر اور ملامت

کرنے اور حجت کے زور سے غالب آنے کے ہیں۔ انگریزی میں Reprove کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی سرزنش کرنے اور ڈانٹنے کے ہیں! اب یہ کھلی ہوئی تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی نے ان لوگوں کو سرزنش اور زجر و توبیخ نہیں کی ہے جنہوں نے مسیح کی تکذیب کی اور انکی والدہ پر تہمت لگائی اور ان پر قتل کا فتویٰ صادر کیا۔ یہ بات نہ اب تک پر صادق آتی ہے جو شاگردوں پر نازل ہوئی تھی اور نہ عیسائی کسی

(۱۰) حضرت عیسیٰؑ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں ہے"۔ اس فقرہ میں فارقلیط کی دو مزید صفات بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس جہان کا سردار (رئیس ھذا العالم) .. Prince of this world) ہو دوسرے یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ پر فضیلت رکھتا ہے، کیونکہ حضرت اس کے مقابلہ میں اپنی بے بضاعتی کا اظہار صریح کرتے ہیں کہ "مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں" (بعض ترجموں میں ہے "مجھ میں اس کا کچھ نہیں") یہ دونوں باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ آنے والا مسیح کے ساتھ متحد الحقیقت نہیں ہے، بلکہ غیر ہے، آسمان کا نہیں بلکہ اس جہاں کا سردار ہے، اور مسیح کے مقابلہ میں افضل ہے روح القدس ان صفات کی حامل نہیں ہو سکتی۔ ایک انسان ہی ان کا مصداق ہو سکتا ہے۔

(۱۱) پھر مسیح فرماتے ہیں کہ "مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر ابھی تم ان کے تحمل کی قوت نہیں رکھتے" یہ فقرہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنے والے سے وہ روح مراد نہیں ہے جو شاگردوں پر نازل ہوئی تھی، کیونکہ اس نے حضرت عیسیٰ کے احکام پر کسی حکم کا اضافہ نہیں کیا۔ عیسائیوں کے اپنے بیان کے بموجب اس نے مسیحیوں کو صرف عقیدۂ تثلیث کی تعلیم دی اور انہیں حکم دیا کہ دنیا کو اس عقیدہ کی طرف دعوت دیں۔ اس میں کونسی ایسی بات ہے جو اس تعلیم پر زائد ہو جو حضرت عیسیٰ خود عیسائیوں کے اعتقاد کے بموجب صلیب پر چڑھنے کے وقت تک دیتے رہے؟ ہاں یہ ضرور ہوا کہ انہوں نے اس روح کے نزول کے بعد توراۃ کے احکام عشرہ میں سے

چند کے سوا باقی تمام احکام کو ساقط کر دیا اور بہت سے محرمات کو حلال کر لیا۔ مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے متعلق حضرت مسیح کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ تم اس کے تحمل کی قوت نہیں رکھتے۔ احکام کا اسقاط تو کوئی بار نہیں بلکہ پچھلے بار کو ہلکا کرنے والی چیز ہے، پھر اس کے لیے تحمل کی قوت نہ ہونے کے کیا معنی؟ البتہ مزید احکام کو قبول کرنا ضرور قوتِ تحمل چاہتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السلام کے زمانۂ نبوت میں عیسائی اس قدر ضعیف الایمان اور کمزور تھے کہ وہ فرائض و واجبات اور اوامر و نواہی اور جہاد و قتال اور سیاست مدن کے عظیم الشان بار کو نہیں سنبھال سکتے تھے۔ انہی چیزوں کے متعلق حضرت مسیح نے فرمایا کہ مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی تھیں، مگر اس وقت تم ان کو برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے، اس لیے میں انہیں ملتوی کرتا ہوں۔ میرے بعد فارقلیط، اس جہان کا سردار، مجھ سے افضل شخص آکر تمہیں ان کی تعلیم دے گا۔ اب جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کی شریعت پر غور کرے گا، اس کا دل خود گواہی دیگا کہ آپ ہی نے اس کام کو مکمل کیا جسے حضرت عیسیٰ ناقص چھوڑ گئے تھے۔ اور آپ ہی اس بشارت کے مصداق ہو سکتے ہیں۔

(۱۲) پھر حضرت فرماتے ہیں "وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا"۔ یہ کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو بنی اسرائیل سے اندیشہ تھا کہ وہ آنے والے نبی کی تکذیب کریں گے، اس لیے پھر ایک مرتبہ انہیں یقین دلانے کی ضرورت پیش آئی کہ وہ شخص نبی صادق ہوگا، اپنی ہوائے نفس کی بنا پر کچھ نہ کہے گا بلکہ جو کچھ اس پر وحی کیا جائے گا وہی تم تک پہنچا دے گا۔ مزید براں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد روح القدس نہیں ہے کیونکہ مسیحی اعتقاد کے بموجب وہ تو اللہ کے ساتھ عینیت رکھتی ہے، پھر اس کے حق میں یہ کہنے کا کونسا موقع تھا کہ وہ جو کچھ سنے گی وہی کہے گی۔ پس لامحالہ اس کے مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کیونکہ آپ انسان ہیں، عین اللہ

نہیں ہیں اور آپ ہی کے حق میں اس اندیشہ کے متعدد وجوہ تھے کہ بنی اسرائیل آپ کی تکذیب کریں گے، اور بعد کے واقعات نے بھی ثابت کر دیا کہ بنی اسرائیل نے نہایت شدت کے ساتھ آپ کی تکذیب کی۔

(۱۴) آخر میں حضرت یہ بھی فرماتے ہیں کہ "جو کچھ میرے پاس ہے وہ اسی سے لے گا" یہ بات بھی روح القدس پر صادق نہیں آتی: کیونکہ اہل تثلیث کے نزدیک تو وہ قدیم ہے، غیر مخلوق ہے، قادر مطلق ہے، اس کے لیے کوئی کمال منتظر نہیں ہے، بلکہ ہر کمال اس کو بالفعل حاصل ہے۔ پس ضرور ہے کہ یہ موعود کسی ایسی جنس سے ہو جو بالذات عالم نہ ہو، بلکہ اس کا علم معطی حق کی عطا کا نتیجہ ہو۔ ایسا شخص صرف ایک بشر رسول ہی ہو سکتا ہے۔ پھر چونکہ اس وہم کا موقع تھا کہ آنے والا نبی حضرت عیسیٰ کی شریعت کا متبع ہوگا، اسیلئے حضرت نے اُس کو دفع کرنے کے لیے فرمایا کہ "سب چیزیں جو باپ کی ہیں وہ میری ہیں اس لیے میں نے کہا کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اسی سے لے گا" مطلب یہ ہے کہ تمام تعلیم حق خدا کی طرف سے ہے میرے پاس جو کچھ ہے وہ بھی خدا کا ہے، اور آنے والا نبی بھی جو کچھ کہے گا وہ خدا کی طرف سے کہے گا۔ لہٰذا تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کی تعلیم میری تعلیم سے کچھ مغائر ہے۔ بلکہ اس کو اپنی ہی چیز سمجھنا۔

بشارت مذکورۃ الصدر کی اس توضیح کو دیکھیے۔ اگر کوئی شخص انکار پر اصرار کرنے والی ذہنیت نہ رکھتا ہو، اور کھلے دل سے بشارت کے صریح مفہوم کو سیدھے سادے طریق پر سمجھنے کی کوشش کرے، تو بشارت کے الفاظ اور تاریخ کے مسلّم واقعات اس کو یقین دلا دیں گے کہ وہ بشارت ایک آنے والے نبی ہی کے لئے تھی، اور مسیح کے بعد سے آج تک کوئی ایسی عظیم الشان شخصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا پیدا نہیں ہوئی جو اس بشارت کی مصداق ہو۔

مسیحی علماء کے شبہات اب ان شبہات پر بھی ایک نظر ڈالیے جو ہماری اس تعبیر پر مسیحی علماء کی طرف

سے دوار و کیے گئے ہیں ۔

(۱) اس عبارت میں فارقلیط کی تفسیر روح القدس اور روح حق سے کی گئی ہے اور یہ دو نوں لفظ اقنوم ثالث کے لیے مختص ہیں۔ پھر فارقلیط سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کر مراد ہو سکتے ہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ عہد قدیم اور عہد جدید میں روح القدس اور روح الحق اور روح الصدق کے الفاظ جہاں کہیں استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد لازماً اقنوم ثالث ہی نہیں ہے ، بلکہ بکثرت مقامات پر ان کو اقنوم ثالث کے سوا دوسرے معانی کے لیے استعمال کیا گیا ہے مثلاً کتاب حزقیال باب ۳۷ کی آیت ۱۴ میں اللہ تعالیٰ ان ہزاروں آدمیوں کو جنہیں اس نے حزقیال علیہ السلام کے معجزہ سے زندہ کیا تھا ، خطاب کرکے فرماتا ہے " اور میں اپنی روح تمہارے اندر ڈالوں گا " یہاں روح اللہ سے مراد نفس ناطقہ انسانیہ ہے نہ کہ اقنوم ثالث جو اہل تثلیث کے نزدیک عین اللہ ہے ۔ یوحنا کے پہلے خط کا چوتھا باب ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے ۔

" اے عزیزو ہر ایک روح کا یقین نہ کرو بلکہ روحوں کو آزماؤ کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں یا نہیں ۔ کیونکہ بہت سے جھوٹے نبی دنیا میں نکل کھڑے ہوئے ہیں ۔ خدا کی روح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی روح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے ... ... ہم خدا سے ہیں جو خدا کو جانتا ہے وہ ہماری سنتا ہے اور جو خدا سے نہیں وہ ہماری نہیں سنتا ۔ اسی سے ہم حق کی روح کو پہچان لیتے ہیں "
(آیت ۱ - ۶) ۔

ان آیات میں بھی روح اللہ اور روح حق سے مراد اقنوم ثالث نہیں ہے بلکہ یہاں اس سے مراد واعظ حق ہے ، اور مجرد روح بمعنی واعظ اور داعی استعمال کی گئی ہے

جو اگر گمراہی کی طرف بلائے تو گمراہی کی روح کہی جائے گی۔ پس فارقلیط کی تفسیر میں روح القدس اور روح الحق کے الفاظ استعمال کرنے سے لازم نہیں آتا کہ اس سے مراد وہ روح القدس ہو جس کو مسیحی عقیدہ میں اقنوم ثالث کہا جاتا ہے۔ بلکہ بشارت کے دوسرے الفاظ اور قرائن صاف بتا رہے ہیں کہ اس سے مراد واعظ حق اور داعی صدق ہے۔

(۲) اس عبارت میں مسیح کا خطاب حواریوں سے ہے اور ہر جگہ ضمیر مخاطب استعمال کی گئی ہے۔ لہٰذا ضرور ہے کہ فارقلیط حواریوں ہی کے سامنے ظاہر ہو، نہ کہ پانچ چھ سو سال بعد۔

جواب اس کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی ضمیر خطاب استعمال کی جائے تو لازماً موجود الوقت حاضرین یا ہم عصر لوگ ہی اس سے مراد ہوں۔ حالانکہ ہر جگہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر انجیل متی باب ۲۶۔ آیت ۶۴ میں جناب مسیح علیہ السلام سردار کاہنوں اور شیوخ اور عوام کو خطاب کر کے کہتے ہیں:۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کے دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے"۔

اس قول کے مخاطب مر چکے۔ ایک ہزار نو سو برس سے زیادہ زمانہ گذر گیا۔ مگر ابھی تک کسی ابن آدم قادر مطلق کے دہنی طرف بیٹھا ہوا اور آسمان کے بادلوں پر آتا ہوا نظر نہ آیا۔ اگر اس قول کے مخاطب صرف وہی لوگ تھے جو اس مجمع میں موجود تھے، تو مسیح کا یہ قول جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔

(۳) فارقلیط کے متعلق مسیح نے کہا ہے کہ وہ روح حق ہے جسے دنیا نہیں پا سکتی کیونکہ وہ اُسے نہ دیکھتی ہے نہ جانتی ہے لیکن تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم میں ہو گی"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد روح ہی ہے نہ کہ ایک مجسم انسان جسے دنیا نے

دیکھا بھی اور جانا بھی۔

جواب یہ اعتراض اگر ضد کی بنا پر نہیں ہے، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معترضین کسی بلیغ اور حکیمانہ کلام کے مغز کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ رویت اور معرفت کے دو مرتبے ہوتے ہیں۔ ایک رویت و معرفت تو یہ ہے کہ آپ نے معلم کے جسد اور رنگ وروپ کو دیکھا اور یہ جان لیا کہ وہ ایک خاص شکل وصورت اور صفات رکھنے والا انسان ہے دوسری رویت و معرفت یہ ہے کہ آپ نے اس روح کو دیکھا اور جانا جو اس کی تعلیم اور اس کی سیرت میں پوشیدہ ہے مسیح کی مراد دراصل یہ دوسری نوع ہی کی رویت ومعرفت ہے، اسی لیے انہوں نے یہاں شخص کے بجائے "روح حق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اگر رویت سے مراد رویت بصری اور معرفت سے مراد معرفت جسدی ہو تو ظاہر ہے کہ روح اس اعتبار سے نہ تو مرئی ہے اور نہ قابل معرفت۔ لہٰذا روح کے لیے اس معنی میں دیکھنے اور جاننے کے الفاظ استعمال کرنا ہی سرے سے بے معنی ہوتا۔ پس مسیح کے کلام کا واضح مقصود یہ ہے کہ فارقلیط میں حق اور صداقت کی جو روح ہو گی، دنیا کے لیے اس کو پانا مشکل ہوگا۔ مگر جو سچے مسیحی ہیں وہ آسانی کے ساتھ اسے پالیں گے۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں سچے عیسائیوں کے متعلق ارشاد ہوئی ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ

اور تم ایمان لانے والوں کے ساتھ محبت کرنے میں سب سے زیادہ جن کو قریب پاؤگے وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔ انہوں نے جب وہ پیغام سنا جو

الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (الانعام: ۱۱)۔

رسول پر اتارا گیا ہے تو تم نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کیوں کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے پس ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ دے۔ اور کیا ہم کو جنون ہو گیا ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے سامنے آیا ہے ایمان نہ لائیں اور پھر یہ بھی امید رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو صالح لوگوں میں داخل کر دے گا۔

اس آیت میں قرآن مجید نے مسیح کے اس قول کی حرف بحرف تائید کی ہے کہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت سچے عیسائی روح حق کو جلدی پہچان لیں گے کیونکہ وہ پہلے سے حق آشنا اور حق شناس ہو چکے تھے۔

تاہم اگر کوئی مسیحی رویت کے معنی کو رویت بصری اور معرفت کے معنی کو معرفت جدی ہی میں محصور کرنے پر اصرار کرے تو ہم اس سے انجیل کی حسب ذیل آیات کے معنی دریافت کریں گے:۔

"میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ دیکھتے ہیں اور پھر نہیں دیکھتے اور سنتے ہیں اور پھر نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے"۔ (متی۔ باب ۱۳۔ آیت ۱۳۔)

"اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہے"۔ (متی۔ باب ۱۱۔ آیت ۲۷)

"تم مجھے بھی جانتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ میں کہاں کا ہوں (یوحنا۔ باب ۷، آیت ۲۸)

"نہ تم مجھے جانتے ہو نہ میرے باپ کو۔ اگر مجھے جانتے تو میرے باپ کو بھی جانتے۔ (یوحنا

باب ۸۔ آیت ۱۹)۔

اگر دیکھنے اور جاننے کے مدارج میں تفاوت نہیں ہے، تو آپ اس گورکھ دھندے کو کیونکر سلجھائیں گے کہ ایک ہی وقت میں دیکھنے اور جاننے کی نفی بھی ہے اور اثبات بھی۔

(۴) کتاب الاعمال کے پہلے باب میں ہے: "اور ان سے فکر ان کو حکم دیا کہ یروشلم سے باہر نہ جاؤ۔ بلکہ باپ کے اس وعدے کے پورا ہونے کے منتظر رہو جس کا ذکر تم مجھ سے سن چکے ہو کیونکہ یوحنا نے تو پانی سے بپتسمہ دیا مگر تم تھوڑے دنوں کے بعد روح القدس سے بپتسمہ پاؤ گے" (آیت ۵) یہ قول دلالت کرتا ہے کہ فارقلیط وہی روح ہے جو پینتکست کے دن نازل ہوئی، کیونکہ باپ کے وعدے سے مراد فارقلیط ہی ہے۔

جواب۔ یہ کہنا کہ باپ کے وعدے سے مراد فارقلیط ہے اور فارقلیط سے مراد روح القدس ہے، یہ محض ایک ادعا ہی ادعا ہے، اور ہم اس کو بدلائل غلط ثابت کر چکے ہیں۔ دراصل فارقلیط کی بشارت ایک الگ چیز ہے اور شاگردوں پر نزول روح کا وعدہ ایک دوسری چیز ہے۔ دونوں وعدے الگ الگ پورے کیے گئے۔ یوحنا نے صرف فارقلیط کی بشارت نقل کی ہے، دوسرے انجیلیوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ لوقا نے نزول روح کا وعدہ نقل کیا ہے۔ یوحنا نے اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ مولفین اناجیل کا حال یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات کو تو سب کے سب بالاتفاق نقل کرتے ہیں، مثلاً یروشلم جاتے وقت حضرت عیسیٰ کا گدھے پر سوار ہونا، مگر بڑے بڑے اہم معاملات کے بیان میں اکثر اختلاف کرتے ہیں حتیٰ کہ کسی بڑے معاملہ کا ایک شخص ذکر کرتا ہے۔ اور دوسرا بالکل نہیں کرتا۔ ابن الارملا کو مردوں میں سے جلا اٹھانا، ستر شاگردوں کو روانہ کرنا، برص کے دس مریضوں کو چنگا کرنا صرف لوقا کے ہاں مذکور ہے، دوسرے انجیلی مصنفین نے ان واقعات کا کوئی ذکر نہیں کیا، حالانکہ یہ اہم

واقعات ہیں۔ قانائے گلیل کی شادی میں شرکت، اور وہاں پانی کو مے بنا دینا صرف یوحنا کے ہاں بیان ہوا ہے، باقی سب اس باب میں خاموش ہیں، حالانکہ یہ وہ واقعہ ہے جس میں پہلی مرتبہ مسیح سے ایک معجزہ صادر ہوا اور ان کی بزرگی کو جان کر لوگوں نے ان پر ایمان لانا شروع کیا۔ اسی طرح بیت صیدا میں ایک ۳۸ سال کے مریض کو چنگا کرنے کا واقعہ، اور ایک زناکار عورت کا قصہ اور ایک جنم کے اندھے کو اچھا کرنے کا حال بھی صرف یوحنا نے لکھا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اہم واقعات ہیں۔ یہی کیفیت متی اور مرقس کی بھی ہے۔ یہ دونوں بھی بعض واقعات کے بیان میں منفرد ہیں۔ پس جو شخص اناجیل میں نظر رکھتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ نزول روح القدس کی بشارت اور آمد فارقلیط کی بشارت، دونوں ایک نہیں ہیں، بلکہ قطعاً الگ ہیں، اور دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔

انجیل برنا باس اور اس کی بشارتیں

یہاں تک ہم نے وہ بشارتیں نقل کی ہیں جو اہل کتاب کے ہاں قانونی کتابیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ اب ہم غیر قانونی کتابوں میں سے ایک اہم کتاب کا ذکر کرتے ہیں جو مسیح کے حواری برنابا (St. Barnabas) کی انجیل کہلاتی ہے۔ یہ ایک قدیم کتاب ہے جس سے ابتدائی زمانہ کے مسیحی خوب واقف تھے۔ اس میں صریح طور پر توحید خالص اور ابطال تثلیث کا ذکر تھا، نیز اس میں دین مسیحی کے حقیقی اصول بھی بیان کیے گئے تھے جن کو مٹا کر سینٹ پال نے مسیحیت کی شکل بدل دی۔ مگر بدقسمتی سے پیروان مسیح کا سواد اعظم پال کا متبع ہوگیا، اور اسی کے مذہب نے رومیوں میں فروغ پایا یہاں تک کہ قسطنطین اعظم کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد یہی سرکاری مذہب بن گیا۔ قسطنطین کے عہد میں ایک پادری ایریس (Arius) نامی تھا جس نے لوسیان انطاکی کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح خدا نہیں ہے، نہ خدا نے مسیح کے جسم میں

حلول کیا ہے، بلکہ خدا نے اپنی روح مسیح میں پھونک دی تھی۔ اس لحاظ سے وہ ایک ہی خدا کا قائل تھا اور مسیح کو اس کا بندہ سمجھتا تھا۔ سرکاری مذہب کے اکابر نے اس کی سخت مخالفت کی۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیہ (Nicaea) کے مقام پر ایک کونسل مقرر کی گئی، جس میں ایک مہینہ سے زیادہ مدت تک اس مسئلہ پر سخت مباحثہ ہوتا رہا۔ قسیسوں کی اکثریت غیر جانبدار رہی۔ مگر قسطنطین کے شاہی اثر سے ایریس اور اس کے پیروؤں کو دین سے خارج کر دیا گیا۔ اس مباحثہ میں ایریس نے برنا باکی انجیل کو بھی منجملہ دوسرے شواہد کے، اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش کیا تھا۔ سرکاری مذہب کے ائمہ پہلے سے اس انجیل کو ترک کر چکے تھے۔ اب جو ایرین فرقہ نے اس سے استدلال کر کے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی، تو اس کی مخالفت کا جذبہ اور بڑھ گیا، یہاں تک کہ اس کا مطالعہ حرام قرار دیدیا گیا، اور اس کے پڑھنے والوں کو سخت سزائیں دی جانے لگیں۔

اس طرح انجیل برنا با قریب قریب دنیا سے ناپید ہو گئی لیکن اس کے چند نسخے پھر بھی موجود رہے۔ قرآن کے مترجم جارج سیل نے اس کا ہسپانوی نسخہ دیکھا تھا۔ اس سے بہت پہلے ایک راہب مرینو نامی نے سولہویں صدی کے اواخر میں اس کا لاطینی نسخہ پاپائے روم کے کتب خانہ میں دیکھا اور وہاں سے چرا لیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی نسخہ کو دیکھ کر مرینو مسلمان ہو گیا۔ ایک اور نسخہ بلاط (ویانا) کے کتب خانہ میں پایا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں ایل ریگ (L. Ragg) نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں آکسفرڈ سے شائع کیا، اور اس نسخہ سے عربی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔

مسیحی علماء کہتے ہیں کہ یہ انجیل جعلی معلوم ہوتی ہے۔ غالباً کسی ایسے پادری نے ایطالوی زبان میں اس کو تصنیف کیا ہے جو مسیحیت کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا ہو گا لیکن یہ محض ایک قیاس ہے۔ اس کا کوئی ثبوت وہ نہیں دے سکے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ امر ثابت ہے کہ ظہور اسلام سے تین سو برس پہلے برنا باکی انجیل موجود تھی اور اس میں پولوسی عقائد کے خلاف باتیں پائی جاتی تھیں جن کی بنا پر اس کو مستند کتابوں کے زمرہ

خارج کیا گیا۔ سب سے بڑی بات جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اس انجیل کے جعل سے کوئی تعلق نہیں ہے گذشتہ بارہ صدیوں میں علمائے اسلام نے مسیحیوں کے رد میں بہت کچھ لکھا اور خود مسیحی کتابوں سے بھی استدلال کیا مگر کسی مسلمان مصنف کی کتاب میں برنا باکی انجیل کا ذکر نہیں پایا گیا۔ یہ ایسی بات ہے جس کو دشمن اسلام مارگولیتھ جیسے شخص نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مسیحیوں کو اس کتاب کے جعلی ہونے کا شبہہ زیادہ تر اس وجہ سے ہوا کہ اطالین نسخہ پر کچھ عربی تعلیقات پائی گئی ہیں لیکن جن لوگوں نے ان تعلیقات کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ کسی مسلمان عالم کی نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان کی زبان نہایت ناقص ہے حتیٰ کہ ایک جگہ سبحان اللہ کو اللہ سبحان لکھا ہے۔

اس مختصر تعارف کے بعد ہم اس انجیل کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

" تب شاگرد رونے لگے اور بولے کہ اے استاد تو ہمیں کیوں چھوڑے جاتا ہے۔ ہمارے لیے مرجانا اس سے بہتر ہے کہ تو ہمیں چھوڑے۔ یسوع نے جواب دیا تمہارا دل نہ گھبرائے اور نہ ڈرے کیونکہ میں وہ نہیں ہوں جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا اور وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں تو میں اللہ کے اس رسول کے لیے راستہ صاف کرنے آیا تھا جو دنیا کو نجات دلانے کے لیے قریب میں آنے والا ہے۔ مگر تم ہوشیار رہنا کہ دھوکا نہ کھا جاؤ۔ بہت سے جھوٹے نبی آئیں گے جو میرا کلام لیں گے اور میری انجیل کو نجس کریں گے۔

تب اندریاس بولا اے استاد ہمیں اس کی علامت بتا دے کہ ہم پہچانیں۔

یسوع نے جواب دیا وہ تمہارے زمانہ میں نہ آئے گا بلکہ تمہارے بعد برسوں پیچھے آئیگا۔ جب کہ میری انجیل مٹ جائے گی اور دنیا میں ۳۰ مومن بھی نہ پائے جائیں گے۔ اس وقت اللہ دنیا پر رحم کھائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے سر پر سپید عمامہ ہوگا۔ اللہ کے برگزیدہ

۱؎ یوحنا باب ۱۴ - آیت ۲۷ - ۲؎ متی باب ۲۴ - آیت ۱۱ -

بندوں میں سے ایک اس کو پہچانے گا اور اس کو عالم پر ظاہر کرے گا۔ وہ بید ینوں پر بڑی قوت کے ساتھ آئے گا۔ اور عالم سے بتوں کی پرستش مٹا دیگا - میں اس کو چھپاتا ہوں کیونکہ اس کا اعلان اُس کے واسطے سے ہوگا، اور وہی خدا کا جلال ظاہر کرے گا اور میری سچائی کھولے گا، اور ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے برتر کہیں گے۔ ..... وہ تمام انبیا سے زیادہ روشن حق کے ساتھ آئیگا اور ان لوگوں کو سخت توبیخ کریگا جو اس عالم میں بے راہ نہیں چلتے ..... پس جب بت پرستی کو زمین پر گرتے دیکھا جائے، اور اقرار کیا جائے کہ میں ایک انسان ہوں دوسرے انسانوں جیسا، تو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس وقت اللہ کا نبی آئے گا۔ (فصل ۷۲۔ آیت ۷ تا ۲۴)۔

اس کے بعد فصل ۹۶ میں مسیح اور سردار کاہن کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔ کاہن نے مسیح سے اس کی بابت پوچھا تو مسیح نے اس کو اپنا اور اپنی ماں کا نام بتایا اور کہا کہ میں بشر ہوں۔ دوسرے بنی آدم کی طرح فانی بشر۔ اس سلسلہ میں لکھا ہے:۔

"کاہن نے جواب میں کہا موسیٰ کی کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارا خدا قریب میں ہمارے لیے مسیا کو بھیجے گا جو ہم کو اس بات کی خبر دینے کے لیے آئیگا کہ اللہ کیا چاہتا ہے، اور وہ عالم کے لیے اللہ کی رحمت لے کر آئے گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تو ہم سے سچ کہدے کہ کیا تو ہی اللہ کا مسیا ہے جس کا ہم انتظار کر رہے تھے؟

یسوع نے جواب دیا، سچ ہے، اللہ نے اس کا وعدہ کیا تھا، مگر میں وہ نہیں ہوں، کیونکہ وہ مجھ سے پہلے پیدا کیا گیا اور میرے بعد آئے گا[1]۔

کاہن نے جواب میں کہا ہم تیرے کلام اور تیری نشانیوں سے یہ سمجھتے ہیں کہ بہرحال تو

---

[1] یوحنا باب ۱۔ آیت ۱۵۔

نبی اور اللہ کا قدوس ہے۔ اسی لیے میں کُل یہودیہ اور اسرائیل کے نام پر درخواست کرتا ہوں کہ تو خدا کی محبت میں ہم کو بتا دے کہ مسیا کس طرح آئے گا؟

یسوع نے جواب دیا قسم ہے اس خدا کی جس کے حضور میں میری جان حاضر ہے، میں وہ مسیا نہیں ہوں جس کا انتظار تمام قبائل زمین کر رہے ہیں جس کا وعدہ ہمارے باپ ابراہیم سے خداوند نے اس طرح کیا تھا کہ تیری نسل سے میں کُل زمین والوں کو برکت دوں گا۔ مگر جب خداوند مجھ کو اس دنیا سے لے گا، تب شیطان ایک مرتبہ پھر اس فتنہ کو بھڑکائے گا اور جو لوگ خدا سے نہیں ڈرتے وہ ان کو یہ کہنے پر آمادہ کرے گا کہ میں خدا ہوں اور خدا کا بیٹا ہوں۔ اس سبب سے میرا کلام اور جو کچھ میں سکھاتا ہوں، نجس ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ تیس ایماندار نہ پائے جائیں گے۔ تب اللہ دنیا پر رحم کھائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے لیے اس نے سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ جو قوت کے ساتھ جنوب کی طرف سے آئے گا اور بتوں کو ان کی پوجا کرنے والوں کو نابود کرے گا۔ اور شیطان سے اس کی حکومت جو اس نے آدمی پر قائم کر لی ہے، چھین لے گا۔ وہ خداوند کی رحمت کے ساتھ آئے گا خداوند پر ایمان لانے والوں کو رہائی دلائے گا اور جو کوئی اس کے کلام پر ایمان لائے گا مبارک ہوگا (آیت ۲-۱۵)

پھر فصل ۹۷ یوں شروع ہوتی ہے:۔

"حالانکہ میں اس کی جوتیوں کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں، پر میں نے خداوند سے یہ نعمت اور رحمت پائی ہے کہ اسے دیکھوں۔

تب کاہن نے حاکم اور رئیس کے ساتھ مل کر جواب میں کہا کہ اے یسوع اللہ کے قدوس اپنے دل کو پریشان نہ کر کیونکہ یہ فتنہ ہمارے زمانہ میں دوبارہ نہ اٹھے گا کیونکہ ہم ابھی رومیوں کے سرداروں کی مجلس کو لکھتے ہیں کہ فرمان جاری ہو کہ کوئی شخص تجھ کو خداوند اور خداوند کا

بیٹا نہ کہنے پائے۔ تب یسوع بولا کہ تمہارے کلام سے مجھ کو تسلی نہیں ہوتی کیونکہ جدہر سے تم روشنی کی امید رکھتے ہو ادہر ہی سے تاریکی آئے گی۔ مگر مجھ کو تسلی اس سے ہوتی ہے کہ وہ رسول آنے والا ہے جو میرے حق میں ہر جھوٹی رائے کو مٹا دے گا اور اس کا دین پھیل جائے گا اور سارے جہان پر چھا ئیگا کیونکہ خداوند نے ہمارے باپ ابراہیم سے ایسا ہی وعدہ کیا ہے۔ اور جو بات مجھ کو تسلی دیتی ہے یہ ہے کہ اس کے دین کے لیے انتہا نہیں کیونکہ اللہ اس کو ٹھیک ٹھیک محفوظ رکھیگا

کاہن نے جواب میں کہا کیا دوسرے رسول بھی اللہ کے رسول کے بعد آئیں گے

یسوع نے جواب دیا اس کے بعد سچے نبی خداوند کے بھیجے ہوئے نہ آئیں گے۔ مگر بہت سے جھوٹے نبی آئیں گے اور یہی بات ہے جو مجھے رنج دیتی ہے کیونکہ شیطان خداوند عادل کے حکم سے ان کو بھڑکائے گا پس وہ میری انجیل کے دعوے کو آڑ بنائیں گے[1]

حیدروس نے جواب میں کہا کیسی بات ہے کہ ان کافروں کا آنا خداوند عادل کے حکم سے ہوگا؟

یسوع نے جواب دیا۔ عدل یہی ہے کہ جو اس کی رحمت کے لیے حق پر ایمان نہ لائے وہ اپنی لعنت کے لیے جھوٹ پر ایمان لائے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ دنیا ہمیشہ سچے نبیوں کی تحقیر کرتی رہی اور جھوٹوں سے محبت کرتی رہی جیسا کہ میشع اور ارمیا کے زمانے میں دیکھا گیا کیوں کہ مشابہ اپنے مشابہ ہی کو پسند کرتا ہے۔

تب کاہن بولا مسیا کا نام کیا ہوگا اور وہ کیا علامت ہوگی جس کے ساتھ اس کی آمد کا اعلان ہوگا؟

[1] بعید نہیں کہ یہ اشارہ مسیح موعود بننے کی طرف ہو۔ اگر ہمارا یہ قیاس درست ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرور یہ کلام نبی صادق ہی کا ہے۔ کیونکہ اب سے صدیوں پہلے یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ کوئی مدعی مسیح موعود بننے کا دعوی کریگا۔

"یسوع نے جواب دیا کہ مسیا کا نام عجیب ہے کیونکہ خداوند نے خود ہی اس کا نام رکھا جب اس کو پیدا کیا اور آسمانی شان میں اس کو جگہ دی خداوند نے کہا ٹھیر اے محمدؐ کیونکہ تیری خاطر سے میں ارادہ کرتا ہوں کہ جنت کو اور عالم کو اور مخلوقات کے جم غفیر کو بناؤں جو سب میں تجھ کو بخش دوں گا حتیٰ کہ جو تجھے مبارک کہے گا وہی مبارک ہو گا اور جو تجھے لعنت کرے گا وہی ملعون ہو گا۔ اور جب میں تجھ کو دنیا میں بھیجوں گا تو تجھے اپنا رسول بناؤں گا تاکہ تو رہائی دلائے اور تیرا کلام صادق ہو حتیٰ کہ آسمان اور زمین کو زوال آجائے مگر تیرے ایمان کو کبھی زوال نہ آئے اس کا مبارک نام محمدؐ ہے۔

تب سب لوگ پکارنے لگے اے خداوند ہمارے لیے اپنا رسول بھیج۔ اے محمدؐ دنیا کو چھڑانے کے لیے جلدی آ" (آیت ۱۰۰۱)۔

ان بشارتوں میں صرف ایک چیز ایسی ہے جس کو دیکھ کر ایک غیر جانب دار آدمی پہلی نظر میں شبہ کرے گا کہ شاید یہ کوئی جعلی کتاب ہے وہ یہ کہ اس میں کتب آسمانی کے عام انداز کے خلاف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی نام بعینہٖ موجود ہے لیکن ذرا تامل کرنے سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے۔ بعید نہیں کہ در اصل مسیح علیہ السلام نے وہی لفظ استعمال کیا ہو جس کا ترجمہ دوسری اناجیل کے مولفین نے فارقلیط (Paraclete) کیا ہے۔ برنا باکے مولف یا مترجم نے اسی لفظ کا ترجمہ (Periclite) کیا اور بعد کے مترجمین نے یہ دیکھ کر کہ اس کا صحیح مفہوم لفظ "محمدؐ" ہے اور اس نام کے مسمیٰ میں وہ تمام صفات بھی پائی گئی ہیں جو مسیح علیہ السلام نے بیان کی ہیں، یہی لفظ استعمال کرنا مناسب سمجھا۔ پس نام کی صراحت اگر پائی جاتی ہے تو ترجمہ میں پائی جاتی ہے۔ اصل انجیل برنا باجس کے تراجم دوسری زبانوں میں ہوئے آج موجود نہیں ہے کہ اس کو دیکھ کر تحقیق کیا جا سکتا ہو کہ اس میں بھی لفظ محمد استعمال کیا گیا تھا یا اس کا ہم معنی کوئی اور لفظ

جنایات بر جائداد

اسلامی قانون ٹارٹ کا ایک اہم شعبہ

از جناب مولوی محمد غوث حسینی صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی (عثمانیہ)

[یہ اس تحقیقی مقالہ کا ایک حصہ ہے جو صاحب مقالہ نے جامعۂ عثمانیہ میں پیش کیا تھا]

الف۔ حق تملک۔ ب۔ حقوق جو بربنا ملکیت حاصل ہوتے ہیں۔ ج۔ حرمت مال غیر

۱ الف۔ حق تملک

(۱) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا۔ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا۔ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا۔ وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۔ وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ الَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا۔[۱]

---

[۱] سورۃ النساء ع ۵۔

ان آیات کریمہ کا حسب ذیل ترجمہ ہو سکتا ہے۔

"اے ایمان والو۔ ایک دوسرے کے مال آپس میں ناحق خورد برد نہ کیا کرو مگر یہ کہ آپس کی خوشی سے باہمی خرید و فروخت ہو۔ اور نہ آپس میں خون کرو اللہ کو تم پر رحم ہے۔ اور جو کوئی یہ کام تعدی اور ظلم سے کرے اس کو ہم آگ میں ڈالیں گے۔ اور یہ اللہ پر آسان ہے۔ اگر تم بری چیزوں سے جو تم کو منع ہوئی ہیں۔ بچتے رہو گے ہم تم سے تمہاری تقصیریں اتار دیں گے۔ اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کر دیں گے۔ اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اُس کی ہوس مت کرو۔ مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ اللہ کو ہر چیز معلوم ہے اور ہم نے ہر کسی کے وارث اُس مال میں ٹھیرا دئے ہیں جو ماں باپ اور قرابت والے چھوڑ مریں۔ اور جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے اُن کو ان کا حصہ پہونچاؤ۔ ہر چیز اللہ کے روبرو ہے[1]"

قرآن شریف میں اس مقام پر سب سے پہلے حرمت مالِ غیر کا ذکر ہوا ہے۔ بعد ازاں اسی سلسلہ میں بیان فرمایا ہے کہ ہر مرد اور عورت جو کچھ کمائے وہ اُسی کا حق ہے۔ اس سے حق تملک ثابت ہو گیا۔ علاوہ براں "اَمْوَالَكُمْ" میں جو ضمیر ہے اُس سے بھی حق تملک ثابت ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر آیات ذیل میں بھی حق تملک تسلیم کر لیا گیا ہے۔

۱۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔[2]

اس آیت کریمہ کے حسب ذیل معنی ہو سکتے ہیں۔

---

[1] ماخوذ از ترجمہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب و مولوی نذیر احمد صاحب۔ [2] سورۃ البقرہ ع ۳۶۔

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بعد نہ تو احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہیں کو ہے اُن کا ثواب اپنے رب کے پاس اور نہ اُن کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے"[۱]۔

(۲) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ[۲]۔

اس آیت شریف کے معنی یہ ہو سکتے ہیں۔

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ رات اور دن چھپے اور کھلے تو اُن کو ہے ان کا اجر اپنے رب کے پاس"[۳]۔

(۳) لَتُبْلَوُنَّ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ[۴]۔

یعنی "البتہ تم اپنے اموال اور اپنی جانوں میں آزمائے جاؤ گے"[۵]۔

(۴) وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ[۶]

اس آیت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔

"اور دے ڈالو یتیموں کو ان کے مال اور بدل نہ لو گندا ستھرے سے اور نہ کھاؤ اُن کے مال اپنے مالوں کے ساتھ"[۷]

ان آیات کریمہ میں مال کے ساتھ جو ضمائر استعمال فرمائے ہیں ان سے حق تملک کا صاف پتہ چلتا ہے۔ غرض اس طرح شریعت اسلامی نے دوسرے عام اساسی حقوق[۸] کے ساتھ مال یا جائداد

---

[۱] ماخوذ از ترجمہ مولٰنا شاہ عبدالقادر صاحب۔ [۲] سورۃ البقرہ ع ۳۸۔ [۳] ماخوذ از ترجمہ مولٰنا شاہ عبدالقادر صاحب [۴] آل عمران ع ۱۹۔ [۵] مولٰنا شاہ عبدالقادر صاحب۔ [۶] النساء ع ۱۔ [۷] شاہ عبدالقادر صاحب۔ [۸] مثلاً حریت، مساوات عمومی، امن عام، حفاظت خود اختیاری وغیرہ۔

کے تملک کا حق بھی تسلیم کیا ہے۔

انگریزی قانون نے بھی شخصی حقوق کے ضمن میں حق تملک کو تسلیم کیا ہے[1]۔

حق تملک کے متعین ہونے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی بنا پر کیا حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

ب۔ حقوق جو بربنا ملکیت حاصل ہوتے ہیں

انگریزی قانون نے قرار دیا ہے کہ ملکیت کی بنا پر حسب ذیل چار قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ ملکیت کی بنا پر مالک جائداد زمین یا شئے سے بلا مداخلت غیر انتفاع حاصل کر سکتا ہے۔ مالک مال کو قبضہ میں رکھ سکتا استعمال کر سکتا اور منتقل کر سکتا ہے[2]۔

۲۔ ملکیت کی بنا پر مالک جائداد اس اراضی یا شئے سے جس پر دوسرے شخص کو ملکیت حاصل ہو نفع حاصل کر سکتا اور اس کو حاصل کر سکتا یا قبضہ میں رکھ سکتا ہے[3]۔

۳۔ ملکیت کی بنا پر دوسرے شخص کے مقابلہ میں ایسا حق حاصل ہو جو صرف اس دوسرے شخص کی ذات تک محدود ہو اور اس حق کی بنا پر دوسرا شخص زمین نقدی یا کوئی اور شئے منتقل کرنے کا پابند ہے[4]۔

۴۔ حق جو کہ صنعت یا ایجاد وغیرہ کی بنا پر بلا مداخلت غیر حاصل ہوتا ہے[5]۔ موضوع مقالہ کے لحاظ سے ہمیں صرف پہلی قسم کے حق سے بحث ہے اس کے متعلق قدرے تفصیل ضروری ہے۔

جائداد چاہے منقول ہو یا غیر منقول مالک جائداد اپنی جائداد میں وسیع یا محدود حد تک ہر قسم کا تصرف کرنے کا مستحق ہے۔ مالک چاہے تو جائداد خود اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے اور غیر محدود طریقہ سے اُسے حقوق مالکانہ کا استعمال کر سکتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مالک کو آزادی حاصل ہے کہ چاہے تو اپنی جائداد بیع یا ہبہ کر دے بلکہ اس کو اختیار حاصل ہے کہ اگر اپنی خوشی ہو تو زمین اجارہ دے اور مال

---

[1] آبرس کامن لا، جلد اول صفحہ ۵ سنہ ۱۹۲۰ء　[2] Jus in Rem　[3] Jus in Realiena

[4] Jus in Personam

[5] آبرس۔ کامن لا۔ جلد اول صفحہ سنہ ۱۹۲۰ء

تلف کر دے ۔ اس سے قطع نظر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چند شخص حقوق کے ساتھ کسی مدت مقررہ کے لیے قابض
جائداد رہے غیر شخص حقوق کے ساتھ بھی قبضہ حاصل رہ سکتا ہے" یہ غیر شخص حقوق شخص بھی کر دیے
جا سکتے ہیں ۔ ان حقوق کی نوعیت اس حد تک وسیع ہے کہ کامل حقوق مالکانہ سے مشکل ہی امتیاز
امتیاز ہو سکتا ہے ۔ ان کی نوعیت اس قدر محدود بھی ہو سکتی ہے کہ محض کسی خاص مقصد سے اس کا تعلق

شریعت اسلامی میں یہ اصول مسلم ہے ۔ قرآن شریف کی جو آیات کریمہ ابتداءً باب میں نقل
کی گئی ہیں ان میں باہمی خرید و فروخت کا جو اشارہ ہے خود اس سے تصرف کا اختیار حاصل ہوا ہے اسلامی
فقہا نے طے کیا ہے کہ

"ایسی حالت میں جب کہ کسی غیر کو کوئی منازعت نہ ہو کوئی شخص اپنی مقبوضہ شئے میں تصرف
کرنے سے ممنوع نہیں قرار دیا جا سکتا[2]"

ملکیت کی جو تعریف اسلامی فقہانے کی ہے اس میں "جواز تصرف" ہی کو "ملکیت" کی اصلی خصوصیت
قرار دیا ہے[3]

اس ضمن میں قرار دیا گیا ہے ۔ کہ
دریاؤں کے پانی کا استعمال کسی خاص فرد سے مختص نہیں ہے کسی سے اجازت حاصل کرنے
کے بغیر ہر شخص پانی پی سکتا ہے ! البتہ اگر کسی نے کچھ پانی اپنے برتن میں محفوظ کر لیا ہے تو اس پر اس
شخص کو ملکیت حاصل ہو گئی ۔ اب اس میں مالک جس طرح چاہے تصرف کرنے کا مجاز ہے
بیع کر دے یا ہبہ اور چاہے تو صدقہ کے طور پر دیدے بغرض جس طرح چاہے عمل کرے[4]

[1] پولک لا آف ٹارٹس صفحہ ۳۵۲ سنہ ۱۹۲۹ء ۔ [2] فصول عمادی مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ نمبر (۱۰۱۴) فقہ
حنفی عربی فصل (۳۴) فی ما یمنع الانسان عنہ ۔ [3] شرح مجلۃ الاحکام تالیف سلیم بن رستم صفحہ ۵۵ جلد ۱
ردالمختار ۔ [4] قواعد زرکشی بحوالہ ابو حامد الاسفرائینی تعلیق صحیح بخاری صفحہ ۳۱۹ از کتاب المساقاۃ ۔ باب شرب الناس والدواب
من الانہار مطبوعہ مطبع مصطفائی دہلی سنہ ۱۳۰۵ھ

مالک کو تصرف کا جو اختیار حاصل ہے اس کو امام اعظم نے بڑی وسعت دی ہے۔ جیسا کہ انگریزی قانون میں طے کیا گیا ہے[1] امام اعظم نے قرار دیا ہے کہ

"ایسا حر آزاد شخص جو عاقل اور بالغ ہو اور اقتضائے عقل و شرع کے خلاف اپنے مال کے اتلاف و اسراف پر اتر آئے یعنی "سفیہ" ہو جائے تو اُس کو اپنے مال میں اس قسم کے تصرف سے منع نہیں کیا جائے گا۔ اپنے مال میں اس کا ہر تصرف درست ہے۔ گو یہ تصرف بے جا اسراف اور بے فائدہ و خلاف مصلحت اتلاف تک کیوں نہ پہنچ جائے۔ چاہے اپنا مال سمندر میں ڈبو دے۔ پانی میں ڈال دے۔ یا جلا ڈالے۔ جو چاہے کرے[2]"

امام شافعی نے قرار دیا ہے۔ کہ بیجا اتلاف اور بے فائدہ اسراف کی صورت میں تصرف سے ممانعت کی جا سکتی ہے[3]

لیکن واضح ہو کہ اس ممانعت کی بنا پر مسرف اپنے حقوق تملک سے محروم نہیں ہو جاتا بلکہ باغراض مصالح عامہ اس پر صرف روک پیدا کی جاتی ہے تاکہ سوسائٹی میں بے جا اسراف سے کوئی فساد حال نہ پیدا ہو۔ چنانچہ اپنے مال میں اسراف و اتلاف سے کسی قسم کے ہرجہ کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے[4]

اس سلسلہ میں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اسراف اگر امور خیر میں کیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص اپنی حیثیت سے بڑھکر خیرات کرتا اور کھانا کھلاتا یا کپڑے پہناتا ہے اور اسی طرح دوسرے وجوہ خیر میں روپیہ اڑاتا ہے تو امام شافعی نے بھی ممانعت ضروری نہیں قرار دی ہے! البتہ حرام امور میں روپیہ لگایا جائے یا مال سمندر میں ڈبو دیا جائے (یعنی خواہ مخواہ ضائع کیا جائے) یا کسی معاملہ میں دھوکہ کا اندیشہ ہو اس صورت میں حکم امتناعی جاری کیا جا سکیگا[5]۔

---

[1] پولک آف ٹارٹس ص ۳۵۲ سنہ ۱۹۲۹ء۔ [2] الہدایہ ص ۳۳۳ جلدین اخیرین کتاب الحجر۔ الجوہرۃ النیرہ ص ۲۲۵ جلد اول کتاب الحجر۔ [3] المنہاج ص ۲۷ ۔ امام محمد اور امام ابو یوسف امام شافعی سے متفق ہیں۔ ہدایہ اخیرین ص ۳۳۵ ۔ [4] القواعد الکلی۔ تحت "لا" [5] المنہاج ص ۲۸

ج۔ حرمت مالِ غیر

مال پر جو حق تملک حاصل ہے اور اس سے انتفاع کے جو حقوق حاصل ہیں ان کے متعلق یہ امر بھی واضح رہنا چاہیے کہ ان حقوق سے استفادہ میں قانون نے جو قیود اور شرائط مقرر کی ہیں ان کی پابندی کوئی مفر نہیں۔ حق تملک کیساتھ ہی ذمہ داریاں بھی پیدا ہوتی ہیں مالک جائداد پر یہ پابندی عائد ہے کہ اپنی جائداد کو اس طرح استعمال کرے اور قائم رکھے کہ ہمسایوں کے لیے یہ امر تکلیف کا موجب نہ ہو جائے[1]

اس کے ساتھ ہی تمام افراد کا یہ فرض ہے کہ مالک جائداد کے حقوق کی حرمت قائم رکھیں اور کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہ کریں جس سے اُن حقوق میں کوئی مداخلت یا دست اندازی واقع ہو۔ حقوق تملک چاہے وہ اراضی سے متعلق ہوں یا مال سے منشور اعظم کے زمانہ سے آج تک برابر قابل حفاظت قرار دیے گئے ہیں[2]۔ یہ حق جو ہر شخص کو اپنی جائداد کی حفاظت کے متعلق حاصل ہے قطعی حق ہے[3]۔ بلا قانونی وجہ جواز کے دوسرے شخص کی مملوکہ اراضی یا مال پر کسی طرح ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا[4]۔

اسلامی شریعت نے ابتدا ہی سے حقوق جائداد کی حرمت اور اس کی کامل حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ حجۃ الوداع کے یادگار موقع پر شارع علیہ السلام نے جو نہایت اہم خطبہ دیا تھا اس میں یہ بھی فرمایا ہے کہ۔

" ان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھٰذا فی بلدکم ھٰذا فی شھرکم ھٰذا (متفق علیہ)[5]

---

[1] آجرس کامن لا۔ ص۱۳ جلد اول۔ [2] الف آجرس کامن لا۔ ص۱ جلد اول۔ ب۔ تاریخ دستور انگلستان صفحہ ۹۴ سلسلۂ جامعہ عثمانیہ تالیف۔ ایف، سی، مانٹیگو۔ [3] انڈرہل لا آف ٹارٹس۔ ترجمہ بحیاتھ ص۳۳ سلسلۂ جامعہ عثمانیہ م ۱۹۲۳ء۔ [4] پولک ص۱۰ لا آف ٹارٹس ۱۹۲۹ء [5] مشکوٰۃ باب خطبۃ یوم النحر ص۲۳۲ مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ ۱۳۱۹ھ

اس بنا پر دوسروں کی جائداد پر ہر قسم کی جنایت قطعاً ممنوع ہے مخفی نہ رہے کہ دوسروں کے مال کا اتلاف، دوسروں کے مال میں دست اندازی، دوسروں کے مال کا حبس بیجا، دوسروں کی زمین پر مداخلت بے جا، ان سب جنایات سے خود قرآن شریف میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔

"ایک دوسرے کے مال آپس میں خورد برد نہ کیا کرو"[1]

اس حکم سے اتلاف مال غیر کی ممانعت صراحۃً ثابت ہے مال کا لفظ عام ہے مال منقول اور مال غیر منقول دونوں اس میں شامل ہیں۔ اس حکم سے دوسروں کے مال منقول میں دست اندازی اور مال غیر منقول میں مداخلت بے جا کی ممانعت بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس سے خورد برد کا راستہ کھلتا ہے۔ گویا کہ یہ خورد برد کا مقدمہ ہے اور مقدمہ حرام کا حرام ہوتا ہے۔

اراضی میں مداخلت بے جا کی ممانعت کے متعلق علیحدہ صراحۃً بھی احکام موجود ہیں چنانچہ ارشاد ہوا ہے

"اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور سلام کیے بغیر نہ جایا کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ شاید تم یاد رکھو۔ پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر تم کو کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس چلے جاؤ اسی میں تمہارے لئے زیادہ ستھرائی ہے۔ اور تم جو کرتے ہو اللہ جانتا ہے۔ غیر آباد مکانات جن میں تمہارا اسباب ہو اُن میں (بے اجازت) چلے جانے سے تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو کچھ تم علانیہ کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے"[2]۔

اسی طرح مال کے حبس بے جا کی ممانعت کے متعلق حکم ہوا ہے کہ

"اللہ تم کو حکم فرماتا ہے کہ پہنچاؤ امانتیں امانت والوں کو"[3]

بہر حال اسلامی فقہا نے طے کیا ہے کہ۔

---

[1] سورۃ النساء رکوع ۵۔ [2] سورۂ نور ع ۴ ترجمہ مولانا شاہ عبدالقادر و مولوی نذیر احمد صاحب۔ [3] النساء ع ۸

الف "کسی شخص کو یہ جائز نہیں ہے کہ دوسرے کی ملک میں بلا اجازت مالک کوئی تصرف کرے"[1]

ب "کسی دوسرے شخص کے مکان میں بلا اس کی اجازت کے داخل ہونا جائز نہیں ہے"[2]

ج "دوسرے کے مال میں اس کی بلا اجازت کوئی تصرف ناجائز ہے اور بلا اجازت دوسرے کے مال پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے"[3]

د "بلا سبب شرعی دوسرے کے مال کا اخذ کسی کے لیے جائز نہیں ہے"[4]

ھ "دوسرے کے مال میں تصرف کرنے کے لیے کسی کا حکم دینا شرعاً بے اثر ہے"[5]

دوسروں کے مال کی حرمت کا اسلامی شریعت نے جس حد تک لحاظ کیا ہے اس کے متعلق بعض مثالوں کا ذکر بے موقع نہیں ہے۔

۱۔ "میت کے دفن کے بعد بلا عذر قبر سے اس کا نکالنا درست نہیں ہے۔ چاہے دفن پر زیادہ عرصہ گذرا ہو یا کم البتہ کسی عذر کی بنا پر میت کو نکالا جا سکتا ہے۔ عذر یہ ہو سکتا ہے کہ زمین کا مغصوب ہونا ظاہر ہو جائے"[6]

۲۔ کسی غیر کی زمین پر بغیر اجازت مالک کوئی مردہ دفن کر دیا جائے تو مالک کو دو باتوں کا اختیار ہے

الف۔ چاہے تو مردے کو نکالنے پر اصرار کرے۔

ب۔ یا چاہے تو زمین ہموار کر کے اس پر حقوق مالکانہ کا استعمال کرے مثلاً وہ چاہے تو زراعت کر سکتا ہے یہ اس بنا پر کہ سطح کے اوپر اور نیچے مالک کی ملکیت ثابت ہے اور مالک کو اختیار ہے کہ چاہے تو اوپر اور نیچے جو شئے انتفاع حقوق میں حارج ہے اس کو دور کر دے اور یا چاہے تو نیچے جو شئے انتفاع حقوق میں حارج ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے اور سطح کے اوپر اپنے حقوق

---

[1] مادہ ۹۶ مجلۃ الاحکام۔ [2] الدر المختار ص ۱۶۳ جلد ۵ م مصر ۱۲۹۹ ء [3] الدر المختار ص ۱۴۲ م مصر ۱۲۹۹ ہجری [4] مجلۃ الاحکام مادہ ۹۷۔ [5] مجلۃ الاحکام مادہ ۹۵ [6] فتاوی حمادیہ ص ۵۱ و ص ۵۲ م کلکتہ

سے منتفع ہونے کا سامان فراہم کرے[1]۔

۲۔ بھوک سے مجبور ہوکر جبکہ مردار بھی حلال ہے کوئی شخص اگر دوسرے کے مال سے اس کی بلااجازت کچھ کھالے تو ذمہ داری عائد ہوگی اضطرار کی بناء پر دوسرے کا حق بے اثر نہیں ہوجاتا[2]۔

۴۔ ذہاب مال کا خوف ہو تو نماز کا توڑ دینا مباح ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے سواری کا جانور کرایہ پر لیا تاکہ اس پر سواری کرکے کہیں جائے۔ راستہ میں نماز کیلئے ٹھیر گیا اور نماز میں مشغول ہوگیا۔ اس اثنا میں جانور کہیں چلا گیا یا کوئی شخص اس کو لے بھاگنے پر اترآیا اگر نماز نہ توڑی جائے تو ذمہ داری عائد ہوگی اور ہرجاوا کرنا پڑے گا[3]۔

۵۔ امام کو یہ حق نہیں ہے کہ حق ثابت و معروف کے بغیر کسی کے قبضہ سے کوئی شئے نکال لے[4]۔

اس ساری بحث سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ حرمت مال غیر کے متعلق اسلامی شریعت نے وہ سارے حقوق تسلیم کیے ہیں جو ایک متمدن قوم کو امن کی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ امر مخفی نہ رہے کہ اپنی ملکیت میں کوئی ایسا تصرف کہ اس سے ہمسایہ کو ضرر فاحش ہو ممنوع ہے[5]۔ اس بنا پر کہ

"مفاسد کو دور کرنا منافع حاصل کرنے سے اولیٰ ہے[6]"

"شریعت میں منہیات کا اعتنا ماموراتِ کے اعتنا سے زیادہ ہے[7]"۔

مختصر یہ کہ حق تملک، حقوق جو بربنائے ملکیت حاصل ہوتے ہیں اور حرمت مال غیر کے متعلق جو اصول انگریزی عصری قانون نے طے اور تسلیم کیے ہیں وہ اصول شریعت اسلامیہ میں اس کی ابتداء سے ہی مسلم ہیں۔

---

[1] فتاوای حاویہ ص۲۰۵۔ [2] مجلۃ الاحکام مادہ ۳۳۔ [3] الاشباہ والنظائر۔ ملاحظہ ہو اتحاف الابصار تبویب الاشباہ ص۲۰۳ م مصر۔ [4] اتحاف الابصار ص۲۱۹۔ [5] مجلۃ الاحکام مادہ ۳۰۔ [6] ایضاً ۳۰۔ [7] ایضاً ۳۰۔

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں اسلامی تعلیم

اشاعت گذشتہ میں سبیل اشارات اُس مجلس کا تذکرہ کیا گیا تھا جو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں دینیات اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کو ضروریات زمانہ کے مطابق ڈھالنے کے لیے تہیداً مقرر کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے اختصار کے ساتھ یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی پر نقد کرتے ہوئے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اس میں بنیادی نقص کیا ہے، اور حقیقی اصلاح کے لیے نظام تعلیم کس ڈھنگ پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر بعد میں ہم نے محسوس کیا کہ محض چند اشارات سے کام نہ چلے گا جس تخیل کو ہم پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے اکثر تعلیمی رہنماؤں کے ذہن سے ابھی بہت دور ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کے سامنے پوری تفصیل کے ساتھ موجودہ طرز تعلیم کے اساسی نقائص پیش کیے جائیں اور انھیں بتایا جائے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کو حقیقت میں "اسلامی" تعلیم بنانے کی صحیح صورت کیا ہے اس غرض کے لیے ہم نے ایک مفصل بیان مرتب کر کے یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ وہ اسے "مجلس اصلاح تعلیم دینی" کے سامنے پیش کر دیں۔ چونکہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے تمام ارباب تعلیم کے لیے لائق غور و فکر ہے، اس لئے ہم اس کو شائع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ناظرین ہمارے اس بیان کو ملاحظہ فرمائیں۔ یونیورسٹی کے موجودہ نصاب دینیات پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ ہمارے مقاصد کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ نیز ان سوالات کو بھی پیش نظر رکھیں، جو اس نصاب کے متعلق بعض ارکان مجلس کی جانب سے بھیجے گئے ہیں۔ (ایڈیٹر)۔

نصاب دینیات مسلم یونیورسٹی بابت ۱۹۳۷ء

ہائی اسکول کے لیے

سنی دینیات۔ (۱) ابواب قدوری۔ (۲) العقیدۃ الحسنہ۔ (۳) لکچر اسلامی اخلاق۔

شیعہ دینیات۔ (۱) اخبار المعصومین۔ (۲) سورۂ جمعہ، سورۂ لقمان، سورۂ منافقون (ترجمہ مولوی فرمان علی صاحب مع تشریح)۔

۲۔ انٹرمیڈیٹ کے لیے

سنی دینیات۔ (۱) تاریخ آغاز اسلام۔ (۲) فقہ۔ جامع صغیر۔ (۳) اخلاق۔ کتاب الحقوق و کتاب العبادات

شیعہ دینیات۔ (۱) تذکرۃ المعصومین (۲) رسالۂ جعفریہ۔ (۳) باب الزکوٰۃ والخمس از جامع عباسی۔

۳۔ بی۔ اے۔ اور بی ایس سی کے لیے

سنی دینیات۔ (۱) فقہیہ ابواب ہدایہ (نکاح۔ محرمات۔ کفو۔ ولایت۔ طلاق۔ خلع۔ مہر۔ وقف۔ ہبہ۔ وصیت۔ شفعہ) کتاب الطہارت۔ کتاب الصلوٰۃ (۲) تاریخ القرآن (۳) عقیدۃ احسنہ شاہ ولی اللہ صاحب مع شرح و ایضاح

شیعہ دینیات۔ سراج المبین حصہ اول۔ سوانح عمری حضرت علی۔ عقائد شیخ صدوق۔ فقہ۔ نکاح، تجارت، میراث، طلاق، وقف، ہبہ، شفعہ، وصیت، از جامع عباسی۔

دینیات کے مخصوص امتحانات

۱۔ دینیات کا تکمیلی نصاب برائے بی۔ اے۔ (جونیر) بی۔ اے (سینیر)۔

(۱) نیز اصلی طلبہ میں عبارت کو روانی کے ساتھ پڑھنے اور اس کا ترجمہ کرنے اور اس کی تشریح کرنے کی اچھی استعداد ہونی چاہیے

۲۔ بی۔ ٹی۔ ایچ کے لیے

ابتدائی امتحان۔ (۱) القرآن و اصول التفسیر (سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران) فوز الکبیر (۲) حدیث و اصول حدیث۔ بلوغ المرام، نخبۃ الفکر (۳) فقہ ہدایہ جلد اول تا کتاب الحج (۴) فرائض۔ سراجیہ

آخری امتحان۔ (۱) القرآن (سورۃ النساء تا آخر سورۃ البروج)۔ (۲) حدیث۔ تجرید البخاری (۳) فقہ۔ ہدایہ۔ (از کتاب النکاح تا آخر باستثناء نکاح الرقیق و کتاب العتاق) (۴) اصول فقہ۔ منار

امیدوار کو مجمع عام میں خطبہ بھی دینا ہوگا اگر ممتحنین اس کی ضرورت سمجھیں۔

۳۔ ایم ٹی ایچ کے لیے

(۱) القرآن (از سورۂ یونس تا آخر سورۂ احقاف) (۲) تفسیر۔ تفسیر مظہری (سورۂ بقرہ و آل عمران) تفسیر کشاف (جزء ۲۶ تا ۳۰ مع سورۂ فاتحہ) (۳) حدیث جامع ترمذی۔ (۴) اصول حدیث مقدمہ ابن صلاح۔ (۵) فقہ۔ ہدایہ آخیرین۔ (باستثناء کتاب المکاتب۔ کتاب الولاء۔ کتاب الماذون۔ کتاب الجنایات۔ کتاب المعاقل۔ کتاب الخنثیٰ۔ کتاب الدیات)۔ (۶) اصول فقہ۔ ارشاد الفحول۔ (۷) عقائد۔ شرح عقائد نسفی۔ الحجۃ اللہ البالغہ (جزو اول)۔

برائے مطالعہ۔ تفسیر مفتی عبدہٗ مصری۔

امیدوار کو مجمع عام میں خطبہ بھی دینا ہوگا۔

سوالات منجانب ارکان مجلس اصلاح تعلیم دینی

مذکورۂ بالا نصاب کے متعلق مجلس کے ارکان میں سے سر محمد یعقوب، ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے جدا جدا چند سوالات مرتب کئے ہیں جنہیں ہندوستان کے مسلم اداروں، سربرآوردہ علماء، یونیورسٹی کورٹ کے ارکان اور مسلم اخبارات کے پاس بغرض حصول جوابات بھیجا گیا ہے۔

سوالات مرتبۂ سر محمد یعقوب:۔

(۱) مسلم یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم کا موجودہ طریقہ حسب ذیل ہے۔ کیا آپ کے خیال میں

طرز تعلیم قابل اطمینان ہے؟۔

۲۔ مغربی سائنس اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے سے طلبہ کے دلوں میں مذہب کی طرف سے جو شکوک اور بے اعتنائی پیدا ہوجاتی ہے، کیا مسلم یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم دینیات ان کے رفع کرنے کے واسطے کافی ہے؟

۳۔ اگر موجودہ تعلیم دینیات کافی اور قابل اطمینان نہیں ہے تو آپ کی رائے کے مطابق اس میں کیا اور کس قسم کی تبدیلی ہونی چاہیے؟

۴۔ مسلم یونیورسٹی اسکول میں دینیات کی تعلیم کس طرح ہونی چاہیے اور کیا مضامین اسکول کے طلبہ کو پڑھانے چاہئیں؟

(۵) مسلم یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد تعلیم دینیات کس زبان میں ہونی چاہیے، انگریزی میں یا اردو میں؟

(۶) کیا آپ کچھ کتابوں کے نام بتا سکتے ہیں جو مسلم یونیورسٹی میں نصاب تعلیم دینیات میں داخل کیجا سکیں؟

(۷) اگر انگریزی میں دینیات کی تعلیم دینا آپ کی رائے میں مناسب ہو تو اس کے نصاب کے واسطے کتابوں کے مہیا کرنے کے واسطے آپ کی کیا رائے ہے؟

(۸) کیا آپ کی رائے میں یہ مفید ہوگا کہ علاوہ کتابی تعلیم کے مسلم یونیورسٹی میں اہم مسائل پر جید علماء کے لکچر ہوا کریں؟ کیا آپ کچھ ایسے اشخاص کے نام بتا سکتے ہیں جو اس قسم کے لکچر دے سکیں؟

(۹) سنی اور شیعہ طلبہ کی تعلیم کہاں تک علیحدہ علیحدہ دیجائے اور کس حد پر پہنچنے کے بعد طلبہ کی دینیات کی تعلیم مشترک ہوجائے؟

(۱۰) مسلم یونیورسٹی میں اس وقت دینیات میں ایک ڈگری دیجاتی ہے جس کا نام بی ٹی ایچ ہے۔ اس کا کورس حسب ذیل ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس ڈگری کا قائم رکھنا یونیورسٹی کے واسطے مفید اور ضروری ہے؟ اور اگر ہے تو اس کا موجودہ نصاب تعلیم مناسب ہے یا تبدیلی کی ضرورت ہے؟ اگر تبدیلی کی ضرورت ہے تو کس قسم کی؟

سوالات مرتبہ ڈاکٹر عبدالجبار خیری :-

(۱) اسلامک اسپرٹ (Islamic Spirit) سے کوئی محدود (Definite) مراد ہے جس کی جامعہ میں ضرورت ہے؟ مفہوم معین کیا جائے۔

(۲) اسلام کیا ہے؟ اسلام کا کیا مقصد ہے؟ اسلام کا مقصد کس طرح سے حاصل ہو سکتا ہے؟

سوالات مرتبہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی:

۱۔ طلبہ کے عقائد پر اصل حملہ مغربی علوم اور مغربی فنون کا ہوتا ہے اور اصلی ضرورت انہی حملوں سے ان کے عقائد اسلامی کے تحفظ کی ہے۔ نصاب تعلیم کو براہ کرم اس نقطۂ نظر سے جانچیے اور ارشاد فرمایئے کہ جناب کے خیال میں اس خاص مقصد کے لیے نصاب میں کیا کیا ترمیمات مناسب ہوں گی؟

بیان منجانب ایڈیٹر ترجمان القرآن

مسلم یونیورسٹی کورٹ اس امر پر تمام مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اپنے ادارہ کے بنیادی مقصد، یعنی مسلمان طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی طرف توجہ کی، اور اس کو روبعمل لانے کے لئے آپ کی مجلس کا تقرر کیا۔ اس سلسلہ میں جو کاغذات یونیورسٹی کے دفتر سے بھیجے گئے ہیں، ان کو میں نے پورے غور و خوض کے ساتھ دیکھا۔ جہاں تک دینیات اور علوم اسلامیہ کے موجودہ طریق تعلیم کا تعلق ہے اس کے ناقابل اطمینان ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جو نصاب اس وقت پڑھایا جارہا ہے وہ یقیناً ناقص ہے لیکن مجلس کے معزز ارکان کی جانب سے جو سوالات مرتب کیے گئے ہیں، ان کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مجلس کے پیش نظر صرف ترمیم نصاب کا سوال ہے، اور غالباً یہ سمجھا جارہا ہے کہ چند کتابوں کو خارج کرکے چند دوسری کتابیں رکھ دینے سے طلبہ میں "اسلامی اسپرٹ" پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو میں کہوں گا کہ یہ اصلی صورت حال کا بہت ہی نامکمل اندازہ ہے۔

دراصل ہم کو اس سے زیادہ گہرائی میں جاکر یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن، حدیث، فقہ، اور عقائد کی اس تعلیم کے باوجود، جو اس وقت دی جاری ہے، طلبہ میں "حقیقی اسلامی اسپرٹ" پیدا نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اگر محض موجودہ نصاب دینیات کا نقص ہی اس کی وجہ ہے تو اس نقص کو دور کر دینا بلاشبہ اس خرابی کو رفع کر دینے کے لیے کافی ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کے اسباب زیادہ وسیع ہیں، اگر آپ کی پوری تعلیمی پالیسی میں کوئی اساسی خرابی موجود ہے، تو اصلاح حال کے لیے محض نصاب دینیات کی ترمیم ہرگز کافی نہ ہوگی۔ اس کے لیے آپ کو اصلاحات کا دائرہ زیادہ وسیع کرنا ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی محنت طلب اور مشکلات سے لبریز ہو۔ میں نے اس مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے۔ اور جن نتائج پر میں پہنچا ہوں انھیں امکانی اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

میرا یہ بیان تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلے حصہ میں یونیورسٹی کی موجودہ تعلیمی پالیسی پر تنقیدی نظر ڈال کر اس کی اساسی خرابیوں کو واضح کیا جائیگا اور بتایا جائیگا کہ مسلمان قوم کے حقیقی مفاد کے لیے اب ہماری تعلیمی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ دوسرے حصے میں اصلاحی تجاویز پیش کی جائیں گی۔ اور تیسرے حصہ میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر سے بحث کی جائے گی۔

(۱)

اس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طریق تعلیم رائج ہے وہ تعلیم جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔ دو بالکل متضاد اور بے جوڑ تعلیمی عنصروں کو جوں کا توں لے کر ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی گئی کہ ایک مرکب علمی قوت بن کر کسی ایک کلچر کی خدمت کر سکیں۔ یکجائی و اجتماع کے باوجود یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر، خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے تو

یہ کہنا پڑے گا کہ تعلیم میں اس قسم کے متباین اور متناقض عناصر کی آمیزش اصلاً غلط ہے، اور اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ آمیزش اور بھی زیادہ قباحت کا سبب بن گئی ہے، کیونکہ اول تو خود آمیزش ہی درست نہیں، پھر اس پر مزید خرابی یہ ہے کہ یہ آمیزش بھی مساویانہ نہیں ہے۔ اس میں مغربی عنصر بہت طاقت ور ہے اور اسلامی عنصر اس کے مقابلہ میں نہایت کمزور ہے۔ مغربی عنصر کو پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہے کہ وہ ایک عصری عنصر ہے جس کی پشت پر رفتار زمانہ کی قوت اور ایک عالمگیر حکمران تمدن کی طاقت ہے۔ اس کے بعد وہ ہماری یونیورسٹی کی تعلیم میں ٹھیک اسی شان اور اسی طاقت کے ساتھ شریک کیا گیا ہے جس کے ساتھ وہ ان یونیورسٹیوں میں ہے اور ہونا چاہیے جو مغربی کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ یہاں مغربی علوم و فنون کی تعلیم اس طور پر دی جاتی ہے کہ ان کے تمام اصول اور نظریات مسلمان لڑکوں کی صاف اور سادہ لوحِ دل پر ایمان بن کر ثبت ہو جاتے ہیں، اور ان کی ذہنیت کلیۃً مغربی سانچے میں ڈھل جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ مغربی نظر سے دیکھنے اور مغربی دماغ سے سوچنے لگتے ہیں، اور یہ اعتقاد ان پر مسلط ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی چیز معقول اور با وقعت ہے تو وہی ہے جو مغربی علم و حکمت کے اصول و مبادی سے مطابقت رکھتی ہو۔ پھر ان تاثرات کو مزید تقویت اُس تربیت سے پہنچتی ہے جو ہماری یونیورسٹی میں عملاً دی جا رہی ہے۔ لباس، معاشرت، آداب و اطوار، رفتار و گفتار، کھیل کود، غرض کونسی چیز ہے جس پر مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی رجحانات کا غلبہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی کا ماحول اگر پورا نہیں تو ۹۵ فی صدی یقیناً مغربی ہے اور ایسے ماحول کے جو اثرات ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں ان کو ہر صاحب نظر خود سمجھ سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی عنصر نہایت کمزور ہے۔ اول تو وہ اپنی تمدنی و سیاسی طاقت کھو کر ویسے ہی کمزور ہو چکا ہے۔ پھر ہماری یونیورسٹی میں اس کی تعلیم جس انداز سے دی جاتی

سے دی جاتی ہے وہ زمانے سے صدیوں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی زبان اور ترتیب و تدوین ایسی نہیں جو عصری دماغوں کو اپیل کر سکے۔ اس میں اسلام کے ابدی اصولوں کو جن حالات اور جن عملی مسائل پر منطبق کیا گیا ہے ان میں سے اکثر اب درپیش نہیں ہیں، اور جو اب درپیش ہیں ان پر ان اصولوں کو منطبق کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مزید براں اس تعلیم کی پشت پر کوئی تربیت کوئی زندہ ماحول، کوئی عملی برتاؤ اور چلن بھی نہیں۔ اس طرح مغربی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم کی آمیزش اور بھی زیادہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ ایسی نامساوی آمیزش کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کے دل و دماغ پر مغربی عنصر پوری طرح غالب آ جائے اور اسلامی عنصر محض ایک سامان مضحکہ بننے کے لیے رہ جائے یا زیادہ سے زیادہ اس لیے کہ زمانۂ ماضی کے آثار باقیہ کی طرح اس کا احترام کیا جائے۔

میں اپنی صاف گوئی پر معافی کا خواستگار ہوں مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس کو بے کم و کاست بیان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیوی تعلیم بحیثیت مجموعی بالکل ایسی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سر تا پا غیر مسلم بناتے ہیں، پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دیدیتے ہیں، تاکہ آپ پر اسے غیر مسلم بنانے کا الزام عائد نہ ہو، اور اگر وہ اس بستہ کو اٹھا کر پھینک دے (جس کی وجہ دراصل آپ ہی کی تعلیم ہوگی) تو وہ خود ہی اس فعل کے لیے قابل الزام قرار پائے۔ اس طرز تعلیم سے اگر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ مسلمان پیدا کرے گا تو یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ معجزے اور خرق عادت کے متوقع ہیں، کیونکہ آپ نے جو اسباب مہیا کیے ہیں ان سے قانون طبیعی کے تحت تو یہ نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ فی صدی ایک یا دو چار طالب علموں کا مسلمان (کامل اعتقادی و عملی مسلمان) رہ جانا کوئی حجت نہیں۔ یہ آپ کی یونیورسٹی کے فیضان تعلیم و تربیت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت ہے کہ جو اس فیضان سے اپنے ایمان و اسلام کو بچا لے گیا وہ دراصل فطرت ابراہیمی پر پیدا ہوا تھا۔ ایسے مستثنیات جس طرح علیگڈھ کے فارغ التحصیل

اصحاب میں پائے جاتے ہیں' اسی طرح ہندوستان کی سرکاری یونیورسٹیوں' بلکہ یورپ کی یونیورسٹیوں کے متخرجین میں بھی مل سکتے ہیں جن کے نصاب میں سرے سے کوئی اسلامی عنصر ہے ہی نہیں۔

اب اگر آپ ان حالات اور اس طرز تعلیم کو بعینہٖ باقی رکھیں اور محض دینیات کے موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقتور نصاب شریک کردیں تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیت کی کشمکش زیادہ شدید ہوجائے گی۔ ہر طالب علم کا دماغ ایک رزمگاہ بن جائے گا جس میں یہ دو طاقتیں پوری قوت کے ساتھ جنگ کریں گی، اور بالآخر آپ کے طلبہ تین مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

ایک وہ جن پر فرنگیت غالب رہے گی، عام اس سے کہ وہ انگریزیت کے رنگ میں ہو، یا ہندی وطن پرستی کے رنگ میں یا ملحدانہ اشتراکیت کے رنگ میں۔

دوسرے وہ جن پر اسلامیت غالب رہے گی، خواہ اس کا رنگ گہرا ہو یا فرنگیت کے اثر سے پھیکا پڑجائے۔

تیسرے وہ جو نہ پورے مسلمان ہوں گے نہ پورے فرنگی۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ نتیجہ بھی کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں۔ نہ خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے اس اجتماع نقیضین کو مفید کہا جاسکتا ہے، اور نہ قومی نقطۂ نظر سے ایسی یونیورسٹی اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرسکتی ہے جس کے نتائج کا ۲/۳ حصہ قومی مفاد کے خلاف اور قومی تہذیب کے لیے نقصان کا کا مترادف ہو کم از کم مسلمانوں کی سی غریب قوم کے لیے تو یہ سودا بہت ہی مہنگا ہے کہ وہ لاکھوں روپے کے خرچ سے ایک ایسی ٹکسال جاری رکھے جس میں سے ۳۳ فی صدی سکے تو مستقل طور پر کھوٹے نکلتے رہیں، اور ۳۳ فی صدی ہمارے خرچ پر تیار ہوکر غیروں کی گود میں ڈال دئے جائیں، بلکہ بالآخر خود ہمارے خلاف استعمال ہوں۔

مذکورۂ بالا بیان سے دو باتیں اچھی طرح واضح ہو جاتی ہیں :-

اولاً، تعلیم میں متضاد عناصر کی آمیزش اصولی حیثیت سے غلط ہے۔

ثانیاً، اسلامی مفاد کے لیے بھی ایسی آمیزش کسی طرح مفید نہیں، خواہ وہ اُسی قسم کی غیر مساوی آمیزش ہو جیسی اب تک رہی ہے، یا مساوی کر دی جائے، جیسا کہ اب کرنے کا خیال کیا جا رہا ہے۔

ان امور کی توضیح کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی اب کیا ہونی چاہیے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر یونیورسٹی کسی نہ کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو، نہ آج تک دنیا کی کسی درسگاہ میں دی گئی ہے، نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر درسگاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اُس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کس کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہے؟ اگر وہ مغربی کلچر ہے تو اس کو مسلم یونیورسٹی نہ کہیے، نہ اس میں دینیات کا ایک نصاب رکھ کر خواہ مخواہ طالب علموں کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کیجیے۔ اور اگر وہ اسلامی کلچر ہے تو آپ کو اپنی یونیورسٹی کی پوری ساخت بدلنی پڑے گی اور اس کی ہیئت ترکیبی کو ایسے طرز پر ڈھالنا ہوگا کہ وہ بحیثیت مجموعی اس کلچر کے مزاج اور اس کی اسپرٹ کے مناسب ہو، اور نہ صرف اس کا تحفظ کرے، بلکہ اس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اچھی طاقت بن جائے۔

جیسا کہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ، موجودہ حالت میں تو آپ کی یونیورسٹی اسلامی کلچر کی نہیں بلکہ مغربی کلچر کی خادم بنی ہوئی ہے اس حالت میں اگر صرف اتنا تغیر کیا جائے کہ دینیات کے

موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقتور کر دیا جائے اور تعلیم و تربیت کے باقی تمام شعبوں میں پوری مغربیت برقرار رہے تو اس سے بھی یہ درسگاہ اسلامی کلچر کی خادم نہیں بن سکتی۔ اسلام کی حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات خود بخود آپ پر منکشف ہو جائیگی کہ دنیوی تعلیم و تربیت اور دینی تعلیم کو الگ الگ کرنا اور ایک دوسرے سے مختلف رکھ کر ان دونوں کو یکجا جمع کر دینا بالکل لا حاصل ہے۔ اسلام مسیحیت کی طرح کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جس کا دین دنیا سے الگ کوئی چیز ہو۔ وہ دنیا کو دنیا والوں کے لئے چھوڑ کر صرف اعتقادیات اور اخلاقیات کی حد تک اپنے دائرے کو محدود نہیں رکھتا اس لئے مسیحی دینیات کی طرح اسلام کے دینیات کو دنیویات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا اصل مقصد انسان کو دنیا میں رہنے اور دنیا کے معاملات انجام دینے کے لئے ایک ایسے طریقہ پر تیار کرنا ہے جو اس زندگی سے لیکر آخرت کی زندگی تک سلامتی عزت اور برتری کا طریقہ ہے اس غرض کے لئے وہ اس کی نظر و فکر کو درست کرتا ہے اس کے اخلاق کو سنوارتا ہے اس کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے، اس کے لیے حقوق و فرائض معین کرتا ہے۔ اور اس کو اجتماعی زندگی کا ایک خاص نظام وضع کر کے دیتا ہے۔ افراد کی ذہنی و عملی تربیت، سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور زندگی کے تمام شعبوں کی ترتیب و تعدیل کے باب میں اس کے اصول و ضوابط سب سے الگ ہیں، انہی کی بدولت اسلامی تہذیب ایک جداگانہ تہذیب کی شکل اختیار کرتی ہے، اور مسلمان قوم کا بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا انہی کی پابندی پر منحصر ہے پس جب حال یہ ہے تو "اسلامی دینیات" کی اصطلاح بے معنی ہو جاتی ہے اگر زندگی اور اس کے معاملات سے اس کا ربط باقی نہ رہے۔ اسلامی کلچر کے لیے عالم دین بیکار ہے جو اسلام کے عقائد اور اصول سے تو واقف ہے مگر ان کو لے کر علم و عمل کے میدان میں بڑھنا اور زندگی کے دائم التغیر احوال و مسائل میں ان کو برتنا نہیں جانتا۔ اسی طرح اس کلچر کے لیے وہ عالم دنیا بھی بیکار ہے جو دل میں تو اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے مگر دماغ سے غیر اسلامی طریق پر سوچتا ہے معاملات کو غیر اسلامی نظر سے دیکھتا ہے اور زندگی کو غیر اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اسلامی تہذیب

کے زوال اور اسلامی نظام تمدن کی ابتری کا اصل سبب یہی ہے کہ ایک مدت سے ہماری قوم میں صرف انہی دو قسموں کے عالم پیدا ہو رہے ہیں، اور دنیوی علم و عمل سے علم دین کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلامی کلچر پھر سے جوان ہو جائے اور زمانہ کے پیچھے چلنے کے بجائے آگے چلنے لگے، تو اس ٹوٹے ہوئے ربط کو پھر قائم کیجیے۔ مگر اس کو قائم کرنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ دینیات کے نصاب کو جسم تعلیمی کی گردن کا قلادہ یا کمر کا پشتارہ بنا دیا جائے۔ نہیں۔ اس کو پورے نظام تعلیم و تربیت میں اس طرح اتار دیجیے کہ وہ اس کا دوران خون، اس کی روح رواں، اس کی بینائی و سماعت، اس کا احساس و ادراک، اس کا شعور و فکر بن جائے، اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جز بناتا چلا جائے۔ اس طرح آپ مسلمان فلسفی، مسلمان سائنس دان، مسلمان ماہرین معاشیات، مسلمان مقنن، مسلمان مدبرین، غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہر پیدا کر سکیں گے، جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کریں گے، تہذیب حاضر کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے تہذیب اسلامی کی خدمت لیں گے اور اسلام کے افکار و نظریات اور قوانین حیات کو روح عصری کے لحاظ سے از سر نو مرتب کریں گے۔ یہاں تک کہ اسلام از سر نو علم و عمل کے ہر میدان میں اسی امامت و رہنمائی کے مقام پر آ جائیگا جس کے لیے وہ درحقیقت دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

یہ ہے وہ تخیل جو مسلمانوں کی جدید تعلیمی پالیسی کا اساسی تخیل ہونا چاہیے۔ زمانہ اس مقام سے بہت آگے نکل چکا ہے جس پر سرسید ہم کو چھوڑ گئے تھے۔ اگر اب زیادہ عرصہ تک ہم اس پر قائم رہے تو بحیثیت ایک مسلم قوم کے ہمارا ترقی کرنا تو درکنار، زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔

(۲)

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اوپر جس تعلیمی پالیسی کا ہیولیٰ میں نے پیش کیا ہے اس کو

صورت کا لباس کس طرح پہنایا جاسکتا ہے۔

(۱) مسلم یونیورسٹی کے حدود میں "فرنگیت" کا کلی استیصال کر دینا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی قومی تہذیب کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا نہیں چاہتے، تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی نئی نسلوں میں "فرنگیت" کے ان روز افزوں رجحانات کا سدباب کریں۔ یہ رجحانات دراصل غلامانہ ذہنیت اور باطنی احساس ونائت (Inferiority Complex) کی پیداوار ہیں پھر جب ان کا عملی ظہور لباس، معاشرت، آداب و اطوار اور بحیثیت مجموعی پورے اجتماعی ماحول میں ہوتا ہے تو یہ ظاہر اور باطن دونوں طرف سے نفس کا احاطہ کر لیتے ہیں، اور اس میں شرف قومی کا رمق برابر احساس بھی نہیں چھوڑتے۔ ایسے حالات میں اسلامی تہذیب کا زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے۔ کوئی تہذیب محض اپنے اصولوں اور اپنے اساسی تصورات کے مجرّد ذہنی وجود سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ عملی برتاؤ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے نشوونما پاتی ہے۔ اگر عملی برتاؤ مفقود ہو جائے تو تہذیب اپنی طبعی موت مر جائے گی، اور اس کا ذہنی وجود بھی برقرار نہ رہ سکے گا پس سب سے مقدم اصلاح یہ ہے کہ یونیورسٹی میں ایک زندہ اسلامی ماحول پیدا کیا جائے۔ آپ کی تربیت ایسی ہونی چاہیے جو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی قومی تہذیب پر فخر کرنا سکھائے۔ ان میں اپنی قومی خصوصیات کا احترام بلکہ عشق پیدا کرے، ان میں اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کی روح پھونک دے، اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے علم اور اپنی تربیت یافتہ ذہنی صلاحیتوں سے اپنے قومی تمدن کو شائستگی کے بلند مدارج کی طرف لے چلیں۔

(۲) اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا انحصار بڑی حد تک معلمین کے علم و عمل پر ہے۔ جو علم خود اس روح سے خالی ہیں، بلکہ خیال اور عمل دونوں میں اس کے مخالف ہیں ان کے زیر اثر رہ کر متعلمین میں اسلامی اسپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ محض عمارت کا نقشہ بنا سکتے ہیں، مگر اصلی معمار آپ نہیں

آپ کے تعلیمی اسٹاف کے ارکان ہیں۔ "فرنگی" معماروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ اسلامی طرز تعمیر پر عمارات بنائیں گے، کریلے کی بیل سے خوشۂ انگور کی امید رکھنا ہے۔ محض دینیات کے لیے چند "مولوی" رکھ لینا ایسی صورت میں بالکل فضول ہوگا جبکہ دوسرے تمام یا اکثر علوم کے پڑھانے والے غیر مسلم یا ایسے مسلمان ہوں جن کے خیالات غیر اسلامی ہوں کیونکہ وہ زندگی اور اس کے مسائل اور معاملات کے متعلق طلبہ کے نظریات اور تصورات کو اسلام کے مرکز سے پھیر دیں گے، اور اس زہر کا تریاق محض دینیات کے کورس سے فراہم نہ ہو سکے گا۔ لہذا خواہ کوئی فن ہو، فلسفہ ہو یا سائنس، یا معاشیات یا قانون، یا کوئی اور، مسلم یونیورسٹی میں اس کی پروفیسری کے لیے کسی شخص کا محض ماہر فن ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پورا اور پکا مسلمان ہو۔ اگر مخصوص حالات میں کسی غیر مسلم ماہر فن کی خدمات حاصل کرنی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن عام قاعدہ یہی ہونا چاہیے کہ ہماری یونیورسٹی کے پروفیسر وہ لوگ ہوں جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ یونیورسٹی کے اساسی مقصد یعنی اسلامی کلچر کے لیے خیالات اور اعمال دونوں کے لحاظ سے مفید ہوں۔

(۳) یونیورسٹی کی تعلیم میں عربی زبان کو بطور ایک لازمی زبان کے شریک کیا جائے۔

یہ ہماری کلچر کی زبان ہے اسلام کے ماخذ اصلیہ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن اور سنت تک بلا واسطہ دسترس حاصل نہ کریگا اسلام کی روح کو نہ پاسکے گا نہ اسلام میں بصیرت حاصل کر سکے گا۔ وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا، اور اس طرح آفتاب کی روشنی اس کو براہ راست آفتاب سے کبھی نہ مل سکے گی، بلکہ مختلف قسم کے رنگین آئینوں کے واسطے ہی سے ملتی رہیگی۔ آج ہمارے جدید تعلیمیافتہ حضرات اسلامی مسائل میں ایسی ایسی غلطیاں کر رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی ابجد تک سے ناواقف ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ قرآن اور سنت سے استفادہ کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے۔ آگے چل کر پرادنشل آٹانومی کے دور میں جب

ہندوستان کی مجالس مقننہ کو قانون سازی کے زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہوں گے اور سوشل رفارم کے لیے نئے نئے قوانین بنائے جانے لگیں گے اس وقت اگر مسلمانوں کی نمائندگی ایسے لوگ کرتے رہے جو اسلام سے ناواقف ہوں اور اخلاق و معاشرت اور قانون کے مغربی تصورات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو جدید قانون سازی سے مسلمانوں میں سوشل ریفارم ہونے کے بجائے الٹی سوشل ڈیفارم ہوگی اور مسلمانوں کا اجتماعی نظام اپنے اصولوں سے اور زیادہ دور ہوتا چلا جائیگا پس عربی زبان کے مسئلہ کو محض ایک زبان کا مسئلہ نہ سمجھیے، بلکہ یوں سمجھیے کہ یہ آپ کی یونیورسٹی کے اساسی مقصد سے تعلق رکھتا ہے اور جو چیز اساسیات سے تعلق رکھتی ہو اس کے لیے سہولت کا لحاظ نہیں کیا جاتا، بلکہ ہر حال میں اس کی جگہ نکالنی پڑتی ہے۔

(۴) ہائی اسکول کی تعلیم میں طلبا کو حسب ذیل مضامین کی ابتدائی معلومات حاصل ہونی چاہئیں

الف ۔ عقائد ۔ اس مضمون میں عقائد کی خشک کلامی تفصیلات نہ ہونی چاہئیں ۔ بلکہ ایمانیات کو ذہن نشین کرنے کے لیے نہایت لطیف انداز بیان اختیار کرنا چاہیے جو فطری وجدان اور عقل سلیم کو اپیل کرنے والا ہو۔

طلبہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے ایمانیات دراصل کائنات کی بنیادی صداقتیں ہیں اور یہ صداقتیں ہماری زندگی سے ایک گہرا ربط رکھتی ہیں۔

ب ۔ اسلامی اخلاق ۔ اس مضمون میں مجرد اخلاقی تصورات نہ پیش کیے جائیں ۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اور انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ایسے واقعات لیکر جمع کیے جائیں جن سے طلبہ کو معلوم ہو کہ ایک مسلمان کے کیرکٹر کی خصوصیات کیا ہیں، اور مسلمان کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔

ج ۔ احکام فقہ ۔ اس مضمون میں حقوق اللہ و حقوق العباد اور شخصی کردار کے متعلق اسلامی

قانون کے ابتدائی اور ضروری احکام بیان کیے جائیں جن سے واقف ہونا ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ مگر اس قسم کے جزئیات اس میں نہ ہونے چاہئیں جیسے ہماری فقہ کی پرانی کتابوں میں آتے ہیں کہ مثلاً کوئیں میں چوہا گر جائے تو کتنے ڈول نکالے جائیں۔

د۔ اسلامی تاریخ یہ مضمون صرف سیرت رسول اور دور صحابہ تک محدود رہے۔ اس کے پڑھانے کی غرض یہ ہونی چاہیے کہ طلبہ اپنے مذہب اور اپنی قومیت کی اصل سے واقف ہوجائیں اور ان کے دلوں میں قومی افتخار کا جذبہ پیدا ہو۔

۳۔ عربیت عربی زبان کا محض ابتدائی علم جو ادب سے ایک حد تک مناسبت پیدا کردے۔

۴۔ قرآن صرف اتنی استعداد کہ لڑکے کتاب اللہ کو روانی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ سادہ آیتوں کو کسی حد تک سمجھ سکیں اور چند صورتیں بھی ان کو یاد ہوں۔

(۵) کالج کی تعلیم میں ایک نصاب عام ہونا چاہیے جو تمام طلبا کو پڑھایا جائے۔ اس نصاب میں حسب ذیل مضامین ہونے چاہئیں۔

الف عربیت انٹرمیڈیٹ میں عربی ادب کی متوسط تعلیم ہو۔ بی اے میں پہنچ کر اس مضمون کو تعلیم قرآن کے ساتھ ضم کردیا جائے۔

ب۔ قرآن۔ انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کو فہم قرآن کے لیے مستعد کیا جائے۔ اس مرحلہ میں صرف چند مقدمات ذہن نشین کرا دینے چاہئیں۔ قرآن کا محفوظ اور تاریخی حیثیت سے معتبر ترین کتاب ہونا۔ اس کا وحی الٰہی ہونا۔ تمام مذاہب کی اساسی کتابوں کے مقابلہ میں اس کی فضیلت۔ اس کی بے نظیر انقلاب انگیز تعلیم۔ اس کے اثرات نہ صرف عرب پر بلکہ تمام دنیا کے افکار اور قوانین حیات پر۔ اس کا انداز بیان

اور طرز استدلال۔

بی اے میں اصل قرآن کی تعلیم دی جائے۔ یہاں طرز تعلیم یہ ہونا چاہیے
طلبہ خود قرآن کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کریں اور استاد ان کی مشکلات کو حل ا
ان کے شبہات کو رفع کرتا جائے۔ اگر مفصل تفسیر اور جزئی بحثوں سے اجتناب
اور صرف مطالب کی توضیح پر اکتفا کیا جائے تو دو سال میں بآسانی پورا قرآ
پڑھایا جا سکتا ہے۔

ج۔ تعلیمات اسلامی اس مضمون میں طلبا کو پورے نظام اسلامی سے روشناس کرا دیا جائے۔ اسلا
کی بنیاد کن اساسی تصورات پر قائم ہے۔ ان تصورات کی بنا پر وہ اخلاق اور سیر
کی تشکیل کس طرح کرتا ہے۔ پھر انہی کی بنا پر وہ کس طرح ایک سوسائٹی کا نظام مرتب
کرتا ہے۔ پھر اس سوسائٹی کی زندگی کو وہ معاشرت، معیشت، سیاست اور بین الاق
تعلقات میں کن اصولوں پر منظم کرتا ہے اس کے اجتماعی نظام میں فرد اور جماع
کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم کس ڈھنگ پر کی گئی ہے۔ حدود اللہ کیا ہ
ان حدود کے اندر مسلمان کو کس حد تک فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے اور ان حد
باہر قدم نکالنے سے نظام اسلامی پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور جامعیت
کے ساتھ ایک نصاب میں لائے جائیں اور اس کو چار سال کے مدارج تعلیمی پر ا
مناسبت کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے۔

(۶) نصاب عام کے بعد علوم اسلامیہ کو تقسیم کر کے مختلف علوم و فنون کی اختصاصی تعلیم میں ع
اور ہر فن میں اسی فن کی مناسبت سے اسلام کی تعلیمات کو پیوست کیجیے مغربی علوم و فنون بجا۔
سب کے سب مفید ہیں، اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ بھی دشمنی نہیں، بلکہ ایجاباً میں ک

جہاں تک حقائق علمیہ کا تعلق ہے، اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں دشمنی
دراصل علم اور اسلام میں نہیں بلکہ "مغربیت" اور اسلام میں ہے۔ اکثر علوم میں اہل مغرب اپنے
چند مخصوص اساسی تصورات، بنیادی مفروضات (Hypotheses) نقطہائے آغاز (Starting points) اور زوایائے نظر رکھتے ہیں جو بجائے خود ثابت شدہ حقائق نہیں ہیں بلکہ محض ان کے اپنے وجدانیات ہیں وہ حقائق کو لے کر اپنے ان وجدانیات کے سانچہ میں ڈھالتے ہیں، اور اس سانچے کی مناسبت سے ان کو مرتب کرکے ایک مخصوص نظام بنا لیتے ہیں
اسلام کی دشمنی دراصل انہی وجدانیات سے ہے۔ وہ حقائق کا دشمن نہیں بلکہ اس وجدانی سانچے کا دشمن ہے جس میں ان حقائق کو ڈھالا اور مرتب کیا جاتا ہے۔ وہ خود اپنا ایک مرکزی تصور، ایک زاویہ نظر، ایک نقطۂ آغازِ فکر، ایک وجدانی سانچہ رکھتا ہے جو اپنی اصل اور فطرت کے اعتبار سے مغربی سانچے کی عین ضد واقع ہوا ہے۔ اب یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ضلالت کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ مغربی علوم و فنون سے حقائق لیتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ آپ مغرب ہی سے اس کا وجدانی سانچہ بھی لے لیتے ہیں فلسفہ، سائنس، تاریخ، قانون، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علمی شعبوں میں آپ خود ہی اپنے نوجوان اور خالی الذہن طلبہ کے دماغوں میں مغرب کے اساسی تصورات بٹھاتے ہیں ان کی نظر کو مغربی زاویۂ نظر کے مطابق نصب کرتے ہیں، مغربی مفروضات کو مسلمات بناتے ہیں، استدلال واستشہاد اور تحقیق و تفحص کے لیے صرف وہی ایک نقطۂ آغاز ان کو دیتے ہیں جو اہل مغرب کا نقطۂ آغاز ہے اور تمام علمی حقائق اور مسائل کو اُسی طرز پر مرتب کرکے ان کے ذہن میں اتار دیتے ہیں جس طرز پر اہل مغرب نے ان کو مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد صرف ایک دینیات کا شعبہ کیا کرسکتا ہے جس میں مجرد تصورات ہیں مگر حقائق علمیہ اور مسائل حیات پر ان تصورات کا انطباق نہیں بلکہ طلبہ کے ذہن میں جملہ معلومات کی ترتیب

ان تصورات کے بالکل برعکس ہے یہی گمراہی کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ گمراہی کا سدباب کرنا چاہتے ہیں تو اس سرچشمہ کے مصدر پر پہنچ کر اس کا رخ پھیر دیجئے اور تمام علمی شعبوں کو وہ نقطۂ آغاز، وہ زاویہ نظر، وہ اساسی اصول دیجئے جو قرآن نے آپ کو دئیے ہیں جب اس وحدانی سانچہ میں معلومات مرتب ہوں گی اور اس نظر سے کائنات اور زندگی کے مسائل کو حل کیا جائیگا تب آپ کے طلبہ مسلم طلبہ بنیں گے اور آپ یہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے ان میں "اسلامی اسپرٹ" پیدا کی ورنہ ایک شعبہ میں اسلام اور باقی تمام شعبوں میں غیر اسلام رکھ دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آپ کے فارغ التحصیل طلبہ فلسفہ میں غیر مسلم، سائنس میں غیر مسلم، قانون میں غیر مسلم، سیاسیات میں غیر مسلم، فلسفۂ تاریخ میں غیر مسلم، عمرانیات میں غیر مسلم ہوں گے اور ان کا اسلام محض چند اعتقادات اور چند مذہبی مراسم کی حد تک رہ جائے گا۔

(۷) بی ٹی ایچ اور ایم ٹی ایچ کے امتحانات کو بند کر دیجیے۔ نہ ان کی کوئی ضرورت نہ کوئی فائدہ۔ جہاں تک علوم اسلامیہ کے مخصوص شعبوں کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک شعبے کو اسی کے مماثل علم کے مغربی شعبہ کے انتہائی کورس میں داخل کر دیجیے۔ مثلاً فلسفہ میں حکمت اسلامیہ اور اسلامی فلسفہ کی تاریخ اور فلسفیانہ افکار کے ارتقا میں مسلمانوں کا حصہ۔ تاریخ میں تاریخ اسلام اور اسلامی فلسفۂ تاریخ۔ قانون میں اسلامی قانون کے اصول اور فقہ کے وہ ابواب جو معاملات سے متعلق ہیں۔ معاشیات میں اسلامی معاشیات کے اصول اور فقہ کے وہ حصے جو معاشی مسائل سے متعلق ہیں سیاسیات میں اسلام کے نظریات سیاسی اور اسلامی سیاسیات کے نشو و ارتقا کی تاریخ اور دنیا کے سیاسی افکار کی ترقی میں اسلام کا حصہ۔

(۸) اس کورس کے بعد علوم اسلامیہ میں ریسرچ کے لیے ایک مستقل شعبہ ہونا چاہیے جو مغربی یونیورسٹیوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی علمی تحقیق پر سند فضیلت (Doclorate) دیا کرے۔ اس شعبہ میں ایسے لوگ تیار کئے جائیں جو مجتہدانہ طرز تحقیق کی تربیت پا کر نہ صرف مسلمانوں

بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا کی نظری و فکری رہنمائی کے لیے مستعد ہوں۔

(۳)

حصۂ دوم میں جس طرز تعلیم کا خاکہ میں نے پیش کیا ہے وہ بظاہر ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے لیکن میں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ توجہ اور محنت اور صرف مال سے اس کو بتدریج عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ آپ کسی راہ میں پہلا قدم اٹھاتے ہی منزل کے آخری نشان پر نہیں پہنچ سکتے۔ کام کی ابتدا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اسکی تکمیل کا پورا سامان پہلے سے آپ کے پاس موجود ہو۔ ابھی تو آپ کو صرف عمارت کی بنیاد رکھنی ہے، اور اس کا سامان اس وقت فراہم ہوسکتا ہے۔ موجودہ نسل میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس طرز تعمیر پر بنیادیں اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت سے جو نسل اٹھے گی وہ دیواریں اٹھانے کے قابل ہوگی، اور پھر تیسری نسل ایسی نکلیگی جس کے ہاتھوں یہ کام انشاء اللہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ جو درجہ کمال کم از کم تین نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد حاصل ہوسکتا ہے، اس کو آج ہی حاصل کرلینا ممکن نہیں، اور اگر اس کے حصول کو غیر ممکن دیکھ کر آپ اس کی ابتدا ہی نہ کریں، حالانکہ ابتدا کرنے کے اسباب آپ کے پاس موجود ہیں تو یہ سراسر نادانی ہوگی۔

چونکہ میں اس اصلاحی اقدام کا مشورہ دے رہا ہوں اس لیے یہ بھی میرا ہی فرض ہے کہ اس کو عمل میں لانے کی تدابیر بھی پیش کروں۔ اپنے بیان کے اس حصہ میں، میں یہ بتانا چاہتا ہوں اس طرز تعلیم کی ابتدا کس طرح کی جاسکتی ہے اور اس کے لیے قابل عمل تدبیریں کیا ہیں۔

(۱) ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے عقائد، اسلامی اخلاق اور احکام شریعت کا ایک جامع کورس حال ہی میں سرکار نظام کے محکمہ تعلیمات نے تیار کرایا ہے۔ اس کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ بہت

کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔

عربی زبان کی تعلیم قدیم طرز کی وجہ سے جس قدر ہولناک ہوگئی تھی، الحمد للہ کہ اب وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ اس کے لیے جدید طریقے مصر و شام اور خود ہندوستان میں ایسے نکل آئے ہیں جن سے بآسانی یہ زبان سکھائی جاسکتی ہے۔ ایک خاص کمیٹی ان لوگوں کی مقرر کی جائے جو عربی تعلیم کے جدید طریقوں میں علمی و عملی مہارت رکھتے ہیں اور ان کے مشورہ سے ایک ایسا کورس تجویز کیا جائے جس میں زیادہ تر قرآن ہی کو عربی کی تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔ اس طرح تعلیم قرآن کے لیے الگ وقت نکالنے کی بھی ضرورت نہ رہے گی اور ابتدا ہی سے طلبہ کو قرآن کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

اسلامی تاریخ کے بکثرت رسالے اردو زبان میں لکھے جاچکے ہیں۔ ان کو جمع کر کے بنظر غور دیکھا جائے اور جو رسائل مفید پائے جائیں ان کو ابتدائی جماعتوں کے کورس میں داخل کرلیا جائے۔

مقدم الذکر دونوں مضامین کے لیے روزانہ صرف ایک گھنٹہ کافی ہوگا۔ اسلامی تاریخ کا مضمون کوئی الگ وقت نہیں چاہتا۔ تاریخ کے عمومی نصاب میں اس کو ضم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہائی اسکول کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کوئی زیادہ تغیر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ تغیر کی ضرورت جو کچھ بھی ہے نصاب تعلیم، طرز تعلیم اور تعلیمی اسٹاف میں ہے۔ دینیات کی تدریس اور اس کے مدرس کا جو تصور آپ کے ذہن میں اب تک رہا ہے اس کو نکال دیجیے۔ ۱۹۳۶ کے لڑکے کی ذہنیت اور اس کے نفسیات کو سمجھنے والے مدرس رکھیے، ان کو ایک ترقی یافتہ نصاب تعلیم دیجیے، اور اس کے ساتھ ایسا ماحول پیدا کیجیے جس میں "اسلامیت" کے بیج کو بالیدگی نصیب ہوسکے۔

(۲) کالج کے لیے نصاب عام کی جو تجویز میں نے پیش کی ہے اس کے تین اجزا ہیں :-

(الف) عربیت ۔ (ب) قرآن ۔ (ج) تعلیمات اسلامی ۔

ان میں سے عربیت کو آپ ثانوی لازمی زبان کی حیثیت دیجیے ۔ دوسری زبانوں میں سے کسی کی تعلیم اگر طلبہ حاصل کرنا چاہیں تو ٹیوٹرس کے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں ۔ مگر کالج میں انگریزی زبان (یعنے ذریعۂ تعلیم کے بعد جو دوسری زبانیں بطور ثانوی زبان کے پڑھائی جاتی ہیں ان کو موقوف کر کے صرف عربی کی تعلیم دیجیے ۔ اگر نصاب اچھا ہو اور پڑھانے والے آزمودہ کار ہوں تو انٹرمیڈیٹ کے دو سالوں میں طلبہ کے اندر اتنی استعداد پیدا کی جا سکتی ہے کہ وہ بی اے میں پہنچ کر قرآن کی تعلیم خود قرآن کی زبان میں حاصل کر سکیں ۔

قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں ۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو وہ اپنے لکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کرے گا پھر بی ۔ اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھا دے گا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے اور اسلام کی روح سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے ۔

تعلیمات اسلامی کے لیے ایک جدید کتاب لکھوانے کی ضرورت ہے جو ان مقاصد پر حاوی ہو جن کی طرف میں نے حصۂ دوم کے نمبر ۵ ضمن (ج) میں اشارہ کیا ہے کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے خود ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ایک کتاب اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کے عنوان سے لکھنی شروع کی تھی جس کے ابتدائی تین باب "ترجمان القرآن" میں محرم ۵۲ھ سے شعبان ۵۳ھ تک کے پرچوں میں شائع ہوئے ہیں ۔ اگر اس کو مفید سمجھا جائے تو میں اس کی تکمیل کر کے یونیورسٹی کے نذر کر دوں گا ۔

ان مضامین کے لیے کالج کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کسی تغیر کی ضرورت پیش آئے گی عربیت کے لیے وہی وقت کافی ہے جو آپ کے ہاں ثانوی زبان کے لیے ہے۔ قرآن اور تعلیمات اسلامیہ دونوں کے لیے باری باری سے وہی وقت کافی ہو سکتا ہے جو آپ کے ہاں دینیات کے لیے مقرر ہے۔

(۳) زیادہ تر مشکل اُس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں پیش آئے گی جسے میں نے حصۂ دوم کے نمبر ۵ میں پیش کیا ہے۔ اس کے حل کی تین صورتیں ہیں جن کو بتدریج اختیار کیا جا سکتا ہے۔

الف۔ ایسے پروفیسر تلاش کئے جائیں (اور وہ ناپید نہیں ہیں) جو علوم جدیدہ کے ماہر ہونے کے ساتھ قرآن اور سنت میں بھی بصیرت رکھتے ہوں جن میں اتنی اہلیت ہو کہ مغربی علوم کے حقائق کو ان کے نظریات اور ان کی وجدانی اساس سے الگ کر کے اسلامی اصول و نظریات کے مطابق مرتب کر سکیں۔

(ب) اسلامی فلسفہ، قانون، اصول قانون و فلسفۂ تشریع، سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، تاریخ و فلسفۂ تاریخ وغیرہ کے متعلق عربی، اردو، انگریزی، جرمن اور فرنچ زبانوں میں جس قدر لٹریچر موجود ہے اس کی چھان بین کی جائے۔ جو کتابیں بعینہٖ لینے کے قابل ہوں ان کا انتخاب کر لیا جائے۔ اور جن کو اقتباس یا حذف و ترمیم کے ساتھ کارآمد بنایا جا سکتا ہو اُن کو اسی طریق پر کام میں لایا جائے۔ اس غرض کے لیے اہل علم کی ایک خاص جمعیت مقرر کرنی ہو گی۔

(ج) چند ایسے فضلاء کی خدمات حاصل کی جائیں جو مذکورہ بالا علوم پر جدید کتابیں تالیف کریں۔ خصوصیت کے ساتھ اصول فقہ، احکام فقہ، اسلامی معاشیات، اسلام کے اصول عمران اور حکمت قرآنیہ پر جدید کتابیں لکھنا نہایت ضروری ہے، کیونکہ قدیم کتابیں اب درس و تدریس کے لیے کارآمد نہیں ہیں۔ ارباب اجتہاد کے لیے تو بلاشبہ ان میں بہت اچھا مواد مل سکتا ہے

گران کو جوں کا توں لے کر موجودہ زمانے کے طلبہ کو پڑھانا بالکل بے سود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سردست ان تینوں تدبیروں سے وہ مقصد بدرجہ کمال حاصل نہ ہوگا جو ہمارے پیش نظر ہے۔ بلاشبہ اس تعمیر جدید میں بہت کچھ نقائص پائے جائیں گے لیکن اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ صحیح راستہ پر پہلا قدم ہوگا۔ اس میں جو کوتاہیاں رہ جائیں گی ان کو بعد کی نسلیں پورا کریں گی یہاں تک کہ اس کے تکمیلی ثمرات کم از کم پچاس برس بعد ظاہر ہوں گے۔

(۴) اسلامی ریسرچ کا شعبہ قائم کرنے کا ابھی موقع نہیں۔ اس کی نوبت چند سال بعد آئے گی اس لیے اس کے متعلق تجاویز پیش کرنا قبل از وقت ہے۔

(۵) میری تجاویز میں فرقی اختلافات کی گنجائش بہت کم ہے تاہم اس باب میں علمائے شیعہ سے استصواب کر لیا جائے کہ وہ کس حد تک اس طرز تعلیم میں شیعہ طلبا کو سنی طلبہ کے ساتھ رکھنا پسند کریں گے؟ اگر وہ چاہیں تو شیعہ طلبہ کے لیے خود کوئی اسکیم مرتب کریں، اگر مناسبت ہوگا کہ جہاں تک ہو سکے تعلیم میں فروعی اختلافات کو کم سے کم جگہ دی جائے اور مختلف فرقوں کی آیندہ نسلوں کو اسلام کے مشترک اصول و مبادی کے تحت تربیت کیا جائے۔

(۶) سر محمد یعقوب کے اس خیال سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ وقتاً فوقتاً علما، و فضلا کو اہم مسائل پر لکچر دینے کے لیے دعوت دی جاتی رہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ علیگڈھ کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام دنیائے اسلام کا دماغی مرکز بنا دیا جائے۔ آپ اکابر ہندوستان کے علاوہ مصر، شام، ایران، ٹرکی، اور یورپ کے مسلمان فضلا، کو بھی دعوت دیجیے کہ وہ یہاں آکر اپنے خیالات، تجربات اور نتائج تحقیق سے ہمارے طلبہ میں روشنی فکر اور روح حیات پیدا کریں۔ اس قسم کے خطبات کا فی معاوضہ دے کر لکھوائے جانے چاہییں تاکہ وہ کافی وقیع

محنت اور غور و فکر کے ساتھ لکھے جائیں اور ان کی اشاعت نہ صرف یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے بلکہ عام تعلیم یافتہ پبلک کے لیے بھی مفید ہو۔

(۷) اسلامی تعلیم کے لیے کسی ایک زبان کو مخصوص کرنا درست نہیں۔ اردو، عربی، اور انگریزی تینوں زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں بھی اس وقت نصاب کے لیے کافی سامان موجود نہیں ہے۔ لہٰذا سردست ان میں سے جس زبان میں بھی جو مفید چیز مل جائے اس کو اسی زبان میں پڑھانا چاہیے۔ دینیات اور علوم اسلامیہ کے معلمین سب کے سب ایسے ہونے چاہئیں جو انگریزی اور عربی دونوں زبانیں جانتے ہوں۔ علیگڈھ کے لیے کوئی ایک کا آدمی صحیح معلم دینیات نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے بیان کی اس طوالت پر عذر خواہ ہوں۔ مگر اتنی تطویل و تفصیل میرے لیے ناگزیر تھی، کیونکہ میں بالکل ایک نئے راستہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں جس کے نشانات کو پہچاننے میں خود مجھے غور و فکر کے کئی سال صرف کرنے پڑے ہیں۔ میں حتماً اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں کے مستقل قومی وجود اور ان کی تہذیب کے زندہ رہنے کی اب کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ ان کے طرز تعلیم و تربیت میں انقلاب پیدا کیا جائے اور وہ انقلاب ان خطوط پر ہو جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی موجود ہے، اور خود علی گڈھ میں بھی ان کی کمی نہیں، جو میرے ان خیالات کو ایک دیوانے کا خواب کہیں گے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔ پیچھے دیکھنے والوں نے آگے دیکھنے والوں کو اکثر دیوانہ ہی سمجھا ہے، اور ایسا سمجھنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن جو کچھ میں آج دیکھ رہا ہوں، چند سال بعد شائد میری زندگی ہی میں وہ اس کو بچشم سر دیکھنے لگیں گے اور ان کو اس وقت اصلاح حال کی ضرورت محسوس ہوگی جب طوفان سر پر ہوگا اور تلافی مافات کے مواقع کم تر رہ جائیں گے۔

مطبوعات

عربی کا معلم حصہ اول و دوم، از مولوی عبدالستار خاں صاحب، صدر مدرس مدرسۃ الاسلام منارہ مسجد، بمبئی، حجم ۴۷۸ صفحات، قیمت عہ

لغت عرب کے قواعد کو مختصر اور سہل طریق پر بیان کرنے کی اب تک جتنی کوششیں کیگئی ہیں ان میں یہ کوشش کامیاب تر ہے۔ مدارس عربیہ میں صرف و نحو کی جو کتابیں متداول ہیں وہ ملکۂ لسان کے مبادی میں ایسا رسوخ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو اکثر بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ مہینوں گردانوں کے چکر میں سرگرداں رہنے اور زبان سے قطع نظر کرکے محض قواعد کی تحصیل میں مدتوں مشغول رہنے کے بعد بھی اکثر طالب العلم ادب سے بیگانہ ہی رہتے ہیں جملوں کی صرفی و نحوی تحلیل میں تو انھیں بڑی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر کلام عرب سے انھیں کوئی مناسبت پیدا نہیں ہوتی۔ اس طریقے کو متاخرین کی کتابوں نے رواج دیا اور صرف و نحو کے گوناگون مسائل کا وہ انبار لگایا کہ وسیلہ بجائے خود مقصود بن گیا۔ مولوی عبدالستار خاں صاحب نے اس نقص کا عمدگی سے مداوا کیا ہے۔ انہوں نے طلاب کو رٹانے سے زیادہ سمجھانے کی کوشش کی ہے، زبان کو مقصود قرار دے کر مبتدی کی ذہنی رفتار کے متناسب دل نشین اسلوب میں میزان سے کافیہ تک کے تمام ضروری مسائل بڑی خوبی سے سمو دیئے ہیں جس کی وجہ سے ایک ذہین مبتدی قلیل مدت میں بلا امداد معلم عربی زبان میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر سکتا ہے۔

اس کتاب کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ بکثرت امثلہ کلام اللہ سے اخذ کی گئی ہیں۔ جس سے نہ صرف اس طرز کی دوسری کتابیں بلکہ متاخرین کی بھی اکثر کتابیں یکسر عاری ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر ایم اے کی اس رائے سے ہمیں پورا اتفاق ہے کہ بہ نسبت دیگر مروجہ کتب کے یہ کتاب اگر عربی مدارس کے ابتدائی نصاب میں داخل کی جائے تو زیادہ مفید ہوگی، ان دونوں حصوں کے ساتھ ایک ایک کلید بھی صاحب کتاب نے مرتب کی ہے، یہ کلید صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو بطور خود عربی زبان سیکھنی چاہتے ہوں۔ ان دونوں کلیدوں کی قیمت تین آنے اور پانچ آنے ہے (ا-خ)

عربی کا نیا قاعدہ | حصۂ اول ودوم، از مولوی عبدالستار خاں صاحب، قیمت ۹ پائی ار ۶ پائی

فاضل مرتب نے یہ قاعدے حروف شناسی کی تسہیل کے لیے مرتب کئے ہیں اور عربی تعلیم کی طرح ان کے یہ دونوں قاعدے بھی تمام دوسرے قاعدوں سے بہتر ہیں جو آج کل بازاروں میں بکتے ہیں یہ دونوں قاعدے احاطۂ بمبئی کے محکمۂ تعلیم نے ابتدائی مدارس کے نصاب میں داخل کرلیے ہیں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ ناظرین ترجمان القرآن ان قاعدوں سے اپنے بچوں کی تعلیم کی بسم اللہ کریں (ا-خ)

تقریر سیرت | از مولنا احمد سعید صاحب ناظم جمعیت علماء ہند۔ ضخامت ۸۰ ۲۴ صفحات قیمت ۱ عہ ملنے کا پتہ:- دینی بک ڈپو، کوچہ ناہر خاں۔ بیت السعید۔ دہلی۔

مولنا احمد سعید صاحب وعظ وبیان کے بادشاہ ہیں۔ دو برس ہوئے کہ سیرت نبوی پر ا ٹا وے میں ایک تقریر کی تھی جو بعد کو کتابی صورت میں شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔ یہ اسی تقریر کی دوسری اشاعت ہے جسے مولنا کی نظر ثانی نے کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ تقریر کیا ہے، خوش بیانی کا ایک دریا ہے جس کی موجوں پر سیرت پاک، قصص انبیاء وصالحین لطائف قرآن وحدیث، عقل ونقل اور سیاست ملی کے سفینے رواں ہیں۔ (ا-خ)۔

ہمارے نبی کے صحابہ | تالیف مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ۸ ر۔ ملنے کا پتہ: دفتر ترجمان القرآن (حیدرآباد دکن)۔

قدوسی صاحب نے یہ کتاب بچوں کے لیے تالیف کی ہے اخلاق وعبادات اور معاشرت

کے جلی عنوانات کے تحت صحابۂ کرام کی سیرت بیان کی ہے۔ زبان و بیان اور انتخاب احوال کا اسلوب بچوں کی فہم سے مناسب ہے۔ صحیح اسلامی تربیت کے لیے بچوں کو ایسی ہی کتابیں پڑھانی چاہئیں تاکہ شروع ہی سے ان کے دل و دماغ پر اسلامی سیرت کے نقوش مرتسم ہوں اور بزرگوں کے نقش و قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہو۔ (ا ۔ خ)

قومی زبان | تالیف مولنا یعقوب الرحمن صاحب عثمانی لکچرار عثمانیہ کالج (ورنگل) قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ: دار التالیف دیوبند۔

اس مختصر رسالہ میں فاضل مؤلف نے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کیلئے اردو زبان ہی ایک مشترک قومی زبان ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اردو زبان کی خصوصیات بڑی خوبی کے ساتھ بیان کی ہیں اور ان اعتراضات کو رد کیا ہے۔ جو اردو پر کیے جاتے ہیں آج کل اردو کے خلاف جو منظم جدوجہد ہو رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کے حامی اس قسم کے مضامین کو زیادہ سے زیادہ شائع کریں۔ صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندی اور انگریزی اور دوسرے صوبوں کی زبانوں میں بھی ان کی اشاعت ہونی چاہیے۔ (ا ۔ م)

اسلامی علمی زندگی کی درسی کتاب | تالیف سید قاسم حسینی صاحب۔ صفحات ۱۲۲ مجلد قیمت عہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

مؤلف کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس قانونِ حیات کی علمی واقفیت اور عملی اتباع کی طرف توجہ دلائیں جو قرآن مجید اور سنت محمدی میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقصد نہایت مبارک ہے۔ اور مؤلف کی تحریر سے ان کی دردمندی کا بھی پتہ چلتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ آج کل اسلام کی نمایندگی کے لیے محض دردمندی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ پختہ کاری، وسعت نظر، اور حکیمانہ اسلوبِ بیان کی بھی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں ان تینوں چیزوں کی کمی پائی جاتی ہے۔ زبان ناقص ہے املا تک درست نہیں جگہ جگہ غیر ضروری مباحث سے بیان میں الجھاؤ پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور

علم دین میں بھی مؤلف کی واقفیت محدود معلوم ہوتی ہے۔ خیالات پاکیزہ اور مقاصد بہت عمدہ ہیں مگر لکھنے والوں کو قلم اٹھانے سے پہلے اپنی قوت کا صحیح اندازہ کر لینا چاہیے۔ (ا۔م)

نورالنور | تالیف جناب غوثی شاہ صاحب چنچلگوڑہ۔ حیدر آباد دکن۔ ضخامت ۹۶ صفحات قیمت درج نہیں۔ جناب مؤلف سے طلب کی جا سکتی ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے کتاب و سنت سے مسئلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ بحث کس قدر پیچیدہ اور نازک ہے معمولی عقل و فہم کے آدمی تو درکنار، بڑے بڑے ذکی اور صاحب نظر لوگ بھی اس راہ میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اسی لیے اکابر صوفیہ نے عوام کے سامنے اس مسئلے کو پیش کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، اور خواص کے سامنے بھی اس وقت تک بیان نہیں کیا ہے جب تک کہ وہ تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی کے ساتھ معرفت حق کے ابتدائی مدارج سے نہ گذر جائیں۔ پس ہماری رائے میں یہ مناسب ہی نہ تھا کہ شاہ صاحب ممدوح اس کتاب کو شائع فرماتے۔ جہاں تک بیان کا تعلق ہے انہوں نے اپنی طرف سے توضیح کی کوشش میں دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ مگر جو مقامات ہمیشہ سے مزال اقدام رہے ہیں وہ اس تبیین و توضیح کے بعد بھی ویسے ہی ہیں۔ دراصل ان مسائل کا تعلق بیان کرنے والے کی قوت بیان سے زیادہ سمجھنے والے کی قوت فہم و ادراک سے ہے، اور یہ چیز ہر کس و ناکس کو میسر نہیں۔ (ا۔م)۔

تاریخ دکن | تالیف جناب ہارون خانصاحب شیروانی استاذ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ ضخامت ۲۷۰ صفحات۔ قیمت مجلد عہ۔ غیر مجلد ۱۲/

فاضل مؤلف نے یہ کتاب ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کے لیے لکھی ہے۔ مگر عام ناظرین بھی اس کے ذریعہ سے تاریخ دکن کی ضروری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ بیان نہایت صاف اور سلیس ہے واقعات قیاساً مستند ہیں۔ تاریخ نگاری کا جدید اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس سے پڑھنے والوں کی نظر واقعات

کے باطن تک بھی پہنچ سکتی ہے، اور وہ تغیرات احوال میں تمدن و تہذیب کے ارتقاء کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مزید براں اس کتاب میں اُن نقائص کی اصلاح پر بھی کافی توجہ کی گئی ہے جو ہندوستان کی تاریخ نگاری میں غیر قومی نقطۂ نظر کے غالب ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ (ا - م)۔

الزہرات | جناب عبدالرحمن کاشغری صاحب استاذ دارالعلوم ندوہ کے عربی کلام کا مجموعہ ہے شاعر ترکی الاصل ہے اور ہندوستان میں اس نے عربی کی تعلیم پائی ہے، مگر کلام میں عربیت کی شان پائی جاتی ہے، ہندوستان میں عربی ادب کے مذاق کو زندہ کرنے کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان میں اہل ندوہ پیش پیش ہیں، اور ان کی خدمات قدر کے قابل ہیں۔ امید ہے کہ عربیت کا ذوق رکھنے والے حضرات اس مجموعۂ کلام سے لطف اندوز ہوں گے قیمت ۸ر ملنے کا پتہ مکتبۃ الضیاء لکھنؤ۔

اسباب زوال امت | امیر شکیب ارسلان کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جسے سیرت کمیٹی (پٹی) نے شائع کیا ہے۔ امیر موصوف دنیا ئے اسلام کے لیڈروں میں ایک نمایاں شخصیت رکھتے ہیں۔ مسلمانان عالم کے حالات پر انکی نظر بہت گہری اور وسیع ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ پستی کے اہم ترین اسباب کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور نہایت عبرت انگیز واقعات سے مثالیں دیکر مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کونسی اخلاقی اور ایمانی کمزوریاں ہیں جو ان کے زوال کی باعث ہوئیں اور اب تک ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں میں اس رسالہ کی عام اشاعت ہونی چاہیے قیمت فی نسخہ ۲؎ آٹھ نسخوں کے لیے ایک روپیہ۔ سو نسخوں کے لیے دس روپیہ۔

جدید خطبات جمعہ | از جناب "خطیب رازی" شائع کردہ سیرت کمیٹی، پٹی (ضلع لاہور)۔

یہ خطبے اردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ہر خطبہ کی ابتدا عربی میں حمد و صلوٰۃ اور چند آیات قرآنی سے کی گئی ہے اور اس کے بعد نہایت عام فہم اردو میں مسلمانوں کے موجودہ حالات و